تاریخ دارالعلوم دیوبند

جلد اوّل

برِّ صغیر کے مسلمانوں کا سب سے بڑا دینی کارنامہ

اسلامی تعلیم و ثقافت اور ملّت کی نشأۃِ ثانیہ کا سرچشمہ
دارالعلوم دیوبند کی عظیم دینی و علمی خدمات اور سیاسی سرگرمیوں کا تاریخی جائزہ

بایماء

مجلسِ شوریٰ دارالعلوم دیوبند

مرتبہ: سیّد محبوب رضوی

تاریخ دارالعلوم دیوبند جلد اوّل

طباعت و ترجمے کے جملہ حقوق دارالعلوم دیوبند کے لئے محفوظ ہیں

طباعت فوٹو آفسیٹ

مقدمہ :- حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

مصنف ــــــــــــ سیّد محبوب رضوی

طبع اول ــــــــــــ ۱۹۹۲ء

تعداد طبع ــــــــــــ ایک ہزار

کتابت ــــــــــــ دلشاد احمد صدیقی

کتابت ــــــــــــ مولوی مقبول احمد

مطبع ــــــــــــ

قیمت مجلد ــــــــــــ

طابع و ناشر

ادارۂ اہتمام دارالعلوم دیوبند (یوپی)

فہرست مضامین

مقدمہ ۱۱

دیباچہ ۵۷

باب اوّل

مدارس کا آغاز ۶۸

اسلام ہندوستان میں ۶۹

ہندوستان کے مدارس ۷۱

شاہ ولی اللہ کی تعلیمی خدمات ۸۶

دارالعلوم کے اکابرِ علم (سلسلۂ اسناد) ۹۲

شاہ عبدالعزیزؒ ۹۴

شاہ محمد اسحاقؒ ۹۵

شاہ عبدالغنیؒ ۹۵

مولانا مملوک علیؒ ۹۷

مولانا رشیدالدین خاںؒ ۱۰۰

شاہ رفیع الدینؒ ۱۰۱

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ۱۰۲

حاشیۂ بخاری کا زمانۂ تحریر ۱۰۹

درسِ حدیث کا طریقہ ۱۱۲

تواضع اور استغنا ۱۱۵

تحفظِ اسلام کی خدمات اور اجراء مدارس ۱۱۶

میلہ خداشناسی شاہجہاں پور ۱۱۷

مناظرہ رڑکی ۱۱۹

تحریکِ اصلاح عقدِ بیوگان ۱۲۰

جنگِ آزادی میں شرکت ۱۲۱

وفات ۱۲۲

اکابرِ ستہ ۱۲۳

مولانا ذوالفقار علیؒ ۱۲۳

مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ ۱۲۵

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ۱۲۵

دیوبند، سرزمینِ دارالعلوم ۱۲۹

اکابرِ دارالعلوم کی عمریں قیامِ دارالعلوم کے وقت ۱۳۵

نصب العین ۱۳۶

☆

باب دوم

دارالعلوم دیوبند کا قیام ۱۴۹
چندہ کی تحریک ۱۵۰
بانیٔ دارالعلوم کا دستور العمل ۱۵۲
دارالعلوم کا افتتاح ۱۵۵
قیام دارالعلوم کا اعلان ۱۵۶
دارالعلوم کی حیرت انگیز کامیابی ۱۵۷
تعلیمی اور انتظامی اقدامات ۱۶۰
سالانہ امتحان ۱۶۱
سنہ ۱۲۸۴ھ کے حوادث ۱۶۱
درجۂ قرآن اور درجۂ فارسی کا آغاز ۱۶۲
کتبِ درسیہ کی فراہمی ۱۶۳
تعلیمی کیفیت ۱۶۳
سنہ ۱۲۸۵ھ میں حضرت گنگوہیؒ کا معائنہ ۱۶۴
مختلف مقامات میں مدارسِ دینیہ کا اجراء ۱۶۴
وباء اور قحط کی مشکلات ۱۶۵
اہتمام میں تبدیلی ۱۶۵
سنہ ۱۲۸۷ھ میں سابقہ عوارض کے اثرات ۱۶۵
سنہ ۱۲۸۸ھ کا سالِ ترقی ۱۶۶
مولانا رفیع الدینؒ کی واپسی ۱۶۶
سنہ ۱۲۸۹ھ، عطاءِ اسناد ۱۶۶
دورۂ حدیث میں بعض علماء کی شرکت ۱۶۷
درسی کتابوں کے عطیات ۱۶۷
جلسۂ تقسیم انعام ۱۶۹
دارالعلوم کی بین الاقوامی شہرت ۱۷۳
مدارس کے الحاق کا آغاز ۱۷۳
حضرت شیخ الہند مسندِ تدریس پر ۱۷۴
دارالعلوم کے لئے موجودہ جگہ کی تجویز ۱۷۴
ایک انگریز جاسوس کے دلچسپ مشاہدات ۱۷۵
دس سالہ حالات کا خلاصہ ۱۸۱
جلسۂ تقسیم اسناد ۱۸۲
دارالعلوم کی اولین عمارت کا سنگِ بنیاد ۱۸۳
فتاویٰ کا آغاز ۱۸۶
مدارسِ ملحقہ کے امتحانات ۱۸۶
ترک مجروحین کا کے لئے چندہ ۱۸۷
حضراتِ اکابر کا سفرِ حج ۱۸۷
انجمن ثمرۃ التربیت کا قیام ۱۸۷
مدرسہ کے بجائے دارالعلوم ۱۸۷
تعلیم طب کا اجراء ۱۸۸
حضرت نانوتویؒ کی وفات ۱۸۹

حضرت گنگوہیؒ کی سرپرستی ۱۹۱
حضرت شیخ المشائخ کی ہدایت ۱۹۱
جلسۂ تقسیم انعام و دستار ۱۹۲
دار العلوم کے ہندو معاونین ۱۹۴
سنہ ۱۳۰۰ھ، دار العلوم کے ثمرات اور اٹھارہ سالہ نتائج کا خلاصہ ۱۹۶
شعبۂ طب کا قیام ۱۹۷
حضرت مولانا محمد یعقوبؒ نانوتوی کی وفات ۱۹۸
سنہ ۱۳۰۳ھ، کے تعلیمی اعداد و شمار ۱۹۹
حیدر آباد میں ایک امدادی انجمن کا قیام ۱۹۹
ریاست حیدر آباد کی امداد ۲۰۰
مولانا رفیع الدینؒ کا سفر حج ۲۰۱
شیخ الہندؒ مسندِ صدارت پر ۲۰۱
معاونِ اہتمام ۲۰۱
دار الافتاء کا قیام ۲۰۲
فضلاء دار العلوم، ملک کے دینی مدارس میں ۲۰۲
اہتمام میں تبدیلی ۲۰۳
حضرت گنگوہیؒ کی تشریف آوری ۲۰۳
دار الاقامہ کی تعمیر کے لئے حیدر آباد کی مساعی ۲۰۴
دار الطلبہ کی تعمیر ۲۰۶
کتب خانہ کا ذخیرۂ کتب ۲۰۶
حضرت تھانویؒ اور رائپوریؒ کی رکنیت مجلس شوریٰ ۲۰۷
شعبۂ تجوید کا اجراء ۲۰۷
انگریزی تعلیم کی تجویز ۲۰۸
صوبۂ متحدہ کے گورنر کا ورود ۲۰۹
مولانا ذوالفقار علیؒ کی وفات ۲۱۰
حضرت گنگوہیؒ کی وفات ۲۱۰
جلسۂ تقسیم انعام ۲۱۲
حضرت مولانا حبیب الرحمٰنؒ مسندِ اہتمام پر ۲۱۴
کتب خانہ کی عمارت ۲۱۴
سنہ ۱۳۲۵ھ، حوادثِ وفات ۲۱۵
تعمیرِ مسجد کی تجویز ۲۱۶
حیدر آباد اور بھوپال کے چندے میں اضافہ ۲۱۷
ایک مبصر کا تبصرہ ۲۱۷
مسجد کی تعمیر ۲۱۹
حضرت شاہ صاحبؒ اور حضرت مولانا مدنیؒ مسندِ تدریس پر ۲۲۱
جمعیۃ الانصار کا قیام ۲۲۱
دستار بندی کا عظیم الشان جلسہ ۲۲۲
مطبخ کا اجراء ۲۲۵

شعبۂ تبلیغ کا قیام ۲۲۵

دارالحدیث کی تعمیر ۲۲۶

بنیادِ دارالحدیث میں طلبہ کی مخلصانہ ہمت ۲۲۷

بارگاہِ نبوت میں دارالحدیث کی مقبولیت ۲۲۸

علامہ سید رشید رضا کا ورودِ دارالعلوم ۲۳۰

انجمن "ہلالِ احمر" کی امداد میں دارالعلوم کی مساعیٔ حسنہ ۲۳۱

مجلہ "القاسم" ۲۳۲

"ہلالِ احمر" کے چندے کا اثر دارالعلوم پر ۲۳۳

۱۳۳۳ھ کے اجمالی حالات ۲۳۴

"الرشید" کا اجراء ۲۳۴

جبۂ نبویؐ کا غلاف ۲۳۵

ڈھاکہ کے لئے وفد کی روانگی ۲۳۸

تنخواہوں میں اضافہ ۲۳۹

ریلوے اسٹیشن پر مسجد کی تعمیر ۲۴۱

گورنر یوپی کا ورود ۲۴۱

حیدرآباد کے عطیے میں اضافہ ۲۴۳

دارالعلوم کی غیر معمولی ترقی ۲۴۵

تعلیمی کیفیت ۲۴۵

حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری ۲۴۷

رسالہ "سیرِ دارالعلوم" ۲۴۸

۱۳۳۶ھ، وفیات ۲۵۱

دارالعلوم کا اثر جنوبی اور مشرقی افریقہ میں ۲۵۲

حضرت شیخ الہندؒ کی رہائی اور واپسی ۲۵۴

جدید دارالاقامہ کی بنیاد ۲۵۵

حضرت شیخ الہند کی وفات ۲۵۶

فرانس اور جنوبی افریقہ کی گرانقدر امداد ۲۵۸

حضرت مہتمم صاحب کا حیدرآباد کے عہدۂ افتاء کے لئے انتخاب ۲۵۸

اضافۂ مشاہرات اور بعض تغیرات ۲۶۰

شدھی اور سنگھٹن کے زمانے میں دارالعلوم کی تبلیغی خدمات ۲۶۱

تبلیغی تعلیم کا انتظام ۲۶۶

چارسالہ مالیات کا مدّوجزر ۲۶۷

حضرت مہتمم صاحب کی حیدرآباد سے واپسی ۲۶۷

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کا تقرر بجائے حضرت مہتمم صاحبؒ ۲۶۸

حضرت تھانویؒ کی سرپرستی ۲۶۸

ایک اہم حادثہ ۲۶۹

گذشتہ ہنگامہ کی تجدید ۲۷۰

دستورِ اساسی میں ترمیم ۲۷۰

مجلس انتظامیہ کا قیام ۲۷۱

طلبہ کی اسٹرائک اور حضرت شاہ صاحبؒ کے ہم خیال حضرات کا استعفاء ۲۷۱
حیدر آباد کا تحقیقاتی وفد ۲۷۴
حضرت حافظ صاحبؒ کا سانحۂ وفات ۲۷۵
حضرت مولانا عثمانی کا حادثۂ وفات ۲۷۷
اہتمام کے لئے حضرت مولانا محمد طیب صاحب کا انتخاب ۲۷۸
مسجد میں اضافہ اور دارالحدیث کی تکمیل ۲۸۱
دورۂ تفسیر کا اجراء ۲۸۱
تجوید کا لزوم ۲۸۲
تعمیر دارالحدیث فوقانی ۲۸۲
قواعدِ داخلہ میں اصلاح ۲۸۳
کھانے کے ٹکٹ ۲۸۳
ایک مبارک چندہ ۲۸۴
پنشن کا اجراء ۲۸۵
صدارتِ اہتمام ۲۸۵
سرپرستی کا مسئلہ ۲۸۵
تین شعبوں کا قیام ۲۸۷
شعبۂ تنظیم و ترقی ۲۸۷
محافظ خانہ ۲۸۷
شعبۂ ورزش ۲۸۸
علماء مصر کا وفد ۲۸۸
چند جدید عمارتیں ۲۸۹
حافظ محمد ابراہیم صاحب وزیر رسل و رسائل کا ورود ۲۹۱
مولانا سندھی کی واپسی ۲۹۳
سلطان ابن سعود کا علمی ہدیہ ۲۹۴
حضرت مہتمم صاحب کا سفر افغانستان ۲۹۵
دارالتفسیر کی تعمیر ۳۰۰
باب الظاہر کی تعمیر ۳۰۰
ایک مفید تعلیمی اسکیم کی تدوین ۳۰۱
دارالعلوم اور مسلم یونیورسٹی کا تعلق ۳۰۲
دارالاقامہ کی تکمیل ۳۰۴
ماہنامہ "دارالعلوم" کا اجراء ۳۰۵
حضرت مولانا مدنیؒ کی گرفتاری ۳۰۶
سالانہ امتحان کا التواء و تعطیلِ عام ۳۰۷
چینی نمائندے عثمان وُو کی آمد ۳۰۸
ملکی حالات کا اثر دارالعلوم پر ۳۰۹
علامہ عثمانیؒ کی یکسوئی ۳۱۰
حضرت مولانا مدنیؒ کی رہائی ۳۱۱
شعبۂ خوشخطی کا اجراء ۳۱۲
دارالصنائع کا قیام ۳۱۲

بہار اور گڑھ مکتیشر کے فسادزدہ مسلمانوں کی امداد و اعانت ۳۱۳
پراویڈنٹ فنڈ کا اجرار ۳۱۴
۱۵ اگست ۱۹۴۷ء ۳۱۵
دارالافتار کی جدید عمارت ۳۲۱
انسدادِ ارتداد مسلمانانِ دہرہ دون ۳۲۱
مسلم یونیورسٹی کورٹ کے لئے علمائے دیوبند کا انتخاب ۳۲۱
دارالعلوم کی تلاشی اور احکام عیدالاضحیٰ کی ضبطی ۳۲۲
پاکستانی طلبار کے داخلے میں حکومتِ ہند کا تعاون ۳۲۴
حکومتِ ہند کی جانب سے بیرونِ ہند میں دارالعلوم کا تعارف ۳۲۴
سفیرِ افغانستان کی دارالعلوم میں تشریف آوری ۳۲۶
مولانا آزاد کی تشریف آوری ۳۲۷
ملک کی تقسیم کا آمدنی اور طلبار کی تعداد پر اثر ۳۲۸
اچاریہ ونوبا بھاوے کے تاثرات ۳۳۱
دارالعلوم کا ایک نازک مالیاتی دور ۳۳۳
قرب وجوار کے مسلمانوں کی فیاضی ۳۳۴
ایک مصری فاضل کا ورود ۳۳۴
شعبۂ طب میں اضافہ اور دارالشفار کا قیام ۳۳۵
دارِ جدید میں پانی کی بہم رسانی ۳۳۶
ملک حجاز کا پیغام تبریک ۳۳۶
الوزیر السادات کی دارالعلوم میں آمد ۳۳۷
امریکہ اور یورپ میں دارالعلوم کا تعارف ۳۳۸
مصر سے دارالعلوم کے روابط ۳۳۸
دارالعلوم کی مسجد میں توسیع ۳۳۹
ایک مذہبی اجتماع ۳۳۹
فتاویٰ دارالعلوم کی تدوین ۳۴۰
صدر جمہوریۂ ہند دارالعلوم میں ۳۴۲
حضرت مہتمم صاحب کا سفر برما ۳۴۹
حضرت مولانا مدنی کی وفات ۳۵۰
شاہِ افغانستان کا ورود ۳۵۱
دارالعلوم دیوبند اور افغانستان کے تعلقات ۳۵۱
شعبۂ تنظیم فضلار دارالعلوم ۳۵۶
حضرت مہتمم صاحب کا سفر افریقہ ۳۵۸
دائرۃ المعارف حیدرآباد کی جوبلی میں دارالعلوم کی نمائندگی ۳۵۸
صدر جمال عبدالناصر کے لئے علمی ہدایا ۳۵۹
حجاجِ کرام ۳۶۰
جامعۂ طبیہ کا اجرار ۳۶۰

ڈاکٹر پی۔ہار۔ڈی کی آمد	۳۶۱
ہمایوں کبیر کی آمد	۳۶۲
قرآن مجید کے ریکارڈ	۳۶۱
دارالعلوم ایک صدی کے بعد	۳۶۹
کتب خانہ کی ترتیب	۳۷۲
مولانا حفظ الرحمٰن کی وفات	۳۷۲
شام کے ایک جلیل القدر عالم کے تاثرات	۳۷۴
حضرت مہتمم صاحب کا سفرِ افریقہ و مصر	۳۷۸
مستشرقین کی کانگریس میں دارالعلوم کی شرکت	۳۸۵
مجلّہ "دعوۃ الحق" کا اجراء	۳۸۵
غلّے کی فراہمی میں حکومت اتر پردیش کا تعاون	۳۸۶
اتر پردیش کے گورنر کی دارالعلوم میں آمد	۳۸۷
دارالعلوم مرکزی حکومت کی نظر میں	۳۸۹
ایک افسوسناک واقعہ	۳۹۱
کتب خانہ کا جدید ہال	۳۹۲
علماء دیوبند کی تصانیف	۳۹۲
مصر، شام اور اُردن کے لئے امداد	۳۹۳
حضرت علامہ بلیاوی کی وفات	۳۹۴
دارالعلوم کا عام الحزن	۳۹۴
۱۳۸۹ھ کی اسٹرائک	۳۹۶
مغربی ممالک کے ریسرچ اسکالر	۳۹۷
عرب ممالک کے زائرین کے تاثرات	۳۹۸
مسجدِ چھتہ	۳۹۹
نصابِ تعلیم میں تبدیلی	۴۰۰
دارالعلوم کا بیرونی ملکوں سے رابطہ	۴۰۰
جدید تعمیرات	۴۰۰
دارالعلوم کی خدمات سے ہندوستان کی تاریخ روشن ہے	۴۰۱
حضرت مہتمم صاحب کا سفرِ یورپ	۴۰۲
مُسلم پرسنل لا کے تحفظ کی جدوجہد	۴۰۳
حوادث	۴۰۹
مصری ثقافتی وفد	۴۱۰
واردین وصادرین	۴۱۰
زائرینِ حجاز	۴۱۰
رابطہ عالم اسلامی کے وفود	۴۱۱
گورنر اتر پردیش کی آمد	۴۱۱
دارالقضاء کا قیام	۴۱۲
حضرت مہتمم صاحب کا سفر افریقہ و حجاز اور یورپ	۴۱۲
شیخ الازہر اور دیگر علمائے عرب کی تشریف آوری	۴۱۵

وفیات ۴۱۷

صدر جمہوریہ ہند کی آمد ۴۱۸

باب سوم

دار العلوم کا مسلک ۴۲۴

دار العلوم کے قیام کی مشکلات اور مشیتِ ایزدی کا فیصلہ ۴۳۶

دار العلوم کی عالمگیر دینی دعوت اور تعلیمی تحریک ۴۳۹

دار العلوم کے فضلاء کرام کی کارکردگی ۴۴۵

دار العلوم دیوبند کا علمی اور دینی فیضان ۴۴۸

دار العلوم کے نقشِ قدم پر دینی مدارس کا قیام ۴۶۴

مدرسہ تھانہ بھون ۴۶۶

مدرسہ اسلامی میرٹھ ۴۶۷

مدرسہ اسلامی گلاؤٹھی ۴۶۹

مدرسہ اسلامی دان پور ۴۷۰

مدرسہ اسلامی مراد آباد ۴۷۲

تحفظِ دین کی مساعی ۴۷۷

دار العلوم کا حصہ تحریکِ آزادی میں ۵۰۶

فضلائے دار العلوم کی تصنیفی خدمات ۵۱۸

مآخذ و مراجع ۵۳۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

الہامی مدرسہ اور اس کا الہامی مکتبِ فکر

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

آج جبکہ دارالعلوم کی تاریخ اور اس کے کارناموں کی تفصیل آپ کے سامنے آرہی ہے ضرورت ہے کہ اس کی معنویت اور حقیقت پر بھی ایک مختصر روشنی ڈالدی جائے کہ اس کے بغیر اس کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی، گو فنِ تاریخ کے لحاظ سے اس قسم کے کشفی اور الہامی واقعات کو اہمیت نہ دیجائے اور انھیں محض خوش اعتقادی کا ثمرہ کہہ کر نظر انداز کردیا جائے لیکن جبکہ اُس کی بنیادوں ہی میں یہ معنوی حقیقت اساسی حیثیت رکھتی ہو، بلکہ اس کی مجموعی تاریخ کی روح ہی یہ حقائق ہوں جس سے اس کی امتیازی شان کا نشوونما ہوا ہو، تو ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی حقیقی تاریخ ہی ان خصوصیات میں مضمر ہے اور ان کا ذکر نہ کیا جانا اس کی امتیازی شان کو پس پردہ ڈالدینا ہے اس لئے ضروری تھا کہ اس کی ظاہری تاریخ کے ساتھ اس کی باطنی تاریخ بھی سامنے آجائے کہ یہ ادارہ اوّل سے لے کر آخر تک کس معنوی اساس پر قائم ہے اور کن حقائق سے اس کی روز افزوں مقبولیت کا نشوونما ہوا ہے۔

اس سلسلے میں بنیادی طور پر اولین چیز اس کا مکتبِ فکر ہے جس کے واضح کئے بغیر اس کی معنویت پر روشنی نہیں پڑسکتی، اور نہ ہی اس کا دینی رُخ واضح ہوسکتا ہے۔ یہاں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں، اوّل یہ کہ اس کا مرکزی فکر کیا ہے جس سے اس کے قیام کا نصب العین متعین ہو، اس

مرکزی فکر کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ جس سے اس کے گوشہ ہائے عمل متعین ہوں، اس فکر کا سرچشمہ کیا ہے جہاں سے یہ فکر اسے ملا، اس کے پہنچنے کا راستہ کیا ہے جس سے اس کا استناد اور قابل اطمینان ہونا نمایاں ہو، یہی وہ سوالات ہیں جنھیں حل کئے بغیر اس کی معنویت اور حقیقت پر روشنی نہیں پڑ سکتی۔

سو اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ دارالعلوم کا سلسلۂ استناد محدثِ ہند حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے چلتا ہے، جس کی سند متصل اوپر سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا علم اور ذوق و فکر شاہ عبدالعزیز، پھر شاہ محمد اسحاق اور شاہ عبدالغنی کے واسطوں سے حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ اسرارہم تک پہنچا اور انھوں نے اس ادارۂ مقدسہ یعنی دارالعلوم دیوبند کے ذریعے سے اسے عالمگیر بنایا، سو بلاشبہ کتاب و سنت کی تعلیم اور توحید و رسالت کی عظمت و توقیر کی وضاحت و بیان میں حضرت شاہ ولی اللہ کا ایک مخصوص رنگ اور ممتاز اندازِ تفہیم ہے، جس کا اولین جوہری مادہ وحیٔ خداوندی اور اس کا تفقہ ہے، جو ان کا اساسِ فکر ہے، پھر تعلیم و تلقین کے دائرے میں اس کی وہ نوعیتِ بیان ہے جو ہر دور کی نفسیات کو اپیل کرتی ہے جس کے مختلف اجزاء ترکیبی ہیں، جو حسبِ نفسیاتِ زمانہ اس میں کارفرما ہوتے آرہے ہیں، پھر یہ اندازِ فکر محض کسی عقلی سوچ بچار یا ذہنی کاوش کا نتیجہ نہیں بلکہ الہامی ہے جس کی الہامی نوعیت کو خود حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ہی اپنی معرکۃ الآراء تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں ظاہر کر دیا ہے، فرمایا کہ:۔

وبینا انا جالس ذات یوم بعد صوٰۃ العصر متوجھاً الی اللہ اذ ظھرت روح النبی صلی اللہ علیہ وسلم وغشیتنی من فرقی بشیٔ خیل الی انہ ثوب القی علی و	ایک دن میں نماز عصر کے بعد متوجہ الی اللہ بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک ظاہر ہوئی اور سر سے مجھے ڈھانپ لیا، مجھے یوں محسوس ہوا کہ کوئی کپڑا مجھ پر ڈالدیا گیا ہے اور

نفث في روعي في تلك الحالة
انه اشارة الى نوع بيان
للدين ووجدت عند ذلك
في صدري نورا لم يزل
ينفسح كل حين ثم الهمني
ربي بعد زمان ان مما كتبه
عليَّ بالقلم الاعلى ان انتهض
يوما لهذا الامر الجلي وانه
اشرقت الارض بنور ربها وانعكست
الاضواء عند مغربها وان
الشريعة المصطفوية
اشرقت في هذا الزمان
على ان تبرز في قمص
سابغة من البرهان
ثم رأيت الامامين الحسن
والحسين في منام رضي الله
عنهما وانا يومئذ بمكة
كانهما اعطياني قلما و
قالا هذا قلم جدنا
رسول الله صلى الله عليه وسلم
ولطالما اُحدّث نفسي ان ادوّن

اور اس حالت میں میرے دل میں یہ ڈالا گیا کہ یہ
دین کی ایک خاص نوعیت کے بیان کی طرف اشارہ
ہے اور اس وقت میں نے اپنے سینہ میں ایک نور
محسوس کیا جو ہر لحہ بڑھتا اور پھیلتا جاتا تھا، کچھ
عرصہ کے بعد میرے رب نے مجھے الہام فرمایا کہ
قلم اعلیٰ (قلم تقدیر) نے جو امور میرے لئے لکھے ہیں
ان میں سے یہ بھی ہے کہ میں کسی دن اس امر کیلئے
کھڑا ہو جاؤں جسے پھیلتے ہوئے نور کی شکل
میں میں نے دیکھا تھا، یعنی دین کا ایک خاص بیان
وتشریح، بالیقین زمین چمک اٹھی اپنے رب کے نور سے
اور اس کی شعاعیں منعکس ہوئیں غروب کے وقت،
روشنی نے اپنا عکس زمین پر ڈالا ہے (یعنی
دل کی ہر سمت پر یہ نور چھا گیا جو علم حقائق کا ایک
خاص نور تھا) اور ارادہ یہ کہ شریعت مصطفویہ اس
دور میں حجت وبرہان کے مکمل لباس میں نمایاں
ہونی ہے (جو اس عقل پسندی کے دور کی نفسیات
کا تقاضا ہے) پھر میں نے مکہ مکرمہ میں ایک روز
دین کے دو اماموں حضرت حسن وحسین رضی اللہ
عنہما کو خواب میں دیکھا کہ گویا ان دونوں نے مجھے
ایک قلم عطا کیا اور فرمایا کہ یہ ہمارے جد امجد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کا قلم ہے، تب میں بار بار اپنے دل میں

فيه رسالة تكون تبصرة للمبتدي وتذكرة للمنتهي۔	سو چاہا کہ اس فن اسرار و حقائق میں ایک رسالہ مدوّن کروں جو مبتدی کے لئے تو بصیرت بنے اور منتہی کے لئے تذکیر ثابت ہو (تو "حجۃ اللہ البالغہ" تصنیف کی)
(حجة الله البالغة) (ج ۱ ص ۳)	

اس سے واضح ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے باالہام خداوندی بھانپ لیا تھا کہ اب دین کو محض نقل و روایت سے عقیدتمندانہ سمجھنے کا زمانہ نہیں رہا، عقلی مطالبوں اور حجت طلبیوں کا دور شروع ہو گیا ہے، حقیقت شناسی، حق طلبی اور اعتقادی روایات پر ایمانی پختگی سست پڑ گئی ہے اور عقل پرستی غالب آتی جا رہی ہے، تا آنکہ لوگ مغیبات کو بھی عقل ہی کی ترازو میں تولنے کی فکر میں لگ گئے ہیں۔ اس لئے جب تک منقول دین کو معقول کا لباس پہنا کر پیش نہیں کیا جائے گا اس وقت تک اس دور کی عقل پرست طبیعتیں مطمئن نہ ہوں گی اور اسے اِنْ هٰذَا اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ کہہ کر ناقابلِ التفات ٹھہرا دیں گی اور دین سے محروم ہو جائیں گی۔ اس لئے شاہ صاحب نے باالہامِ خداوندی اس جامع منقول و معقول مکتبِ فکر کے ذریعے دین پہنچانے کا فیصلہ فرمایا تا کہ پورا دین جیسے نقل و روایت کے لحاظ سے کامل ہے اسی طرح عقل و درایت کی رو سے بھی کامل ہی نمایاں ہو، اور کسی بھی عقل پرست یا درایت دوست انسان کے لئے ناقابلِ التفات نہ ہونے پائے اس لئے یہ نادرِ روزگار کتاب حجة الله البالغہ خاص اس موضوع پر تصنیف فرمائی جس سے صاف واضح ہے کہ بیان دین کا یہ فکر خالص الہامی تھا جو ولی اللّٰہی قلب میں القا ہوا، ساتھ ہی حضرت شاہ صاحب نے یہ بھی واضح فرما دیا کہ یہ عقلی مصالح اور حِکَم و اَسرار دین کی بنیاد نہیں ہیں کہ ان پر دین موقوف ہو بلکہ اصلی بنیاد صرف وحی الٰہی اور اس کی مستند روایت ہے یہ عقلی براہین محض اس کے اثبات اور لوگوں کے قریب الفہم کرنے کے ذرائع ہیں، خود عقائد و مقاصد دین کا ماخذ نہیں، حتیٰ کہ اگر کوئی فلسفی یا عقلی اصول کسی عقیدہ کے مخالف ہو تو اسے ترک کر دیا جانا اور عقیدہ کو مضبوطی سے تھام لیا جانا ہی حقیقی دین ہوگا، اس لئے اُس الہامی زبان

میں اس بیان کی نوعیت اور درجۂ حجیت پر بھی روشنی ڈالی اور فرمایا کہ:۔

فلما ظهر اعجاب كل ذي رأي برأيه وتشعبت بهم السبل اختار قوم ظاهر الكتاب والسنة وعضوا بنواجذهم على عقائد السلف ولم يبالوا بموافقتها للاصول العقلية ولا بمخالفتها لها فان تكلموا بمعقول فلالزام الخصوم والرد عليهم اولزيادة الطمانينة لا لاستفادة العقائد منها وهم اهل السنة (حجة الله ص ۹)

اور جب ہر ذی رائے کا اصرار اپنی رائے پر ظاہر ہونے لگا اور لوگوں کے راستے مختلف ہو گئے تو ایک قوم نے ظاہر کتاب و سنت کو اختیار کر لیا اور عقائدِ سلف کے بارہ میں اُسے دانتوں سے مضبوط پکڑ لیا، فلسفیانہ یا عقلی اصول کی موافقت یا مخالفت کی کوئی پرواہ نہیں کی، پھر بھی انھوں نے ان عقلی اصول کو اختیار کیا تو مخالفین کے رد کیلئے یا زیادہ اطمینان حاصل کرنے کے لئے، نہ کہ اُن سے عقائد اخذ کرنے کے لئے۔ بس یہی لوگ ہیں وہ اہل السنت

پھر عقائد و اصولِ دین ہی نہیں، عملی مسائل کے بارہ میں مزید فرمایا کہ:۔

واوجبت ايضا انه لا يحل ان يتوقف في امتثال احكام الشرع اذا صحت بها الرواية على معرفة تلك المصالح لعدم استقلال عقول كثير من الناس في معرفة كثير من المصالح ولكون النبي صلى الله عليه وسلم اوثق عندنا من عقولنا۔ (حجة الله ص ۶)

اور (اس سنت نے ہم پر) یہ بھی واجب کیا ہے کہ احکام شرعیہ کے ماننے اور عمل کرنے میں جبکہ وہ صحیح روایت سے ہم تک پہنچ جائیں ان مصالح کے پہچاننے پر ہرگز توقف نہ کیا جائے، کیونکہ عموماً عام عقلیں اس معرفت میں مستقل نہیں ہیں (جب تک علم وحی ان کی رہنمائی نہ کرے) نیز اس لئے بھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات ہماری (جزوی) عقلوں سے کہیں زیادہ باوثوق اور واجب الاعتماد ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ اہل السنت والجماعت کے مسلک پر عقل اصل نہیں بلکہ وحی اصل ہے

عقل وحی پر حاکم نہیں جیسا کہ معتزلہ سمجھے ہوئے ہیں بلکہ وحی عقل پر حاکم اور عقل کے صحت وسقم کا معیار ہے، پس عقیدہ ہو یا عمل اس کی بنیاد وحی پر قائم کی جائے گی نہ کہ اپنی عقلی سوچ بچار پر، کیونکہ دینِ خداوندی نقلِ صحیح پر مبنی ہے جو روایت ہو کر ہم تک پہنچا ہے، عقلی اختراعات پر نہیں جو ہمارے ہی اندر سے ابھرتے ہیں، آسمان سے نازل نہیں ہوتے، یہ عقلی مصالح محض ردِّ خصوم کے لئے یا خصوم اور مخالفین کو انہی کی زبان میں دین سمجھانے کے لئے یا بطور خود ذاتی اطمینان حاصل کرنے کے لئے ہیں نہ کہ ایمان لانے یا دین بتانے کے لئے ہیں۔

اس سے واضح ہے کہ نقلی اور روایتی دین کو عقلی دلائل، طبعی مصالح اور رُوحانی اسرار و حِکَم کے جامہ میں پیش کیا جانا اور دین کو دینِ فطرت دکھلا کر اس دور کی عقل زدہ طبیعتوں کے لئے قابلِ قبول بنا دینا اس الہامی مکتبِ فکر کا پہلا جزو ہے جو حضرت شاہ صاحب کے قلب میں منجانب اللہ القا ہوا۔ لیکن حجۃ اللہ البالغہ ہی کے اسلوب بیان اور طرزِ تفہیم سے جس میں عقائد و مسائل کے اثبات کے لئے یہ عقلی حکمتیں اور حجتیں پیش فرمائی ہیں یہ بھی نمایاں ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے ان حکمتوں کو متعلقہ آیات و روایات کی طرف منسوب فرما کر انہیں زیادہ تر کشفی اور ذوقی رنگ میں پیش فرمایا ہے، اس لئے قدرتی طور پر اس سے صرف وہی عقل پسند طبیعتیں مطمئن ہو سکتی ہیں جو کسی نہ کسی حد تک ان روایات کو مانتے ہوئے اس ذوق اور اندرونی وجدان کی کوئی اہمیت ذہن میں لئے ہوئے ہوں، اور ان کا ایمانی احساس بالکل مردہ نہ ہو چکا ہو، ورنہ جو لوگ سرے سے اس اعتقاد اور ذوق کے اس کوچہ ہی سے نابلد اور بے ذوق محض ہوں وہ اسے علم و حکمت کہنے کے بجائے تخیل آفرینی کا عنوان دے کر اڑا دیتے اور بے التفاتی کی نذر کر کے دین سے بدستور محروم رہ جاتے چہ جائیکہ اس سے کوئی فائدہ اٹھاتے، چنانچہ اس عقل پسندی کے ابتدائی دور میں جو انگریزوں کی دراندازیوں، عیارانہ سازشوں اور ان کے ملحدانہ نظریات کا بھی ابتدائی ہی دور تھا، اس عقل و نقل کی آمیزش سے وہ لوگ راہ راست پر آتے رہے جنہیں گو عقل چین سے نہیں بیٹھنے دیتی تھی لیکن پھر بھی وہ اس دور کے عمومی ماحول اور دینی رنگ کے

پھیلے ہوئے اثرات سے کچھ نہ کچھ مانوس اور متاثر ہونے کی وجہ سے اتنے بیگانۂ دین نہیں ہو گئے تھے کہ کھلے بندوں الحاد و دہریت کی دلدل میں پھنس جاتے یا ان دلی ذوق و وجدان اور ضمیر کی سلامتی سے کلیۃً بیگانہ ہو کر صریح انکار و تکذیب پر آجاتے۔

لیکن اس دور کی طفولیت کا زمانہ گذر جانے پر جب عقل پسندی کے شباب کا دور آیا اور انگریزی اقتدار بھی مخفی اور سازشی دور سے گذر کر کھلے میدانوں میں دوڑنے لگا تو اسی نسبت سے یہ ذوق بھی گھٹنے لگا، بلکہ اس کی ساتھ جیسے فرنگی نظریات اور الحادی انکار دین کے مقابلہ میں ایک حریف کی صورت میں سامنے آنے لگے اور فلسفے کے ساتھ سائنس کا جوڑ لگ جانے سے یہ نظریات محسوسات کی صورت اختیار کرنے لگے تو عقل محض بھی پیچھے رہ گئی اور اُس کے تحت حکومت پر یلغار کر کے محسوس پسندی نے قبضہ جما لیا اور کسی منقول کو معقول بنا کر پیش کر دیا جانا بھی اس کے مان لینے کا ضامن نہ رہا جب تک کہ اسے محسوسات کا لباس پہنا کر سامنے نہ کر دیا جائے، کیونکہ زمانہ کی رفتار اور ہوا کا رُخ بتلا رہا تھا کہ اب عنقریب نیوٹن اور گوئٹے کی جگہ لینن اور اسٹالین لینے والے ہیں اور نظریاتی فلسفوں کے بجائے رحسّی اور معاشرتی ازم اور حسیاتی فلسفوں کی داغ بیل پڑنے والی ہے۔ جو کسی بھی نظریاتی اور عقلیاتی فلسفہ کو اس وقت تک اہمیت دینے کے لئے تیار نہ ہوں گے جب تک کہ اس میں عملیاتی اور محسوس عوامل کار فرما نظر نہ آئیں بلکہ ان معاشرتی اور حسیاتی ازموں کے گلے میں زور و توانائی کی تلواریں بھی حائل نہ ہوں، چنانچہ انگلستان کی پارلیمنٹ میں حسّی اور مادّی طاقتوں کے گھمنڈ میں گلیڈ اسٹون کی یہ صدا گونجنے والی تھی کہ "ہم اب اس درجہ طاقتور ہو چکے ہیں کہ اگر آسمان بھی ہم پر گرنا چاہے تو ہم اُسے اپنی سنگینوں کی نوک پر روک لیں گے" پھر کچھ وقفہ کے بعد اسٹالن کا یہ نعرہ فضا میں گونجنے والا تھا کہ اب ہم نے روسی سرحدوں میں خدا کا داخلہ ممنوع قرار دیدیا ہے، گگارین چاند کے سفر سے واپس ہو کر یہ کہنے والا تھا کہ میں زمین کے مرکز سے گذر کر آسمانی فضا میں چکر کاٹتا رہا اور میں نے ایک گھنٹہ میں سترہ مرتبہ سورج کا طلوع و غروب دیکھا، مگر خدا کو وہاں کسی جگہ نہیں پایا، نیز اس دنیائے دنی میں کھلے بندوں اینٹی خدا اور اینٹی رسول انجمنیں بھی قائم ہونے والی تھیں، صرف

اس لئے کہ خدا انھیں اِن آنکھوں سے نظر نہیں آتا، معاذ اللہ۔ حاصل یہ کہ عقلی تگ و تاز کے بجائے حسّی دوڑ شروع ہو رہی تھی اور دل و دماغ کی طاقتوں کی جگہ صرف پیشانی کی آنکھ کی حکمرانی جمنے والی تھی، بالفاظ دیگر وہ پُرانی یہودیت دنیا کے سامنے پھر سے زندہ ہو کر سامنے آنے والی تھی جس نے یہود کے ایمان کو غارت کیا تھا اور وہ یہی تھی کہ انھوں نے اپنی دینی بنیاد پر تیشہ چلاتے ہوئے آنکھ ہی کو اپنا معبود ٹھہرا لیا تھا، اور یہ کہا تھا کہ:

لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً — ہم (اے موسیٰ) تم پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک خدا کو کھُلی آنکھوں نہ دیکھ لیں۔

اور یہ کہ ہم خدائی کلام کو کلام الٰہی تسلیم نہیں کریں گے جب تک کہ خدائی آواز اپنے ان کانوں سے نہ سُن لیں، حتیٰ نسمع کلام اللہ۔ گویا یہ زیغ اصول کی شکل اختیار کر چکا تھا کہ جو چیز آنکھ سے محسوس نہ ہو وہ موجود بھی نہیں ہے، جس کا حاصل یہی تو تھا کہ عقل کی جگہ حس اور معقولات کی جگہ محسوسات لے چکے تھے، اس لئے وہ معنویات کو بھی جو دل سے دیکھنے کی چیزیں اور حسّی شکل و صورت سے بری و بالا ہیں آنکھوں ہی سے دیکھ لینے کے خواہش مند تھے جو فطرت کے خلاف تھا، پس انھیں دین جیسی لطیف اور معنوی حقیقت سمجھانے کے لئے محض عقلی قمیص میں سامنے لے آنا کافی نہیں رہ گیا تھا، جب تک اسے محسوسات کا لبادہ اُڑھا کر سامنے نہ لایا جائے اس لئے جیسے اس عقل پسندی کے دور کے آغاز پر حضرت الامام شاہ ولی اللہ نے بالہامِ الٰہی بیانِ دین کے لئے عقلی حجت و برہان کی راہ ڈالی اسی طرح اس حس پسندی کے دور کے آغاز پر اُنہیں کی چوتھی علمی پشت کے ایک جوہر فرد حضرت شاہ عبدالغنی محدث دہلویؒ نے دنیا کی یہ صورت حال دیکھ کر بیانِ دین میں محسوسات کے لباس کی نشاندہی بھی فرمائی گو اس کے عملی دور کا آغاز بعد میں ہوا، چنانچہ یہ حقیقت خود اُنہی کے واقعہ سے نمایاں ہوتی ہے جیسے حاجی امیر شاہ خاں صاحب خورجوی متوسّل خاص حضرت قاسم العلوم نانوتویؒ نے طلبہ کی ایک جماعت کے سامنے بیان فرمایا جس میں یہ احقر راقم الحروف بھی حاضر تھا، کہ حکیم نورالدین خلیفۂ اول مرزا قادیانی، حضرت شاہ عبدالغنی صاحب کے تلامذہ میں شامل تھا،

گو بعد میں گمراہ ہو گیا، اس کے فارغ التحصیل ہو جانے پر حضرت شاہ صاحب نے اُس سے فرمایا کہ میاں نور الدین کتابیں تو تم نے ختم کر لیں اب کچھ اللہ اللہ کرنا سیکھو، اُس نے کہا کہ حضرت قرآن پڑھ لیا، حدیث پڑھ لی اِس کے سوا اور اللہ اللہ کیا ہے؟ فرمایا کہ میاں نور الدین تم نے میرے درسِ حدیث سے یہ اندازہ لگا لیا ہو گا کہ میں منقول کو معقول کر کے دکھلا دیتا ہوں، اللہ اللہ کرنے سے یہ معقول محسوس بن جائے گا، منشا یہ تھا کہ کثرتِ ذکر سے ہی اشراقِ قلبی پیدا ہوتا ہے جس کے نور سے عالمِ معنویات کے ساتھ عالمِ حسّیات کے حقائق و معارف بھی کھل جاتے ہیں، اشارہ اس طرف تھا کہ اب دین کو صرف نظری طور پر عقلی رنگ میں پیش کر دیا جانا کافی نہ ہو گا، جب تک اُسے حسّی انداز کے دلائل اور محسوس شواہد سے دنیا کے آگے نہ رکھا جائے، جس کا راستہ ریاضت و مجاہدہ اور کثرتِ ذکر کے سوا دوسرا نہیں کہ اس سے قلب میں معرفت و بصیرت اور اس سے انکشافِ حقائق کی شان پیدا ہوتی ہے اور نظریاتی مسائل محسوسات بن کر نظر آنے لگتے ہیں۔

بس اس بیانِ دین میں حضرت الامام ولی اللہ نے تو عقلی مصالح و اسرار کو شامل کیا تھا، اور ان کے اس طبقۂ چہارم کے تلمیذِ خاص (حضرت شاہ عبدالغنیؒ) نے اسی کے ساتھ حسّی اور شاہداتی دلائل و شواہد کو بھی شامل کر دیا ہے جو اسی الہامِ ربّانی اور القاء عرفانی کے نور کا اثر تھا، لیکن تھا بہر حال یہ بھی وہی ذوقی اور خطابی انداز جو آیات و روایات کی حکمت کے طور پر اپنوں یا ذہنی قریب کے افراد ہی کے لئے مؤثر اور اُنہی کے جذبات کو اپیل کر سکتا تھا، ایسی استدلالی شان کا نہ تھا کہ ایک منکرِ محض اور معاندِ خالص کو بھی جو کتاب و سنت اور وحی الٰہی کا انکار دل میں چھپائے ہوئے ہو اور خود سرے سے وجودِ صانع کا منکر، نبوت ہی کی ضرورت سے منحرف ہو کر حشر و نشر ہی کا سرے سے قائل نہ ہو، اور ان عقائد کو محض ایک دل خوش کن داستانِ پارینہ سمجھے ہوئے ہو تو آیت و روایت یا اس کی نسبت سے پیدا شدہ حکمت و بصیرت اس پر کیا اثر انداز ہو سکتی تھی جو آیت و روایت کا نام سنتے ہی بدک جاتا ہو، اس لئے ضرورت تھی کہ آیات و روایات کا ابتدائی ذکر کئے بغیر دین کو اس کے سامنے محض سائنٹیفک اصول سے فلسفیانہ پیرایوں اور موجودہ دور کے حسّیاتی آزمودوں کے

انداز سے اس طرح پیش کیا جائے کہ قطع نظر نقد و روایت کے اور قطع نظر ان کے عقلی دلائل اور محسوس براہین کے اسلام اس کے سامنے مستقلاً ایک فلسفہ اور ازم کی صورت سے نمایاں ہو۔ ابتداء میں یہ محسوس ہی نہ ہو کہ یہ کوئی آسمانی دین پیش کیا جا رہا ہے بلکہ احساس یہ ہو کہ یہ ایک مستقل نظری اور طبعی فلسفہ اور دستور زندگی ہے جس کے اپنائے بغیر آدمی اپنی زندگی کبھی بھی خوشگواری کے ساتھ نہیں گذار سکتا، اور جب اُس کی عقل کی تنگنائیوں میں اس دین سے اُنس کچھ رواں دواں ہو جائے تو آخر میں کہا جائے کہ یہی تو وہ اسلام ہے جس سے تم بدکے ہوئے تھے۔

اس صورت حال کو سامنے رکھ کر اگر آج کے دور کو دیکھا جائے تو یہ صورت حال اُس میں اپنی انتہائی منزل تک پہنچ چکی ہے، آج کی جنگ عقائد و افکار کی نہیں بلکہ نظریات کی ہے اور حقیقتاً نظریات کی بھی نہیں بلکہ زیادہ تر عنوانات اور اسالیب بیان کی ہے، آج اگر ایک حقیقت کو خدا اور رسول کا نام لے کر پیش کیا جائے تو قومیں اس سے راہِ فرار اختیار کر لیتی ہیں، اور وہی حقیقت اگر تمدن و معاشرت اور دنیوی مفادات کے عنوان سے پیش کی جائے تو اسے قابل توجہ ہی نہیں بلکہ لائق قبول سمجھتی ہیں جس کے معنی یہ نکلتے ہیں کہ اصل دشمنی خدا اور رسول کے نام سے ہے، ان کے پیغام سے نہیں ہے بشرطیکہ وہ ان کے نام سے پیش نہ کیا جائے جس کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہے کہ آج کے سطحیت پسند دور میں ساری مذہبی جنگیں حقائق و وقائع کی نہیں صرف عنوانات کی ہیں یعنی سطحیت پسندی اس حد پر آ چکی ہے کہ معانی اور حقائق تو بجائے خود ہیں صرف تعبیر اور تعبیری نسبتوں پر حق و باطل کا مدار ٹھہر گیا ہے، مثلاً اگر ابتداءً ہی تلقین عقیدہ کسی دینی روایت یا مذہب کے نام سے سامنے آئے خواہ کتنی ہی حکمتیں کھول دی جائیں وہ بدستور وحشت و فرار کی نذر ہوتی رہے گی، اور اُسی کو اگر سائنس، فلسفہ، معاشیات اور تمدنی مصالح کے عنوان سے ایک ازم کی صورت میں پیش کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ وحشت و فرار کا ذریعہ ثابت نہیں ہوتی بلکہ لائق توجہ اور قابلِ قبول ہو جاتی ہے گویا دنیا لفظ پسند اور

معنی بیزار ہو چکی ہے، اس لئے محسوسات اور لفظی عنوانات ہی سے اس کی اصلاح بھی ممکن ہے بشرطیکہ وہ لفظ انہی معانی کے ہوں جنہیں دلوں میں پیوست کرنا منظور ہو، اس لئے اس دَور کے مریضانِ رُوح کے علاج کے لئے اس ولی اللّٰہی خاندان کی پانچویں علمی پشت میں ایک فرد اُٹھا جس نے اس مذکورہ نہج پر دین و مذہب، دینی عقائد اور دینی اصول و کلیات کو اسی الہامِ ربّانی کی تحریک سے ابتداءً ہی قرآن و حدیث یا مذہب و ملّت کا نام لئے بغیر حقائقِ قرآن و حدیث کو ایسے استدلالی اور منطقی طرزِ بیان سے زمانہ کے سامنے پیش کیا جیسے وہ اس زمانہ کے حسبِ حال ایک مضبوط اور مستحکم ازم پیش کر رہا ہے جس کا ظاہری عنوان ابتداءً نہ اعلانِ مذہب ہے نہ اطلاع غیب مگر انتہاءً وہی مذہب اور عقیدۂ غیب ہے، مگر اس ڈھنگ سے کہ جیسے وہ خالص ایک فلسفیانہ ازم کی تلقین ہے کہ اُس کے مانے بغیر نہ اس دور کی معاشرت صحیح اسلوب سے چل سکتی ہے نہ سیاست و مدنیت اور نہ ہی مابعد الموت کی زندگی استوار اور کامیاب ہو سکتی ہے، اس لئے اس نے ایک نئے حسّیاتی فلسفہ و حکمت کی بنیاد ڈالی، ہم اُسی شخصیت کو حضرت قاسم العُلوم مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے نام سے یاد کرتے ہیں، جو شاہ ولی اللہ شاہ عبدالعزیز، شاہ محمد اسحٰق اور شاہ عبدالغنی کے علوم کا نچوڑ اور ان کے دینی تفقّہ کا خلاصہ تھا، اور اس نے وہی امانت جو ولی اللّٰہی دور سے لی تھی اس دور کے مناسب حال حکیمانہ انداز سے دنیا کے سامنے رکھدی، چنانچہ اس دور کے ذہن کے پیش نظر حضرت قاسم العلوم کی تحریرات اور تصنیفات میں سطح پر آیات و روایات یا دینی اصطلاحات کا ابتداءً کہیں ذکر نہیں آتا گو وہ معنیً آیات و روایات ہی ہوتی ہیں بلکہ نمایاں طریق پر تعبیری حصّہ بلحاظ صورت استدلالی شکلوں، برہانی حجتوں اور حسّی شواہد و نظائر کی صورتوں پر مشتمل ہوتا ہے اور اندرونی حصّہ بلحاظ معانی و مرادات ایمانی حقیقتوں، عرفانی ذوقیوں اور کشفی و انشراحی کیفیتوں پر مشتمل ہوتا ہے، اس لئے حضرت قاسم العلوم نے اس دور کے مسلّمات اور محسوسات کے آئینہ میں آیات و روایات کا جلوہ نمایاں کیا ہے، مگر فلسفیانہ استدلال اور منطقیانہ طرزِ اثبات سے اس طرح جیسے ایک

مستقل فلسفۂ حیات پیش کیا جا رہا ہے، مگر آخر میں کھلتا یہ ہے کہ یہی تو وہ اسلام ہے جس کے نام سے دنیا کو وحشت زدہ کر دیا گیا تھا، اس طرح اُن پر یہ کھُل جاتا ہے کہ وہ صرف ناموں اور عنوانوں پر لڑ رہے تھے، حقیقتِ حال کی انھیں ہوا بھی نہیں لگی تھی، درحالیکہ فطرۃً وہ حقیقت سے دور نہ تھے لیکن جب اس حکیمانہ طرز سے اُن پر حقیقت کھُل گئی تو انجام کار وہی عنوان اس پر آ گیا جو اس حقیقت کے لئے اللہ رب العزت نے وضع فرمایا تھا یعنی اسلام جسے شاہ ولی اللہؒ اور اُن کے پیشروؤں نے پیش کیا تھا۔

اسی لئے حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ شاہ ولی اللہؒ کی حکمت کے لئے زینہ صرف حکمتِ قاسمیہ ہے جس سے گذرے بغیر آدمی ولی اللٰہی مدارک تک کما حقہ نہیں پہنچ سکتا، پس شاہ ولی اللہؒ جن علوم کو ذوقی اور کشفی رنگ سے پیش کرتے ہیں، حضرت قاسم العلومؒ اُنہی علوم کو استدلالی رنگ سے سامنے لاتے ہیں، وہ فی الجملہ مانوس مگر شکوک میں پڑے ہوئے لوگوں کو منکر نہیں ہونے دیتے، اور یہ منکروں اور خالص ملحدوں کو قائل کرتے ہیں، وہ آیات وروایات کے ذیل میں اُن کی حکیمانہ تشریح کرتے ہیں اور یہ اپنی حکمت سے منحرفوں کو آیات وروایات کے دروازے پر لا کھڑا کرتے ہیں تاکہ قصرِ مذہب میں وہ بآسانی داخل ہو جائیں، بشرطیکہ یہ حکمت اُن تک پہنچ جائے یا پہنچا دی جائے اور جیسے حکمت ولی اللٰہی الہامی ہے ویسے ہی حکمتِ قاسمیہ بھی الہامی اور علمِ لدنّی کا خزانہ ہے اور جیسے حکمت ولی اللٰہی کے بارے میں خود صاحب حکمت نے اپنے کلام میں صراحت کی ہے کہ وہ الہامی ہے، ذہنی کاوشوں کا نتیجہ نہیں، جس کی وضاحت اور صراحت اُن کے کلام سے گذر چکی ہے، ایسے ہی حکمت قاسمیہ کے بارے میں بھی صاحب حکمت کی تصریحات اُن کے کلام میں موجود ہیں جیسے مصابیح التراویح میں خود فرماتے ہیں کہ:

انچہ بصفحۂ خاطرمی ریزند برقلم می آرم (جو کچھ میرے صفحۂ دل پر اتارتے ہیں میں اسے سپردِ قلم کر دیتا ہوں) یا جیسے "تقریر دل پذیر" میں مسئلہ تقدیر کی تقریر

کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ کے فلاں مقام پر پہنچکر قلم رُک گیا اور
طبیعت بند ہو گئی تو میں نے اس بارگاہِ عزت کی طرف رجوع کر کے عرض کیا کہ

قطرۂ دانش کہ دادستی زپیش متصل گردان بدریاہائے خویش

سوالحمد للہ کہ باب مفتوح ہو گیا اور اب جو کچھ بھی وہ دل میں ڈال رہے ہیں میں اُسے صفحۂ قرطاس پر لا رہا ہوں (او کما قال) اسی طرح اور مواقع میں بھی تصریحات ہیں۔ اسی طرح شاہ عبدالغنیؒ کے کلام میں بھی صراحۃً نہیں تو کنایتاً موجود ہے کہ اُن کی حکمتِ تفہیم بھی القائی ہے جیساکہ نورالدین کو اللہ اللہ کرنے کی تلقین سے معقول کے محسوس بن جانے کی اطلاع کثرتِ ذکر کے عنوان سے دی گئی، جس کے معنی اس کے سوا دوسرے نہیں کہ اس ورد کا وارد الہام غیبی ہے جو اُن پر گذرا اور انھوں نے خود چکھ کر دوسرے کو چکھانا چاہا۔

بہرحال ایک ہی حکمتِ لدنّی ہے جو شاہ ولی اللہؒ پر بالہام الٰہی گذری تو اُس نے بیانِ دین میں عقلی رنگ کا جامہ پہنا، شاہ عبدالغنیؒ پر گذری تو اُس نے محسوسات کا پردہ ڈالنے کی نشاندہی کی، اور قاسم العلومؒ پر گذری تو اس نے ذوقیات کے بجائے حسّیات اور اُن میں بھی برہانی استدلال کا لباس اختیار کیا، اور جیسے جیسے زمانہ کی ذہنیت رنگ بدلتی گئی ویسے ہی ویسے یہ حکمتِ لدنّی مختلف لباس اختیار کرتی رہی، جس کا قدرِ مشترک الہام اور القاء ربّانی ہے، یہ ہی القاء جو بانعام خداوندی ان بزرگوں کا ذہن بنتا گیا مگر حضرت نانوتویؒ چونکہ ان سب سے مستفید اور ان کے تربیت یافتہ تھے اس لئے وہ اِن سب بزرگوں کے علم و حکمت کا نچوڑ ثابت ہوئے۔ اس لئے وہ اہل السنت والجماعت کے مسلک کے مکمل شارح بنے اور انھوں نے موقعہ بموقعہ اس مسلک کے علوم کو کہیں عقلی رنگ سے کہیں حسّی رنگ سے کہیں برہانی طرزِ استدلال کے رنگ سے اپنی تعلیم و تلقین اور کتاب و خطاب سے ظاہر کیا، جس سے یہ مسلک جامع انداز سے دنیا کے سامنے آیا، اور اس کی جامعیت نمایاں ہو گئی کہ وہ نقل کے ساتھ عقل اور عقل کے ساتھ حسّ اور حسّ کے ساتھ استدلالی رنگ کا جامع ہے

اس لئے قاسم العلوم کے علم میں علم کے ساتھ معرفت، حکم کے ساتھ حکمت، نقل کے ساتھ عقل معقول کے ساتھ محسوس، قانون کے ساتھ مصالح، شریعت کے ساتھ طریقت، ایمان کے ساتھ احسان، اثبات کے ساتھ دفاع یعنی دین کے ساتھ شوکت دین کے جذبات جمع کر کے اسے ایک معجون مرکب کی صورت سے حیات آفریں تریاقی رنگ میں پیش فرمایا، جو خالص الہام کے سرچشمہ سے نکلی ہوئی حقیقتیں تھیں، اور حق تعالیٰ نے اپنے لامحدود جود و کرم سے ان کا طبعی مزاج ہی یہ بنا دیا کہ اگر وہ ایک جزوی مسئلہ کو بھی ثابت کرتے ہیں تو وہ بھی اصولِ کلیہ کے چولے میں نمایاں ہوتا ہے جس سے ایک جزئی ہی کا نہیں سینکڑوں جزئیات کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اپنے دور میں جب حضرت قاسم العلوم ہی دارالعلوم دیوبند کے بنیادی فکر کے ہمہ اوست تھے جیسا کہ ان کے تلامیذ، ان کے رفیقوں اور اُن کے بزرگوں تک کی تصریحات ہیں تو دارالعلوم کے مسلک میں بھی یہ الہامی شان نمایاں ہونی ناگزیر تھی جو ہوئی، اور واضح ہو گیا کہ اس کا مسلک اور مرکزی فکر اور دینی رُخ کسی سوچ بچار کا کوئی نتیجہ نہیں بلکہ الہامِ الٰہی کے بحرِ ذخار کا ایک قطرہ ہے، پس اگر یہ کہدیا جائے تو بلا خوفِ لومۃ لائم کہا جا سکتا ہے کہ دیوبندیت اوّلاً ولی اللّٰہیت اور ثانیاً قاسمیت کا نام ہے، محض پڑھنے پڑھانے کا نام نہیں، اور اس میں ان علمی نسبتوں کے اجتماع کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ وہ محض مدرسہ نہیں بلکہ مدرسۂ فکر اور آج کل کی اصطلاح میں ایک مستقل مکتبِ خیال ہے۔

اس سے واضح ہے کہ دیوبندیت کوئی مذہب یا فرقہ نہیں جیسے معاندین اسے ایک مذہب یا فرقہ کا نام دے کر عوام کو اشتعال دلانے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ مسلک اہل السنت والجماعت کا ایک جامع مرقع اور مکمل ایڈیشن ہے جس میں اہل السنت والجماعت کی ساری شاخیں اپنی اصل سے جڑی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ شاعرِ مشرق ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اس دیوبندیت کے بارے میں کیا خوب جامع جملہ استعمال فرمایا تھا جو انھیں کو زیب دیتا تھا

جب کہ اُن سے کسی نے پوچھا کہ یہ دیوبندی کیا چیز ہے؟ یہ کوئی مذہب یا فرقہ؟ تو فرمایا کہ نہ مذہب ہے نہ فرقہ بلکہ ہر معقول پسند دیندار کا نام دیوبندی ہے۔ فللّٰہ درّ ما قال۔

بہرحال مدرسۂ دیوبند کا مرکزی فکر اور بنیادی دینی رُخ یا مسلک اہل السنت والجماعۃ کا ایک جامع، معتدل اور ہمہ گیر مسلک ہے جس میں سنت اور جماعت کے جمع ہوجانے سے اصول دین کی عظمت جو کتاب وسنت ہے اور شخصیات دین کا احترام جو فقہار، محدثین، متکلمین، مفسرین صوفیا اور اصولیین اور علما ربانیین ہیں، دونوں جمع ہیں نہ اس میں اصول سے ہٹ کر اختراع وتجدد اور جدت پسندی ہے کہ بدعات ومحدثات کا دروازہ کھُل جائے اور نہ شخصیات دین سے کٹ کر خود پسندی اور اعجاب رائے ہے کہ غرور وگھمنڈ اور کبر ونخوت کا باب مفتوح ہوجائے، اور سلف صالح اور خلف عدول کی عظمت پا در ہوا ہوجائے، پس پہلے روگ کی روک تھام تو لفظ السنت سے ہوتی ہے اور دوسری بیماری کی مدافعت لفظ الجماعۃ سے ہوجاتی ہے، اور اس طرح یہ جامع اور معتدل مسلک ان تمام بیماریوں سے پاک ہوکر مدرسہ دیوبند اور اس کے ہم مشرب مدارس کے ذریعہ سے ہم تک صحیح سالم پہنچ گیا ہے، ورنہ جس مسلک میں بھی افراط وتفریط ہے وہ انھی دو لفظوں السنت اور الجماعۃ کے فقدان یا کسی ایک کی کمی سے ہے، اگر سنت نہ ہو تو بدعت واحداث کا مسلک بن جائے گا اور الجماعۃ نہ ہو تو خود رائی، آزاد فکری اور ہیبا کی کا مسلک بن جائے گا، اور انھی دو کوتاہیوں کا نتیجہ افراط وتفریط ہے

فساد کبیرٌ عالم متھتک　　　واکبر منه جاھل متنسك

ھما فتنة فی العالمین کبیرة　　　لمن بھما فی دینه متمسك

نسبت قاسمی کے ان درخشاں آثار اور دارالعلوم کی اینٹ اینٹ میں انھیں جاری و ساری دیکھ کر ایک نظم بعنوان "تعبیر منام قاسمی" بے ساختہ اس احقر کے قلم وقرطاس پر آگئی درحالیکہ نہ میں شاعر ہوں نہ شعر گوئی اپنا مشغلہ ہے، لیکن جذبات جب اُبھر کر منصّۂ ظہور پر آنے کے متقاضی بن جاتے ہیں تو ان کے لئے فن شاعری نہ شرط ہوتا ہے نہ وہ اس کے

پابند ہوتے ہیں، یہ نظم فارسی زبان میں ۷۰، ۱ اشعار پر مشتمل ہے، اس کے چند اشعار جو نسبتِ قاسمی اور دارالعلوم میں اُس کے رچے بسے ہونے نیز دارالعلوم کے مرکزی فکر سے متعلق ہیں چونکہ اس مقام کے مناسب محسوس ہوئے اس لئے ان کا پیش کر دیا جانا کسی اجنبی چیز کا فصل نہیں سمجھا گیا، بالخصوص وہی حقائق اس نثر میں بھی آپ کے سامنے آچکے ہیں تو ان کا نظم کے لباس میں آجانا کوئی جدید اضافہ نہیں صرف نوعیتِ ادا کا فرق ہے، اور وہ یہ ہیں ؎

نسبتِ قاسمی احسنتَ کہ ہنگامۂ دیں — از تو گرم است بدوراں چہ دفاع وچہ ہجوم
نسبتِ قاسمی اکرمتَ کہ دینِ فطرت — از تو پیدا است بہر کس چہ عدول وچہ ظلوم
نسبتِ قاسمی انعمتَ کہ ایں نعمتِ کُل — از تو حاوی است بر آفاق باندازِ عموم
نسبتِ قاسمی اعدلتَ کہ عدلِ اسلام — بری از فرط و فُرط گشتہ ز تو شد معلوم
نسبتِ قاسمی افضلتَ کہ فیضانِ غیوب — بر تو شد شاہد و مشہود ز غیبِ مکتوم
نسبتِ قاسمی ارشدتَ کہ ارشاد وہُدیٰ — جا گرفتہ بقلوب از تو بتعدیلِ فہوم
نسبتِ قاسمی اَبصرتَ کہ فکرِ انجام — از تو شد در دلِ عالَم ز بصیرت مفہوم
نسبتِ قاسمی ازتست ذکاء و انہام — فہم از خلق الٰہی ز تو تعدیلِ فہوم
نسبتِ جامع اخلاق و شئونِ الفت — کہ ہمیں رحمت و نور است دریں دارِ ظلوم
نسبت علم و عمل نسبتِ عشق و احوال — نسبتِ فقر دروں نسبتِ اسرارِ علوم
نسبتِ علم و حیا نسبتِ الطاف و غنا — نسبت مہر و وفا، نسبتِ عونِ مظلوم
نسبتِ صبر و توکل زرہِ صدق و عفاف — نسبتِ رحم و صلہ نسبتِ کسبِ معدوم
نسبتِ جود و سخا نسبتِ احسان و عطا — نسبتِ داروئے حرماں پئے دردِ محروم
نسبتِ عظمتِ اَخیار بجبِّ اَخیار — نسبتِ شفقت و اکرام باندازِ عموم
انکسار و ادب و عجز و تواضع بشر — نسبتے آنکہ مبرّا است ز کبرِ مذموم

آمدی نسبتِ جامع بہمہ نوع کمال
از تو قاسم و علوم از درِ قاسم مقسوم

نسبتت نسبتِ ممزوج بدین و ملک است
شد نمایاں ز تو معنیٔ کلامِ معصوم

روز مملو بجہادت، بریاضت شبہا
قوتِ تست باین ظاہر و باطن منظوم

روز تو کفر کشی در شب تو نفس کشی
ہمتِ تست با آفاق و با نفس مضموم

جملہ اوصاف بہم کردہ بہ نسبت دادند
زیں سبب قاسمی نسبت شدہ جامع مفہوم

نسبت قاسمی مجموعہ ایں اوصاف است
لِس ہمیں مکتبِ فکر است دریں دار العلوم

ایں کہ رنگیست حکیمانۂ دینِ اسلام
قاسم العلوم بنا کردہ بریں دار العلوم

مدرسۂ دیوبند کے اس جامع اور معتدل فکریا مسلک کو سامنے رکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس مسلکِ اعتدال کے تحت بانیٔ دار العلوم کا مقصد اور مطمحِ نظر ہندوستان کے تمام مسالک حقہ اور اہلِ مسالک کو باہم جوڑنا تھا جبکہ اس وقت ملک میں جماعتی تشتت جزو مسالک بنا ہوا تھا اور سارے مسالک اور مسالک والے مسلکی تفاوت کی وجہ سے باہم دست و گریباں تھے، الاماشاء اللہ ایک فقیہ صوفی کے خلاف تھا اور صوفی فقیہ کو محرومِ باطن، ظواہر پرست، بے بصیرت اور زاہدِ خشک کہتا تھا اور فقیہ صوفی کو بے سند تخیلات اور بنام باطن ذہنی اوہام کا اسیر، دماغی گھمیر میں مبتلا، اور عقائدِ سلف سے منحرف شمار کرتا تھا، اور محدث متکلم کا مخالف تھا اور متکلم محدث وقت کا، محدث متکلم کو اسیرِ عقل، مرعوبِ زمانہ، سلف اور سلفیت سے منحرف اور دین کو بنام کلام فلسفہ بنا دینے والا اور عقائدِ سلف سے محروم بلکہ تحریف کنندۂ دین بتلاتا تھا، اور متکلم محدث کو حافظِ لفظ کہہ کر لفظی تعبیرات میں گم، بندۂ ظواہر، حقائق سے نابلد، اصولِ کلیہ سے بے خبر، دین کی عقلی تعبیرات سے عاجز اور زبان ناشناس باور کئے ہوئے تھا وغیرہ وغیرہ۔

غرض مسلکی تفاوت مسلکی نزاع میں تبدیل ہو چکا تھا اور تفاوتِ مسلک نزاع میں تبدیل

ہو چکا تھا اور تفاوتِ مشرب فرقہ بندی کی صورت اختیار کر چکا تھا جس سے امت میں تشتت اور انتشار کے جراثیم پھیلے ہوئے تھے اور ہر ایک دوسرے کے ابطال بلکہ تکفیر تک پر آمادہ تھا لیکن قاسم العلوم اور اُن کے دار العلوم نے اپنے جامع مسلک میں حدیث، تفسیر، فقہ، اصول فقہ، کلام تصوف، حقیقت اور معرفت جملہ دینی علوم و مقامات کو مختلف الالوان پھولوں کا ایک گلدستہ بنا کر (جس میں ہر ہر پھول اپنی اپنی کیاری میں کھلا ہوا اپنے اپنے مقام پر چسپاں تھا) ایسے جامع انداز سے پیش کیا کہ ان تمام مسلکی طبقات کے لئے ایک نقطہ پر جمع ہونے کی صورت پیدا ہو گئی اس لئے یہ فکر جس پر دار العلوم کی بنیاد قائم ہے، اہلِ حق کے لئے جامع اور اہلِ باطل کے لئے قامع ثابت ہوا، جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ دار العلوم کی تعلیم کے تحت اس کے مسلک کے دو بنیادی عنصر ہیں، ایک فقہی اور کلامی یا بالفاظ مختصر علمی مسلک ہے، دوسرا تربیتی اور تہذیبی یا بالفاظ مختصر اخلاقی مسلک ہے اور یہ دونوں علمی اور اخلاقی مسلک کامل الاعتدال ہونے کی وجہ سے تمام مسالک کے مغز کو اپنے اندر لئے ہوئے ہیں، گویا تمام مسالک کی خوبیوں کا خلاصہ ہیں، اس لئے ان پر سارے علمی اور اخلاقی طبقات جمع ہو سکتے ہیں اور وہ ان کا مرکز اجتماع قرار پا سکتا ہے۔

سو جہاں تک علمی مسلک کا تعلق ہے اس کا مرجع الامر حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی ذاتِ گرامی ہے جن پر منجانب اللہ یہ علمی مسلک الہامی طور پر وارد شدہ ہے جس کی تفصیل گذر چکی ہے اور وہ سارے علمی طبقات کے لئے اپنے کمالِ اعتدال اور جامعیت کی وجہ سے جیسے طبعاً مرکزِ کل ہے ایسے ہی سارے اہلِ مسالک اگر انصاف سے کام لیں تو اس پر جمع ہو سکتے ہیں یا کم سے کم اسے اپنا مرکز تسلیم کر کے اس سے قریب ہو سکتے ہیں، مثلاً جہاں تک فقہاء امت اور ائمہ مجتہدین کے مختلف فقہی مذاہب کا تعلق ہے وہ احادیث کے ظاہری تعارض یا اختلاف سے پیدا شدہ اور کسی نہ کسی روایتِ حدیث پر مبنی ہیں۔

دار العلوم کے فقہی مسلک کا اولین اصول یہ ہے کہ اَلْاِعْمَالُ اَوْلٰی مِنَ الْاِهْمَالِ (کسی چیز کو کام میں لے آنا اس کے بیکار چھوڑ دینے سے بہتر ہے) دنیا کی خسیس سے خسیس چیز کو بھی

دانشمند بیکار ضائع نہیں جانے دیتے یہ جائے کہ کسی اعلیٰ چیز کو مہمل چھوڑ کر ضائع کر دیں اور تمام اعلیٰ چیزوں میں اعلیٰ ترین شے کلامِ نبوت اور کلام خداوندی ہے تو اُس کے کسی بھی پہلو کو بیکار اور ناقابلِ عمل بنا دینا بلا شبہ اس مسلک کی فطرت کے خلاف ہے، اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ احادیثِ مختلفہ میں جو حدیث منشأ شارع علیہ السلام سے زیادہ اوفق اور اس سے اقرب ہوتی ہے اسے یہ پیروی امام ابو حنیفہؒ اصل مذہب قرار دے کر بقیہ تمام روایات کو اس کی ساتھ لے اپنے عمل پر جوڑتے چلے جاتے ہیں، جس سے کوئی حدیث بھی خارج از عمل نہیں ہوتی بالفاظ دیگر اُن کے یہاں جمع بین الروایات اصل ہے جس سے تطبیق و توفیق کا راستہ پیدا ہوتا ہے۔ متخالف روایات کو ترک کئے بغیر معقول اور منقول توجیہ سے اصل روایت کے تابع بنا کر عمل کے دائرے میں لے آتے ہیں بیکار بنا کر ضائع نہیں ہونے دیتے تا کہ کلام پیغمبر کا کوئی بھی پہلو خارج از عمل نہ رہنے پائے حتی کہ حدیث مرسل کو بھی ترک کرنے کے بجائے اُس کی حجیت کو بھی تسلیم کرتے ہیں اس لئے ائمہ ہدایت کے تفقہ سے پیدا شدہ کوئی بھی پہلو کسی بھی روایت کا مسلک سے باہر نہیں رہتا جسے ہم یوں بھی تعبیر کر سکتے ہیں کہ تمام ائمہ کے فقہی مراتب بحیثیتِ مجموعی اس مسلک میں آجاتے ہیں، زیادہ سے زیادہ راجح و مرجوح یا افضل و مفضول یا اصل و فرع یا عزیمت و رخصت کا فرق نکل سکتا ہے، البتہ کہیں کہیں جائز و ناجائز کا بھی فرق پیدا ہوتا ہے مگر قلیل، سو اس سے فقہ حنفی کی جامعیت اور دوسرے فقہوں کے برحق ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا، خواہ دو نصوص باہم متعارض ہوں یا ایک ہی نص کے دو پہلو فقہی طور پر متعارض ہوں اس لئے اجتہادی فروعات میں اختلاف تو ہو جاتا ہے مگر خلاف و نزاع کی کوئی شکل پیدا نہیں ہو سکتی کہ کسی فقہی مسلک سے اعراض یا گریز کی تہمت آئے، اس لئے ائمہ اجتہاد کی حقانیت و عظمت بھی ان کی شان کے مناسب قائم رہتی ہے، اور ان کے فقہی مسلک کی صداقت و عظمت اور تعظیم و توقیر میں بھی فرق نہیں آتا پھر یہ اختلاف بھی حق و باطل کا نہیں ہوتا کہ باعثِ کش مکش ہو بلکہ محض خطأ و صواب کا ہوتا ہے جن میں سے کوئی بھی پہلو اجر سے خالی نہیں اور ظاہر ہے کہ جب سارے فقہوں اور فقیہوں کے اجتہادات اس طرح ایک مرکز پر جمع ہو کر درجہ بدرجہ اپنے اپنے مقام و مرتبہ کے مناسب قائم رہتے ہیں

تو نہ صرف یہ کہ نزاع و جدال کے رخنے مسدود ہو جاتے ہیں بلکہ قدرِ مشترک کے طور پر ایک ما بہ الاتحاد بھی پیدا ہو جاتا ہے جس کے تحت یہ سارے فقہ اور فقہی مراتب نہ صرف معتبر ہی ٹھہرتے ہیں بلکہ ایک مرکز پر سمٹ آتے ہیں جو اس مسلک کی جامعیت کی کھلی دلیل ہے۔

رہے فِرَقِ حقۂ اسلامیہ جو اصول و مبانی میں متحد رہ کر فروعی عقائد کے معانی میں بتقاضائے قواعدِ شرعیہ کچھ مختلف ہیں تو ظاہر ہے کہ اس کا منشا بھی اجتہادی نظر و فکر ہی ہے جس سے تبفاوتِ اجتہاد، متفاوت نظریات قائم ہو کر عقیدے کی صورت اختیار کر لیں اور وہ فرقہ سمجھے جانے لگیں درحالیکہ وہ فرقہ نہیں ہوتے جبکہ تمام اصول اور مبانیٔ اسلام میں متحد ہیں، لیکن حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا مسلک جبکہ جامع نص و اجتہاد ہے تو ان فروعی عقائد کا بھی کوئی اجتہادی پہلو جب تک کہ شریعت کے بنیادی اصول اور اساسی قواعد و ضوابط سے متصادم نہ ہو نا قابلِ قبول نہیں رہتا بجز اس کے کہ اس پہلو کو مسئلہ کا بنیادی مقام دینے کے بجائے اُسے ضمنی، فرعی مقام پر رکھ دیا جائے ترک نہیں کیا جاتا۔ اس طرح سے کوئی بھی حقانی فرقہ اور اس کا کوئی بھی اعتقادی مسئلہ جبکہ تھوڑی سی توجیہ کے بعد اس مسلک سے باہر نکلنے نہیں پاتا، صرف مقصدی اور غیر مقصدی درجہ کا فرق باقی رہ جاتا ہے تو اُسے بھی کلیۃً متروک کر دینے کی صورت پیدا نہیں ہوتی جبکہ وہ کسی نص کے محتملات یا کسی شرعی اصول کی فرعیات کے دائرہ میں رہے، اس لئے اس جامع مسلک میں یہ اسلامی فرقے بھی اصل فرقۂ حقہ سے کلیۃً جدا نہیں ہوتے بلکہ اس سے قریب تر ہو جاتے ہیں، صرف فِرَقِ باطلہ ہی باہر رہ جاتے ہیں جو حق کے دائرہ میں داخل ہی ہونا نہیں چاہتے، رہے وہ طبقات جو اسلامی مسائل میں محض اپنے عقلی تگ و تاز سے شبہات کا شکار ہو کر جمہور کے مسلک سے جدا نظر آئیں اور امورِ غیبیہ میں رائے زنی کر کے غیب کو بھی شاہد ہی کی ترازو میں تولنے کی سعی میں لگے رہیں تو یہ ولی اللٰہی مسلک چونکہ جامع عقل و نقل اور جامع معقول و محسوس ہے اور اس میں تمام اعتقادات اور اصولِ کلیہ کو عقلی براہان اور فطری مصالح کے لباس میں پیش کیا گیا ہے جو اس قسم کے عقلی شبہات کے لئے دافع اور عقلی الجھنوں میں پھنسے ہوئے طبقات

کے لئے عقلی تشفی و تسلی کا سامان اپنے اندر رکھتا ہے تو مسلک حق سے ان طبقات کے نکل بھاگنے کا سوال بھی باقی نہیں رہتا بشرطیکہ شرعیات کے ان عقلی براہین کو کانوں میں جگہ دیں اور دل کو حاضر کرلیں، چنانچہ تجربات شاہد ہیں کہ اس قسم کے عقل پسند لوگوں نے جب بھی اس شرعی مسلک کو عقلی لباسوں اور فکر صحیح کے ملبوسات میں جلوہ گر دیکھا ہے تو ان کے شبہات زائل بھی ہو گئے ہیں اور وہ بصدق دل اپنی ناواقفی یا بے توجہی کا اقرار کر کے اس مسلک سے قریب ہو گئے یا اس کے حامی بن کر اسی کا ایک فرد بن گئے ہیں، اس کے بعد سیاسی حلقے رہ جاتے ہیں جو دین و ملک کو الگ الگ کہنے کے عادی ہیں اور ہمہ وقت جنہیں دین کے نام سے اپنے سیاسی مقاصد کے ضائع ہونے کا اندیشہ رہتا ہے تو اس مسلک اعتدال میں شرعی سیاست کے وہ اصولی قواعد بھی کتاب و سنت سے اخذ کر کے پیش کر دیئے گئے ہیں جو ان تمام خطرات کا جواب ہی نہیں بلکہ سیاسی مقاصد کی تحصیل کا فطری راستہ بھی ہیں۔

بہر حال اس مسلک اعتدال کا دائرہ اصولاً اس حد تک جامع، وسیع اور حاوی ہے کہ نہ اُس سے اجتہادی طبقات جدا رہ سکتے ہیں نہ کلامی گروہ اور نہ عقلی اور فلسفی حلقے کٹ سکتے ہیں جبکہ اُن کے مسلمات سب اس میں لپٹے ہوئے ہیں، جس کے معنی اس کے سوا دوسرے نہیں ہیں کہ ولی اللّٰہی مسلک نے تمام فرقوں، تمام حلقوں اور تمام طبقات کو اصولاً اپنے اندر سمیٹ کر کے جمع کرلیا ہے، جس میں مرکزیت کی وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جو کسی بھی معقول پسند علمی طبقہ کو اپنے سے باہر نہیں رہنے دیتیں، اور جب بھی اُنھیں انصاف اور حق پسندی سے کام میں لایا جائے گا، وہ ان سب کے لئے ایک تشفی بخش نسخہ اور جامع مرکز توجہ ثابت ہوں گی اور باہمی نزاعات یا قومی تفرقے کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکیں گی، چنانچہ حجۃ اللّٰہ البالغہ کا ایک مستقل مبحث، سیاسیات، عمرانیات، مدنیات اور معاشرات پر مشتمل ہے، جس کا لقب اُن کے یہاں ارتفاقات ہے اور اس میں سیاسی شعبے کی شرعی بحثیں اور شرعی نقاط فطری دلائل سے کھول کر رکھ دیئے گئے ہیں، جس سے آج کی سیاست کا بھی کوئی معقول نظریہ خارج نہیں

اس لئے سیاسی طبقات کے لئے بھی یہ مسلک ایک جامع مرکز کی حیثیت رکھتا ہے جس پر یہ حلقے جمع ہو سکتے ہیں بشرطیکہ اُسے دیکھیں اور سمجھنے کی کوشش کریں۔

ادھر دار العلوم کے اس مسلک کا دوسرا بنیادی عنصر تربیت اخلاق اور تزکیہ نفوس ہے جو ریاضات و مجاہدات اور سلاسل تصوف سے وجود پذیر ہوتا ہے، اس مسلک کے تحت جماعت دیو بند کے اکابر اکثر و بیشتر سلسلۂ چشتیہ سے اور بہت سے اکابر سلسلۂ نقشبندیہ سے وابستہ ہیں نقشبندیہ خاندان کا قریبی مرجع و منتہا مجاہد اعظم حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی رحمہ اللہ ہیں اور چشتیہ خاندان کے ملجا و ماوی حضرت شاہ عبدالرحیم ولایتیؒ ہیں، دونوں ہم عصر ہیں اور ایک ہی دور میں ہمہ گیر انداز سے فیض رساں رہے ہیں اس لئے اس ملک میں یہ ہی دو سلسلے زیادہ معروف اور زیادہ رائج ہیں، چشتیت میں قلندرانہ رنگ غالب ہے جس کی خاص کیفیات شورش و جوش اور وجد و طرب وغیرہ ہیں، جس کے تحت ہاؤ ہو کا حال قال اُن پر زیادہ طاری ہوتا ہے اور اس سے ان کی زندگی کا عنوان افروختن و سوختن و جامہ دریدن ہے، ادھر نقشبندیہ میں اخفا و تستّر سکوت و صموت اور ضبط و تحمل کا غلبہ ہے جس سے وہ اس شعر کے سچے مصداق ہیں ؎

نقشبندیہ عجب قافلہ سالار انند کہ برند از رہِ پنہاں بحرم قافلہ را

بظاہر دونوں سلسلوں میں تضاد کی نسبت نظر آتی ہے، گو منزل و مقصد واحد ہے، لیکن ان دونوں سلسلوں کے مذکورہ بزرگوں حضرت سید احمد شہید اور حضرت شاہ عبدالرحیم میں خدا ساز طریقہ پر جانبین سے تاثیر و تاثر کی صورت پیدا ہوئی اور صوفیہ کی اصطلاح کے مطابق جانبین کی نسبتوں میں تبادلۂ کیفیات کی شکل نمایاں ہوئی، واقعہ طویل ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت سید صاحبؒ پر انبساط و انبساط اور شگفتگی کی کیفیت رہتی تھی اور حضرت شاہ عبدالرحیم پر خوف و خشیت، لرزہ براندامی، حزن و فکر اور گریہ کی کیفیت طاری رہتی تھی۔

حضرت سید صاحب کے سفر جہاد کے موقعہ پر دونوں بزرگ بوڑیہ کی مسجد میں جمع ہو گئے اور باہمی جذب و کشش سے ایک بند کمرے میں یکجا ہوئے، باہر آئے تو سید صاحب رو رہے تھے

اور شاہ صاحب رو بضحک و تبسم تھے یعنی ہر ایک کی نسبت دوسرے پر اثر انداز ہوئی، جسے یوں تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ چشتیت اور نقشبندیت میں باہمی آمیزش ہوئی اور دونوں بزرگوں کے پاکیزہ آثار و کیفیات ایک دوسرے میں پہنچکر مخلوط ہو گئے، جس سے سید صاحب کی نقشبندیت میں تو قدرے شور و فغاں اور گریۂ و بکا کے اثرات نمایاں ہو گئے، اور شاہ صاحب کی چشتیت میں ضبط و سکوت اور آداب شرعیہ کے تحت اتباع سنت کے وقار و تمکنت نے غلبہ پا لیا، جس سے حضرت شاہ عبدالرحیم کی یہ نقشبندیت آمیز چشتیت ان کے ارشد خلفاء حضرت میانجی نور محمد جھنجھانوی قدس سرہٗ میں جلوہ گر ہوئی جس میں باطنی سوز و گداز کے ساتھ ادب شریعت اور اتباع سنت کا رنگ غالب ہو گیا، جسے حضرت میانجی صاحب نے ان الفاظ میں ادا فرمایا (جیسا کہ میں نے عم محترم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ مہتمم سادس دارالعلوم دیوبند سے بارہا سنا) کہ "فقیر نے ایک ایسی ہنڈیا پکائی ہے کہ نہ سو برس پہلے پکی تھی نہ سو برس بعد میں پکے گی"۔ اس پر حضرت ممدوح فرمایا کرتے تھے کہ قیام دارالعلوم کے دور کے رمز شناس اہل اللہ کا عام نظریہ یہ تھا کہ حضرت میانجی صاحب کی وہ سو برس والی ہنڈیا یہ دارالعلوم دیوبند ہے جس میں شریعت کے ساتھ طریقت اور سوختہ جانی کے ساتھ ادب دانی اور احوال و کیفیات کی ساتھ اتباع سنت جمع ہے اور اس لئے اس سلسلہ کے سوز و گداز اور حال و قال والے لوگ محض سوختہ جان ہی نہیں ادب داں بھی ہیں، جن میں باطنی سوز و گداز کے ساتھ غلبہ حال ادب شریعت اور اتباع سنت کا ہے، سوزش باطنی چشتیت کی ہے اور ادب دانی اور پیروئ سنت کی متانت نقشبندیت کی ہے، اس لئے یہ سلسلہ جو حضرت میانجیؒ اور ان کے بعد حضرت حاجی امداد اللہؒ سے ہوتا ہوا حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ تک آیا تو ان بزرگوں کے فیضان سے اُس کا مظہر یہی دارالعلوم بنا جسے ہر دو سلسلوں کے اکابر کی نسبتوں کا مجموعہ کہنا چاہئے، اور اس کی شان یہ نمایاں ہوئی کہ ؎

بر کفے جام شریعت بر کفے سندانِ عشق — ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

اس ہنڈیا سے دار العلوم کی تعبیر کا یہ مقولہ اکابر حضرت قاسم العلومؒ کے اس مقولہ سے اور بھی زیادہ مؤکد اور بلحاظ حقیقت منضبط ثابت ہو جاتا ہے جو میں نے انہی اکابر مرحومین اور بالخصوص حضرت عم محترم ممدوح سے سُنا ہے کہ حضرت نانوتویؒ نے فرمایا کہ مجھے اس مدرسہ کی صورت عالم مثال میں ایک معلق ہنڈیا کی سی دکھلائی گئی ہے، بعض حضرات نے اس معلق ہنڈیا کی تعبیر توکل سے کی ہے کہ اس مدرسہ کا مدار یقیناً ہنڈیا پر تو ضرور ہے جو طعام کا ظرف ہوتی ہے لیکن وہ معلق ہے جو توکل کی شان ہوتی ہے کہ اسباب اختیار کر لینے کے بعد بھی نتیجہ تابع مشیت ہوتا ہے محض اختیار اسباب سے کسی نتیجہ کی برآمد یقینی نہیں ہوتی بلکہ مشیت پر معلق رہتی ہے، اس لئے اس مدرسہ کا معلق ہنڈیا کی صورت سے نمایاں ہونا اس پر تنبیہ ہے کہ اس مدرسہ میں ظاہری اسباب سے زیادہ نظر توکل اور امدادِ خداوندی پر رکھی جائے جیسے اس کے لئے مستقل آمدنی یا ارباب تموّل کے محکم وعدوں کا نہ ذریعہ پیدا کیا جائے نہ ان پر بھروسہ کر لیا جائے جیسا کہ خود حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے بنیادی اصول ہشتگانہ میں اس پر پوری توجہ دلائی گئی ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، لیکن اس توجیہ کو مانتے ہوئے بھی واقعاتِ سابقہ کی روشنی میں اس کے معنی وسلک اسی جامعیت کے زیادہ چسپاں نظر آتے ہیں جس میں شریعت و طریقت، سوز و گداز اور ادب دلنواز کو جمع کیا گیا ہے، گویا حضرت میانجی کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ سو برس سے ملت ہندیہ میں جو جامعیت مسلک مضمحل ہو چکی تھی اور ہر طبقہ دوسرے طبقہ سے عدمِ جامعیت اور مسلکی انفرادیت کی وجہ سے دست و گریباں تھا، بالخصوص شریعت و طریقت کو دو الگ الگ راہیں کہہ کر دو مسلک علیحدہ علیحدہ بنائے گئے تھے اس فقیر کے ہاتھ پر وہ دوئی اور دورُخی ختم کر دی گئی ہے اور اب چشتیت و نقشبندیت کی آمیزش سے جوش با ہوش اور خروش باسروش کا دور آگیا ہے جس کی ہنڈیا تیار ہو چکی ہے اور اب اسی کا پکا ہوا کھانا اس ملک میں مشرق و مغرب تک تقسیم ہوگا، یہی وجہ ہے کہ ان اسلاف مرحومین کے یہاں باوجود غلبۂ چشتیت کے جو ان کا اصل سلسلہ ہے بیعت چاروں خاندانوں اور بالخصوص نقشبندیت میں بھی لی جاتی تھی اور تربیت حسبِ استعداد چاروں

سلاسل کے مطابق کی جاتی تھی، کتنے ہی اکابر کی تربیت ان بزرگوں نے نقشبندیہ طریق پر کی ہے جو چشتیت میں نہیں چل سکے، خود حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ ہی اپنا حال فرماتے تھے، کہ حضرت گنگوہیؒ کے یہاں بیعت کے بعد جب میں چشتیت کے طریقہ پر نہ چل سکا تو حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ تمہارا حصہ نقشبندیت میں ہے، چشتیت میں نہیں ہے اور پھر اسی نقشبندیت پر انہیں چلایا تو وہ آگے بڑھے اور حق تعالیٰ نے انہیں اُسی میں کامیاب اور واصل فرمایا۔

اس صورتِ حال کو سامنے رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے مسلک میں سلاسلِ علمیہ اور سلاسلِ فقہیہ کے ساتھ سلاسلِ صوفیہ کو بھی جمع کر دیا گیا ہے جس سے کوئی سچا نقشبندی اور سہروردی اور قادری اُن سے الگ نہیں رہ سکتا۔

اس جامع مسلک کا نقش راسخ اپنے شیخ طریقت حضرت حاجی امداد اللہؒ کے فیضان سے جب حضرت قاسم العلوم پر پڑا اور وہ بشہادۃِ شیخ اپنے شیخ کی زبان قرار پائے جیسے شمس تبریز کی زبان عارف رومی بنے تو یہ جامعیت ہمہ وقت ان کی نگاہوں میں رہی اور اس کا عمومی ظہور دارالعلوم سے ہوا اور بالآخر یہی دارالعلوم کا مسلک قرار پایا، ایک کے مرجع الامر شاہ ولی اللہؒ تھے اور دوسرے کے مرجع الامر حضرت جھنجھانوی کے خلیفۂ اعظم حضرت حاجی امداد اللہؒ تھے جس سے حقیقت قاسمیت بنی اور وہ جبکہ اس دارالعلوم میں مدارِ حدیث تھے اور مرجع الاستناد تھے، تو اس کے صاف معنی وہی ہوتے ہیں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے کہ قاسم العلوم اور دارالعلوم کا نقطۂ نظر تمام سلاسل اور اہلِ سلاسل کا اتحاد تھا علمی مسلک میں ان کا مطمح نظر تمام علمی سلسلوں اور حلقوں کو جمع کرنا تھا کہ صوفی اور متکلم، محدث و فقیہ اور اصولی و عارف متبائن نہ رہیں بلکہ ایک سمجھے جائیں اور ان کے فنون بھی باہم ممزوج اور مخلوط ہو کر مضمون واحد کی صورت سے نمایاں ہوں۔

ادھر تربیتی سلسلوں میں سلاسل اولیاء کو جمع کرنا تھا کہ جو چشتی ہو وہی نقشبندی بھی ہو، اور جو نقشبندی یا قادری اور سہروردی ہو وہی چشتی بھی ہو تا کہ سلسلے ہی نہیں اہلِ سلاسل بھی قدرتاً ایک ہو کر نمایاں ہوں، اس لئے اگر دارالعلوم کو مرکز اتحاد امت تسلیم کیا جائے تو خلافِ واقعہ

نہ ہوگا، یہی وہ مرکزی فکر تھا جو حضرت قاسم العلوم کے قلب کی امانت تھا اور وہ اُسے اس مدرسہ کے راستہ سے پھیلانا چاہتے تھے، پس عام اہل نظر تو اس مدرسہ کو صرف مدرسہ جانتے تھے، لیکن حضرت مولانا اُسے مدرسہ نہیں بلکہ مدرسۂ فکر جانتے تھے، اس لئے ابتدا ہی سے اُسے وسعت پذیر بنانے پر ہمت کئے ہوئے تھے، یہی وجہ ہے کہ دارالعلوم کے پروردوں میں اصاغر ہوں یا اکابر جامعیت کا یہ رنگ قدرِ مشترک کے طور پر درجہ بدرجہ سب میں نمایاں رہا اور ہے کہ درس وتدریس کے ساتھ ان میں ریاضت ومجاہدہ، سند حدیث کے ساتھ سند خلافتِ باطنی اور جوشِ احوال کے ساتھ ادب قال، باطنی سوز وگداز کے ساتھ ادب روح نواز اور سلاسل شریعت کے ساتھ سلاسل طریقت کا سلسلہ برابر کے درجہ میں قائم ہوا جہاں چشتیت کی لائن سے کلیری صابریت اور گنگوہی قدوسیت آئی وہیں نقشبندیت کی لائن سے مجددی پیروئی سنت اور سیّد احمد شہید کے اعلاء کلمۃ اللہ کی روح بھی راسخ رہی، اس لئے مدرسہ کے نونہالوں میں نہ تو زہد خشک ہوا کہ خشونت نمایاں ہو، نہ لین محض رہا کہ مداہنت کی تہمت آئے، نہ منکرات کے بارہ میں چشم پوشی ہوئی کہ مرعوبیت کا الزام سر آئے اور نہ بے بصرانہ روک ٹوک رہی کہ اکھڑ پن کا اعتراض ہو، بلکہ دینی تصلّب کے ساتھ شفقت علی الخلق اور تقشف کے ساتھ ملاطفت ومدارات سب باہم آمیختہ رہیں جو وابتغ بین ذلك سبیلا کی صحیح تصویر اور سو برس والی ہنڈیا کی صحیح تعبیر ہے جس سے اس سو سال کی قلیل مدت میں عمومی اصلاح وتربیت کے سلسلے اس جامع جماعت میں عالمگیر پیمانہ پر قائم ہو کر کامیاب ہوئے خواہ وہ تعلیم کا سلسلہ ہو یا تبلیغ کا اور خواہ تربیت خلق کا طریقہ ہو یا اصلاح امت کا۔

اس جامع مسلک کے مرکزی فکر میں علوم وفنون کے ساتھ اس طبقاتی جامعیت اور اجتماعیت کا بھی اضافہ شامل ہے جس کے تحت اس دارالعلوم نے ہمیشہ اتحاد بین المسلمین اور وحدت کلمہ کی بنا پر وحدتِ امت پر زور دیا ہے اور فرقہ مابینی سے ہمیشہ احتراز کیا ہے، جو درحقیقت اس فکر کی حقیقی روح ہے جس سے اُس دور کی امت کا انتشار ہی رفع نہیں ہوا جو حکومت چھن جانے سے مہلک انداز میں اُس پر مسلط ہو گیا تھا بلکہ امت کے ایک نقطہ اور ایک مرکز پر جمع ہونے کی صورت

بھی پیدا ہوگئی اور ساتھ ہی اتحاد طبقات کے ساتھ ان طبقات کے مراتب و درجات کا فرق بھی نمایاں ہوگیا، اور پھر ان خواص کے اجتماع سے منتشر عوام کے جمع ہونے کی صورت بھی خود بخود پیدا ہوگئی یہ الگ بات ہے کہ جن لوگوں کو اپنے مخصوص مقاصد کی خاطر امت کا انتشار ہی مطلوب ہو اور وہ اس اجتماع کے قصر کے دروازہ کے قریب آنا بھی گناہ سمجھ کر اس سے دور بھاگنا ہی اپنا مطمح نظر بنا چکے ہوں اور انھیں نظریات تو درکنار مشاہدات کے معائنہ کی بھی فرصت نہ ہو تو اس سے مسلک کی جامعیت، معقولیت اور عمومیت پر کیا حرف آسکتا ہے؟ وہ اپنا خود فکر کریں! فان تولوا فانما ھم فی شقاق فسیکفیکھم اللّٰہ وھو السمیع العلیم

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ خواہ وہ سو برس والی ہنڈیا ہو یا معلّق ہنڈیا، دونوں باتیں ان اکابر و اسلاف کے مکشوفات ہی سے تعلق رکھتی ہیں جو امور غیبیہ میں سے ہے، کسی عقلی سوچ بچار یا ذہنی کاوش کا ثمرہ نہیں اور ظاہر ہے کہ جب ان ہانڈیوں کا مصداق یہ دارالعلوم ہے تو نتیجہ واضح ہے کہ اس ادارہ کی حقیقت کا تعلق غیبی طاقتوں اور بشارات و اشاراتِ غیب سے ہے، محض رسمی مشوروں سے نہیں، بلکہ مشورے بھی خود اُن اشارات ہی پر مبنی اور مرتب ہوئے ہیں، اس لئے اس ادارہ کو سوائے الہامی مدرسہ کے اور کیا نام دیا جاسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس ادارہ کی چلانے والی قوت چونکہ غیبی طاقت ہے اس لئے وقت کی مشکلات اور موانع میں بھی اس کے لئے غیبی مخلص پیدا کرنے والی طاقت آج بھی وہی غیبی قوت ہے جس نے ابتداء ہی سے اس عالم شاہد میں اس کا پرداز ڈالا اور اس کی کارفرمائی اس درجہ نمایاں ہے کہ ہم جیسے کمترین خدام دارالعلوم تک بھی اس کا ہمہ وقت مشاہدہ کرتے رہتے ہیں اور کرتے آرہے ہیں، اس طاقت کا اثر ہے کہ اس کا کام محض متوکلانہ طریق پر بلا تہیۂ اسباب عالمگیر پیمانہ پر جاری ہے، کارکنوں کا کام صرف حسن نیت اور اخلاص ہے نہ کہ اُسے چلانا۔

اسی طرح حضرت قاسم العلوم کا یہ خواب کہ "میں بیت اللہ شریف کی چھت پر کھڑا ہوا ہوں اور میرے ہاتھ پاؤں کی انگلیوں سے نہریں جاری ہیں جو اطراف عالم میں پھیل رہی ہیں، جس کی

تعبیر اس دور کے بزرگوں نے یہ دی تھی کہ آپ سے علومِ نبوت کا فیضان تمام دنیا میں جاری ہوگا اور قیام دارالعلوم کے بعد انہی اہل اللہ کا یہ فرمانا، کہ ان کے خواب کی مجسّم تعبیر یہ دارالعلوم ہے یا حضرت مولانا رفیع الدین صاحب نقشبندی مہاجر مدنی و مہتمم ثانی دارالعلوم کا یہ خواب کہ علوم دینیہ کی چابیاں میرے ہاتھ میں دے دی گئی ہیں جس سے مراد دارالعلوم ہی لیا گیا تھا، درحقیقت اُسی ہنڈیا کی تعبیر ہے جو حضرت تھانوی اور حضرت نانوتوی کو دکھلائی گئی تھی جس سے صاف واضح ہے کہ یہ دارالعلوم اپنی حقیقت و معنویت اور اپنی ہیئت و صورت دونوں ہی کے لحاظ سے غیبی بشارات کا مظہر اور مصداق ہے اور غیبی طاقتیں ہی اس کی تشکیل میں کارفرما ہیں، بہرحال اس ادارہ کے فکر میں جس پر دارالعلوم کی معنوی عمارت کھڑی ہوئی ہے، علمی، اخلاقی، عملی، عقلی اور سیاسی اوصاف کی ساتھ ساتھ جامعیت، اجتماعیت اور عدل واعتدال کا وصف بھی مسلک کا جوہری جز ثابت ہوتا ہے، اس لئے حسبِ مقالات اکابر وقت کے اہل اللہ کے طبقوں میں یہ مدرسہ من حیث الجماعت مجدد شمار کیا گیا جس نے اپنے فکر اور معرفت مزاج افراد کے ذریعہ دین کے تمام شعبوں کی تجدید کا فرض انجام دیا اور وقت کے اولیاء اللہ کی نسبتوں کا مجموعہ ثابت ہوا۔

ظاہر ہے کہ جب اس مدرسہ کی حقیقت اور معنویت یعنی اس کے مرکزی فکر اور اس کے اجزائے ترکیبی کا وجود ہی الہام ربانی سے ہوا ہے تو قدرتی طور پر اس کی صورت اور تشکیل و تعمیر میں بھی الہامات الٰہیہ کا دخل طبعی تھا، جبکہ صورت کا وجود فطرتاً اپنی حقیقت ہی کے تابع اور اس کا ظل بلکہ اس کا مظہر ہوتا ہے جس میں وہ حقیقت جلوہ گر ہوتی ہے اس لئے اس کی معنویت ہی کے مناسب اس کی تاسیس، اس کا اجراء، اس کی تعمیر، اس کے نظم کا ڈھانچہ حتی کہ اس کی بنیادی اور کلیدی شخصیات کا انتخاب تک محض عام مروجہ مشاورتی طریقوں سے عمل میں نہیں آیا کہ چند ذی رائے افراد نے بیٹھ کر مشورہ کرلیا ہو کہ ایک مدرسہ قائم کرنا ہے اور بحث و تمحیص کے بعد جب ایک رائے پر سب جمع ہو گئے تو اُسے عملی جامہ پہنا دیا ہو، بلکہ اس کے مرکزی فکر کی طرح اس کے تمام تشکیلی امور بھی کچھ الہامات اور واردات غیبیہ ہی کے تابع دکھائی دیتے ہیں،

چنانچہ وہ مرکزی فکر بھی جو ولی اللّٰہی خاندان سے چل کر حضرت قاسم ورشید تک پہنچا تھا جب اس مدرسہ کے قیام کے وقت اس کی ذہنی تشکیل ہوئی تو وہ بھی ان سب اولیاء وقت کے دلوں میں بالہام ربانی ہی وارد ہوا اور بلا استثناء ظاہری بیکدم ان کی ارواح اس بارہ میں ایک زبان ہو گئیں، گویا باتباع سنت نبوی و باقتضائے آیت وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ اُسے مشورہ واستشارہ کی صورت بھی دی گئی لیکن اصل اشارات غیب ہی کو رکھا گیا، چنانچہ جب بھی یہ حضرات مقدسین یک جا ہوتے تو اپنے اپنے مکاشفے ہی ایک دوسرے کے سامنے رکھتے تھے، اگر ایک بزرگ فرماتے کہ میرے دل میں یہ القا ہوا ہے کہ اب ہندوستان میں تعلیم دین عام کرنے کے لئے قیام مدرسہ کی ضرورت ہے تو دوسرے بزرگ کہتے کہ یہی میرے دل میں بھی آرہا ہے، ایک کہتے کہ مجھ پر یہ منکشف ہوا ہے کہ مدرسہ قائم ہو تو دوسرے کہتے کہ یہی میرے قلب میں بھی وارد ہوا ہے، چوتھے اگر یہ فرماتے کہ مجھے خواب میں دکھلایا گیا ہے کہ اب قیام مدرسہ کی ضرورت ہے تو دوسرے فرماتے کہ یہی انکشاف میرے قلب میں بھی ہوا ہے، غرض یہ ایک ہی آواز تھی جو ان تمام ارباب قلوب کے قلوب میں غیبی داعیہ کے طور پر گونج رہی تھی، جس کا خلاصہ انہی کے تذکروں کے مطابق یہ تھا کہ اب جبکہ ہندوستان میں مسلم اقتدار ختم ہو چکا ہے اجتماعی طور پر علم کی سرپرستی کرنے والا کوئی باقی نہیں رہا ہے اور کوئی رہ بھی گیا ہے تو حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے وہ آگے بڑھنے کی ہمت نہیں رکھتا جس سے علوم نبوت کا یہ ورثہ رہا سہا بھی گم ہو جانے کے راستہ پر پڑ گیا ہے، اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کی نسل کہیں جہالت کا شکار ہو کر اغیار کے ہاتھوں نہ چڑھ جائے اور اس ملک سے مسلم قوم اور دین کا خاتمہ نہ ہو جائے، اس لئے قیام مدرسہ لازمی ہے جس کے ذریعہ قوم کو تعلیم و تربیت سے سنبھالا جائے، اگر مسلمانوں میں دینی شعور، دینی تعلیم اور دینی جذبات باقی رہیں گے تو دین باقی رہنے پر وہ اپنی دنیا بھی سنوار سکیں گے، لیکن اگر قوم کی بنیاد ہی ختم ہو گئی تو تعمیر نو کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہے گا، اس لئے اب حفاظت دین کی صورت بجز قیام مدرسہ کے دوسری نہیں۔ ظاہر ہے کہ ان بزرگوں کے انکشافات سامنے آنے کی یہ نوعیت کسی رسمی مشورہ کی نہ تھی بلکہ الہامات اور مبشرات غیب کے تبادلوں کی تھی جن پر باطنی اور روحانی اجماع منعقد ہو گیا

اور اس نے ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ کو مدرسہ دیوبند کے آغاز کی صورت اختیار کرلی، جس سے واضح ہے کہ اس مدرسہ کے قیام کا مسئلہ بھی اُس کے مرکزی فکر کی طرح الہامی تھا جو اشاراتِ غیب سے وقوع پذیر ہوا، بلکہ ان مؤسسین کے دور سے بھی کافی پہلے اور ولی اللّٰہی خاندان کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے اہل اللہ نے بھی اس مدرسہ کے قیام کو اور نہ صرف قیام کو بلکہ اُس کے محلِ وقوع کو بھی اشاراتِ غیب ہی سے محسوس کیا اور لطیف اشاروں میں اس کا اظہار فرمایا۔

میں نے اپنے بزرگوں سے بارہا سُنا اور ان کے حلقوں میں یہ ایک معروف اور عام زبان زد بات تھی اور پھر اس کی سند تاریخی اوراق سے بھی ملتی ہے کہ حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ جہاد کے سلسلہ سے صوبہ سرحد جاتے ہوئے جب دیوبند سے گذرے تو اس جگہ پہنچکر جہاں آج مدرسہ واقع ہے فرمایا کہ مجھے یہاں سے علم کی خوشبو آرہی ہے، حالانکہ اس وقت اس جگہ شہر کی کوڑیاں پڑتی تھیں، مگر مثل مشہور ہے کہ بارہ برس میں کوڑیوں کے دن بھی بھوڑ آتے ہیں، بالآخر یہاں سے علم کی خوشبوئیں پھوٹ نکلیں جیسا کہ حضرت شہید کا اشارہ تھا، جس سے واضح ہے کہ دارالعلوم کا محلِ وقوع بھی کچھ اشاراتِ غیب ہی سے متعین ہوا ہے جو طبعی اسباب کے تحت وقت کے ان بزرگانِ امت کے قلوب کے دواعی کے لئے محرّک ثابت ہوا، جس سے انھوں نے بھی اپنے داعیۂ قلب سے اسی جگہ کا انتخاب کیا جو غیب در غیب ہوتا ہوا ان کے قلوب تک پہنچا ہوا تھا اور بالآخر ۱۲۸۳ھ میں منصۂ شہود پر بصورت مدرسہ جلوہ گر ہوگیا، حضرت نانوتوی رحمہ اللہ اپنے روشن ضمیر رفقاء کے ساتھ اجراءِ مدرسہ کے لئے مستعد ہوئے اور جب حضرت حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت نانوتویؒ کو میرٹھ خط بھیجا کہ چندہ کی ایک مقدار بھی جمع ہوگئی ہے اب آپ تشریف لے آویں تو حضرت نے اُسی وقت ملّا محمود صاحب دیوبندی کو جو میرٹھ میں مدرس تھے وہیں بلا کر فرمایا کہ ملّا جی آپ کو یہاں کیا تنخواہ ملتی ہے؟ فرمایا دس روپیہ ماہوار، حضرت نے فرمایا کہ اگر آپ کی تنخواہ پندرہ روپیہ ماہوار ہوجائے اور قیام دیوبند ہی میں ہو جو آپ کا وطن ہے تو کیسا ہے؟ فرمایا حضرت اس سے بہتر اور کیا بات ہوسکتی ہے، تب حضرت نے میرٹھ ہی میں ان کا تقرر فرما کر

انھیں دیوبند بھیجدیا اور حضرت حاجی محمد عابد صاحب کو لکھا کہ میں پندرہ روپیہ ماہوار پر ملا محمود صاحب کو بھیج رہا ہوں، آپ کار تعلیم جاری کردیں، میرے آنے کا انتظار نہ فرمادیں میں بھی بعد میں پہنچ جاؤں گا اس عدم حاضری کی وجوہ اور ان کی مصالح بہ مضمون "بانی دار العلوم" میں دیکھی جاسکتی ہیں جو اخبار "مدینہ بجنور" اکتوبر ۱۹۶۵ء میں شائع ہوچکا ہے۔

بہر حال چھتہ کی مسجد میں کار تعلیم کا اجرا ہوگیا، تعمیر مدرسہ اسکے آٹھ نو سال بعد شروع ہوئی جس کے سنگ بنیاد میں یہ سب بزرگ مجتمع تھے، چونکہ اس مدرسہ کے تمام بنیادی امور بشارات غیبی سے عمل میں آرہے تھے، اسی لئے ان اسلاف مقدسین میں رائے مشورہ اور مفاہمت باہمی سے زیادہ اس مدرسہ کے بارے میں توجہ الی اللہ، دعار، استدعار، اور استکشاف غیب ہی پر زیادہ نظر رہتی تھی اور اسی میں وقت زیادہ لگایا جاتا تھا، بالفاظ دیگر اسباب عادیہ سے بالاتر ہو کر غیبی مدد ہی پر اس مدرسہ کے قیام کا زیادہ تر مدار تھا نہ کہ فراہمی اسباب پر، چنانچہ ذیل کا واقعہ اس بارہ میں شاہد عدل ہے جو ارواح ثلٰثہ میں بھی درج ہے اور بزرگوں سے بھی سننے میں آتا رہا ہے کہ مدرسہ کے قیام کے بعد دیوان محمد یٰسین صاحب مرید خاص حضرت قاسم العلوم جو رشتہ میں میرے نانا بھی ہوتے تھے اور دار العلوم کے کتب خانہ کے سب سے پہلے ناظم تھے حج کے لئے تشریف لے گئے تو مکہ مکرمہ میں اپنے شیخ الشیخ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ کی مجلس مبارک میں بکثرت حاضر باش رہتے تھے رخصت کے وقت انھوں نے حضرت حاجی صاحب سے استدعار کی کہ حضرت ہمارے مدرسہ کے لئے دعار فرمائیے، تو فرمایا "بہ خوش، مدرسہ کے قیام کے لئے راتوں سجدوں میں پیشانیاں ہم نے رگڑیں کہ خداوندا اپنے دین اور علم کی حفاظت کے لئے مدرسہ قائم فرما، اور مدرسہ آپ کا ہوگیا؟ پھر فرمایا کہ خیال گذرتا تھا کہ مدرسہ تھانہ بھون میں قائم ہوگا (جو حضرت حاجی صاحب کا وطن ہے) یا نانوتہ میں (جو حضرت قاسم العلوم کا وطن ہے) کیا خبر تھی کہ اس دولت کو دیوبند والے لے اڑیں گے۔؟

ان واقعات سے پوری طرح واضح ہے کہ مدرسہ دیوبند کے قیام کا جذبہ اولاً سرخیل جماعت

حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ کے اندر ابھرا، اور اُن سے منتقل ہو کر ان کی جماعت میں منتقل ہوا یہ سب ہی حضرات ارباب باطن تھے اس لئے ہر ایک کے باطن میں قیام مدرسہ کا یہ جذبہ جاگزیں ہو گیا جسے ہم نے سابقہ سطور میں "باطنی اجتماع" سے تعبیر کیا ہے، مگر عمومی طور پر ان سب اکابر میں یہ تخیل قیام مدرسہ ہی کی حد تک تھا، جس کا حاصل تعلیم دین اور اس راستہ سے اس ملک میں مسلمانوں کا تحفظ اور بقا پیش نظر تھا، لیکن جہاں تک مدرسہ کے ساتھ اس کے مرکزی فکر اور اس کے ہمہ گیر نصب العین نیز انگریزوں کے لائے ہوئے ملحدانہ اور دنیا پرستانہ نظریات کا ایک ہمہ گیر علمی تحریک کی صورت سے مقابلہ اور ساتھ ہی بکھری ہوئی قوم کی شیرازہ بندی اور بالخصوص اس ملک میں شوکتِ رفتہ کی بازیافت یا کم از کم خود اختیاری کے جذبہ کے ساتھ پورے عالم اسلامی تک اس کے اثرات پھیلا دینا وغیرہ کے ہمہ گیر جذبات اور نظام ہائے عمل صرف اُن ہی میں موجزن تھا جو جہادِ شاملی میں امامِ جہاد حضرت حاجی امداد اللہ رحمہ اللہ کی سرکردگی میں شریک معرکہ ہو کر مسلمانوں کی لاشوں کو خاک و خون میں تڑپتا ہوا اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے، اور ان میں بھی بالخصوص حضرت حاجی صاحب کے دست راست حضرت قاسم و رشید تھے جن میں صرف مدرسہ ہی کا نہیں بلکہ اس کی اجتماعیت کے تصورات بھی سامنے تھے، اس نقطۂ اجتماعیت کے معیار سے ان جذبات میں حضرت قاسم العلومؒ سب سے آگے تھے، جنھیں خود ان کے شیخ طریقت حضرت حاجی امداد اللہؒ ہی اپنے مکنونات قلبی کا ترجمان فرما چکے تھے جیسا کہ حضرت حاجی صاحب نے حضرت قاسم العلوم کو مولانا رومی سے تشبیہ دیتے ہوئے فرمایا کہ مولانا رومی تو شمس تبریزی کی زبان تھے جن کے ذریعہ اُن کے علوم و معارف اور مکنوناتِ باطن ظاہر ہوئے اور مجھے مولوی محمد قاسم زبان بنا کر دیئے گئے ہیں یعنی میرے علوم و معارف اور قلبی دواعی ان کے ذریعہ ظاہر ہوتے ہیں اس لئے یہ امدادالٰہی کیفیات خاص طور سے حضرت نانوتویؒ میں سب سے زیادہ اُبھریں، اور جونہی حضرت حاجی صاحب نے عَلَمِ جہاد بلند کیا تو سب سے پہلے اُس جھنڈے کے نیچے حضرت قاسم العلومؒ ہی موجود تھے اور انھوں نے ہی حضرت گنگوہی کو بھی پانچ چھ ماہ کی گفت و شنید سے آمادۂ جہاد کیا

اسی طرح اس مدرسۂ زیرِ تجویز اور اس کے فکر و مقصد میں بھی جو امدادی جذبہ تھا جیسا کہ واقعۂ بالا سے ظاہر ہوا وہی آگے آسکتے تھے جو خود شیخ ہی کے اعلان کے مطابق ان کے باطنی ترجمان تھے۔

چنانچہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم سادس دارالعلوم کی روایت کے مطابق جب دارالعلوم کی عمارت بنائے جانے کا مسئلہ اُٹھا اور حضرت قاسم العلوم نے اُس کی ضرورت ظاہر فرمائی تو حضرت حاجی محمد عابد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جن کا شمار بانیانِ مدرسہ میں ہوتا ہے، مدرسہ کی مستقل عمارت سے اختلاف کرتے ہوئے فرمایا کہ "جب شہر میں وسیع جامع مسجد موجود ہے، اس کے ہر سہ جانب اتنے کمرے بھی ہیں جن میں ۳۰۔ ۴۰ طلبا بآسانی رہ سکتے ہیں اور جامع مسجد کا وسیع مُسقّف حصہ درس و تدریس کے لئے کافی ہوسکتا ہے تو پھر مدرسہ کی مستقل عمارت میں مسلمانوں کا پیسہ کیوں ضائع کیا جائے، لیکن حضرت قاسم العلوم نے وجوہِ عمارت بیان کرتے ہوئے آخر میں فرمایا کہ حاجی صاحب اس مدرسہ کے بارہ میں آپ وہ چیز نہیں دیکھ رہے ہیں جو مجھے نظر آرہی ہے۔ یہ مدرسہ یہیں تک رہنے والا نہیں ہے آگے جانے والا ہے، مدرسہ کی مستقل عمارت ہی سے اُس کے بنیادی مقاصد پورے ہو سکتے ہیں، کچھ وقفہ اور گفت و شنید کے بعد جس کا واقعہ طویل ہے اور اس موقعہ پر اُس کی ضرورت بھی نہیں، حضرت حاجی صاؔحب بھی اس پر راضی ہوگئے اور سب حضرات نے مل کر سنگِ بنیاد رکھا۔

اس سے واضح ہے کہ عامۃً ان مؤسّس اکابر مدرسہ کا تصور صرف تعلیم و تعلّم ہی کی حد تک تھا حتی کہ عمارتِ مدرسہ کا سنگِ بنیاد رکھنے تک بھی یہی رہا جب کہ مدرسہ کے اجراء پر آٹھ نو سال بھی گذر چکے تھے، یہ وسیع اور عالمگیر نصب العین ان کے سامنے نہ تھا جو حضرت قاسم العلوم اور ان کے رفقاءِ جہادِ شاملی باشاراتِ غیب اور بفیضانِ ولی اللہ و امداد اللہ اپنے اندر لئے ہوئے تھے اور جہادِ شاملی کے بعد یہ مقاصد اور بھی زیادہ قوت اور عزیمت کے ساتھ اُبھر آئے جس کا سرچشمہ حضرت حاجی امداد اللہ اور سرخیل حضرت قاسم العلوم تھے۔

اس ولی اللّٰہی اور امداد اللّٰہی تصور میں اوپر تعلیم کا پردہ تھا اور نیچے اُسی تعلیمی لائن سے

اعلاء کلمۃ اللہ، مسلمانوں کی آفاقی عزت وشوکت اور ملّت کی عالمگیر خدمت کے اجتماعی جذبات پنہاں تھے، اسی حقیقت کو نمایاں کرتے ہوئے مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنے ایک مضمون "دار العلوم میں بیتے ہوئے دن" جو دار العلوم میں شائع شدہ ہے، حضرت شیخ الہندؒ کا یہ مقولہ نقل کیا ہے کہ :۔

"حضرت الاستاذ (حضرت نانوتویؒ) نے اس مدرسہ کو کیا درس وتدریس، تعلیم و تعلّم کے لئے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا، جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے"۔

آخر میں ارشاد فرمایا :۔

"صرف تعلیم وتعلّم، درس وتدریس جن کا مقصد اور نصب العین ہے میں ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوں، لیکن اپنے لئے تو اسی راہ کا انتخاب میں نے کیا ہے جس کے لئے دار العلوم کا یہ نظام میرے نزدیک حضرت الاستاذ نے قائم کیا تھا"۔

چنانچہ حضرت نے احاطۂ مدرسہ میں طلباء کو فنونِ سپہ گری سکھلانے کا بندوبست بھی فرمایا، تاکہ علم کے ساتھ سپاہیانہ اسپرٹ بھی ان میں قائم رہے، محکمۂ قضا بھی قائم فرمایا تاکہ تنفیذِ احکام شرعیہ کی خو بھی ان میں محفوظ رہے، ترکوں کی امداد کے لئے بھی مساعی فرمائیں، سلطان ترکی کی مدح میں قصائد بھی لکھے تاکہ خلافت اسلامیہ سے مدرسہ کے نونہالوں کا ربط قائم رہے، انگریزی تسلّط کے بعد ایسی اجتماعی انجمنوں کی حمایت وتائید بھی کی جو انگریزوں سے ملکی حقوق حاصل کرنے کے لئے قائم کی گئیں، وغیرہ جو جامع مسجد کے صحن میں انجام نہیں پاسکتے تھے۔

یہ تمام مقاصد اسی ذریتِ قاسمی میں پرورش پاتے رہے، انہی کے تحت حضرت کی دفات

کے بعد اُن کے علمی جانشین شیخ الہند رحمہ اللہ نے ان ملی مقاصد کو آگے بڑھایا اور پھر ان کے تلامذہ نے بھی تعلیمی لائنوں کو مضبوط کیا مگر اجتماعی خدمات سے کبھی کنارہ کشی اختیار نہیں کی بلکہ آزادی کی تمام تحریکات میں قائدانہ حصہ لیا اور ان کے سرخیل اگر انگریزوں کے مقابلہ میں میدان شاملی میں سربکف تھے تو اُن کی ذریت اُسی انگریز کے مقابلہ میں قید و بند اور جیلوں میں سربکف رہی، اور آج بھی کلمۂ حق کہنے میں آگے ہی آگے ہے۔

دارالعلوم کے اسی وسیع اور ہمہ گیر تصور کے پیش نظر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب فرمایا کرتے تھے کہ یہ مدرسہ تکوینی طور پر اس ملک کے تمام معاملات میں قطب الرحیٰ (چکی کی کلی) کی حیثیت رکھتا ہے، جس کے اِرد گرد یہاں کے اجتماعی معاملات شعوری غیر شعوری طور پر گھومتے ہیں اور تشریعی طور پر وہ ایک مجدد کی حیثیت رکھتا ہے جس نے دین کے مختلف گوشوں کی تجدید کی ہے اور خلافِ شرع رسوم و رواج کو مٹا کر اتباعِ سنت کا راستہ ہموار کیا ہے، یہی وہ ہمہ گیر تصور تھا جس پر مدرسہ دیوبند کی بنیاد رکھی گئی اور اس ہمہ گیری اور اجتماعیت کے جذبات سے بھرے ہوئے وہ ہشتگانہ اصولِ اساسی حضرت قاسم العلوم نے مرتب فرمائے جن پر اس مدرسہ کی اساس قائم ہے اور وہ تاحال رواں دواں ہے، اسی اجتماعی تصور پر اس کی تعلیم کا نظم اور اسی پر اُس کے انتظامی سلسلے کا ڈھانچہ وضع ہوا اور اُسی پر اس کی وہ تعلیمی خصوصیات منصۂ ظہور پر آئیں جو شاہ ولی اللہ سے سلسلہ وار نسبتِ قاسمی پروارد ہوئیں اور وہ اسی نسبت کے ساتھ اس مدرسہ میں مدارِ حدیث اور مدارِ سند و استناد ٹھہرے جس کے تحت آج تک اس کے تربیت یافتہ فضلاء یہاں پرورش پا رہے ہیں، اسی بنا پر کہا گیا ہے اور غور سے دیکھا جائے تو بالکل صحیح کہا گیا ہے کہ ولی اللّٰہی مکتبِ فکر کے تحت دیوبندیت درحقیقت قاسمی طرزِ فکر کا نام ہے، جس کی وجہ سے فضلاءِ دیوبند اپنے کو قاسمی لکھتے اور کہلاتے ہیں۔ بہرحال دیوان محمد یٰسین صاحب سے حضرت حاجی امداد اللہ رحمہ اللہ نے جو بات ارشاد فرمائی اُس سے واضح ہے کہ اس مدرسہ کا بنیادی فکر امدادی الہام سے نمودار ہوا اور مجاہدین شاملی کے مصفا قلوب میں

پروان چڑھا اور بالآخران تمام مجاہد اہل اللہ کے قلوب سے چل کر اس کی صورت مثالی مدرسہ دیوبند کی ہو گئی، اس سب کا حاصل اس کے سوا اور کیا ہے کہ قیام مدرسہ کے سلسلہ میں سعی دکوشش کا محور ان بزرگوں کے یہاں اسباب ظاہری نہ تھے بلکہ اسباب غیبیہ تھے اور انہی پر ان کا مدار تھا، دوسرے یہ کہ نظر بر اسباب اگر قیام مدرسہ کے محل وقوع کے لئے کسی کا کوئی خیال بھی قائم ہوتا تھا تو نتیجۂ دائرۂ عمل میں پھر وہی غیبی سلسلہ کشف وانکشاف غالب آجاتا تھا جو غیبی محرکات سے دلوں میں اور پھر خارج میں وقوع پذیر ہونے والا ہوتا تھا، بہرحال جیسے اس مدرسہ کا مرکزی فکر الہامی تھا ایسے ہی اس کے قیام کے دواعی بھی الہامی تھے اور ایسے ہی اس کے محل وقوع کی تشخیص بھی الہامی تھی۔

اس محل وقوع پر جب تعمیر کا مسئلہ سامنے آیا اور ان اکابر نے مدرسہ کی عمارت کے لئے ایک خاکہ تجویز کر کے بنیاد بھی کھدوا دی جو ابھی بھری نہیں گئی تھی کہ شب میں حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمہ اللہ دیوبندی مہتمم ثانی دارالعلوم نے جو نقشبندیہ خاندان کے اکابر اولیاء میں سے تھے، خواب میں دیکھا کہ اس بنیاد پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف ارزانی فرمائی، دست مبارک میں عصا ہے آپ نے فرمایا کہ (شمال کی جانب) جو یہ بنیاد کھودی گئی ہے اس سے صحن مدرسہ چھوٹا اور تنگ رہے گا یہ فرما کر آپ نے اس جگہ سے جانب شمال دس بیس گز آگے بڑھ کر عصائے مبارک سے نشان لگایا اور ایک لانبی لکیر کھینچ دی کہ اس جگہ بنیاد کھودی جائے۔ بیدار ہوتے ہی علی الصباح مولانا ممدوح اس جگہ پر پہنچے تو لکیر کا نشان اُسی طرح موجود پایا جس طرح حضورؐ نے عصاء مبارک سے لگایا تھا، مولانا نے پھر نہ ممبران سے پوچھا نہ کسی سے مشورہ کیا بلکہ نئی بنیاد اسی جگہ کھدوائی، اس سے واضح ہے کہ اس مدرسہ کی تعمیر کا آغاز اور اس کے رقبہ وصحن کی حد بندی بھی مبشرات غیب ہی سے ہوئی ہے، ورنہ مشورے تو پہلے ہو ہی چکے تھے، جن کی رو سے بنیاد بھی کھودی جا چکی تھی، مگر مشوروں پر اس غیبی بشارت اور رؤیا نبوی کو بہرحال مقدم رکھا گیا جیسا کہ اُس کا یہی حق تھا، اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ خواب رویائے صادقہ بلکہ ایک گونہ

کشف کا درجہ لئے ہوئے تھا جس کے واقعی ہونے میں مولانا رفیع الدین صاحب کو ادنیٰ شک و شبہ نہ تھا ورنہ محض خواب و خیال کے بل بوتے پر اتنی خود اعتمادی نہ دکھلاتے اور پوری جماعت کی متفقہ تجویز کو محض خواب و خیال پر اس آسانی سے قربان نہ کر دیتے، پھر اسی کے ساتھ پوری جماعت کا اس پر متفق ہو جانا اور اپنی تجویز کالعدم کر دینا اور مولانا کے اس اقدام پر کسی درجہ میں بھی چون و چرا نہ کرنا بلکہ بطوع و رغبت راضی ہو جانا اس کی بھی واضح دلیل ہے کہ یہ سب ارباب باطن بھی اسے الہام ہی کے درجہ کا خواب سمجھ رہے تھے۔ جس سے اس مدرسہ کی بنیادوں اور تعمیری امور کا بھی بشارات غیبی ہی سے تعلق واضح ہوتا ہے۔

پھر مدرسہ کے اساسی اصول ہشتگانہ جو حضرت بانی مدرسہ نے جو گویا کہ بانیٔ مدارس تھے تحریر فرمائے وہ بھی الہامی ہی سمجھے گئے ہیں کیونکہ اُن میں اصول عقلی و تجرباتی کی ساتھ غیبی پیشگوئیاں بھی شامل ہیں جو سوائے الہام کے محض عقل و دانش سے نہیں کی جا سکتیں، جیسے ان ہی اصول ہشتگانہ میں مدرسہ کی آمدنی کا مدار توکل اور ایک گونہ بے سرو سامانی پر رکھتے ہوئے حضرت نے بطور پیشین گوئی کے فرمایا کہ ایسا نہ ہونے کی صورت میں "یوں نظر آتا ہے کہ امدادِ غیبی منقطع ہو جائے گی" اس سے اولاً تو سرمایۂ مدرسہ کا امداد غیبی ہونا واضح ہوتا ہے اور پھر مستقبل کے بارہ میں یہ کلمہ کہ "یوں نظر آتا ہے" صاف غیبی اطلاع کی طرف مشیر ہے جسے غیبی الہام کے سوا دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا، اسی کو حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو بانیان مدرسہ میں شمار ہیں اس عنوان سے اپنی نظم "ارمغان مدرسہ" میں ظاہر فرمایا ہے ؎

اس کے بانی کی وصیت ہے کہ جب اس کے لئے
کوئی سرمایہ بھروسہ کا ذرا ہو جائے گا
پھر یہ قندیل معلق اور توکل کا یہ چراغ
یوں سمجھ لینا کہ بے نور و ضیا ہو جائے گا

اسی طرح ان اساسی اصول کی بعض اور دفعات میں بھی اس قسم کے الفاظ ملتے ہیں کہ اگر

اس پر عمل نہ کیا گیا تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں وغیرہ وغیرہ

اسی لئے مدرسہ میں آنے والے مفکر اور دانشور قسم کے واردین و صادرین نے بھی جب ان اصول کو دیکھا تو بیساختہ انھیں الہامی ہی بتایا، چنانچہ مولانا محمد علی جوہر مرحوم تحریک خلافت کے زمانہ میں جب دارالعلوم میں تشریف لائے اور انھیں ان اصول کے بارہ میں حضرت ہی کی خود نوشتہ اصل تحریر دکھلائی گئی تو مولانا کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور بے ساختہ فرمایا کہ ان اصول کا عقل سے کیا تعلق ؟ یہ تو الہامی ہیں، پھر فرمایا کہ حیرت ہے کہ سو برس دھکے کھا کر ہم آج جس نتیجہ پہ پہنچے ہیں (کہ اپنے اجتماعی اداروں کو انگریزی کسی امداد پر ہرگز معلق نہ رکھیں بلکہ خود اعتمادی کے ساتھ اپنے ہی ہاتھ میں لے کر کھڑے ہوں) حیرت ہے کہ یہ بزرگ سو برس پہلے ہی اس نتیجہ تک پہنچ چکے تھے، جس سے یہ حقیقت صاف عیاں ہو جاتی ہے کہ اس مدرسہ کے اصول و معاملات کی سطح ہی سے ہر آیندورند یہی محسوس کرتا تھا کہ یہ کارخانہ بلا شبہ امداد غیبی اور اشارات غیبی پر چل رہا ہے جس سے اس کا الہامی مدرسہ ہونا معروف عام ہو چکا تھا، نیز اس سے یہ بھی نمایاں ہے کہ ایک مدرسہ ہی نہیں بلکہ اس کے سرمایہ کی صورتیں بھی کچھ الہام غیبی ہی سے تعلق رکھتی ہیں، پھر اس مدرسہ کے انتظامی امور اور اہتمام مدرسہ کی جزوی تجاویز تک میں بھی کچھ اشارات غیبی ہی کی کارفرمائی نظر آتی ہے چنانچہ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مقولہ اس کا شاہد عدل ہے کہ مدرسہ کا اہتمام میں نہیں کرتا بلکہ حضرت نانوتویؒ کرتے ہیں (درحالیکہ حضرت نے باوجود مدرسہ کی ساری مساعی اور اپنی پوری سرپرستی و نگرانی کے مدرسہ کے نظام حتیٰ کہ درس و تدریس سے بھی کبھی رسمی تعلق نہیں رکھا اور مولانا فرماتے ہیں کہ مدرسہ کا پورا نظم و نسق حضرت نانوتوی ہی فرماتے ہیں) سو اس کی تفصیل مولانا نے یہ فرمائی کہ نظام مدرسہ کے بارہ میں جو چیز بھی حضرت کے قلب پر وارد ہوتی ہے وہی بعینہ میرے قلب میں منعکس ہو جاتی ہے اور میں کر گذرتا ہوں اور بعد میں حضرت نانوتویؒ فرماتے ہیں کہ مولانا اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے، یہی میرے دل میں بھی آرہا تھا اس کے معنی بجز توافق غیبی یا اشارۂ غیبی کے اور کیا ہو سکتے ہیں ؟ اسے ایک الہام ہی نہیں بلکہ

توارد الہام بھی کہا جائے گا، جس سے اس مدرسہ کے نظم ونسق میں بھی الہامات ومبشرات کا کافی دخل ثابت ہوتا ہے، واقعات پر نظر کی جائے تو انتخاب طلبہ کا معاملہ بھی عام تقدیر الٰہی کے علاوہ جس سے باہر کوئی چیز بھی نہیں جا سکتی خصوصی طور پر بطرز الہام ومبشرات ان روشن ضمیر بزرگوں پر کچھ غیبی ہی انداز سے منکشف ہوتا تھا اور اس کے اشارات کارفرما ہوتے تھے، چنانچہ یہ واقعہ دار العلوم کے تحریری اوراق میں مرقوم ہے اور اس احقر نے بلا واسطہ بھی اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ ایک دن مولانا رفیع الدین صاحبؒ اپنے عہد اہتمام میں احاطۂ مولسری میں (جیش عمارت نودرہ) کھڑے ہوئے تھے، چند طلبہ بھی حاضر تھے کہ دورۂ حدیث کا ایک طالب علم مدرسہ کے مطبخ سے کھانا لے کر لپکتا ہوا آیا اور اس نے نہایت گستاخانہ انداز سے شوربے کا پیالہ مولانا کے سامنے زمین پر پٹختے ہوئے کہا کہ یہی ہے آپ کا اہتمام اور نظم کہ اس پانی جیسے شوربے میں نہ گھی ہے نہ مسالہ اور کچھ اور الفاظ بھی سخت سُست کہے، طلبہ کو غصہ بھی آیا مگر مولانا کے ادب اور ان کی خاموشی کی وجہ سے وہ بول نہ سکے، مولانا نے نہایت تحمل اور بردباری سے اس طالب علم پر سر سے لے کر پیر تک تین دفعہ نظر ڈالی اور اس کے جانے کے بعد فرمایا کہ کیا یہ مدرسہ دیوبند کا طالب علم ہے؟ پھر فرمایا کہ یہ مدرسہ کا طالب علم نہیں۔ طلبہ نے عرض کیا کہ حضرت اس کا نام تو باقاعدہ دفتر مطبخ میں درج ہے اور باقاعدگی کے ساتھ برابر مطبخ سے کھانا لے رہا ہے، فرمایا کچھ بھی ہو یہ مدرسہ کا طالب علم نہیں، جب چھان بین ہوئی تو چند دن کے بعد حقیقت کھلی کہ یہ واقعی مدرسہ کا طالب علم نہیں بلکہ اس کا ہم نام ایک دوسرا طالب علم ہے جس کا باقاعدہ مطبخ سے کھانا جاری ہوا تھا اور رجسٹروں میں اسی کے نام کا اندراج بھی تھا، مگر اشتراک نام سے اس گستاخ طالب علم نے فائدہ اٹھا کر دھوکہ سے خود کھانا لینا شروع کر دیا جس سے اصل مستحق بے چارہ محروم رہ گیا، بات کھل جانے پر طلبہ نے مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ حضرت بات وہی نکلی جو آپ نے فرمائی تھی کہ یہ مدرسہ دیوبند کا طالب علم نہیں، مگر باوجود ان اندراجات کے حضرت نے اتنے وثوق اور یقین سے کیسے فرما دیا تھا کہ یہ مدرسہ کا طالب علم نہیں؟

فرمایا کہ ابتداءً اہتمام میں، میں اہتمام سے گھبراتا تھا، چھوڑنے کا ارادہ کرتا تو حضرت نانوتویؒ مانع آتے (کیونکہ اُنہی کے امر پر مولانا نے اہتمام قبول فرمایا تھا) اس دوران میں نے خواب دیکھا کہ دارالعلوم کا یہ کنواں (جو احاطۂ مولسری میں واقع ہے) دودھ سے بھرا ہوا ہے اور اوپر کی مُن تک دودھ آیا ہوا ہے کہ ہاتھ سے دودھ لے سکتے ہیں، اس کی من پر نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم تشریف فرما ہیں اور دودھ تقسیم فرمارہے ہیں، سینکڑوں کی تعداد میں لوگ دودھ لے کر جارہے ہیں، کوئی مشک بھر کرلے جارہا ہے، کوئی بالٹی بھر کر، کوئی لوٹا بھر کر، کوئی پیالہ بھر کر، اور جس کے ہاتھ میں کوئی برتن نہیں وہ چُلّو ہی بھر کرلئے چلا جارہا ہے، غرض اپنے اپنے ظرف کے بقدر لوگ دودھ لے کر جارہے ہیں۔

خواب دیکھ کر میں اس کا مطلب اور تعبیر سمجھنے کے لئے مراقب ہوا تو منکشف ہوا کہ کنواں تو مدرسہ دیوبند کی صورت مثالی ہے، دودھ علم کی صورت مثالی ہے، ذاتِ اقدس نبویؐ قاسم العلوم (علم کی تقسیم کنندہ) ہے اور دودھ لینے والے لوگ مدرسہ دیوبند کے طلبہ ہیں جنھیں خواب میں متمثل کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں عجیب بات مولانا نے یہ ارشاد فرمائی کہ جب تعلیم کا سال شروع ہوتا ہے (یعنی شوال) اور داخلہ کے لئے طلبہ آتے ہیں تو داخلہ لینے والوں میں۔ میں ہر ایک کو پہچان لیتا ہوں کہ یہ بھی اُن دودھ لینے والوں میں تھا اور یہ بھی۔ میں نے اس گستاخ طالب علم پر سر سے لے کر پیر تک تین بار نگاہ ڈالی یہ اس مجمع میں تھا ہی نہیں، اس لئے میں نے قوت سے کہہ دیا کہ یہ مدرسہ دیوبند کا طالب علم نہیں ہے، اور الحمد للہ کہ باضابطہ رجسٹروں سے بھی اس کی تصدیق ہوگئی، اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس مقبول درسگاہ کے طلبہ کا انتخاب بھی کچھ غیبی انتخابات ہی سے متعلق ہے، جو قلوب میں اِلقا ہوتا ہے، محض ظاہری اسباب مدارِ کار نہیں ہیں، باوجودیکہ اختیار بھی کئے جاتے ہیں اور اختیار کیا جانا ضروری بھی ہے بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس ادارہ میں اُنہی روشن ضمیر بزرگوں کے فیضان اور متروکہ ورثہ سے آج بھی یہی دیکھا جارہا ہے کہ خاص حالات اور کسی فتنہ کے موقع پر اس نوع کے طلبہ یا کارکنوں

کے عزل و نصب کے بارہ میں ذمہ دار قلوب میں وہ پہلو ضرور سانح ہو جاتے ہیں جو بظاہر اسباب تدابیر کے برخلاف سمجھے جاتے ہیں مگر نتیجہ خداساز طریقہ پر بہتر ظاہر ہوتا ہے جس کے تحت بہت سے واقعات ہیں، اس لئے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ غیبی اشارات کی روح جو ورثہ اکابر ہے آج تک بھی اس ادارہ میں کار فرما ہے اور ابھی تک اپنے کام میں لگی ہوئی ہے، فللہ الحمد۔

میں نے اپنے بزرگوں سے سُنا ہے کہ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ مہتمم خامس دارالعلوم کے تقرر اہتمام کے موقع پر مشاورت کے درجہ میں جیسا کہ عموماً ہوتا ہے، مختلف رائیں سامنے آئیں لیکن حسب روایت مولوی محمود صاحب رامپوری ممبر شوریٰ دارالعلوم دیوبند، حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے جب یہ فرمایا کہ میں نے تین بار اس مسئلہ کو حق تعالیٰ کے سامنے پیش کیا تینوں دفعہ حافظ احمد صاحب ہی کا نام آیا ہے کہ اُنہی کے ہاتھ پر اس مدرسہ کی ترقی ہے، تو اسے سوائے غیبی اشارہ کے اور کیا کہا جائے، میں جانتا ہوں کہ یہ مؤرخانہ انداز کی چیزیں نہیں لیکن اس دارالعلوم کی تاریخ کو ان وجدانیات سے الگ بھی نہیں کیا جا سکتا جبکہ اس کی بنیادوں ہی میں یہ اعتقادی روح گھسی ہوئی ہے، اس لئے اس میں طبعاً تاریخی عظمت کے ساتھ قلوب کی عقیدت کا سلسلہ بھی توأم ہے جسے اُس کی تاریخ سے جدا نہیں کیا جا سکتا، ہاں اگر یہ بزرگ کورے دانشور ہوتے تو ممکن تھا کہ اُن کے بارہ میں یہ امور کچھ بے محل کہے جاتے لیکن ان کے عارف باللہ اور صاحب کشف و کرامت ہونے کی صورت میں یہ امور بلاشبہ تاریخ میں تقدم کا درجہ رکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ دارالعلوم کے فیض یافتہ نونہالوں میں جنھیں فضلاء دیوبند کہا جاتا ہے اپنے ادارہ کے ساتھ کسی رسمی تنظیم کا سلسلہ قائم نہیں، لیکن پھر بھی قلوب سے قلوب اور روحوں سے روحیں اس درجہ وابستہ ہیں کہ کسی رسمی تنظیم سے عادتاً ایسی وابستگی ممکن نہیں، رسمی تنظیم کا سلسلہ اگر قائم کیا جائے جو عموماً زبانوں پر آتا ہے تو اس کی افادیت سے انکار نہیں، لیکن اس الہامی ادارہ میں اس روح کے بغیر وہ بھی کارآمد اور مؤثر نہیں ہو سکتا، کیونکہ ادارے کا اصل مزاج روح ہے رسم نہیں، حقیقت ہے نمائش نہیں، اخفاء ہے تشہیر نہیں، اور معنویت ہے محض صورت سازی نہیں

گو تبعاً صورت سے انکار بھی نہیں۔

یہ چند واقعات اس لئے سپردِ قلم کئے گئے کہ دارالعلوم کی تاریخ کے ساتھ اس کی اصلیت معنویت اور حقیقت بھی سامنے آجائے اور واضح ہو جائے کہ دارالعلوم صرف یہ نہیں ہے کہ ایک وسیع اور طویل و عریض رقبہ میں اس کی عمارات پھیلی ہوئی ہیں، یا بیسیوں شعبوں پر اس کا نظامِ عمل منقسم ہے، یا سینکڑوں سے متجاوز اس کا عملہ ہے یا اس میں بہت سے دفاتر ہیں یا اُس میں سینکڑوں طلبہ کا ہجوم ہے اور وہ اساتذہ کی ایک بڑی تعداد کا محور و مرکز ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب چیزیں اگر ہیں اور ضرور ہیں تو اس کی صورت سے متعلق ہیں، حقیقت سے نہیں حقیقت و ماہیت وہی غیبی قوتیں اُس کی وہ معنوی حقیقتیں ہیں جو اُس کے مرکزی فکر، بنیادی نصب العین دینی رخ اور منشأ تعمیر و تاسیس میں سمائی ہوئی ہیں اور اربابِ قلوب اور اصحابِ روحانیت سے مسلسل اور متصل نسبتوں کے ساتھ اُس میں سرایت کئے ہوئے ہیں، اور روح بہ روح اور قلب بہ قلب باطنی رشتوں سے منتقل ہوتی آرہی ہیں، جس سے یہ ادارہ اکابر اہل اللہ کی نسبتوں اور ولایتوں کے الوان کا مجموعہ ثابت ہوا ہے اور ایک ایسا مرکزی دائرہ بن گیا جس میں علم و اخلاق کی یہ مختلف الانواع شاخیں محض کتابوں کے کالے نقوش سے جمع نہیں ہو گئیں بلکہ اُن میں کتنے ہی اربابِ قلوب کی ہمتیں اور کتنے ہی سلف و خلفِ صالحین کے تصرّفات بروئے کار آئے اور وہ مجموعۂ انوار و برکات بنا، اس لئے خلاصہ کے طور پر اگر نسبتوں کی اس جامعیت کو لفظوں میں لایا جائے تو اس کے مسلک اور سالکین کو اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے کہ اس ادارہ کا مسلک جیسے جامع علم و معرفت، جامع عقل و عشق، جامع عمل و اخلاق، جامع دیانت و سیاست، جامع روایت و درایت، جامع خلوت و جلوت، جامع عبادت و مدنیت، جامع اسرار و حکمت، جامع صحو و سُکر، جامع جذب و سلوک، جامع حال و قال اور جامع ظاہر و باطن ہے۔ اسی طرح اس مسلک کے سالک بھی درجہ بدرجہ ان نسبتوں کے جامع ہیں جو اُس کے ماحول سے بن بن کر نکلتے رہے ہیں اور ان مسلکی نسبتوں کے لحاظ سے ہم کہہ سکتے

ہیں کہ وہ اصل کے لحاظ سے مسلم فرقہ کے لحاظ سے اہل سنت والجماعت، مذہب کے لحاظ سے حنفی، مشرب کے لحاظ سے صوفی، کلام کے لحاظ سے اشعری، سلوک کے لحاظ سے چشتی ونقشبندی فکر کے لحاظ سے ولی اللّٰہی، برہان وعیان اور مکتب پسندی کے لحاظ سے قاسمی، تفقہ اور فقہ شناسی کے لحاظ سے رشیدی، اجتماعیت کے لحاظ سے محمودی اور مرکزی نسبت کے لحاظ سے دیوبندی ہیں، جو صرف مدرسہ کے احاطہ سے مختص نہیں بلکہ اس میں تمام وہ مدارس اور اُن کے وہ تمام علمی وعملی ادارے اور حلقے شامل ہیں جو ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے مختلف رنگوں سے دین کی اشاعت وترویج اور تعلیم وتبلیغ میں مصروف ہیں، مختصر یہ کہ ان گوناگوں نسبتوں کے تحت اس جماعت کا طرۂ امتیاز علم واخلاق کی جامعیت، وسعت نظری، روشن ضمیری اور رواداری کے ساتھ دین وملت اور قوم ووطن کی خدمت اس کا مخصوص شعار رہا ہے، لیکن ان تمام شعبہ ہائے زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت اس جماعت میں مسئلہ تعلیم ہی کو حاصل رہی ہے، جبکہ یہ تمام شعبہ ہائے زندگی علم ہی کی روشنی میں صحیح طور پر بروئے کار آسکتے تھے، اور اسی پہلو کو اُس نے آج تک نمایاں رکھا ہے، جس سے اُس میں مذکورہ جامعیتیں نمایاں ہوئیں، اور اُن کے حقائق واقعیہ مختلف صورتوں میں متمثل ہو ہو کر دنیا کے سامنے آتے رہے۔ اور انہی حقائق نے یہ مختلف مظاہر اختیار کر لئے ہیں جنھیں ہم **تاریخ دارالعلوم** کے نام سے پیش کر رہے ہیں، اس لئے جہاں تک دارالعلوم کی اس تاریخ کا سوال ہے اس کی تدوین بھی ضروری اور ناگزیر تھی کیونکہ اس دنیا میں روح کا قیام جسم کے بغیر ممکن نہیں، اس لئے جسم اور اُس کے احوال وعوارض سے قطع نظر نہیں کی جاسکتی، بلکہ ہزاروں مصالح کے لحاظ سے وہ ضروری اور ناگزیر ہے، ورنہ اگر یہ تاریخی حقائق اور سلف کے وقائع نتیجہ خیز، عبرت آموز اور ہدایت ورحمت نہ ہوتے تو نہ فرمایا جاتا کہ

لقد کان فی قصصھم عبرۃ لاولی الالبصار ما کان حدیثا یفتریٰ ولکن تصدیق الذی بین یدیہ وتفصیلا لکل شئ وھدیً وبشریٰ للمسلمین ط

اس لئے ضروری تھا کہ اس کی تاسیس، اس کی تعمیر، اس کا سلسلۂ انتظام، اس کا طریق کار، اس کی مؤثر شخصیات، اس کا نصاب، اس کا طریق تعلیم اور اس کے نامور فضلاء، اس کے اراکین شوریٰ، اس کے عہدیداران اور اس سے متعلقہ حوادث و واقعات کی نقشہ کشی کی جائے جس کا نام تاریخ ہے، خود میرا اپنا دلی اور پرانا جذبہ بھی ابتداء ہی سے یہی تھا کہ تاریخی طور پر یہ چیزیں مرتب ہوں، جن میں خصوصیت سے ان تین عنوانوں کے تحت واقعہ نگاری کی اہمیت نمایاں ہو، بانیٔ دارالعلوم، سوانح بانیٔ دارالعلوم اور تاریخ دارالعلوم، سو جہاں تک بانیٔ دارالعلوم کا تعلق ہے اُس کے بارہ میں ایک تفصیلی مقالہ شائع ہو چکا ہے۔

ادھر سوانح بانیٔ دارالعلوم کی تکمیل احقر ہی کے ایماء پر مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی مرحوم بنام "سوانح قاسمی" تین جلدوں میں فرما چکے ہیں، نیز مولانا انوار الحسن صاحب شیر کوٹی دو جلدوں میں علیحدہ مرتب کر چکے ہیں جو شائع ہو چکی ہیں، اور بھی متعدد حضرات نے اس کے ضروری اجزاء پر قلم اٹھایا ہے جو مضامین کی صورت میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

جہاں تک تاریخ دارالعلوم کا تعلق ہے دلی داعیہ تھا کہ خود مرتب کروں لیکن اُس میں ورق گردانی، فارغ وقت اور فراغ قلب کی ضرورت تھی جو مجھے اہتمام دارالعلوم کے پھیلے ہوئے کاموں کے پیش نظر پوری طرح میسّر نہیں ہو سکا، پھر بھی چونکہ یہ دلی جذبہ تھا اس لئے وہ کسی نہ کسی طرح اُبھر کر عملی جامہ پہنتا رہا، ۱۳۴۸ھ میں جو تفویض اہتمام کا پہلا سال ہے، اس سے پہلے چھ سات سال تک نیابت اہتمام کا دور رہا۔ احقر نے دارالعلوم کی ۶۶ سالہ رپورٹ مرتب کی جو تاریخ دارالعلوم تو نہ تھی مگر تاریخ کی نشاندہی ضرور تھی، اور اس کے لئے احاطۂ دارالعلوم میں ایک اجلاس بھی بلایا جس میں مقامی اور بیرونی مؤقر حضرات کو دعوت دی گئی تھی، جو مجلس شوریٰ کے رکن شیخ ضیاء الحق صاحب راجپوری کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں یہ رپورٹ پڑھی گئی اور کافی برمحل، مؤثر اور نافع ثابت ہوئی، اُس کے بعد احقر نے دارالعلوم سے ایک جریدۂ غیر معمولی بنام "آئینۂ دارالعلوم" جاری کیا جو سہ ماہی

نکلتا تھا، اُس میں سنوی اور کچھ تاریخی حالات کا خلاصہ دیا جاتا تھا، اس سے اخلاقی نفع کے علاوہ مالی نفع چندوں کے اضافہ کی صورت میں ظاہر ہوا، جس کے بارہ میں خطوط موصول ہوئے اور چندہ بڑھتا رہا، اُس کے بعد ۱۳۸۵ھ میں دارالعلوم کے عمومی نظم و تعلیم اور متعلقہ حالات کے سلسلہ سے کچھ اوراق اصولی اور کلّی انداز میں مرتب کئے گئے جو کتابی صورت میں شائع ہوئے، دفتر نے اُسے تاریخ دارالعلوم کے نام سے شائع کر دیا، حالانکہ وہ دارالعلوم کی تاریخ نہ تھی بلکہ تعارف تھا، مگر سنوی حالات سے الگ ہوکر اصولی اور عمومی صورت میں تھا، جس میں اصولی عنوانات کے تحت کچھ مثالیں پیش کی گئی تھیں، استقصاء اور احاطہ پیشِ نظر نہ تھا، بہرحال یہ سب کچھ ہوا مگر تاریخ دارالعلوم کا خانہ بدستور خالی تھا اور اس کی شدید ضرورت تھی، مجلسِ شوریٰ میں یہ مسئلہ آیا تو اس کی ضرورت متفقہ طریق پر محسوس کی گئی، اور اُس کی جامع تدوین اور اہمیت کے پیشِ نظر تاریخ نویسی کے لئے ہمارے محترم بھائی سید محبوب صاحب رضوی ناظم محافظ خانہ دارالعلوم کا انتخاب عمل میں آیا، جنھیں طبعی طور پر تاریخ سے لگاؤ اور اس فن سے مناسبت ہے اور واقعہ نگاری کا فطری سلیقہ ہے، دارالعلوم میں جب کبھی تاریخی سوالات آتے ہیں تو اُنہی سے اس بارہ میں مدد لی جاتی ہے، اور وہ باحسن اسلوب اس کام کو بڑے سلیقہ سے انجام دے دیتے ہیں، اس لئے تاریخ دارالعلوم کے سلسلہ میں یہ انتخاب نہایت موزوں اور برمحل ثابت ہوا، برادر ممدوح نے اپنا پورا وقت لگا کر تاریخ دارالعلوم کی تدوین کا کام انجام دیا، اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے تاریخ کی تدوین میں بہترین حُسنِ ترتیب، ضروری معلومات کی فراہمی اور اُس کی ساتھ مؤرخانہ انداز سے مستند حوالہ جات و استناد جامع عنوانات کے تحت واقعات اور معاملات کا تجزیہ تفصیل کی جگہ تفصیل، اور اجمال کی جگہ جامع اجمال کا قابلِ قدر ثبوت دیا ہے۔

واقعات کی ترتیب بہترین انداز پر کی گئی ہے، عبارت سلیس اور شگفتہ ہے، واقعات

کے بیان میں حوالے دیئے گئے ہیں جو تاریخی حیثیت سے ضروری ہوتے ہیں اور وجہ اطمینان بنتے ہیں، جو ہر آئینہ لائق تحسین و تبریک ہے۔ فجزاہم اللہ عنا خیراً۔

میں خود بھی اس تاریخ سے مستفید ہوا، اسے پڑھا اور ماشا ءاللہ کہتا رہا، ان کی خواہش تھی کہ میں بھی بطور مقدمہ اس کے بارہ میں کچھ سطور قلمبند کروں، لیکن تاریخ بیانی میں انھوں نے اس کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی کہ کوئی دوسرا اس پر قلم اُٹھائے۔

البتہ دارالعلوم کی اس صورت کشی اور ہیئت نمائی کے ساتھ اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ دارالعلوم کی حقیقت اور معنویت بھی سامنے آجائے تاکہ صورت نمائی کے ساتھ حقیقت نمائی بھی صفحۂ اوراق پر آجائے، اس لئے جو اُمور ہمارے محترم سید صاحب نے بطور مظاہر تاریخ کے پیش فرمائے ہیں میں نے اُنھیں اُمور کو بطور مصادر تاریخ کے پیش کر دیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ معنویات کی ان سطروں کے ساتھ تاریخ دارالعلوم کی صورت نگاری سے اس کی صورت اور حقیقت دونوں بیکدم سامنے آجائیں گی، اور دارالعلوم اپنے ظاہر و باطن کے ساتھ نمایاں ہوجائے گا۔ وباللہ التوفیق

محمد طیب غفرلہٗ

مہتمم دارالعلوم دیوبند

۲۲ رجب ۱۳۹۶ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیمؒ

دیباچہ

شورشِ عندلیب نے، روح چمن میں پھونک دی

ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی، خوابِ ناز میں

۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ (۳۰ مئی ۱۸۶۶ء) پنجشنبہ کا دن ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں وہ مبارک و مسعود دن تھا جس میں دیوبند کی سرزمین میں علومِ اسلامیہ کی نشأۃِ ثانیہ کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ جس سادہ اور معمولی طریقے سے یہ آغاز ہوا تھا اُس کو دیکھکر یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ جس مکتب کا آغاز اِس بے سروسامانی سے ہو رہا ہے چند ہی سال کے بعد وہ علومِ اسلامیہ کا ایشیا میں سب سے بڑا مرکز بننے والا ہے، چنانچہ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ برِّصغیر سے گزر کر افغانستان، ایران، سمرقند و بخارا، برما، انڈونیشیا، ملائیشیا، ترکی اور برِّاعظم افریقہ کے دور دراز خطّوں سے کتاب و سنّت اور شریعت و طریقت کے طالبین یہاں جوق در جوق آنے شروع ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے علم و دانش کی کرنوں نے برِّاعظم ایشیا کے مُسلمانوں کے دل و دماغ کو نورِ ایمانی اور تہذیبِ اسلامی سے منوّر کر دیا۔

جس زمانے میں دارالعلوم دیوبند قائم ہوا اس وقت ہندوستان میں قدیم مدارس قریب قریب ختم ہو چکے تھے، اور کہیں کہیں جو دو چار باقی بھی رہ گئے تھے اُن کی حالت کرمکِ شب تاب سے زیادہ نہ تھی، اس وقت بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلامی علوم ہندوستان سے رختِ سفر

باندھ چکے ہیں ؎

جدھر جاتی تھیں نظریں، تذکرے تھے شرک و بدعت کے ÷ فنا سب ہو چکے تھے، مدرسے درسِ شریعت کے
پتہ باقی نہ تھا، اسلاف کی بے مثل شوکت کا ÷ زمانہ ہو چکا تھا ختم، اسلامی حکومت کا

ان حالات میں چند اہل اللہ اور علمائے ربانی نے بنورِ باطن درپیش خطرات کو محسوس کیا۔ وہ جانتے تھے کہ قوموں کو علم کی بدولت ہی ان کا صحیح مقام حاصل ہوا ہے۔ انھوں نے حکومتِ وقت سے بے نیاز ہو کر محض عوامی چندے اور تعاون سے "دارالعلوم دیوبند" کی بنیاد رکھی، حضرت نانوتوی قدس سرہٗ نے دارالعلوم اور دوسرے دینی مدارس کے لئے جو اصول تجویز فرمائے اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ دارالعلوم کو متوکلانہ طریق پر عوامی چندوں سے چلایا جائے، اور امداد کے لئے صرف غریب عوام پر بھروسہ کیا جائے۔

دارالعلوم دیوبند آج عالمِ اسلام کا مشہور دینی و علمی مرکز ہے، برِصغیر میں اسلام کی نشرواشاعت کا یہ سب سے بڑا ادارہ اور دینی علوم کی تعلیم کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے، دارالعلوم دیوبند سے ہر دور میں ایسے باکمال فضلاء تیار ہو کر نکلے جنھوں نے وقت کی دینی ضرورت کے تقاضوں کے مطابق صحیح دینی عقائد اور علومِ دینیہ کی نشرواشاعت کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، یہ حضرات برِصغیر کے علاوہ دوسرے مختلف ملکوں میں بھی علمی و دینی خدمات انجام دینے میں مصروف ہیں، اور ہر جگہ انھیں ممتاز حیثیت سے مسلمانوں کی دینی رہنمائی کا مقام حاصل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند تیرھویں صدی ہجری کی ایک عظیم دینی، تعلیمی اور اصلاحی تحریک تھی، یہ وقت کی ایسی ضرورت تھی جس سے بے اعتنائی اور چشم پوشی مستقبل میں مسلمانوں کو اُن خطرات سے دوچار کر سکتی تھی جس کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا، ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ کو جو قافلہ صرف دو نفوس پر مشتمل تھا، آج اس کے جلو میں ایشیا کے بہت سے ملکوں کے نفوس شامل ہیں۔

گزشتہ ایک صدی سے دارالعلوم دیوبند نہ صرف اس برِصغیر میں بلکہ تمام دنیائے اسلام میں مسلمانوں کی دینی تعلیم کے لئے ایک بے نظیر درس گاہ بھی جاتی رہی ہے، جامع ازہر کے

علاوہ اسلامی اور دینی علوم و فنون کا کوئی ادارہ ایسا نہیں ہے جو اپنی قدامت، مرجعیت و مرکزیت اور طلبار کی کثرت کے لحاظ سے اتنی اہمیت رکھتا ہو جتنی دارالعلوم دیوبند کو دنیائے اسلام میں حاصل ہے۔ ہندوستان کی اس گم نام بستی میں دارالعلوم کی بنیاد کچھ ایسے مخلص بزرگوں کے مقدس ہاتھوں سے رکھی گئی تھی کہ بہت تھوڑے عرصے میں اس کی علمی عظمت دنیائے اسلام میں قائم ہوگئی، اور یہ اسلامی دنیا کی نہایت ہردل عزیز درس گاہ سمجھی جانے لگی، اور ممالکِ اسلامیہ کے طالبانِ علم دارالعلوم دیوبند میں علوم و فنون کی طلب و تحقیق کے لئے جمع ہو گئے، آج برِصغیر کے طول و عرض میں دینی علوم سے واقف جتنی ہستیاں نظر آتی ہیں اُن کی بڑی تعداد اسی دریائے علم سے سیراب ہوئی ہے، اور بڑے بڑے علمار نے اسی عظیم الشان درس گاہ میں زانوئے تلمذ تہ کیا ہے، یہ حقیقت ہے کہ علمی خدمات کی گراں مائیگی میں برِصغیر ہی میں نہیں بلکہ دوسرے اسلامی ممالک میں بھی ایک دو کے علاوہ کوئی تعلیم گاہ ایسی نہیں ہے جس نے ملتِ اسلامیہ کی اتنی وسیع اور اہم دینی اور علمی خدمات انجام دی ہوں، علمائے دارالعلوم کے دینی علمی، تبلیغی اور تصنیفی کارناموں کا برِصغیر ہی میں نہیں بلکہ دوسرے اسلامی ممالک میں بھی بارہا اعتراف کیا گیا ہے، خصوصاً رُشد و ہدایت اور تدریس و تبلیغ کے میدانوں میں یہ سب سے آگے نظر آتے ہیں۔ برِصغیر کے اسلامی معاشرے میں انھیں بلند مرتبہ اور وسیع مقام حاصل ہے، دارالعلوم کے غُلغلے سے افغانستان اور بخارا و سمرقند تک کی علمی مجلسیں گونج اُٹھیں، اس کے فارغین علمار بڑے بڑے مدرسوں کے صدر المدرسین مقرر ہوئے اور یہ کہنا ایک مستند تاریخ اور حقیقت ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا یہ چشمۂ فیض اپنی خصوصیات کے ساتھ تشنگانِ علوم کو سیراب کرنے میں ایک صدی سے زائد مدت سے مصروف ہے، اور پورا ایشیا اس چمنستانِ نبوت کی خوشبو سے مہک رہا ہے، دنیائے اسلام میں آج ہزاروں لاکھوں دینی درس گاہوں میں صرف دو ہی تعلیم گاہیں ایسی ہیں جن پر مسلمانوں کو سب سے زیادہ اعتماد رہا ہے، ایک جامع ازہر اور دوسری دارالعلوم دیوبند، ان دونوں اداروں نے مسلمانوں کی جس قدر دینی خدمات انجام دی ہیں وہ آپ اپنی مثال ہیں۔ دارالعلوم کی انہی دینی، علمی اور

فکری سرگرمیوں نے اسے دنیائے اسلام کی آنکھوں کا مرکز بنا دیا ہے، اور عجیب تر بات یہ ہے کہ دارالعلوم نے یہ تمام ترقیاں حکومت سے بے نیاز رہ کر کی ہیں، دارالعلوم دیوبند کی برکات اور عالم گیر فیضان بتلا رہا ہے کہ اس درس گاہ پر علم الٰہی اور علم نبوی کی ایک تجلّی خاص پرتو فگن ہے جو برابر قلوب کو اپنی جانب جذب کرتی رہتی ہے! دارالعلوم دیوبند نے کیا اور کتنے عظیم کارنامے انجام دیئے اور کیسی کیسی نامور شخصیتیں پیدا کیں اور انھوں نے دینی زندگی کے ہر میدان میں کس طرح اپنی خدمت اور افادیت کے نقوش قائم کئے، یہ سب باتیں آپ کو تاریخ دارالعلوم دیوبند کے مطالعے سے معلوم ہوں گی۔

دارالعلوم دیوبند کے وجود پر برِّ صغیر کے مسلمان جس قدر بھی فخر و مسرّت کا اظہار کریں اس کے درست اور حق بجانب ہونے میں کوئی تامّل نہیں کیا جا سکتا، دارالعلوم کی تاریخ عہدِ حاضر میں مسلمانوں کی تاریخ جد و جہد کا روشن باب ہے، اقامتِ دین اور حرّیتِ فکر کی اس عظیم جد و جہد کو اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، دارالعلوم دیوبند حقیقت میں ایک بحرِ بیکراں ہے، جس سے برِّ صغیر کے علاوہ پورے ایشیا کے تشنگانِ علوم بھی سیراب ہو رہے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کی تاریخ کا اگر غائر نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت صاف طور پر نظر آتی ہے کہ یہ قدیم طرز کی صرف ایک درس گاہ ہی نہیں ہے، بلکہ درحقیقت احیائے اسلام اور قیامِ ملّت کی ایک عظیم الشان تحریک ہے۔

دیوبند کی سرزمین میں اس دینی درس گاہ کا قیام اور اس کا استحکام برِّ صغیر کے مسلمانوں کی ایک متحدہ سعی و کوشش کا نتیجہ ہے، دین کی خدمت، اسلام کی تائید، اسلامی علوم و فنون کا احیاء اور اُن کی نشر و اشاعت، علم دین کے شائق طلباء کی دست گیری دارالعلوم دیوبند کے مخصوص اور عظیم بالشان کارنامے ہیں۔ یہ ایک سو چودہ سال سے سلفِ صالحین کے مسلک کے مطابق مسلمانوں کی صحیح علمی اور عرفانی تربیت کر رہا ہے، زوالِ بغداد کے بعد جس طرح قاہرہ اسلامی علوم و فنون کا مرکز بنا، ٹھیک اسی طرح دہلی کے زوال کے بعد علمی مرکزیت دیوبند کے

حصے میں آئی اور بڑی بڑی نامور شخصیتیں اس درس گاہ سے اٹھیں، بے شمار علمار فضلار نے اس کی آغوش میں پرورش پائی، یہاں سے ہزاروں علمار مشائخ، محدثین، فقہار، مصنفین اور دوسرے علم و فن کے ماہرین پیدا ہوئے اور آسمانِ علم وعمل کی زینت بنے، جنھوں نے مختلف انداز سے دین کی خدمات انجام دی ہیں، اور آج بھی اس برِّصغیر کے گوشے گوشے میں انجام دے رہے ہیں، دارالعلوم دیوبند کی تاریخ، اسلام کی تاریخ میں ایک عہد آفریں دور کا تاریخی باب ہے! مختصر یہ ہے کہ علوم و فنون کا یہ بحرِ زخار تشنگانِ علم کی بہت بڑی تعداد کو اب تک سیراب کر چکا ہے، جنھوں نے نسیمِ بہار بن کر اس کی علمی خوشبو کو چار وانگِ عالم میں پھیلا دیا ہے، دارالعلوم کے فیض یافتگان ایک ایسے گھنے درخت کے مشابہ ہیں جس کی سرسبز و شاداب شاخوں اور پتّوں کا شمار کرنا آسان نہیں ہے!

دارالعلوم دیوبند اپنے یوم تاسیس سے شریعت و طریقت دونوں کا مرکز رہا ہے، آسمانِ شریعت و طریقت اور علم وعمل کے جتنے بھی ماہ و انجم اس وقت برِّصغیر میں چمک رہے ہیں اُن میں سے بیشتر اسی شمسِ بازغہ کی روشنی سے منوّر ہیں اور اسی سرچشمۂ علم و عرفان سے سیراب ہو کر نکلے ہیں، ہر شخص جانتا ہے کہ برِّصغیر کے اکثر و بیشتر بڑے بڑے علمار نے اسی درس گاہ میں زانوئے تلمذ تہ کیا ہے، اور بہت سے ایشیائی ملکوں میں خوانِ دارالعلوم کے زلّہ ربا موجود ہیں جنھوں نے برِّصغیر اور اس کے باہر بہت سے ملکوں میں کتاب وسنّت کے چراغ روشن کئے ہیں اور بے شمار انسانوں نے اُن کے ذریعے سے رُشد و ہدایت کا فیض پایا ہے۔

دارالعلوم دیوبند نے مسلمانوں کی فکر و نظر کو تازگی و پاکیزگی، قلب کو عزم و حوصلہ اور جسم کو قوت و توانائی بخشنے میں بڑا کام کیا ہے، اس کا فیضان عام ہے، اس سے ایسے بیشمار لوگوں نے اپنی علمی تشنگی بجھائی ہے جن کے علمی شوق کو پورا کرنے کے لئے اسباب مہیا نہ تھے اسی کے ساتھ دارالعلوم کے نقشِ قدم پر بہت سے علمی اور دینی چشمے جاری ہو گئے، جن میں سے ہر چشمہ اپنے افادہ و فیضان کا ایک خاص دائرہ رکھتا ہے، یہ سب اسی نظامِ شمسی کے

ستارے ہیں جن کی روشنی سے برصغیر میں مسلمانوں کی علمی اور دینی زندگی کا گوشہ گوشہ روشن ہے۔

ان دینی مدارس کے اس فیض کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے کہ ان کی بدولت لاکھوں مسلمان گھرانوں کی حالت سدھر گئی، مسلمانوں کا احساس کمتری دور ہوا، اور ان کی بدولت ملت کو ایسے بے شمار افراد میسر آگئے جنھوں نے حالات اور وقت کے مطابق زندگی کے مختلف گوشوں میں مسلمانوں کی رہ نمائی کی۔ انھوں نے احیائے اسلام کی عظیم خدمات کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں سیاسی شعور کو بیدار کیا اور آزادی کی جدوجہد میں قائدانہ حصہ لیا جس کے نتیجے میں برصغیر کے ملکوں کو آزادی حاصل ہوئی۔

ماضی میں دارالعلوم دیوبند نے جس طرح اسلام، دینی علوم اور مسلمانوں کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں توقع ہے کہ مستقبل میں بھی یہ مسلمانوں میں قوتِ عمل کو ابھارنے، ایمانوں کو تقویت پہنچانے اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا فریضہ اسی طرح انجام دیتا رہے گا۔

اگرچہ دارالعلوم دیوبند کا ابر گوہر بار تیرھویں صدی ہجری کے اواخر سے عالم اسلام پر مصروف باراں ہے، مگر دارالعلوم کے حالات سے اب تک بہت کم لوگ واقف ہیں، اکابر دارالعلوم کا طریق کار ہمیشہ یہ رہا ہے کہ انھوں نے اپنے کام کو شہرت دینے کے بجائے کام کی رُوح کو پیشِ نظر رکھا ہے، جس کے لئے صرف سالانہ روداد کی اشاعت کو کافی سمجھا گیا اور وہ بھی محض اس لئے کہ اس کے ذریعے سے ہمدردانِ دارالعلوم کو اُن کے چندے کا مصرف معلوم ہوتا رہے اور یہ کہ قوم نے اپنے جن نونہالوں کو دارالعلوم کی آغوش میں دیا ہے اُن کے تعلیمی نتائج سے وہ باخبر رہیں، اس لئے روداد میں چندے کے آمد و صرف اور طلبار کے تعلیمی نتائج ہی پیش کردینے پر پوری توجہ رہتی ہے۔ البتہ ضمناً اُس سال کے اہم واقعات بھی درج کردیئے جاتے ہیں۔ دارالعلوم کی طویل زندگی کے یہ واقعات رودادوں میں اس قدر منتشر ہیں کہ اُن سے استفادہ آسان نہیں ہے۔

تاریخ دارالعلوم کے سلسلے میں سب سے پہلے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ مہتمم دارالعلوم نے ۱۳۸۵ھ میں "دارالعلوم کی صد سالہ زندگی" کے عنوان سے ایک مختصر کتاب تحریر فرمائی جس میں دارالعلوم کی تاسیس اور اس کے تعلیمی، تبلیغی اور انتظامی امور کے احوال و کوائف کا مختصر اور جامع مرقع پیش فرمایا ہے، مگر ضرورت تھی کہ دارالعلوم کی تاریخ کے اہم واقعات کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا جائے تاکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی علمی تاریخ کے لئے مواد مہیا ہو سکے لیکن اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ تاریخ دارالعلوم کی تدوین کا کام چند پختہ کار مصنفین کی جماعت اپنے ہاتھوں میں لیتی اور مشترکہ مساعی کو اپنی کاوش و تحقیق کے بعد پیش کرتی، اور ہوا یہ کہ مجلس شوریٰ دارالعلوم نے شعبان ۱۳۹۱ھ میں اتفاق سے اس کے لئے انتخاب کیا ایک کم علم، بے سواد اور مجھ جیسے ہیچ مداں شخص کا، اسی کے ساتھ یہ بھی پیش نظر رہے کہ یہ نقش اول ہے، اس لئے خامیوں اور غلطیوں کا پایا جانا لازمی ہے

کوئی انسانی کام نقائص خامیوں اور فروگزاشتوں سے پاک نہیں ہو سکتا ہے، اسلئے تاریخ دارالعلوم کے مکمل یا حرف آخر ہونے کا دعویٰ ہرگز نہیں کیا جا سکتا، اور پھر یہ تو نقش اول ہے میں نے تو دارالعلوم کے منتشر اور بکھرے ہوئے حالات کو اپنی بساط کے مطابق ایک جگہ جمع کر دیا ہے، یہ واقعات کسی کتاب کے بکھرے ہوئے اوراق کی طرح منتشر تھے، مگر اب یہ ایک شیرازہ بند کتاب کی صورت میں آپ کے سامنے ہیں، یہ عظیم کام چونکہ کسی ایک شخص کے بس کا نہیں ہے، بلکہ درحقیقت مصنفین کے ایک بورڈ کے کرنے کا تھا، اس لئے نقائص او خامیوں کا پایا جانا ناگزیر ہے، جس کے لئے راقم سطور معذرت خواہ ہے۔ لیکن یہ بات میرے لئے وجہ اطمینان ہے کہ ے

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنیٰ کو
کہ فطرت خود ہی کرتی ہے لالہ کی حنابندی

جو باتیں یہاں درج ہونے سے رہ گئی ہیں، یا جو سرسری اور ناتمام درج ہوئی ہیں

اُن کی تکمیل کے لئے دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا ہوگا۔

ایک یہ بات بھی عرض کر دینی ضروری ہے کہ دارالعلوم دیوبند کو اپنی طویل تاریخ میں بہت سی تحریکوں اور اداروں سے واسطہ پڑا ہے۔ اور قدرتی طور پر سب کے تاثرات و خیالات اس کی نسبت یکساں نہیں ہو سکتے۔ ایسے مواقع پر مصنف کی کوشش یہی رہی ہے کہ انصاف کے دامن کو حتی الامکان ہاتھ سے چھوٹنے نہ دیا جائے، اس لئے نزاعی واقعات پر نہایت حزم و احتیاط کے ساتھ قلم اُٹھایا گیا ہے، اور ایسے مقامات سے جلد از جلد گزرنے کی کوشش کی گئی ہے، مدتیں گزر جانیکے بعد اب اُن کی جزئیات اور تفصیلات بیان کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ایسے مقامات پر مختصر طور سے محض واقعہ بیان کر دیا گیا ہے۔

تاریخ دارالعلوم میں پیش کئے گئے حالات کا ماخذ سالانہ شائع ہونے والی روداد ہے، بعض باتیں روزمرہ کے حالات اور ذاتی مشاہدے پر مبنی ہیں، اس کے علاوہ جہاں دوسرے مآخذ سے مدد لی گئی ہے وہاں اس کا حوالہ دے دیا گیا ہے، حوالے سے قاری کا ذہن اس واقعے کے بارے میں بڑی حد تک مطمئن ہو جاتا ہے، اسی کے ساتھ روائت کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کا بھی ہر شخص کو موقع مل جاتا ہے، اور وہ یہ رائے قائم کر سکتا ہے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ قابل اعتبار ہے بھی یا نہیں، اس کے علاوہ مآخذ کے حوالے سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی پیش نظر رہا ہے کہ اس موضوع سے متعلق قاری کو بہت سی کتابوں کا علم ہو جائے گا، اور بعد میں اس موضوع پر کام کرنے والوں کو اس سے سہولت حاصل ہو جائے گی گویا اب یہ راستہ نکل آیا ہے، اور دریا پایاب ہو گیا ہے جس کا جی چاہے اس راستے سے گزر جائے۔

حالات کے ضمن میں روداد کی عبارتیں کہیں بعینہٖ نقل کی گئی ہیں، اور کہیں اُن کا مفہوم اپنے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ فرق موقع و محل کے لحاظ سے برتا گیا ہے، اس کی بڑی وجہ یہ خیال ہے کہ قاری کے ذہن کو اصل عبارت اور اُس کے اسلوبِ نگارش سے بہرحال قریب تر رہنا چاہیئے، تاکہ وہ مصنف کے اندازِ فکر و نگارش اور طرزِ ادا کو سمجھ سکے اور امکانی حدود میں اس سے

استفادہ کر سکے۔

یہ سب جانتے ہیں کہ کسی بھی نئے موضوع پر لکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ راقم سطور نے اس "کوہِ بے ستون" میں "کوہ کنی" کی جرأت کی ہے۔ کامیابی و کامرانی خدائے بزرگ و برتر کے ہاتھ میں ہے! تاریخ دارالعلوم کی تدوین میں جن مشکلات اور دشواریوں سے راقم سطور کو گزرنا پڑا ہے اہلِ نظر اس کا اندازہ کر سکتے ہیں، بہرحال مجھ سے جو کچھ ہو سکا وہ آپ کے سامنے ہے، تاہم یہ توقع ضرور ہے کہ میری یہ کوشش اس موضوع پر آئندہ کام کرنے والوں کے لئے ایک گونہ سہولت کا باعث ہوگی۔ اللہ تبارک وتعالےٰ نے اگر توفیق عطا فرمائی تو نقشِ ثانی اس سے بہتر ہو سکے گا۔

تاریخ دارالعلوم کو متعدد ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے، اور ہر باب کو اس طرح مرتب کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسے اپنے ماقبل و مابعد ابواب سے علیحدہ کر کے ایک مستقل کتاب بنایا جا سکے، اس لئے بعض مقامات پر قارئین تکرار محسوس کریں گے۔ مگر مذکورہ بالا التزام کے ساتھ ایسا کیا جانا ناگزیر تھا۔

اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ راقم سطور کی یہ سعی کس حد تک کامیاب ہو سکی ہے، تاہم میری کوشش یہی رہی ہے کہ دارالعلوم کے حالات و واقعات کا ایک ایسا مرقع تیار ہو جائے جس سے دارالعلوم کی تحریک کا مقصد سامنے آجائے اور یہ معلوم ہو سکے کہ دارالعلوم دیوبند مسلمانوں کے لئے جن مقاصد کو لے کر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا تھا اُن مقاصد کو کس حد تک پورا کر سکا ہے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ!

دارالعلوم دیوبند میں شروع سے اب تک سنِ ہجری کا رواج رہا ہے، ہماری قدیم تاریخوں میں بھی یہی سن رائج تھا، مگر انیسویں صدی عیسوی سے سنِ عیسوی کا رواج عام ہو گیا ہے، اس لئے سنین کے سلسلے میں راقم سطور نے ہجری اور عیسوی دونوں سن لکھے ہیں، مگر ان کے لکھنے میں التزام یہ کیا گیا ہے کہ منقول سن کو اصل قرار دے کر اوپر لکھا گیا ہے اور نیچے اس کی مطابقت

دوسرے سن سے کر دی گئی ہے، اس بنا پر بیشتر مقامات پر تو سنِ ہجری ہی اوپر لکھا ہے، مگر کہیں کہیں سنِ عیسوی بھی اوپر لکھا گیا ہے، اس التزام سے قاری کو بسہولت یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ دونوں میں اصل سن کونسا ہے، اور وہی زیادہ قابلِ لحاظ ہے۔

راقم سطور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ العالی مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا قاضی زین العابدین صاحب سجاد اور حضرت مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی رکن مجلس شوریٰ کا بصمیمِ قلب ممنون اور سپاس گزار ہے، اگر ان حضرات کی رہنمائی اور گراں قدر مشورے مجھے حاصل نہ ہوتے تو تاریخ دارالعلوم دیوبند کا پایۂ تکمیل تک پہنچنا مشکل تھا، اللہ تبارک وتعالےٰ ان حضرات کو جزائے خیر اور اجرِ جزیل عطا کرے، اور راقم سطور کو آئندہ بھی حضراتِ ممدوحین سے استفادہ کا موقع میسر فرمائے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب دامت برکاتہم نے اپنی پیرانہ سالی اور ضعف کے باوجود تاریخ دارالعلوم دیوبند پر گراں قدر مقدمہ لکھنے کی جو زحمت فرمائی ہے وہ ایک ایسی بزرگانہ شفقت اور خدام نوازی ہے جو راقم سطور کے شکریے سے وراء الورا ہے۔

سیّد محبوب رضوی

دارالعلوم دیوبند

۱۳ رجب المرجب ۱۳۹۶ھ، ۲۲ جولائی ۱۹۷۶ء

باب اوّل

اسلام میں مدارس کا آغاز مساجد سے ہوا ہے۔ مسجدِ نبوی سے ملحق وہ مشہور چبوترہ تھا جو تاریخ میں "صُفّہ" کے نام سے موسوم ہے، صحابہ کرامؓ میں سے یہاں جو حضرات فروکش ہوتے تھے وہ اصحابِ صُفّہ کہلاتے تھے، اُن کی تعلیم کے لئے معلم مقرر تھے، اسلام کی دعوت و تبلیغ کیلئے جب کہیں مبلّغ بھیجنا ہوتا تو یہی لوگ بھیجے جاتے۔ [1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک تعلیم و تدریس کی جو اہمیت تھی اس کا اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ مسجدِ نبوی میں تشریف لائے تو آپ نے وہاں صحابہ کرامؓ کے دو حلقے دیکھے، ایک حلقے میں لوگ تلاوت و دعاء میں مشغول تھے، اور دوسرے حلقے میں قرآن مجید کے درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا، آپؐ نے فرمایا:۔

اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا [2] میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں!

یہ فرما کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید کے حلقۂ درس میں تشریف فرما ہو گئے۔

چوتھی صدی ہجری تک تعلیم و تدریس کا کام اسی طرح مساجد سے لیا جاتا رہا، اس زمانے

---

[1] سیرۃ النبی جلد اوّل ص ۲۱۵ طبع اول نامی پریس کانپور۔

[2] سنن ابن ماجہ باب فضل العلماء۔

میں مساجد کے پہلو بہ پہلو مدارس و مکاتب کے قیام کا مذاق عام تھا۔ اس چیز نے ایسا قبولِ عام حاصل کیا کہ اب تک کم و بیش یہ سلسلہ ہر اسلامی ملک کی مسجدوں میں جاری ہے۔

مدارس کا آغاز

موجودہ شکل کے باقاعدہ مدارس کا آغاز اسلام کی تاریخ میں پانچویں صدی ہجری سے ہوتا ہے عام خیال ہے کہ دنیائے اسلام میں پہلا مدرسہ نظام الملک طوسی (وفات ۴۸۵ھ / ۱۰۹۲ء) نے بغداد میں مدرسہ نظامیہ کے نام سے قائم کیا تھا، یہ صحیح نہیں ہے، درحقیقت قدرت کی جانب سے اس اوّلیت کا شرف افغانستان کے نامور فرماں روا سلطان محمود غزنوی (وفات ۴۲۱ھ / ۱۰۳۰ء) کے لئے مقدر تھا[1]، چنانچہ ۴۱۰ھ / ۱۰۱۹ء میں سلطان محمود غزنوی نے اپنے پایۂ تخت غزنی میں ایک جامع مسجد تعمیر کی جو اپنی نفاست اور خوبصورتی کے لحاظ سے "عروسِ فلک" کے نام سے مشہور تھی، مسجد کے ساتھ سلطان نے مدرسہ کی عمارت بھی تعمیر کرائی تھی، مدرسہ کے ساتھ کتب خانہ بھی تھا جو نادر الوجود کتابوں سے معمور تھا، مسجد اور مدرسہ کے اخراجات کے لئے سلطان نے بہت سے دیہات وقف کر دیئے تھے، ابوالقاسم فرشتہ کا بیان ہے۔

درجوار آں مسجد مدرسہ بنا نہادہ و بنفائس کتب و غرائب نسخ موشح گردانیدہ دیہات بسیار بر مسجد و مدرسہ وقف فرمود[2]	مسجد کے قریب مدرسہ قائم کیا، مدرسہ کے کتب خانہ میں عمدہ اور کم یاب کتابیں جمع کیں، مسجد اور مدرسہ کے اخراجات کے لئے بہت سے دیہات وقف کر دیئے۔

---

[1] البدایہ والنہایہ ابن کثیرؒ کی روایت کے مطابق مصر کے حکمران الحاکم بامر اللہ کے عہدِ حکومت (۳۸۶ھ / ۹۹۶ء تا ۴۱۱ھ / ۱۰۲۰ء) میں اگرچہ اس قسم کے مدرسہ کا سراغ ملتا ہے، جس میں حکومت کی جانب سے محدثین اور فقہا تعلیم کے لئے مقرر کئے گئے تھے، مگر دو تین سال کے بعد خود اس نے اس مدرسہ کو منہدم کرا دیا، تفصیل کے لئے دیکھئے البدایہ والنہایہ ابن کثیر جلد ۱۱ ص ۳۴۳ مطبعۃ السعادہ اور حاشیہ تاریخ الکامل ابن اثیر حالات ۳۸۳ھ [2] تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۳ مطبوعہ نول کشور لکھنؤ

سلطان کی اس مثال سے امراء اور ارکانِ دولت میں بھی مدارس قائم کرنے کا شوق پیدا ہوا اور تھوڑے ہی عرصے میں غزنی کے اطراف وجوانب میں بے شمار مدرسے قائم ہو گئے۔ فرشتہ نے لکھا ہے کہ :-

بمقتضائے الناس علیٰ دین ملوکہم ہر یکے از امراء	بادشاہ کی تقلید میں (بمضمونِ الناس علیٰ دین
وا عیانِ دولت بر بنائے مسجد و مدارس ورباطات	ملوکہم (لوگ اپنے بادشاہوں ہی کے راستے پر
وخوانق مبادرت نمودند لہ	چلتے ہیں) امرائے سلطنت مسجدیں، مدرسے
؞ ؞ ؞ ؞	رباطیں اور خانقاہیں تعمیر کرنے میں ایک دوسرے
؞ ؞ ؞ ؞	پر سبقت حاصل کرنے لگے۔

غزنی اس زمانے میں اپنی آبادی کی کثرت اور تمدنی ترقی میں عالم اسلام کے سب سے بڑے مرکز اور خلافتِ عباسیہ کے پایہ تخت بغداد کا مقابلہ کر رہا تھا، پوری دنیا سے اہلِ فضل و کمال، متبحر علماء اور باکمال شعراء اس کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔

سلطان محمود غزنوی کے فرزند سلطان مسعود (۴۲۲ھ / ۱۰۳۰ء - ۴۳۲ھ / ۱۰۴۰ء) نے بھی اپنے نامور باپ کی روایات کو برقرار رکھا چنانچہ اس نے اپنی حدودِ مملکت میں بکثرت مدارس قائم کیے۔ فرشتہ کا بیان ہے :-

در اوائل سلطنت او در ممالکِ محروسہ چنداں	اپنے عہدِ حکومت کے شروع میں اس نے ممالکِ
مدارس ومساجد بنیاد نہاد کہ زبانِ بیان از	محروسہ میں اسقدر مدرسے اور مسجدیں بنوائیں
تعداد آں عاجز وقاصر ست ؎	کہ انکی تعداد بیان کرنے سے زبان عاجز وقاصر ہے

ابوریحان بیرونی کی مشہور کتاب قانونِ مسعودی اسی سلطان مسعود کی جانب منسوب ہے۔

اسلام ہندوستان میں

اسلام کے ابرِ کرم کے چھینٹے اگرچہ ہندوستان کے سمندروں کے کنارے اور یہاں کے پہاڑوں کے دامنوں پر پہلی صدی ہجری

لہ تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۳۰ مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ؎ ایضاً ص ۴۴

کے اواخر ہی میں پڑنے لگے تھے، ہندوستان کے شمال مغرب میں سندھ اور پنجاب تک مُسلمان فاتحانہ انداز سے داخل ہو چکے تھے، ہندوستان کے جنوبی علاقے مالابار وغیرہ میں عرب تاجروں نے پہنچ کر نہ صرف اپنی آبادیاں قائم کرلی تھیں بلکہ وہاں کے بازاروں میں عرب تاجر چھا گئے تھے۔ عرب و ہند قدیم ترین زمانے سے ایک دوسرے سے تجارتی اور تہذیبی روابط میں منسلک رہے ہیں، جنوبی ہند میں مُسلمانوں کی حیثیت اور اُن کی علمی سرگرمیوں کا [illegible] قدر، اندازہ وہاں [illegible] میں آنے والے تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے سیاحوں کے بیانات [illegible] لگایا جا سکتا [illegible] ابنِ حوقل جو چوتھی صدی ہجری کا مشہور سیاح گذرا ہے اپنے چشم دید حالات [illegible] یہ بالعموم مسجدوں میں علماء اور فقہاء کا ایک بڑا گروہ مقیم رہتا ہے۔ ان علماء اور [illegible] استفادہ کرنے والوں کی کثرت کا یہ عالم ہے کہ جس مسجد میں بھی چلے جائیے [illegible] نظر آئے گا۔ لہ

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا پیغام اور اس کی روحانی فتوحات کا دَور ہندوستان میں مُسلمان کشور کُشاؤں کے فاتحانہ داخلے سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا، سیلون، مالدیپ، ٹراونکور کارومنڈل، گجرات اور مالابار وغیرہ کے علاقوں میں عربوں کی آبادیاں کثرت سے قائم ہو گئی تھیں۔ ان علاقوں میں مُسلمانوں کا پُرجوش خیر مقدم کیا گیا، اور اسلام کا پیغام بتدریج ہندوستان میں پھیلتا اور مقبول ہوتا رہا، اسلام کی نعمت ساری انسانیت کے لئے عام تھی جو کالے گورے اور بندہ و آقا کے درمیان امتیاز نہیں کرتی تھی وہ ایک ابرِ نیساں تھا جو پست و بلند گلشن و صحرا سب کو سیراب کرگیا۔ سُلیمان تاجر (۲۳۷ھ) کے بیان کے مطابق یہاں کے راجاؤں سے مُسلمان تاجروں کے بڑے اچھے تعلقات قائم ہو گئے تھے، گجرات میں مُسلمانوں کے مقدمات کے فیصلے کے لئے مقامی حکومت کی جانب سے قاضی مقرر ہوتا تھا، جس کو ہُنرمند کہا جاتا تھا،

لہ سفرنامہ ابنِ حوقل ص ۲۰۳ مطبوعہ لائیڈن۔

مسلمانوں کے سارے مقدمات کا فیصلہ یہی ہُنرمند کرتا تھا۔[1] اس زمانہ میں کثرت سے مسلم آبادیاں اور اُن میں مسجدیں تعمیر ہوگئی تھیں۔

یہ عرب تاجر جو بالعموم اہلِ علم اور اہلِ تصوف ہوتے بازاروں میں کاروبار کرتے، عوام سے ملتے، اپنی نیک اور سادہ زندگی کا عملی نمونہ پیش کرکے لوگوں کی زندگی اور اُن کے فکرونظر کا رُخ بدل دیتے تھے۔ مشہور انگریز مصنف پروفیسر ڈبلو۔ آرنلڈ نے بھی اس کا اعتراف اِن الفاظ میں کیا ہے :۔

"ہندوستان کے مُسلمانوں میں نومسلموں اور اُن کی اولاد کی تعداد زیادہ ہے، جبکہ تبدیلِ مذہب میں جبر و تشدّد کا ذرا بھی شائبہ نہیں ہے، اس تبلیغ میں صوفیار کی ترغیب و تعلیم کا اثر ہی کارفرما رہا ہے[2]

ہندوستان کے مدارس

وسط ہندوستان میں مُسلمانوں کی مستقل حکومت کا قیام ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں قطب الدین ایبک کے عہد (۶۰۲ھ/۱۲۰۵ء - ۶۰۶ھ/۱۲۰۹ء) سے شروع ہوتا ہے، ملتان میں ناصرالدین قباچہ نے جو وہاں کا حکمراں تھا ایک مدرسہ تعمیر کرایا، مشہور عالم و مصنف قاضی منہاج سراج (وفات ۶۵۹ھ/۱۲۵۹ء) کا بیان ہے کہ اس مدرسہ کا انتظام و انصرام ان کے سپرد تھا۔ لکھا ہے کہ :۔

دریں سال یعنی اربع و عشرین وستمائۃ در ماہ ذی الحجہ	ذی الحجہ ۶۲۴ھ/۱۲۲۶ء میں اُچھ کا مدرسہ
مدرسہ فیروزی اُچھ حوالہ ایں داعی شد[3]	فیروزی میرے سپرد کیا گیا۔

شیخ بہاؤالدین زکریاؒ (۵۷۸ھ/۱۱۸۲ء - ۶۶۶ھ/۱۲۶۷ء) کا یہ ابتدائی زمانہ تھا، وہ روزانہ فجر کی نماز

---

[1] سفرنامہ ابن حوقل ص ۲۳۳۔

[2] پریچنگ آف اسلام ص ۲۵۴ مطبوعہ لاہور ۱۹۵۶ء۔

[3] طبقات ناصری ص ۱۴۲ مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ۔

اسی مدرسہ میں پڑھتے تھے، اُس دور کے دو اور مدرسوں کا ذکر بھی تاریخ میں ملتا ہے۔ جنکے نام مدرسہ معزیہ اور مدرسہ ناصریہ تھے۔

قباچہ نے مولانا قطب الدین کاشانیؒ کے ماوراالنہر سے ملتان آنے کے موقع پر ایک اور مدرسہ قائم کیا تھا، جس میں مولانا کاشانیؒ مدتوں تعلیم وتدریس میں مشغول رہے[۱]

اُس زمانے میں محمد بختیار خلجی جس نے سب سے پہلے بنگال فتح کیا تھا اس کی نسبت فرشتہ نے لکھا ہے کہ:۔

درسرحد بنگال درعوض شہر لودیا شہرے موسوم برنگ پور بنا کردہ دارالملک خود ساخت ومساجد وخوانق ومدارس درآں شہر وولایت برسم شعار اسلام بہ رونق ورواج تمام مزین ومجلی گردانید[۲]	بنگال میں ندیا کے بجائے ایک شہر رنگ پور کے نام سے آباد کیا اور اس کو دارالحکومت قرار دیا، اور وہاں مسجدیں، خانقاہیں اور مدرسے تعمیر کئے اور سب پُر رونق ہو گئے۔

آٹھویں صدی ہجری تک ہندوستان میں اسلامی مدارس قائم کرنے کا رواج عام ہو گیا تھا۔ چنانچہ علامہ مقریزی کی روایت کے مطابق سلطان محمد تغلق (۷۲۵ھ ۱۳۲۴ء - ۷۵۲ھ ۱۳۵۱ء) کے عہدِ حکومت میں صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے موجود تھے، مدرسین کے لئے خزانۂ شاہی سے تنخواہیں مقرر تھیں، تعلیم اس قدر عام تھی کہ کنیزیں تک قرآن مجید کی حافظ اور عالم ہوتی تھیں مدارس میں علوم دینیہ کے ساتھ معقولات اور ریاضی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی، خود محمد تغلق بہت بڑا فاضل اور علم دوست بادشاہ تھا، قرآن مجید کے علاوہ اکثر فنون کی کتابیں اسے حفظ یاد تھیں اور ہدایہ کی تو چاروں جلدیں سلطان کے بر نوک زبان تھیں[۳]

محمد تغلق کے جانشین فیروز تغلق (۷۵۲ھ ۱۳۵۱ء - ۷۹۰ھ ۱۳۸۸ء) نے جس شان کے مدارس

---

۱ تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۴۰۸ ۲ تاریخ فرشتہ جلد دوم ص ۲۹۲۔

۳ کتاب الخطط علامہ مقریزی جلد دوم ص ۱۴۴۔

تعمیر کرائے اس کا اندازہ ضیا برنی کے اس بیان سے کیا جاسکتا ہے، کہ دہلی کا مدرسہ فیروز شاہی اپنی شوکت، خوبیٔ عمارت، محلِ وقوع، حسنِ انتظام اور تعلیم کی عمدگی کے لحاظ سے اپنی نظیر نہیں رکھتا، مصارف کے لئے شاہی وظائف مقرر ہیں، پایۂ تخت دہلی کی کوئی عمارت حسنِ تعمیر اور موقع ومحل کے لحاظ سے مدرسہ فیروز شاہی کا مقابلہ نہیں کرسکتی، مدرسہ کی عمارت بہت وسیع اور ایک بڑے باغ میں تالاب کے کنارے پر واقع ہے، ہر وقت سیکڑوں طلباء اور علماء وفضلاء یہاں موجود رہتے ہیں، طلباء اور اساتذہ کے لئے مکانات بنے ہوئے ہیں، باغ کے کنجوں میں سنگِ مرمر کے فرش پر نہایت آزادی کے ساتھ اپنے علمی مشاغل میں منہمک نظر آتے ہیں[1]

فیروز شاہ نے جہاں نئے مدارس جاری کئے وہیں اُس نے پُرانے مدرسوں کی جدید بھی کی علماء وطلباء کے لئے خزانۂ شاہی سے وظائف جاری کئے اور بڑی بڑی جائدادیں مدارس کے لئے وقف کیں[2]

فیروز شاہ کی تعلیمی خدمات میں یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ اُس نے غلاموں اور اُنکے بچوں کی تعلیم وتربیت پر بھی خاص توجہ کی، غلاموں کو حفظِ قرآن مجید کے علاوہ دینی علوم کی تحصیل کا بھی موقع فراہم کیا جاتا تھا، تعلیم کے علاوہ غلاموں کو صنعت وحرفت بھی سکھائی جاتی تھی، شمس سراج عفیف کے بیان کے مطابق عہدِ فیروزی میں۔۔۔۱۸ غلاموں نے علوم وفنون اور صنائع کی تعلیم حاصل کی[3]

اسی فیروز شاہ نے لڑکیوں کے لئے بھی جداگانہ مدارس قائم کئے، مشہور سیاح ابنِ بطوطہ نے جنوبی ہند کے ایک مقام ہنور کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "یہاں کی عورتیں حافظ قرآن مجید

---

[1] تاریخ فیروز شاہی ص ۵۵۹ [2] تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۱۵۱ [3] تاریخ فیروز شاہی شمس سراج عفیف ص ۱۹۱ و ۱۹۲ [4] ہنور کا موجودہ نام ہرنور ہے، یہ مہاراشٹر کی ایک تحصیل ہے۔

ہوتی ہیں، میں نے اس شہر میں لڑکیوں کے تیرہ مکاتب دیکھے"۔ [1]

گجرات کا فرماں روا سلطان محمد عادل شاہ (۸۹۵ھ/۱۴۸۹ء - ۹۱۶ھ/۱۵۱۰ء) جو سلطنت بیجاپور کا حکمراں تھا اُس نے جو مدارس اپنی حدودِ مملکت میں جاری کئے تھے اُن میں حکومت کی جانب سے طلباء کو عام کھانے کے علاوہ روزآنہ بریانی اور مزعفر بھی دیا جاتا تھا۔ اور ایک طلائی سکّہ جو "ہوَنّ [2]" کے نام سے موسوم تھا ہر طالب علم کو ماہانہ ملتا تھا۔ بستان السلاطین کے مصنّف نے گجرات کے ایک مدرسہ آثار کی نسبت لکھا ہے کہ:۔

شاگردانِ راسُفرۂ آثار آش و نان بوقت صبح بریانی و مزعفر و بوقت شام نانِ گندم و کھچڑی و فی اسم یک ہُون و بدون ایں کتاب ہائے فارسی و عربی مدد می نمائند [3]

طلباء کو آثار کے دسترخوان سے صبح کے وقت آش و نان اور بریانی و مزعفر اور شام کے وقت گیہوں کی روٹی اور کھچڑی دی جاتی تھی اس کے علاوہ ہر طالب علم کو ایک ہون دیا جاتا تھا۔ اور فارسی و عربی کی کتابیں بھی دی جاتی تھیں۔

سلاطینِ شرقیہ جونپور کے حکمراں تھے، انھوں نے صدہا مدرسے تعمیر کرائے اور علماء و فضلاء کو دور دراز ملکوں سے بلا کر اُن کو گراں قدر جاگیریں دیں، جونپور کی علمی و تعلیمی برتری لودی سلاطین کے آخری دور تک قائم رہی۔ جونپور میں اٹالہ مسجد کے ساتھ جو مدرسہ قائم تھا اس کی عمارت اب تک موجود ہے، مسجد کے گرد و پیش حجروں کا وسیع سلسلہ پھیلا ہوا ہے، ہندوستان کے مشہور اور بیدار مغز بادشاہ شیر شاہ سوری (۸۷۷ھ/۱۴۷۲ء - ۹۵۲ھ/۱۵۴۵ء) نے اسی مسجد کے دارالعلوم میں

---

[1] ترجمہ اُردو سفرنامہ ابن بطوطہ ص ۷۰، مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی [2] ہون ایک طلائی سکّہ تھا جو دکن میں رائج تھا۔ "ہُن برسنا" کی ضرب المثل میں اسی ہُون کی طرف اشارہ ہے [3] بستان السلاطین بحوالہ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت ص ۱۹۱ مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی۔

زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔[1]

اٹھارویں صدی کے اواخر میں جونپور ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات میں شامل ہوگیا تھا۔ اس زمانے کے سرکاری کاغذات میں جونپور کی گذشتہ عظمت کے بارے میں لکھا ہوا ہے۔

> جون پور جو مسلمانوں کے علوم و فنون کا مرکز اور علماء کا مرجع تھا، جس کو شیرازِ ہند کا خطاب حاصل تھا، جہاں بہت سے مدارس قائم تھے اور جس کی اب صرف گذشتہ عظمت کی داستان ہی باقی رہ گئی ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ شہر ہندوستان کا شیراز تھا، یا ازمنۂ وسطیٰ کا پیرس۔ جون پور کا ہر شہزادہ اس پر فخر کرتا ہے کہ وہ علم و حکمت کا مربی ہے۔ علماء اور حکماء اس شاہی دارالحکومت کی پُر امن سرزمین میں ہر طرح کی علمی ترقیوں کے لئے ہمہ تن کوشاں رہتے تھے۔ محمد شاہ کے زمانے تک ۲۰ مشہور مدرسے جون پور میں موجود تھے، جن کے اب صرف نام ہی نام باقی رہ گئے ہیں اُن میں سے ایک کا بانی پندرھویں صدی کے وسط میں، اور ایک کا بانی سترھویں صدی کے وسط میں گزرا ہے۔[2]

سلطان سکندر لودھی (۸۹۴ھ/۱۴۸۸ء - ۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء) نے اپنے عہدِ حکومت میں بکثرت سرائیں مدرسے اور مسجدیں بنوائیں، ہندوؤں نے فارسی کی تعلیم اسی کے عہدِ حکومت میں شروع کی۔[3] لکھنؤ میں شاہ پیر محمدؒ (وفات ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء) نے مدتوں بزمِ تعلیم گرم رکھی، اُن کی ذات سرچشمۂ فیوض و برکات تھی، انکے بعد اُن کے شاگردِ رشید ملا غلام محمد نقشبند (وفات ۱۱۲۶ھ/۱۷۱۴ء) نے اس مجلس کو اور زیادہ رونق دی، شاہ پیر محمدؒ کا مدرسہ اور خانقاہ لکھنؤ میں دریائے گومتی کے کنارے ٹیلہ پیر محمد کے نام سے مشہور ہے۔[4]

---

[1] جون پور نامہ ص ۴۹ و سیر المتاخرین جلد اول ص ۴۰۱۔ [2] مسلمانوں کی قدیم اسلامی درسگاہیں ص ۲۴ مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ [3] تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۱۸۷۔

[4] حیات شبلی ص ۱۵۔

شیخ پیر محمدؒ کی درس گاہ کی نسبت مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی کی تحقیق یہ ہے کہ تین سو سال قبل یہاں سات سو کے قریب طلبا کے رہنے کا انتظام تھا، یہاں بانیٔ درس نظامی ملا نظام الدین فرنگی محلی کے استاد حضرت شیخ غلام نقشبندؒ کا فیضِ درس جاری رہا۔ یہیں علامہ غلام یحییٰ بہاری (وفات ۱۱۸۰ھ) کی مسندِ درس بچھی تھی۔ ۱؎

ہمایوں (وفات ۹۶۳ھ/۱۵۵۵ء) اور اکبر (۹۶۳ھ/۱۵۵۵ء - ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء) کے عہد میں بھی مدارس کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ دہلی میں اکبر کی رضاعی ماں ماہم بیگم نے ۹۶۹ھ/۱۵۶۱ء میں ایک مدرسہ جاری کیا جس کا تاریخی نام خیر المنازل تھا، اس مدرسے کی شکستہ عمارت کے کھنڈر اب تک نئی دہلی میں پرانے قلعے کے نزدیک مغربی دروازے کے بالمقابل موجود ہیں۔

شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ (وفات ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء) نے اخبار الاخیار میں اپنی تحصیل علم کے سلسلے میں لکھا ہے کہ انھوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایک دوسرے مدرسے کا رخ کیا جس کا نام انھوں نے مدرسہ دہلی لکھا ہے۔ آگے چل کر خود شیخ محدث کی مسندِ درس بھی یہیں بچھی تھی۔ ۲؎

مولانا غلام علی آزاد بگرامی نے لکھا ہے:-

صوبہ اودھ اور صوبہ الہ آباد کا اکثر علاقہ پانچ پانچ، دس دس کوس کے فاصلے پر شرفا کی آبادی پر مشتمل ہے جو سلاطین و حکام کی طرف سے جاگیر رکھتے ہیں، اس علاقے میں مسجدوں مدرسوں اور خانقاہوں کی کثرت ہے، ہر جگہ مدرسین و معلمین طالبانِ علوم کے لئے اپنے دروازے کھلے رکھتے ہیں، اور انھیں حصولِ علم کی ترغیب دیتے ہیں، جس کے سبب سے طالبانِ علوم جماعت در جماعت ایک بستی سے دوسری بستی میں آتے جاتے رہتے ہیں، اور ہر جگہ سکون و اطمینان سے علم حاصل کرتے ہیں، ہر بستی کے مستطیع لوگ طالب علموں کا پورا

۱؎ ضمیمہ روزنامہ قومی آواز لکھنؤ ۱۸ مارچ ۱۹۸۳ء مقالہ بحر زخار اور اس کا مصنف ص ۲ ۲؎ اخبار الاخیار ص ۲۹۴۔

پورا خیال کرتے ہیں اور اُن کی خدمت کو سعادتِ عظمیٰ سمجھتے ہیں۔ اس لیے شاہجہاں بادشاہ کہا کرتے تھے، "پورب شیراز ماست" [۱]

شاہ جہاں (۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء - ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۷ء) کے عہد میں دہلی، لاہور، سیالکوٹ، احمد آباد اور جون پور علم و فن کے لحاظ سے ایسے مقامات تھے جہاں ہندوستان کے علاوہ ہرات اور بدخشاں تک سے طالبانِ علم کھنچ کھنچ کر چلے آتے تھے۔ سیالکوٹ میں ملا کمال کشمیری کی مسند درس قائم تھی۔ معقولات کے مشہور فاضل ملا عبدالحکیم سیالکوٹی انہی ملا کمال کے دامنِ فیض کے تربیت یافتہ تھے۔

شاہجہاں کے عہد میں مسجد فتح پوری اور مسجد اکبر آبادی تعمیر ہوئیں۔ مسجد فتح پوری کا مدرسہ اسی دور کے باقیات الصالحات میں سے ہے۔ مسجد اکبر آبادی حوادثِ روزگار کی نذر ہو چکی ہے۔ یہی وہ مسجد تھی جس میں حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی کا قیام رہا ہے۔ مولانا محمد اسمٰعیل شہید (۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) اور مولانا فضل حق خیرآبادی (وفات ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء) نے اسی مسجد میں تحصیلِ علم کی تھی۔

(۱۰۶۰ھ/۱۶۴۹ء) میں شاہ جہاں نے جامع مسجد کے قریب جنوبی سمت میں ایک عظیم الشان مدرسہ دارالبقا کے نام سے تعمیر کرایا تھا۔ یہ مدرسہ تیرھویں صدی کے اوائل میں ختم ہو گیا تھا۔ مفتی صدرالدین آزردہ (وفات ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء) نے اپنے زمانے میں اسے دوبارہ زندہ کیا، اور اس کے اخراجات بھی اپنے ہی ذمے رکھے، ہمارے بعض اکابر کا اس مدرسے سے تعلق رہا ہے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بھی اس مدرسے میں مقیم رہے ہیں [۲] سنہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ رستخیز میں مفتی صاحب کی جائیداد انگریزی حکومت نے ضبط کی تو مدرسہ دارالبقاء ہمیشہ کے لئے موت کی آغوش میں سو گیا۔

---

[۱] مآثر الکرام جلد اول ص ۲۲۱ و ۲۲۲۔

[۲] سوانح قاسمی ص ۲۹ اور واقعات دارالحکومت دہلی جلد دوم ص ۱۱۳

مغلوں کے دورِ حکومت میں اورنگ زیب عالمگیر (۱۰۶۸ھ/۱۶۵۷ء - ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۶ء) کے عہد کی تعلیمی ترقیاں عام شہرت رکھتی ہیں، اورنگ زیب نے بڑے بڑے شہروں کے علاوہ قصبات و دیہات میں بھی مدارس جاری کیے۔ علماء و مدرسین کو جاگیریں دیں، طلباء کے لیے وظائف مقرر کیے، اس کی کوششوں سے ہر صوبہ اور ہر شہر اور حتیٰ کہ قصبات و دیہات تک میں علم کی شمعیں روشن ہوگئیں۔

لکھنؤ میں فرنگی محل کا دارالعلوم مدرسہ نظامیہ اسی عہد کی یادگار ہے، اورنگ زیب نے ملا نظام الدینؒ[1] (وفات ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) کو ۱۱۰۵ھ/۱۶۹۳ء میں ایک عظیم الشان مکان عنایت کیا۔ یہ مکان فرنگی محل کے نام سے مشہور تھا، یہی وہ مدرسہ نظامیہ ہے جہاں کا ترتیب دیا ہوا نصابِ تعلیم تقریباً تین صدیوں سے ہندوستان کے مدارس عربیہ میں جاری ہے۔ گو اس نصاب میں بہت کچھ تبدیلیاں ہو چکی ہیں، مگر بایں ہمہ یہ نصاب درسِ نظامی ہی کے نام سے موسوم و معروف ہے۔ فرنگی محل کے اس دارالعلوم سے بڑے بڑے نامور علماء اُٹھے جنھوں نے ہندوستان میں علوم کی عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں۔ ملا نظام الدین کے بعد اُن کے اخلاف میں

---

[1] ملا نظام الدین سہالوی ۱۰۸۸ھ میں سہالی ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ علوم کی تکمیل حضرت شاہ پیر محمد کے تلمیذِ رشید شیخ غلام نقشبندؒ سے کی، پچاس سال کے قریب لکھنؤ میں گراں قدر علمی خدمات انجام دیں۔ لکھنؤ میں فرنگی محل کا مدرسہ اور مدارس عربیہ میں رائج "درسِ نظامی" انھیں کا جاری کیا ہوا ہے، ہندوستان کے موجودہ مدارس میں یہ سب سے زیادہ قدیم مدرسہ ہے، فرنگی محل سے بڑے بڑے نامور علماء اُٹھے جن میں ملا حسن (وفات ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۴ء) بحرالعلوم مولانا عبدالعلی (وفات ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) مولانا عبدالحلیم (وفات ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء) مولانا عبدالحی (وفات ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء) اور آخری دور میں مولانا عبدالباری وغیرہم آسمان علم و فضل کے درخشندہ ستارے تھے۔ ملا نظام الدین نے ۹ رجمادی الاول ۱۱۶۱ھ کو وفات پائی۔

(تذکرہ علمائے فرنگی محل)

بحر العلوم مولانا عبد العلی (وفات ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء) مولانا عبد الحلیم (وفات ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء) ملا حسن (وفات ۱۱۹۹ھ / ۱۷۸۴ء) اور آخر میں مولانا عبد الحئی (وفات ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۶ء) وغیرہم نہ صرف درس تدریس کی مسندوں کی زینت رہے بلکہ اپنی تصانیف اور خصوصاً درسی کتابوں کی شروح وحواشی کے ذریعے سے اُنھوں نے جو بیش بہا علمی خدمات انجام دیں اُن کی گونج سے مدارسِ عربیہ کا کوئی گوشہ خالی نہیں ہے۔ [۱]

اوپر گذر چکا ہے کہ اورنگ زیب کے عہد میں قصبات و دیہات تک میں مدارس جاری ہو گئے تھے۔ [۲] چنانچہ دیوبند میں بھی جو اُس زمانے میں چھوٹا سا قصبہ تھا، ایک مدرسہ قائم تھا۔ اس مدرسے کا ذکر عہد اورنگ زیب کے بعض فرامین میں ملتا ہے، لکھا ہے:۔

دریں ولا شیخ وجیہہ الدین پسر غفران پناہ معارف آگاہ شیخ محمد عارف ولد مغفرت پناہ بندگی شیخ محمد اسمٰعیل کہ بصلاح وتقویٰ آراستہ لیاقت تمام دارد و بجائے پدر خود در خانقاہ بتدریس و تذکیر باجماعت طالب علمان و فقراء و صوفیاء مشغول است۔ [۳]

شیخ وجیہہ الدین بن غفران پناہ معارف آگاہ شیخ محمد عارف بن مغفرت پناہ بندگی محمد اسمٰعیل جو صلاح وتقویٰ سے آراستہ اور صاحبِ فضل وکمال ہیں وہ اپنی خانقاہ میں اپنے والد کی جگہ پر طلباء وصوفیاء کی تعلیم و تذکیر میں مشغول ہیں۔

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے تذکرہ علمائے فرنگی محل مؤلفہ مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی [۲] ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی تاریخیں تو بہت لکھی گئی ہیں مگر افسوس ہے کہ انکی علمی تاریخ پر بہت کم توجہ دی گئی ہے، اسلئے ہندوستان میں مسلمانوں کے علمی کارناموں کا بہت کم پتہ چلتا ہے۔ اس سلسلے میں گراں قدر معلومات کا سرمایہ مُسلم فرمانرواؤں اور عمائدین سلطنت کے وہ فرامین اور تحریریں ہیں جو بہت سے خاندانوں میں اب تک موجود ہیں۔ ان فرامین سے جہاں اور بہت سی مفید معلومات بہم پہنچتی ہیں وہیں مُسلم حکمرانوں کی ان کوششوں کا بھی انکشاف ہوتا ہے جو اُنھوں نے علم کی ترقی اور اشاعت کے لئے کی ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ جن خاندانوں میں ایسے فرامینِ شاہی یا عمائدینِ سلطنت کی تحریریں موجود ہوں اُنکے فوٹو یا کم از کم انکی نقلیں شائع کرانے کی اہمیت کو محسوس کرنا چاہئے تاکہ ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی قابلِ قدر علمی سرگرمیوں کا پتہ چل سکے۔ [۳] تاریخ دیوبند ص ۱۰۹ مطبوعہ ۱۳۹۲ھ / ۱۹۷۲ء۔

دہلی میں غازی الدین خاں فیروز جنگ اوّل (وفات ۱۱۲۲ھ/۱۷۱۰ء) نے جو نظام الملک آصف جاہ اوّل کے جدِ امجد تھے ایک مدرسہ اجمیری دروازے کے قریب قائم کیا تھا۔ یہی مدرسہ بعد میں دہلی کالج کے نام سے مشہور ہوا۔ مولانا رشید الدین خاں دہلوی (وفات ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۴ء) اور مولانا مملوک علی نانوتوی (وفات ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء) اسی کالج کے صدر المدرسین رہے ہیں۔[۱] اس مدرسہ میں ہمارے بہت سے اکابر نے تحصیلِ علم کی ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی (وفات ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی (وفات ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی (وفات ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء) حضرت مولانا محمد احسن نانوتوی (وفات ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۵ء) حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندی (وفات ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء) حضرت مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی (وفات ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء) اور دوسرے بہت سے علماء اس مدرسے کے دامنِ فیض سے وابستہ رہے ہیں۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے یہ مدرسہ دہلی کا ایک مشہور دارالعلوم تھا۔ غازی الدین خاں فیروز جنگ کا یہ مدرسہ اُس دور کے مدارس کی ایک زندہ یادگار ہے۔ اسکی عظیم الشان اور وسیع عمارت سے ہمارے امراء کے علمی ذوق اور عالی ہمتی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مدرسہ کے ساتھ مسجد بھی تعمیر کی گئی تھی۔ غازی الدین فیروز جنگ اوّل اسی مدرسہ کے صحن میں آسودۂ خواب ہیں۔

رام پور میں مدرسہ عالیہ قائم تھا جو اب تک موجود ہے۔ والیٔ رام پور نواب فیض اللہ خاں نے بحر العلوم مولانا عبد العلی فرنگی محل (وفات ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) کو بلا کر مدرس مقرر کیا تھا۔ فرنگی محل ہی کے ایک دوسرے عالم ملا حسن بھی اس مدرسے میں مدرس رہے۔ ان لوگوں کے فیضِ تعلیم سے رام پور میں مدتوں تک علم کی گرم بازاری رہی۔[۲]

---

[۱] مدرسہ غازی الدین ہمیشہ انقلاب کی آماجگاہ رہا ہے۔ اس مدرسہ کا دوسرا دور ۱۷۹۲ء/۱۲۰۷ھ میں شروع ہوا اور ۱۸۲۵ء/۱۲۴۱ھ میں یہ مدرسہ دہلی کالج میں تبدیل ہو گیا۔

[۲] ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں ص ۳۳۔

عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان میں ہمارے قدیم فارسی مؤرخین کی توجہ زیادہ تر بادشاہوں کی جنگوں اور سیاسی کارناموں پر مرکوز رہی ہے، علمی اور ثقافتی کارناموں کا ذکر کہیں کہیں ضمناً آجاتا ہے، اس زمانے کے تاریخی مذاق کا دلچسپ موضوع بادشاہوں اور امرائے سلطنت کے جنگی اور سیاسی کارنامے ہوتے تھے، اس لئے ہندوستان میں مسلمانوں کے علمی کارناموں کا ذکر بہت کم ملتا ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے، جیساکہ "ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں" کے مصنف نے اس سوال کے جواب میں کہ "قدیم فارسی تاریخوں میں ہندوستان کے گذشتہ مدارس کے متعلق کیوں تصریحی ابواب نہیں ملتے؟ لکھا ہے کہ:-

"مسلمان اپنے مذہبی مذاق کی بنا پر ہمیشہ تعلیم و تعلّم اور درس و تدریس کو مذہبی مشغلہ اور کارِ خیر خیال کرتے رہے، وہ طلبا کی امداد، تعلیم کی اشاعت، کتب و سامانِ درس و تعلیم کے لئے وقف، مدارس کی بنا و تاسیس اور علما کی خدمت و اعانت وغیرہ کو ایک مذہبی حکم، برکت اور فلاحِ دارین کا باعث سمجھتے رہے۔ اس بنا پر یہ چیزیں بھی اور ضروریاتِ زندگی کی طرح اُن کی زندگی کا لازمی اور ضروری جزو ہو گئی تھیں، اور چونکہ ایک شخص کے روزمرّہ اعمالِ زندگی اس کی تاریخِ حیات میں اہمیت کے ساتھ قابلِ ذکر نہیں سمجھے جاتے بلکہ عام الفاظ میں دوسری ضروریاتِ زندگی کے ساتھ سرسری طور پر مذکور ہوتے ہیں، اس لئے قدیم ایّام میں مسلمانوں نے تعلیمی سلسلے میں جو کچھ کارہائے نمایاں کئے ہیں ان کو قدیم مؤرخین مخصوص ابواب و فصول میں نہیں بیان کرتے۔"

پھر آگے چل کر ایک اور وجہ یہ بیان کی ہے کہ:-

"قدیم زمانے میں تعلیم کے لئے علمی عمارتیں نہیں ہوتی تھیں، زیادہ تر یہ کام مساجد سے لیا جاتا تھا۔ اُس زمانے کی تمام مسجدیں، مدارس کا کام دیتی تھیں، اس لئے ہر قدیم وسیع مسجد ایک بڑی درسگاہ بھی تھی، یہی سبب ہے کہ ہندوستان کے قدیم اسلامی شہروں میں قدم قدم پر تم کو وسیع شاندار مسجدیں ملیں گی، دلّی، آگرہ، لاہور، جونپور، احمد آباد، گجرات وغیرہ، تمام قدیم اسلامی دارالسلطنتوں میں جو عظیم الشان مسجدیں تعمیر ہوئی تھیں اور جو اَب تک باقی ہیں،

ان کی ہیئت کذائی صاف بتاتی ہے کہ ان کا بڑا حصّہ تعلیم گاہوں کے کام میں آتا تھا۔ ان مسجدوں میں اب تک تم کو صحن کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے حجروں کا وسیع سلسلہ نظر آئے گا۔ یہ درحقیقت طلبار اور مدرسین کے رہنے کے مقامات تھے۔ ان میں سے بعض اب تک اس کام میں آتے ہیں مثلاً دہلی کی مسجد فتحپوری واکبر آبادی جو ۱۰۶۰ھ / ۱۶۵۰ء میں تیار ہوئیں۔ ان کے وسیع صحن کے گرداگرد جو کمرے بنوائے گئے وہ مخصوص طور پر طلبار کی اقامت گاہ تھے۔ قدیم خانقاہیں بھی عموماً تعلیم گاہوں کے مصرف میں آتی تھیں، متصوفین اور گوشہ نشین مشائخ زمانہ اس وقت صرف مجاہدۂ نفس ووظائف ہی کو عبادت نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ شریعت وطریقت اور ظاہر و باطن دونوں کی تعلیم وتدریس کو اپنا حقیقی نصب العین خیال کرتے تھے، ہر خانقاہ میں تشنہ لبانِ تصوف وعلوم باطن کی طرح طالبین علوم ظاہر کی جماعتِ کثیر بھی پائی جاتی تھی، خانقاہوں کے لئے حکومت کی طرف سے جو عطیّے یا شخصی اوقاف ہوتے تھے اُن کا بڑا حصّہ طلبار پر صرف ہوتا تھا۔ اس بنار پر قدیم خانقاہوں کو بھی مدارس و مکاتب کے سلسلے میں شمار کرنا چاہیئے۔

سلاطین اور بزرگانِ کرام کی قبروں پر جو مقبرے تعیر ہوتے تھے، ان کے ساتھ اردگرد بہت سے حجرے اور کمرے اس غرض سے بنائے جاتے تھے کہ وہ مدرسوں کے کام آئیں، چنانچہ مقبرہ علاؤالدین خلجی اور مقبرہ ہمایوں وغیرہ اس وقت بھی دہلی، آگرہ، احمد آباد اور بیجاپور وغیرہ میں قائم ہیں ان کی ہیئت خود ان کی تاریخ کو بتا رہی ہے۔[۱]

حکومتوں کی سرپرستی کے علاوہ خود مسلمانوں کا ذوقِ علم جو انھیں آبا و اجداد سے وراثت میں ملا تھا حکومتوں کے خزانے کا بہت کم مرہونِ احسان رہا ہے۔ ہماری قدیم تعلیم گاہیں اپنے لئے مستقل عمارتوں کی محتاج نہ تھیں، مسجدوں، خانقاہوں اور علمار و امرار کے مکانات سے لیکر میدانوں تک تعلیم وتعلّم کی بزم آراستہ رہتی تھی، عام طور پر نامور علمار، اپنے گھروں اور مسجدوں

---

[۱] ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں ص ۱۰ - ۱۲

میں تعلیم دیتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: "طلب العلم فریضۃٌ علیٰ کُلِّ مُسلِمٍ ومسلمۃٍ" (علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے) کی تاکید نے حصولِ علم کا عام مذاق پیدا کر دیا تھا۔ علم کی اشاعت، تعلیم و تعلّم، طلباء کی امداد و اعانت، کتابیں اور دوسری ضروریات درس و تدریس کی فراہمی، مدارس کی تاسیس اور ان کے مصارف کے لئے جائیدادوں کا وقف کرنا، علماء اور طلباء کی مالی امداد و اعانت موجب خیر و برکت اور فلاحِ دارین کا باعث سمجھا جاتا تھا، علم کی اشاعت اور اس کی ترقی کے لئے وسائل مہیا کرنا دوسری ضروریات کی طرح اُن کی زندگی کا لازمی اور ضروری جزو بن گیا تھا، درس و تعلیم ہمارے علماء کی زندگی کا لازمی جُز رہی ہے، وہ خواہ وزارت کی کرسی پر ہوں یا قضا و افتاء کی مسند پر یا کسی دوسرے سرکاری منصب پر، یہ مشاغل انھیں اپنے فرض سے غافل نہیں رکھتے تھے۔

اُس دور میں چونکہ یہ کام مساجد سے بسہولت لیا جاتا تھا، اس لئے قدیم مساجد میں اکثر و بیشتر ایسی عمارتیں ضرور بنائی جاتی تھیں جو درس و تدریس اور طلباء کے قیام کے کام میں آسکیں، اس بارے میں مسجدِ نبوی کا نمونہ مُسلمانوں کے سامنے تھا، مصر میں جامع ازہر اور مراکش میں جامع قزوین اور جامع زیتونیہ اسی طرز کی مسجدیں ہیں، اور اب تک اُن سے تعلیم گاہوں کا کام لیا جارہا ہے جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے خود ہندوستان کے شہروں اور قصبات میں بکثرت ایسی مسجدیں اب تک موجود ہیں جنکے صحن کے تین طرف چھوٹے بڑے حجروں اور دالانوں کا وسیع سلسلہ نظر آتا ہے، دہلی میں مسجد فتحپوری اسی طرز کی قدیم یادگار ہے، اس کے حجرے اور دالان اب تک درس و تدریس اور طلباء کی اقامت گاہ کے طور پر کام آتے ہیں، لاہور کی مسجد وزیر خاں اور جون پور کی اٹالہ مسجد ہزاروں لاکھوں میں چند مثالیں ہیں، یہ مسجدیں اپنے وقت کی عظیم درسگاہیں بھی تھیں[1] خود دارالعلوم بھی

---

[1] یورپ میں بھی عموماً بڑے بڑے تعلیمی مرکزوں کا آغاز دینی و روحانی مرکزوں کلیساؤں اور خانقاہوں سے ہوا ہے، کیمبرج اور آکسفورڈ وغیرہ کا سرچشمہ کلیسا اور خانقاہ ہی ہیں۔

اولاً مسجد ہی میں قائم کیا گیا تھا، اور اس کی عمر کے ابتدائی دس سال مسجد ہی میں گذرے ہیں۔

اس زمانے میں طلباء کے قیام وطعام کا جو عوامی طریقہ رائج تھا، اُس کی نسبت مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے مآثر الکرام میں لکھا ہے۔

صاحب توفیقان ہر معمورہ طلبار علم را نگاہ می دارند وخدمت ایں جماعت را سعادتِ عظمٰی می دانند[1] ۔۔۔	صاحبِ استطاعت ہر آبادی میں طالبانِ علم پر متوجہ رہتے تھے، وہ طلبار کی امداد واعانت اپنے لئے بڑی سعادت سمجھتے تھے۔

ہندوستان میں بارھویں صدی ہجری کا زمانہ وہ پُرآشوب دَور ہے جس میں اسلامی سطوت وعظمت کے ساتھ مُسلمانوں کی علمی سرگرمیاں بھی سرد پڑنے لگی تھیں، اس زمانے میں دہلی کے تخت پر محمد شاہ (۱۱۳۱ھ/۱۷۱۸ء - ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) متمکّن تھا جو اپنے لااُبالی پَن اور کثرتِ مے نوشی کے سبب سے صرف "رنگیلا بادشاہ" مشہور ہو کر رہ گیا ہے، مگر بایں ہمہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا مدرسہ جس کے علمی فیضان سے آج برِّصغیر کا کوئی گوشہ خالی نہیں ہے، اسی رنگیلے بادشاہ کی علمی فیاضی کا مرہونِ احسان ہے۔ واقعات دارالحکومت دہلی کے مصنف کا بیان ہے کہ یہ مدرسہ کسی زمانے میں نہایت عالی شان اور خوبصورت تھا اور بڑا دارالعلوم سمجھا جاتا تھا۔[2]

شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبدالرحیم (وفات ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۸ء) کے زمانے میں یہ مدرسہ پہلے اُس جگہ تھا جہاں اب اُن حضرات کے مزارات ہیں یہ جگہ "مہندیوں" کے نام سے موسوم ہے، جب شاہ ولی اللہ کے زمانے میں طلبار کی کثرت کے باعث یہ جگہ تنگ ہو گئی تو محمد شاہ نے اس کیلئے ایک بڑی حویلی عنایت کی، یہ جگہ کوچہ چیلان میں تھی، واقعات دارالحکومت دہلی کے مصنف نے لکھا ہے کہ "غدر کے ہنگامہ میں مدرسہ برباد ہو گیا، اب متفرق لوگوں کے مکانات اس جگہ بن گئے

---

[1] مآثر الکرام ص ۲۲۲ مطبوعہ مفید عام آگرہ ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء۔

[2] واقعات دارالحکومت دہلی جلد ۲ ص ۱۸۳۔

ہیں مگر محلہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے مدرسہ کے نام سے آج تک پکارا جاتا ہے۔"

بارھویں صدی ہجری کے رُبع اول کے آخر میں شاہ عالم بہادر شاہ اول (۱۱۱۸ھ/۱۷۰۷ء - ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء) کے انتقال کے بعد جہاں مغلوں کی سلطنت کو زوال شروع ہوا، وہیں اسی زمانے سے ہندوستان میں علم کے سوتے بھی خشک ہونے لگے، خصوصاً دینی علوم اُس وقت بڑی نازک صورت اختیار کر چکے تھے، اس کا کچھ اندازہ اس زمانے کے نصابِ تعلیم سے کیا جا سکتا ہے جس کا ذکر آگے آئے گا، چنانچہ ہمارے مدارس میں تفسیر و حدیث اور فقہ کے بجائے علومِ عقلیہ معیارِ فضیلت سمجھے جاتے تھے، صدرا، شمس بازغہ اور شرح مطالع کی شروح اور حواشی ہماری تعلیم گاہوں کا معیارِ علم بن گئے تھے، گویا اس زمانے میں مُسلمانوں کا نصابِ تعلیم ان علوم کے سوا کچھ تھا ہی نہیں۔ علوم دینیہ کا اگر تھوڑا بہت چرچا تھا بھی تو فقہ کی چند کتابوں تک محدود تھا۔ تفسیر و حدیث کا رواج بہت کم ہو گیا تھا، مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ نے ملفوظاتِ عزیزی کے حوالے سے لکھا ہے کہ "میر زاہد جن کو عربی مدارس میں اپنے زوائد ثلاثہ کی بدولت خاص شہرت حاصل ہے اور منطق و فلسفہ میں شاہ عبدالرحیم دہلویؒ کے استاد تھے عالمگیر کی فوج میں ایک بڑی مذہبی خدمت یعنی فریضۂ احتساب پر مامور تھے جس کا براہِ راست فقہ اور فقہی مسائل کی تفصیلات سے تعلق ہے اور جو شخص فقہ اور اُس کی جزئیات سے پورے طور پر واقف نہ ہو صحیح طور پر اُس سے اس اسلامی فریضہ کا انجام پانا مشکل ہے، میر زاہد کو فقہ میں اپنے اوپر اعتماد نہ تھا، شاہ عبدالعزیزؒ راوی ہیں کہ:-

امیرے شرح وقایہ می خواند، بے حضور جدِ بزرگوار سبق نمی فرمود[1]

ایک امیر، میر زاہد سے شرح وقایہ پڑھتا تھا مگر جب تک جدِ بزرگوار شاہ عبدالرحیمؒ نہ آجاتے میر زاہد سبق نہ پڑھاتے تھے۔

غرض کہ اس دور میں مدارسِ عربیہ پر منطق و فلسفہ کا سکہ بیٹھا ہوا تھا، طلبار کا تمام وقت انہی

---

[1] ملفوظاتِ عزیزی ص ۸۲ بحوالہ "الفرقان" شاہ ولی اللہ نمبر ۱۷، و کمالاتِ عزیزی ص ۱۴، ۱۱ مطبوعہ مطبع ہاشمی میرٹھ ۱۸۹۶ء۔

علوم کی تحصیل میں صرف ہو جاتا تھا۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمی خدمات

یہ حالات تھے اور دینی علوم سے اس قدر بُعد پیدا ہو گیا تھا جب دہلی کی تاریخی سرزمین سے علوم نبوی کا ایک طلب گار اٹھا، یہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی تھے جو بارہ سال سے اپنے والد حضرت شاہ عبدالرحیم کے قائم کئے ہوئے مدرسۂ رحیمیہ میں درس و تدریس میں مشغول تھے، دفعۃً ۱۱۴۳ھ میں وہ حجاز روانہ ہو گئے اور دو سال کے قریب وہاں مقیم رہ کر شیخ ابو طاہر مدنی سے مدینہ منورہ میں علم حدیث کی تحصیل کی، شاہ صاحب کی غیر معمولی ذہانت اور جودتِ طبع کی نسبت اُن کے اُستاد شیخ ابو طاہر مدنی (وفات ۱۱۴۵ھ) کا یہ قول بڑی اہمیت رکھتا ہے:۔

قال فیہ انہ کان یُسند عنی اللفظ و کنت اصحح منہ المعنیٰ [1]	ولی اللہ الفاظِ حدیث کی سند مجھ سے حاصل کرتے ہیں، اور میں اُن سے حدیث کے معنی کی تصحیح کرتا ہوں۔

۱۱۴۵ھ میں حضرت شاہ صاحب حجاز سے واپس آئے اور مدینہ منورہ سے علم حدیث کی ایک نہر کاٹ کر ہندوستان کی سرزمین پر نئے سرے سے جاری کر دی، شاہ صاحب کی جاری کی ہوئی نہر وہی ہے جسے حضرت شاہ عبدالغنی دہلوی کے ہندوستان سے ہجرت کرنے کے بعد دیوبند نے خشک ہونے سے نہ صرف بچایا بلکہ پوری روانی اور جوش و خروش کے ساتھ یہاں سے جاری کر دیا، گذشتہ ایک سو سال میں اس کا دینی فیضان صرف برصغیر ہی تک محدود نہیں رہا ہے، بلکہ علم الحدیث کے جلیل القدر امام بخاری کے ہم وطن بھی اس نہر سے سیراب ہوتے رہے ہیں، دوسری طرف اس نہر سے سیراب ہونے والے حضرت مولانا خلیل احمد انبہٹوی اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نے مدینۂ منورہ میں مسندِ درس پر بیٹھ کر اس نہر کو اُس کے

---

[1] ملفوظاتِ عزیزی ص ۸۴ بحوالہ "الفرقان" شاہ ولی اللہ نمبر ۱، و کمالاتِ عزیزی ص ۱۱۴ مطبوعہ مطبع ہاشمی میرٹھ ۱۸۹۶ء۔

اصل سرچشمے سے ملادیا ہے، غرض کہ ہندوستان میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کی جاری کی ہوئی نہر اب ایک بحرِ زخار کی شکل اختیار کر چکی ہے اور پچھلی ایک صدی میں اس کی شاخیں پورے برِاعظم ایشیا میں پھیل کر ہر طرف علوم نبویہ کے تشنہ کاموں کو سیراب کر رہی ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں علوم دینیہ کے تعلیمی سلسلے میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کو ایک عظیم مرکزی مقام اور بے نظیر عظمت حاصل ہے، وہ اپنے دَور میں علوم دینیہ کے دیدہ وَر عالم عظیم مفکر اور مخلص داعی تھے، انھوں نے اسلامی علوم کے حقائق و معارف کو ایک مستقل فن کی حیثیت دے کر ہندوستان میں اسلام کی حفاظت اور مدافعت کا زبردست سامان مہیا کر دیا، شاہ صاحبؒ نے ہندوستان کے علمی اور سیاسی میدانوں میں جو عظیم الشان جدوجہد کی وہ ہماری تاریخ کا ایک زرین اور روشن باب ہے۔

سلطنتِ مغلیہ کے دورِ زوال میں مختلف قوتوں کی کش مکش اور پیہم یورشوں نے ملکی نظم و نسق کو برباد کر دیا تھا، شاہ صاحبؒ نے اس سلسلے میں جو زبردست کارنامہ انجام دیا، اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، یہاں شاہ صاحبؒ کی صرف اُن مساعی کا ذکر کرنا مقصود ہے جو اُنھوں نے دینی علوم کے بقا اور تحفظ کے لئے سرانجام دی ہیں، مغلوں کے سیاسی زوال نے مُسلمانوں میں روحانی اور اخلاقی زبوں حالی کے ساتھ علمی ذہنی اور فکری پستی بھی پیدا کر دی تھی، شاہ صاحبؒ نے دانش مندانہ دیدہ وَری اور ژرف نگاہی کے ساتھ حالات کا حکیمانہ جائزہ لے کر مُسلمانوں کو متنبہ کیا، اُن کی مساعیٔ جمیلہ نے فیض کے دریا بہا دئے، اور ایک مخلوق کو علم حدیث سے سیراب کیا، آج برِصغیر میں دینی علوم کا چرچا، دینی بیداری اور شرک و بدعت سے جتنا کچھ اجتناب نظر آتا ہے یہ سب حضرت شاہ صاحبؒ ہی کے مجددانہ کارناموں کا اثر مابعد ہے! اُن کی کوششوں میں اللہ تعالیٰ نے برکتِ عظیم عطا فرمائی، چنانچہ اُن کے خاندان اور ان کے تلامذہ کی ولولہ انگیز سعی سے یہ برِصغیر ایک ایسا دارالحدیث بن گیا جس کی مثال اُس عہد کے دوسرے اسلامی ملکوں میں مشکل سے ملے گی،

شاہ صاحبؒ نے اپنے حالات و سوانح میں ایک مختصر رسالہ بنام الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف

لکھا ہے، اُس سے اُن کے مجددانہ کارناموں کا کسی قدر اندازہ کیا جا سکتا ہے، لکھا ہے کہ:۔

۴ شوال ۱۱۱۵ھ بروز چہار شنبہ، طلوعِ آفتاب کے وقت یہ فقیر پیدا ہوا، تاریخی نام عظیم الدین[1] رکھا گیا۔ ولادت سے پہلے والدین اور صلحاء نے میرے بارے میں بہت سے بشارتی خواب دیکھے جن کو بعض دوستوں نے رسالہ القول الجلی میں جمع کر دیا ہے، عمر کے پانچویں سال مکتب میں بٹھا دیا گیا۔ ساتویں سال والد ماجد نے نماز روزہ شروع کرا دیا، اسی سال میں رسم ختنہ عمل میں آئی، اور اسی ساتویں سال قرآن شریف ختم ہو کر فارسی تعلیم شروع ہوئی، یہاں تک کہ دسویں سال شرح ملا جامی پڑھ لی، اور مطالعۂ کتب کی استعداد پیدا ہو گئی، چودھویں برس میں شادی ہو گئی پندرھویں سال کی عمر میں والد ماجد کے ہاتھ پر بیعت کی، اور مشائخ صوفیاء بالخصوص حضراتِ نقشبند کے اشغال میں لگ گیا اسی سال بیضاوی کا ایک حصہ پڑھ کر گویا ان دیار کے مروجہ نصابِ تعلیم سے فراغت حاصل کی۔ والد ماجد نے اس تقریب میں بڑے پیمانے پر تمام خواص و عوام کی دعوت کی، اور مجھے درس کی اجازت دی، جن علوم و فنون کا درس اس ملک میں مروج ہے اُن میں حسب ذیل کتابیں میں نے سبقاً سبقاً پڑھیں، حدیث میں مشکوٰۃ شریف (سوائے کتاب البیوع سے کتاب الآداب تک تھوڑے سے حصے کے) بخاری کتاب الطہارۃ تک، شمائل ترمذی کامل، تفسیر بیضاوی اور تفسیر مدارک کا ایک حصہ حق تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک بہت بڑی نعمت مجھ پر یہ ہوئی کہ کابل غور و فکر اور مختلف تفاسیر کے مطالعے کے ساتھ والد ماجد کے درس قرآن میں مجھے حاضری کی توفیق ملی اور اس طرح کئی بار میں نے حضرت سے متنِ قرآن پڑھا اور یہی میرے حق میں فتح عظیم کا باعث ہوا، والحمد للہ علیٰ ذالک۔

علم فقہ میں شرح وقایہ اور ہدایہ پڑھیں، اصول فقہ میں حسامی اور توضیح تلویح کا کافی حصہ اور منطق میں شرح شمسیہ پوری اور شرح مطالع کا کچھ حصہ، کلام میں شرح عقائد مع حاشیہ خیالی اور

---

[1] عظیم الدین کے اعداد ۱۱۱۵ ہوتے ہیں۔

شرح مواقف کا ایک حصہ۔ سلوک و تصوف میں عوارف اور رسائل نقشبندیہ وغیرہ، علم الحقائق میں شرح رُباعیات مولانا جامیؒ. لوائح. مقدمہ شرح لمعات اور مقدمہ نقد النصوص. فن خواص اسماء و آیات میں والد ماجد کا خاص مجموعہ طب میں موجز اور فلسفہ میں شرح ہدایۃ الحکمۃ وغیرہ اور نحو میں کافیہ اور شرح جامی. علم معانی میں مطول اور مختصر المعانی کا وہ حصہ جس پر ملّا زادہ کا حاشیہ ہے، ہیئت و حساب میں بھی بعض مختصر رسالے پڑھے، الحمد للہ کہ اس تحصیل کے زمانے میں ہر فن سے خاص مناسبت پیدا ہو گئی اور اس کے خاص مسائل اور اہم مباحث میرے ذہن کی گرفت میں آگئے۔

میری عمر کے سترھویں سال والد ماجد واصل بحق ہو گئے، مرض وفات میں مجھے بیعت و ارشاد کی اجازت مرحمت فرمائی، حضرت کی وفات کے بعد بارہ سال تک کتبِ دینیہ اور معقولات کے درس میں اشتغال رہا اور ہر علم و فن میں غور کرنے کا موقع ملا۔

۱۱۴۳ھ (۱۷۳۰ء) میں فقیر حج سے مشرف ہوا، اور ۱۱۴۴ھ (۱۷۳۱ء) مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی مجاورت اور شیخ ابو طاہر قدس سرہٗ و دیگر مشائخ حرمین شریفین سے اخذ روایتِ حدیث کی سعادت حاصل ہوئی، مدینہ منورہ کے دورانِ قیام میں روضۂ اقدس میری توجہ کا خاص مرکز رہا، الحمد للہ کہ مجھ فقیر پر اس قدسی دربار سے فیوض و برکات کی بے پایاں بارش ہوئی، نیز اس مبارک سفر میں حرمین شریفین اور عالمِ اسلامی کے بہت سے علماء کے ساتھ خوب صحبتوں کا موقع ملا، شیخ ابو طاہر مدنی قدس سرہٗ کی طرف سے تمام طرقِ صوفیاء کا جامع خرقہ عنایت ہوا، ۱۱۴۴ھ (۱۷۳۱ء) کے آخر میں حج سے پھر مشرف ہو کر اوائل ۱۱۴۵ھ (۱۷۳۲ء) میں وطن کی جانب واپسی ہوئی، اور ۱۴ رجب ۱۱۴۵ھ کو ٹھیک جمعہ کے دن وطن مالوف پہنچ گیا۔

حق تعالےٰ کا عظیم ترین انعام اس بندہ پر یہ ہے کہ اس کو خلعتِ فاتحیۃ بخشا گیا ہے۔ اور اس آخری دَور کا افتتاح اس سے کرایا گیا ہے، اس سلسلے میں جو کام مجھ سے لئے گئے ہیں وہ یہ ہیں کہ فقہ میں جو "مرضی" ہے اس کو جمع کیا گیا اور فقہ و حدیث کی از سر نو بنیاد رکھ کر اس

فن کی پوری عمارت تیار کی گئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام احکام و ترغیبات اور تعلیمات کے اسرار و مصالح کو اس طرح منضبط کیا گیا کہ اس فقیر سے پہلے کسی نے یہ کام اس طور پر نہیں کیا تھا۔

ایک کام مجھ سے یہ لیا گیا کہ فقہ میں اہل سنت کے عقائد کو میں نے دلائل و براہین سے ثابت کیا اور "معقولیوں" کے شکوک و شبہات کے خس و خاشاک سے اُن کو قطعی پاک کر دیا اور اُن کی تقریر بحمداللہ ایسی کی ہے جس کے بعد کسی بحث کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

حکمتِ عملی بھی مجھے بھرپور دی گئی ہے اور کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ سے اس کی تطبیق و تفصیل کی توفیق بھی نصیب ہوئی۔ ان سب کے سوا مجھے وہ ملکہ عطا فرمایا گیا ہے جسکے ذریعے سے میں یہ تمیز کر سکتا ہوں کہ دین کی اصل تعلیم جو فی الحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہے وہ کیا ہے اور کون کون باتیں جو بعد میں اس میں اضافہ ہوئی ہیں کس بدعت پسند فرقے کی تحریف کا نتیجہ ہیں[1]۔

شاہ صاحبؒ نے مندرجہ بالا سطور میں جن خاص کاموں کی طرف اشارہ فرمایا ہے اُس کی تفصیل و حقیقت جاننے کے لئے اُن کی تصانیف سے مراجعت کی ضرورت ہے۔

ان کمالات و خصائص سے آراستہ ہو کر شاہ صاحبؒ نے جب تجدید کے میدان میں قدم رکھا تو کوئی شبہ نہیں کہ انھوں نے نہایت عظیم الشان کارنامہ انجام دیا۔ شاہ صاحبؒ نے جس فضا میں آنکھ کھولی تھی وہ اخلاقی اور روحانی پستی کے لحاظ سے نہایت افسوسناک دور تھا، بدعات اور مشرکانہ اعمال و رسوم گھر گھر رواج پذیر تھے، امراء اور اہل ثروت عیش و عشرت میں ڈوب کر دین سے غافل ہو چکے تھے، شاہ صاحبؒ نے گرد و پیش کے تمام احوال کا جائزہ لے کر اپنا عملِ تجدید جاری کیا، علم حدیث کی ترویج و اشاعت پر کمر ہمت باندھی، اور بے مثال علمی اور فکری کردار ادا کیا، انھوں نے مدرسہ رحیمیہ میں قرآن و حدیث کا درس

---

[1] رسالہ الجز اللطیف مشمولہ سطعات ص ۲۶ - ۲۸ مطبوعہ مطبع احمدی

جاری کیا، اس سلسلے میں آپ نے قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ کیا تاکہ اس کا افادہ عام ہو سکے اسی کے ساتھ انھوں نے حجۃ اللہ البالغہ اور تقلید و اجتہاد پر گراں قدر کتابیں لکھ کر اس بات کی سعی کی کہ اسلامی طریقے پر سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ انھوں نے اپنے بعد ایسے جانشین چھوڑے جنھوں نے علوم و فنون کی حفاظت اور ان کی نشر و اشاعت میں جانشینی کا حق ادا کر دیا، نواب صدیق حسن خاں نے اس خاندان کی نسبت لکھا ہے۔

> ہر یکے از ایشان بے نظیر وقت و فریدِ دہر و وحید عصر در علم و عمل و عقل و فہم و قوتِ تقریر و فصاحتِ تحریر و تقویٰ و دیانت و امانت و مراتب ولایت و ہمچنیں اولادِ اولادِ ایں خانہ تمام آفتاب است۔ ایں سلسلہ از طلائے ناب ست [1]

---

[1] اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء والمحدثین ص ۴۳۰ مطبوعہ نظامی کانپور ۱۲۸۸ھ۔

دار العلوم کے اکابرِ علم کا سلسلۂ اسناد

اکابرِ دار العلوم کے سلسلے میں سرِ فہرست جو شخصیت آتی ہے وہ یہی شاہ ولی اللہ دہلویؒ ہیں، برِ صغیر میں اس وقت علوم دینیہ اور بالخصوص علم حدیث کے جس قدر سلسلے مروج اور موجود ہیں تقریباً ان سب کا آغاز حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے ہوتا ہے، پشاور سے راس کماری تک دینی علوم کا جو کچھ ذوق موجود ہے وہ سب اس گھرانے کا فیض ہے۔ ایک غیر ہندوستانی عالم کا بیان ہے کہ اُسے سارے ہندوستان کی سیاحت میں علم حدیث کا کوئی بھی ایسا عالم نہ ملا جو حضرت شاہ عبد العزیزؒ کے واسطے سے حضرت شاہ ولی اللہؒ کا شاگرد نہ ہو۔ لہ

شاہ صاحبؒ کا خاندان اپنے علم و فضل اور ورع و تقویٰ کے لحاظ سے دہلی میں بہت ممتاز سمجھا جاتا تھا، شاہ صاحبؒ کے والد شاہ عبد الرحیم صاحبؒ فتاویٰ عالمگیری کے مصنفین میں سے تھے، جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے انھوں نے اپنے والد ماجد سے تحصیل علم کی، اور پندرہ سال کی عمر میں علوم متداولہ سے فراغت حاصل کی، شاہ صاحبؒ کا سلسلۂ سند اپنے والد ماجد کے واسطے سے

لہ شاہ ولی اللہؒ کی سیاسی تحریک از مولانا سندھی ص ۸۲۔

علامہ جلال الدین محقق دوانی (وفات ۹۲۸ھ ۱۵۲۱ء) تک پہنچتا ہے۔ اس زمانے میں ہندوستان کے نصابِ تعلیم میں معقولات کا عنصر غالب تھا۔ اس لئے علمِ حدیث کی تکمیل اور سند روایت حاصل کرنے کی غرض سے شاہ صاحبؒ نے حرمین شریفین کا سفر اختیار فرمایا، اور وہاں شیخ ابو طاہر مدنیؒ اور دوسرے نامور مشائخ سے صحاح کی قرارت و روایتِ حدیث کی سند حاصل کی۔ شاہ صاحبؒ کی خداداد ذہانت اور صلاحیت کی نسبت اُن کے استاذ حدیث شیخ ابو طاہر مدنی کا یہ قول اوپر گذر چکا ہے کہ" ولی اللہ الفاظِ روایت کی سند مجھ سے حاصل کرتے ہیں اور میں اُن کے ذریعے سے حدیثوں کے معانی کی تصحیح کرتا ہوں"۔

یہ وہ زمانہ تھا جس میں علمِ حدیث پوری دنیائے اسلام میں ضعف و انحطاط کی آخری منزل سے گذر رہا تھا، ایسی حالت میں علم حدیث کی اشاعت و ترویج شاہ صاحبؒ کا ایک ایسا زبردست کارنامہ ہے جس کا مصر کے ایک جلیل القدر عالم سیّد رشید رضا کو ان الفاظ میں اعتراف کرنا پڑا،
"اگر ہمارے ہندوستانی علماء کی توجہ اس زمانے میں علمِ حدیث کی طرف مبذول نہ ہوتی تو مشرقی ممالک سے یہ علم ختم ہو چکا ہوتا، کیونکہ مصر، شام، عراق اور حجاز میں دسویں صدی ہجری سے چودھویں صدی کے اوائل تک یہ علم ضُعف کی آخری منزل پر پہنچ گیا تھا"۔ [1]

پھر مصر کی حالت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"میں نے جب ۱۳۱۵ھ ۱۸۹۷ء میں مصر ہجرت کی تو جامع ازہر اور دوسری مسجدوں کے خطیبوں کو دیکھا کہ اپنے خطبوں میں ایسی حدیثیں پڑھتے ہیں جن کا کتبِ حدیث میں کہیں پتہ نہیں، اُن میں ضعیف، منکر اور موضوع و جعلی روایتیں ہوتی تھیں اور یہی حال واعظوں، مفتیوں اور مدرسوں کا تھا"۔ [2]

شاہ صاحبؒ کی علمی خدمات صرف درس و تدریس تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ انھوں نے

---

[1] و [2] مقدمہ مفتاح کنوز السنۃ ص ۱ مطبوعہ مصر۔

مختلف علوم میں ایسی جلیل القدر کتابیں بھی تصنیف فرمائیں جنکی نظیر آٹھویں صدی ہجری کے بعد بہت کم ملتی ہے، اس کے علاوہ شاہ صاحبؒ کی علمی زندگی کے اور بھی متعدد عظیم الشان کارنامے ملتے ہیں، یہاں اجمالاً بھی ان کا تذکرہ آسان نہیں ہے، یہ ایک مستقل مضمون ہے۔

شاہ صاحبؒ کے چار فرزند تھے جن میں ہر ایک آسمانِ علم کا درخشندہ ستارہ ہے انمیں سب سے بڑے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ تھے۔

شاہ عبدالعزیزؒ

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ (۱۱۵۹ھ / ۱۷۴۶ء - ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۳ء) اپنے زمانے کے سب سے زیادہ متبحر اور جلیل القدر عالم تھے، حدیث و قرآن کے علوم کی جو اشاعت ان کے زمانے میں ہوئی اس سے پہلے اسلامی ہند کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی، ہندوستان کا کوئی ایسا گوشہ نہیں جہاں شاہ عبدالعزیزؒ کے شاگرد پائے نہ جاتے ہوں۔ ایک غیر ہندوستانی عالم کا بیان اوپر گذر چکا ہے، جسے سارے ہندوستان کی سیاحت میں علم حدیث کا کوئی بھی ایسا عالم نہیں ملا تھا جو شاہ صاحبؒ کا شاگرد نہ ہو، مولانا عبیداللہ سندھیؒ کا خیال ہے کہ شاہ ولی اللہؒ کے خواص سے اگر دس آدمیوں نے استفادہ کیا تو شاہ عبدالعزیزؒ کے خواص سے دس ہزار مستفید ہوئے [۱]

غرض کہ شاہ ولی اللہؒ نے علوم دینیہ کی جس نشاۃ ثانیہ کی بنیاد ڈالی تھی، شاہ عبدالعزیزؒ نے ان کی تکمیل فرمادی اور علم کا ایک ایسا معیار قائم کر دیا جس سے علوم دینیہ کی ایک خاص عزت اور وقار قائم ہو گیا، شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنے والد ماجد کی وفات کے بعد ۶۰ سال کی طویل مدت تک دہلی میں علوم دینیہ کی خدمات انجام دیں، درس و تدریس کے علاوہ شاہ صاحبؒ نے متعدد کتابیں بھی تصنیف فرمائیں، جن میں تفسیر فتح العزیز، تفسیر قرآن میں اور بستان المحدثین، محدثین کے طبقات اور اُن کی مصنفات کی تاریخ میں اور تحفہ اثنا عشریہ تشیُّع کی حقیقت میں بہت مشہور ہیں،

---

[۱] شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص ۴۶۔

آخرالذکر کتاب تو شاہ صاحبؒ کا ایک ایسا شاہکار ہے جس کی کوئی مثال اس موضوع پر اسلامی لٹریچر میں موجود نہیں ہے ۔

شاہ محمد اسحاقؒ

حضرت شاہ محمد اسحاق، شاہ عبدالعزیزؒ کے نواسے اور ممتاز شاگرد تھے، شاہ عبدالعزیزؒ کے سامنے بیسؔ سال تک طلباء کو حدیث کا درس دیا، ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۳ء میں شاہ عبدالعزیزؒ نے انتقال سے پہلے مدرسۂ رحیمیہ شاہ محمد اسحاقؒ کو سپرد فرماکر اپنا جانشین مقرر فرمادیا تھا، ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۱ء تک انھوں نے علم حدیث کی نشر واشاعت کی خدمات انجام دیں، اُن کے علمی فیوض سے تقریباً سارا ہندوستان مستفیض ہوا، مشکوٰۃ المصابیح کا اُردو میں ترجمہ فرمایا، جس کو ان کے ایماء پر اُن کے شاگرد رشید مولانا قطب الدین خان صاحبؒ نے شرح کی صورت میں منتقل کردیا ہے، جو مظاہرِ حق کے نام سے موسوم ہے، مائۃ مسائل اور رسائل اربعین بھی ان کی قابلِ ذکر تصنیف ہیں، شاہ محمد اسحاقؒ نے ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۱ء میں ہندوستان سے ہجرت فرماکر حرم محترم میں اقامت اختیار فرمائی اور وہیں چند سال بعد انتقال فرمایا۔

ترجمہ تذکرہ علمائے ہند میں لکھا ہے کہ: "یہ بات خاص طور سے قابلِ ذکر ہے کہ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں حضرت شاہ محمد اسحٰق دہلویؒ کے اکثر شاگردوں نے بحیثیت علماء کے اس تحریک میں حصہ لیا، جن میں مفتی عنایت احمد کاکوروی صدر امین بریلی، مولانا عبدالجلیل کوئلی (علی گڈھی) مفتی صدرالدین آزردہ، شاہ ابوسعید مجددی (والد ماجد شاہ عبدالغنی مجددی) اور ان کے شاگردوں کے شاگرد یعنی علمائے دیوبند مثلاً مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں[1]۔"

شاہ عبدالغنیؒ

حضرت شاہ محمد اسحاقؒ کے ہجرت فرمانے کے بعد اُن کی جانشینی کا فخر حضرت شاہ عبدالغنی مجددی (۱۲۳۵ھ/۱۸۱۹ء - ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۸ء) کو حاصل ہوا، شاہ عبدالغنیؒ نے حدیث کی کچھ کتابیں اپنے والد شاہ ابوسعیدؒ سے پڑھیں جو شاہ عبدالعزیزؒ کے شاگرد تھے اور کچھ کتابوں کی سند شاہ محمد اسحاقؒ سے حاصل کی تھی، یہ اپنے زمانے میں نو عمری کے

---

[1] ترجمۂ تذکرہ علمائے ہند مطبوعہ کراچی ص ۹۰۔

باوجود حدیث کے یگانۂ روزگار عالم تھے، ملک کے گوشے گوشے سے علمار اور طلبار آتے تھے اور اس خرمنِ کمال کی خوشہ چینی کو فخر سمجھتے تھے، اُن کی درس گاہ ہندوستان میں علم حدیث کا سب سے بڑا مرکز تھی، ابنِ ماجہ پر حاشیہ تحریر فرمایا جو انجاح الحاجہ کے نام سے موسوم ہے، اُن کے فیضِ تعلیم سے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ جیسے یگانۂ روزگار علمار پیدا ہوئے، جنھوں نے علم کی دنیا میں ایک نئی زندگی کا آغاز کیا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں علم حدیث کی یہ سب سے بڑی درسگاہ حوادثِ روزگار کی نذر ہوکر ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی، شاہ عبدالغنیؒ نے مدینۂ منورہ ہجرت فرمائی اور وہیں محرم ۱۲۹۶ھ میں انتقال فرمایا۔

مذکرۂ صدر حضرات کی سندِ روایت کی تفصیل الیانع الجنی میں بتفصیل مذکور ہے۔

حضرت شاہ عبدالغنیؒ کی نسبت مولانا حکیم عبدالحیٔ لکھنوی نزہۃ الخواطر میں لکھتے ہیں:۔

"علم وعمل، زہد، حلم، صداقت، امانت وعفت، صیانت، حُسنِ نیت، اخلاص، رجوع الی اللہ، خوفِ خدا، سنتِ نبوی کی پابندی، حُسنِ اخلاق، مراقبہ اور مخلوق کو نفع پہنچانے، دنیا اور اسبابِ دنیا سے بے رغبتی اُن کی ذات پر ختم تھی، اُن کی مجلس سے اور اُن کے انفاس کی برکت سے بہت سے علمار ومشائخ مستفیض ہوئے، اُن کی بزرگی اور ولایت پر ہند وعرب کے سب لوگوں کا اتفاق ہے، بروز چہار شنبہ ۶ر محرم ۱۲۹۶ھ کو مدینہ منورہ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے" [1]

علمارِ دیوبند کا دوسرا سلسلۂ تلمذ حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ اور مولانا رشیدالدین خان دہلوی کے واسطے سے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ تک پہنچتا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے۔

---

[1] نزہۃ الخواطر جلد ۷، ص ۲۸۹ و ۲۹۰۔

مولانا مملوک علیؒ

استاذ العلماء حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ اپنے دَور کے مشاہیر علماء میں سے تھے، اور اپنے معاصرین علماء میں امتیازی حیثیت کے مالک تھے، درسیات اور خاص طور سے فقہ پر اس قدر عبور تھا کہ اکثر کتابیں زبانی یاد تھیں، حافظے کا یہ عالم تھا کہ سر سید مرحوم لکھتے ہیں کہ: "علم معقول و منقول میں استعدادِ کامل اور کتب درسیہ کا ایسا استحضار ہے کہ اگر فرض کرو کہ ان تمام کتب سے گنجینۂ علم خالی ہو جائے تو ان کی لوحِ حافظہ سے پھر اُن کی نقل ممکن ہے، ان سب کمال و فضیلت پر خُلق و حلم احاطۂ تحریر سے فزوں تر ہے"۔[1]

مولانا رشید الدین خانؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے، فیوض علمی کا حلقہ نہایت وسیع تھا، آپ کے فیضِ تعلیم نے بے شمار علماء پیدا کئے، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے لکھا ہے کہ:-

"مولانا مملوک علیؒ جنھوں نے درسیات کا اکثر حصہ جناب بند حضرت شاہ عبد العزیز قدس سرہٗ کے ارشد تلامذہ حضرت مولانا رشید الدین سے پڑھا تھا، فلکِ علم کے نیرین حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ اور مولانا محمد مظہر صدر المدرسین مظاہر علوم حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ صدر المدرسین دار العلوم جیسی مقدس و مشہور ہستیوں کے استاذ تھے، ان سب حضرات نے علوم دینیہ و فنونِ ادبیہ کی پیاس اس بحرِ زخار سے بجھائی تھی اور ہر چہار جانب سے پریشان ہو کر اسی آستانے پر شفا و تسکین پائی تھی"۔[2]

مولوی کریم الدین پانی پتی کا بیان ہے کہ:-

"نیا مدرسہ عربی اُن کی ذات سے مستحکم ہے۔ فارسی اور اُردو اور عربی تینوں زبانوں میں کمال رکھتے ہیں ہر ایک علم اور فن سے جو اِن زبانوں میں ہیں مہارتِ تامہ اُن کو حاصل ہے، اور جس فن کی کتاب اُردو زبان میں انگریزی سے ترجمہ ہوتی ہے اس کے اصل اصول سے

---

[1] آثار الصنادید حصہ چہارم ص ۔
[2] تذکرۃ الخلیل ص ۹ ۔

بہت جلد ان کا ذہن چسپاں ہو جاتا ہے گویا اس فن کو اول ہی سے جانتے ہیں[1]۔ اور جس کار پر مامور ہیں اس میں کبھی کسی طرح کا حتی الوسع ان سے قصور نہیں ہوا، مدرسے میں ان کی ذات بابرکات سے اتنا فیض ہوا ہے کہ شاید کسی زمانے میں کسی استاد سے ایسا ہوا ہو[2]۔

استاذ العلماء کی ذات مرجع طلباء تھی۔ اکناف و اطراف سے طلباء ان کی خدمت میں پہونچ کر علمی استفادہ کرتے تھے۔ کالج کے علاوہ فارغ اوقات میں ان کے گھر پر طلباء کا ہجوم رہتا تھا۔ مولوی کریم الدین لکھتے ہیں:۔

"گھر اس کا محط الرجال طلباء، مدرسہ اس کا مجمع علماء و فضلاء، صدہا شاگرد اس ذات بابرکات سے فیض اٹھا کر اطراف و اقطار ہندوستان میں فاضل ہو کر گئے، سوا درس دہی طلباء مدرسہ کے اپنے گھر پر بھی لوگوں کو ہر ایک علم کی کتابیں پڑھاتے ہیں، تمام اوقات گرامی اُن کے تعلیم طلباء میں نصف شب تک منقسم ہیں، ان کی خدمت میں صدہا طالب علم اطراف و

---

[1] ارواح ثلاثہ میں لکھا ہے کہ "مولانا مملوک علی نانوتوی" جب تحصیل علم کے لئے دہلی تشریف لے گئے تو یہ صورت پیش آئی کہ جس استاد سے پڑھنا شروع کرتے وہ علوم سے قلتِ مناسبت محسوس کر کے ایک سبق کے بعد دوسرا سبق نہ پڑھاتا تھا، اس صورت حال سے مولانا سخت ملول اور غمگین تھے، ایک روز اسی پریشانی میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ "تحصیل علم کے شوق میں وطن چھوڑ کر آیا ہوں اور کیفیت یہ ہے کہ جس استاذ سے پڑھنا شروع کرتا ہوں وہ ایک سبق کے بعد پڑھانے کا نام نہیں لیتا" شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ "اچھا کل آنا" مولانا اگلے دن حاضر ہوئے شاہ صاحبؒ نے ہدایۃ النحو کا ایک سبق پڑھا دیا اور فرمایا کہ "جاؤ اب جس اُستاد سے پڑھو گے وہ انکار نہیں کرے گا:"

چنانچہ پھر ایسی مناسبت ہوئی اور ایسے چلے کہ بڑے بڑے علماء اُن کے شاگرد ہوئے۔ (ارواح ثلاثہ بحوالہ روایات الطیب، حکایت نمبر ۱۸۵)۔

[2] تذکرہ طبقات الشعراء از مولوی کریم الدین پانی پتی ص ۳۶۳۔

جوار سے واسطے تعلیم پانے علوم کے حاضر ہوتے ہیں اور اُن کے حسن اخلاق سے یہ بعید ہے کہ کسی طالب علم کی خاطر رنجیدہ کریں۔" ۱؎

تذکرۃ الرشید میں حضرت گنگوہیؒ کا یہ قول منقول ہے کہ:۔

"ابتداءً ہم دہلی میں دوسرے اساتذہ سے پڑھتے تھے، لیکن تسکین نہیں ہوتی تھی، کبھی سبق تھوڑا ہوتا تھا اور کبھی شبہات کا جواب نہ ملتا تھا، مگر جب مولانا مملوک علی کی خدمت میں پہنچے تو اطمینان ہوگیا، اور بہت تھوڑے عرصے میں کتابیں ختم کرلیں، گویا استاد نے گھول کر پلادیا، اس زمانے میں اچھے اچھے استاد دہلی میں موجود تھے مگر ایسے استاد کہ مطلب پوری طرح اُن کے قابو میں ہو اور انواع مختلفہ سے تقریر کرکے شاگرد کے ذہن نشین کردیں ایک ہمارے استاد مولانا مملوک علی اور دوسرے ہمارے اُستاد مفتی صدرالدین تھے، رحمۃ اللہ علیہما۔"

حضرت مولانا مملوک علیؒ کی فراستِ علمی کی نسبت حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ نے لکھا ہے کہ:۔

اُن کے سامنے بے سمجھے چلنا مشکل تھا وہ طرزِ عبارت سے سمجھ لیتے کہ یہ مطلب سمجھا ہوا ہے یا نہیں۔" ۲؎

حضرت استاذ الاساتذہ کے تلامذہ کی تعداد کا استقصار بہت مشکل ہے، اُن کے شاگردوں میں بڑے بڑے علماء مثل حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا احمد علی سہارنپوری، حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی، حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی، مولانا محمد منیر نانوتوی، مولوی جمال الدین مدار المہام بھوپال، مولوی کریم الدین پانی پتی مؤلف تذکرہ طبقات

۱؎ تذکرہ فرائد الدہر از مولوی کریم الدین ص ۲۰، بحوالہ مولانا محمد احسن نانوتوی ص ۱۸۱۔

۲؎ سوانح قاسمی ص ۷، مطبوعہ مجتبائی دہلی ۱۳۱۱ھ ۱۸۹۴ء

طبقات الشعراء، شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین ایل۔ ایل۔ ڈی۔ مولانا عالم علی مراد آبادی، مولوی سمیع اللہ دہلوی۔ مولانا عبدالرحمن پانی پتی وغیرہ کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

سوانح مولانا محمد احسن نانوتوی میں لکھا ہے کہ حضرت مولانا مملوک علیؒ نے تحریرِ اقلیدس کے اوّل کے چار مقالوں کا اور گیارھویں بارھویں مقالوں کا عربی سے ترجمہ کیا تھا، اس کے علاوہ ترمذی اور تاریخ یمینی کے ترجمے کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔ [۱]

استاذ العلماء دہلی کالج میں علوم عربیہ کے استاد تھے، ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ/ ۱۸۵۱ء کو انتقال ہوا، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے قبرستان مہندیوں میں مسجد کے سامنے مدفون ہیں، قبر کا نشان موجود نہیں رہا۔

مولانا رشید الدین خاں

مولانا رشید الدین خاں، حضرت شاہ رفیع الدینؒ کے شاگردِ رشید تھے، معقول و منقول خصوصاً علم کلام میں یگانۂ عصر تھے، شاہ صاحبؒ نے اُن کی تعلیم و تربیت بیٹے کی طرح کی تھی، ہر وقت اُن کی اصلاح و ترقی کی فکر دامن گیر رہتی تھی۔ شاہ رفیع الدین کے بعد شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ عبدالقادرؒ نے ان کی اصلاح اور تعلیم و تربیت فرمائی۔

مولانا رشید الدین خاں گو ہر فن میں دستگاہ کامل رکھتے تھے، لیکن علم ہیئت اور ہندسہ میں اُن کو خاص مہارت تھی، اور اس زمانے میں مشکل سے کوئی شخص ان فنون میں اُن کا مقابلہ کرنے کی جرأت کرسکتا تھا، مناظرے میں بھی ان کو زبردست کمال حاصل تھا، عربی زبان کے بے نظیر ادیب تھے۔

علم و فضل کے ساتھ مولانا رشید الدین صاحبؒ کا زہد و تقویٰ بھی مسلّم تھا، قناعت کی زندگی

---

[۱] مولانا محمد احسن نانوتوی ص ۸۷ و ۸۸۔

بسر کرتے تھے، ایک مرتبہ عہدۂ قضا پیش کیا گیا تو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ ۱۸۲۵ء میں جب دہلی کا مشہور مدرسہ غازی الدین دہلی کالج میں تبدیل ہوگیا تو اس میں عربی کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ سو روپیہ ماہوار مشاہرہ ملتا تھا، فیاض طبع تھے، جو ضرورت مند پہنچ جاتا حتی المقدور اس کی مدد کرتے تھے، ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء میں تقریباً ۷۰ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ [1]

شاہ رفیع الدینؒ

حضرت شاہ رفیع الدینؒ، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے چھوٹے بھائی اور خاندان ولی اللّٰہی کے جلیل القدر عالم تھے، ۱۱۶۳ھ/۱۷۴۹ء میں پیدا ہوئے، شاہ عبدالعزیزؒ آخر عمر میں جب بصارت کے جاتے رہنے سے اور کثرت امراض کے باعث درس و تدریس سے معذور ہوگئے تو اپنی جگہ شاہ رفیع الدینؒ کو مامور فرمایا، دُور دُور سے علماء و طلباء شاہ صاحبؒ سے استفادہ کرنے کے لئے دہلی آتے تھے شاہ رفیع الدینؒ کو ہر فن میں ید طُولیٰ حاصل تھا، اور اُن کی یہ خصوصیت مشہور تھی کہ جس فن کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہی اُن کا خاص فن ہے، ریاضیات کی نسبت شاہ عبدالعزیزؒ فرمایا کرتے تھے کہ:-

"مولوی رفیع الدین در ریاضیات چنداں ترقی کردہ اند کہ شاید موجد آں ہم بودہ باشد۔" [2]

مولوی رفیع الدین نے ریاضیات میں اس قدر ترقی کی کہ اس فن کے موجد نے بھی اس سے زیادہ نہ کی ہوگی۔

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:-

درفن ریاضی مولوی رفیع الدین در ہند و ولایت نخواہد بود۔ [3]

---

[1] یہ حالات آثار الصنادید حصہ چہارم ص ۵۱ سے ماخوذ ہیں۔

[2] ملفوظات شاہ عبدالعزیزؒ ص ۴۰ و کمالات عزیزی ۵۶۔

[3] " " ص ۶۲ و کمالات عزیزی ۸۸۔

مولوی رفیع الدین کا فن ریاضی میں ہند اور ولایت میں مثل نہ تھا۔ آپ کی تصانیف میں اُردو ترجمہ قرآن مجید، مقدمۃ العلم، تکمیل الاذہان اور اسرار المحبت اور قیامت نامہ بہت مشہور ہیں، ۱۲۳۳ھ میں انتقال فرمایا، اپنے خاندانی قبرستان میں آسودۂ خواب ہیں۔

سر سید مرحوم لکھتے ہیں :-

"دیارِ ہندوستان کے جمیع فضلائے نامی ان ہی حضرت فیض موہبت کے مستفیضوں میں سے ہیں، ہر فن کے ساتھ اس طرح کی مناسبت تھی کہ ایک وقت میں فنونِ متباینہ اور علوم مختلفہ کا درس فرماتے تھے، جب ایک کی تعلیم سے دوسرے کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوتے حضارِ خدمت کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا اسی فن میں جامۂ یکتائی اُن کے قامتِ استعداد پر قطع ہوا ہے، باوجود ان کمالات کے افاضۂ باطن کا یہ حال تھا کہ جنید بغدادی اور حسن بصری اگر اُن کے وقت میں ہوتے تو بے شک وریب اس میں اپنے تئیں کمترین مستفیدان تصور کرتے۔"

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

حضرت نانوتویؒ ولی اللہی خوانِ علم کے آخری خوشہ چینوں میں تھے ۱۲۴۸ھ / ۱۸۳۲ء میں آپ کی ولادت ہوئی، سہارنپور کے نواح میں ایک قدیم مردم خیز قصبہ نانوتہ[1] ہے، اسی معدن سے یہ جوہرِ فرد نکلا جس کے انوارِ علم نے تیرھویں صدی ہجری کے نصف آخر کی علمی، مذہبی مجالس کو منور و تاباں بنا دیا تھا ابتدائی تعلیم وطنِ مالوف میں حاصل کی، مکتبی تعلیم کے بعد اُن کو دیوبند پہنچا دیا گیا، یہاں کچھ دنوں مولوی مہتاب علی کے مکتب میں پڑھا، پھر اپنے نانا کے پاس سہارنپور چلے گئے، جو وہاں وکیل تھے، سہارنپور میں مولوی نواز سے عربی صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، ۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء کے آخر میں اُن کو حضرت مولانا مملوک علی نانوتوی اپنے ہمراہ دہلی لے گئے، وہاں کافیہ شروع کیا

---

[1] نانوتہ دیوبند سے جانب مغرب ۱۲ میل کے فاصلے پر ایک قدیم قصبہ ہے، یہاں نویں صدی ہجری سے صدیقی شیوخ کا ایک ممتاز خاندان آباد ہے، حضرت نانوتویؒ کا نسبی تعلق اس خاندان سے ہے۔

اور دوسری کتابیں پڑھیں، بعدازاں انھیں دہلی کالج میں داخل کر دیا گیا، مگر حضرت نانوتوی رحؒ نے سالانہ امتحان میں شرکت نہیں کی، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ لکھتے ہیں:۔

"والد مرحوم نے مولوی صاحب کو مدرسہ عربی[1] سرکاری میں داخل کیا اور فرمایا کہ "تم اقلیدس خود دیکھ لو اور قواعد حساب کی مشق کرلو، چند روز میں چرچا ہوا کہ مولوی صاحب سب معمولی مقالے دیکھ چکے ہیں، اور حساب پورا کر لیا ہے، منشی ذکاء اللہ صاحب چند سوال لائے، وہ نہایت مشکل تھے، اُن کو حل کر لینے پر مولانا کی بہت شہرت ہوئی، جب امتحان سالانہ کے دن ہوئے مولوی صاحب امتحان میں شریک نہ ہوئے اور مدرسہ چھوڑ دیا، سب اہلِ مدرسہ کو علی الخصوص ہیڈ ماسٹر صاحب کو جو مدرس اوّل انگریزی تھے نہایت افسوس ہوا۔"

---

[1] دہلی کالج جسے حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ نے "مدرسہ عربی سرکاری" لکھا ہے۔ پہلے یہ مدرسہ غازی الدین خاں کے نام سے موسوم تھا، اسے غازی الدین فیروز جنگ اوّل (متوفی ۱۱۲۲ھ) نے اپنی وفات سے چند سال قبل بیرون اجمیری دروازہ قائم کیا تھا، انتقال کے بعد فیروز جنگ اوّل کو اسی مدرسہ کے صحن میں دفن کیا گیا تھا ان کی قبر اب تک موجود ہے، یہ نظام الملک آصف جاہ اوّل کے والد تھے۔ سابق ریاست حیدرآباد دکن کا حکمراں خاندان انہی آصف جاہ اوّل کی جانب منسوب ہے۔

مدرسہ غازی الدین خاں کی سنگِ سرخ کی دو منزلہ عمارت اُس زمانے کے لحاظ سے بڑی پُرشکوہ اور شاندار تھی، ۱۸۲۵ء/۱۲۴۱ھ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے اسے دہلی کالج میں تبدیل کر دیا، مسٹر جے، ایچ ٹیلر اس کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ۱۸۲۸ء/۱۲۴۴ھ میں دہلی کالج میں انگریزی کی کلاس کھولی گئی اور علومِ جدیدہ کو نصاب میں شامل کیا گیا، اس سے پہلے یہ قدیم مشرقی طرز کا ایک عربی مدرسہ تھا۔

۱۸۴۲ء/۱۲۵۸ھ میں دہلی کالج کو اجمیری دروازے سے کشمیری دروازے کی ایک بڑی عمارت میں منتقل کر دیا گیا، جہاں وہ ۱۸۵۷ء تک جاری رہا، ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ انقلاب میں کالج تباہ ہو گیا اور مسٹر ٹیلر ہلاک ہو گئے، وہ تقریباً ۳۰ سال تک دہلی کالج سے منسلک رہے۔

(باقی حاشیہ صفحۂ آئندہ پر ملاحظہ ہو)

دہلی کالج میں داخلے سے پہلے مولانا مملوک علیؒ سے منطق وفلسفہ وکلام کی کتابیں میرزاہد قاضی مبارک، صدرا، شمس بازغہ وغیرہ اُن کے مکان پر پڑھ چکے تھے، آخر میں اس حلقۂ درس میں حاضر ہوئے جو علوم قرآن وحدیث میں سارے ہندوستان میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا، حضرت شاہ ولی اللہؒ کی مسندِ علم پر حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ رونق افروز تھے، اُن سے علم حدیث کی تحصیل کی، زمانۂ طالب علمی ہی میں ان کی ذہانت علم وفضل اور فہم وفراست کی شہرت عام ہوگئی تھی۔

حضرت مولانا نانوتویؒ کے نامور ہم عصر سر سیّد مرحوم نے زمانۂ طالب علمی میں اُن کی ذہانت علم وفضل، زہد وتقویٰ اور فہم وفراست کی نسبت اپنے تاثرات کا ان الفاظ میں اظہار کیا ہے:۔

"لوگوں کو خیال تھا کہ بعد جناب مولوی محمد اسحاق صاحب کے کوئی شخص اُن کی مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں ہے، مگر مولوی محمد قاسم صاحبؒ نے اپنی کمال نیکی۔ دینداری اور تقویٰ اور ورع اور مسکینی سے ثابت کر دیا کہ اس دلّی کی تعلیم و تربیت کی بدولت مولوی محمد اسحٰق صاحب کی مثل اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے بلکہ چند باتوں میں اُن سے زیادہ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ۱۸۹۰ء / ۱۳۰۸ھ میں اینگلو عربک کالج کے نام سے مدرسہ غازی الدین خاں (دہلی کالج) کی قدیم عمارت میں از سرِ نو جاری کیا گیا۔

(ماخوذ واقعات دارالحکومت دہلی جلد دوم مؤلفہ بشیر الدین احمد مطبوعہ شمسی پریس آگرہ ۱۹۱۹ء / ۱۳۳۶ھ ص ۵۶۲،۳ء۵

اب چند سال سے یہ کالج ڈاکٹر ذاکر حسین کالج کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے:۔ سیّد محبوب رضوی

۱؎ سوانح قاسمی ص ۱۳ مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی ۱۸۹۳ء / ۱۳۱۱ھ۔

یہ ہیڈ ماسٹر کون تھے؟ مولوی عبدالحق اپنی کتاب مرحوم دہلی کالج میں لکھتے ہیں:۔

مسٹر ٹیلر نے دہلی کالج میں تیس برس تک ہیڈ ماسٹری کی اور دو تین سال تک پرنسپل رہے ص ۱۵۔

مسٹر ٹیلر ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں مارے گئے۔ اُنکی ہیڈ ماسٹری کا آغاز ۱۸۲۵ء / ۱۲۴۱ھ سے ہوا، حضرت نانوتویؒ بغرض تعلیم ۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء میں دہلی گئے تھے، اس لئے اُس وقت بھی ٹیلر ہیڈ ماسٹر ہو سکتے ہیں۔

بہت لوگ زندہ ہیں جنھوں نے مولوی محمد قاسم صاحب کو نہایت کم عمری میں دلی میں تعلیم پاتے دیکھا ہے۔ انھوں نے جناب مولوی مملوک علی صاحب مرحوم سے تمام کتابیں پڑھی تھیں۔ ابتدا ہی سے آثار تقویٰ اور ورع اور نیک بختی اور خدا پرستی کے اُن کے اوضاع اور اطوار سے نمایاں تھے اور یہ شعر اُن کے حق میں بالکل صادق تھا ؎

بالائے سرش ز ہوشمندی ٭ می تافت ستارۂ بلندی

زمانۂ تحصیل علم میں جیسے کہ وہ ذہانت اور عالی دماغی اور فہم و فراست میں معروف و مشہور تھے ویسے ہی نیکی اور خدا پرستی میں بھی زباں زد اہلِ فضل و کمال تھے۔ اُن کو جناب مولوی مظفر حسین صاحب کی صحبت نے اتباعِ سنّت پر بہت زیادہ راغب کردیا تھا اور حاجی امداد اللہؒ کے فیضِ صحبت نے اُن کے دل کو ایک نہایت اعلیٰ رتبہ کا دل بنادیا تھا۔ خود بھی پابندِ شریعت و سنّت تھے اور لوگوں کو بھی پابندِ شریعت و سنّت کرنے میں زائد از حد کوشش کرتے تھے۔ باایں ہمہ عام مُسلمانوں کی بھلائی کا بھی ان کو خیال تھا۔ انہی کی کوشش سے علوم دینیہ کی تعلیم کے لئے نہایت مفید مدرسہ دیوبند میں قائم ہوا۔ اور ایک نہایت عمدہ مسجد بنائی گئی۔ علاوہ اس کے اور چند مقامات میں بھی اُنکی سعی اور کوشش سے مُسلمانی مدرسے قائم ہوئے۔ وہ کچھ خواہش پیرو مرشد بننے کی نہیں کرتے تھے لیکن ہندوستان میں اور خصوصاً اضلاعِ شمال و مغرب میں ہزار ہا آدمی اُن کے معتقد تھے اور اُن کو اپنا پیشوا اور مقتدا جانتے تھے۔

مسائل خلافیہ میں بعض لوگ اُن سے ناراض تھے اور بعضوں سے وہ ناراض تھے۔ مگر جہاں تک ہماری سمجھ ہے ہم مولوی محمد قاسم صاحبؒ کے کسی فعل کو خواہ کسی سے ناراضی کا ہو خواہ کسی سے خوشی کا ہو کسی طرح ہوائے نفسانی یا ضد اور عداوت پر محمول نہیں کرسکتے۔ ان کے تمام کام افعال جس قدر کے تھے بلاشبہ للّٰہیت اور ثوابِ آخرت کی نظر سے تھے اور جس بات کو وہ حق اور سچ سمجھتے تھے اُس کی پیروی کرتے تھے۔ اُن کا کسی سے ناراض ہونا صرف خدا کے واسطے تھا اور کسی سے خوش ہونا بھی صرف خدا کے واسطے تھا۔ کسی شخص کو مولوی محمد قاسمؒ اپنے ذاتی

تعلقات کے سبب اچھا یا بُرا نہیں جانتے تھے بلکہ صرف اس خیال سے کہ وہ بُرے کام کرتا ہے یا بری بات کہتا ہے، خدا کے واسطے جانتے تھے مسئلہ حُبّ اللہ اور بغض فی اللہ کا خاص اُنکے برتاؤ میں تھا، ان کی تمام خصلتیں فرشتوں کی سی خصلتیں تھیں، ہم سب دل سے اُن کے ساتھ محبت رکھتے تھے اور ایسا شخص جس نے ایسی نیکی سے اپنی زندگی بسر کی ہو بلاشبہ نہایت محبت کے لائق ہے۔

اس زمانے میں سب لوگ تسلیم کرتے ہیں اور شاید وہ لوگ بھی جو اُن سے بعض مسائل میں اختلاف کرتے تھے تسلیم کرتے ہوں گے کہ مولوی محمد قاسم اس دنیا میں بے مثل تھے اُنکا پایہ اس زمانے میں شاید معلوماتِ علمی میں شاہ عبدالعزیزؒ سے کچھ کم ہو اِلّا اور تمام باتوں میں اُن سے بڑھ کر تھا، مسکینی اور نیکی اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی محمد اسحٰق سے بڑھ کر نہ تھا تو کم بھی نہ تھا درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے اور ایسے شخص کے وجود سے زمانہ کا خالی ہو جانا ان لوگوں کے لئے جو ان کے بعد زندہ ہیں نہایت رنج اور افسوس کا باعث ہے۔[1]

تحصیل علم کے بعد مولانا نانوتویؒ نے ذریعۂ معاش کے لئے حضرت مولانا احمد علی محدثؒ[2]

---

[1] مضمون سرسید مرحوم مندرجہ علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ ۲۴ اپریل ۱۸۸۰ء میں ۴۶۷ و ۴۶۸ تفصیل کے لئے دیکھئے راقم سطور کا مضمون "حضرت نانوتوی سرسید کی نظر میں" مشمولہ سوانح قاسمی جلد سوم۔

[2] حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری ۱۲۲۵ھ میں سہارنپور میں پیدا ہوئے حضرت مولانا مملوک علیؒ اور مولانا وجیہ الدین سے پڑھا۔ حدیث کی تحصیل مکہ مکرمہ میں حضرت شاہ محمد اسحٰق دہلویؒ سے اس طرح کی کہ روزانہ فجر سے ظہر تک حرم میں بیٹھ کر پہلے احادیث کی نقل کرتے اور ظہر کے بعد عصر تک شاہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر نقل کی ہوئی احادیث کی سماعت کرتے تھے، حدیث کی تمام کتابیں شاہ صاحبؒ سے اسی طرح سے پڑھیں۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

سہارنپوری ؒ کے مطبع احمدی دہلی میں[1] اپنے لئے تصحیح کتب کا کام اختیار کیا، اسی زمانے میں حضرت مولانا احمد علیؒ کی فرمائش پر صحیح بخاری کے آخری چند سیپاروں کا حاشیہ بھی تحریر فرمایا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) تعلیم سے فراغت کے بعد ہندوستان واپس آکر حدیث نبوی کے درس و تدریس میں مشغول ہوگئے تعلیم و تعلم کے ساتھ ساتھ اپنے مطبع احمدی سے ۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۸ء میں جامع ترمذی طبع کرائی۔ ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۳ء میں صحیح بخاری اور ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۵ء میں مشکوٰۃ المصابیح کے قلمی نسخوں کو صحیح کرکے نہایت اہتمام کے ساتھ چھپوایا ان کتابوں پر حاشیے لکھے صحیح بخاری کی تصحیح اور تحشیہ میں دس سال صرف ہوئے، ہندوستان میں حدیث کی یہ پہلی کتابیں ہیں جو زیورِ طبع سے آراستہ ہوئیں، ان کی ساری عمر حدیث کے درس اور کتب احادیث کی طباعت میں گزری وہ اپنے زمانے کے جلیل القدر عالم اور نامور محدث تھے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ اور علامہ شبلی جیسے یگانۂ روزگار علمار اُن کے حلقۂ تلمذ میں شامل تھے بقول علامہ شبلی اس زمانے کے اکثر بڑے بڑے علمار احناف ان کے شاگرد تھے۔

محدث سہارنپوریؒ کا ذریعۂ معاش پریس اور تجارت کتب تھا۔ دولت علم کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے دنیوی دولت سے بھی مالا مال کیا تھا، غربار اور طلبار پر فیاضی کے ساتھ خرچ کرتے تھے، اخیر عمر میں مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں طلبار کو تفسیر و حدیث کا درس دیتے تھے، نہایت متواضع، منکسر المزاج اور سیر چشم تھے، مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کی ترقی میں اُن کی علمی اور مالی توجہات کا بڑا حصہ ہے مظاہر علوم سے انھوں نے کبھی معاوضہ نہیں لیا۔

۶ جمادی الاول ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء بروز شنبہ سہارنپور میں وفات پائی، عیدگاہ کے قریب اپنے آبائی قبرستان میں آسودۂ خواب ہیں۔

محدث سہارنپوریؒ کے تفصیلی حالات کے لئے راقم سطور کے مضمون مطبوعہ ماہنامہ "برہان" دہلی بابت ماہ نومبر ۱۹۷۴ء سے مراجعت کی جائے۔ سید محبوب رضوی۔

[1] مطبع احمدی دہلی سے کتب حدیث کی طبع و اشاعت کا بڑا کام انجام پایا۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی لکھتے ہیں:۔

جناب مولوی احمد علی صاحب سہارنپوری ؒ نے تحشیہ اور تصحیح بخاری شریف کے پانچ چھ سپارے آخر کے باقی تھے مولوی صاحب کے سپرد کیا مولوی صاحب نے اس کو ایسا لکھا ہے کہ اب دیکھنے والے دیکھیں کہ اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے، اس زمانے میں بعض لوگوں نے کہ مولوی صاحب کے کمال سے آگاہ نہ تھے جناب مولوی احمد علی صاحبؒ کو بطور اعتراض کہا تھا کہ "آپ نے یہ کیا کام کیا آخر کتاب کو ایک نئے آدمی کے سپرد کیا" اس پر مولوی احمد علی صاحب نے فرمایا تھا کہ "میں ایسا نادان نہیں ہوں کہ بدون سمجھے بوجھے ایسا کروں" اور پھر مولوی صاحب کا تحشیہ دکھلایا، جب لوگوں نے جانا اور وہ جگہ بخاری میں سب جگہ سے مشکل ہے، علی الخصوص تائید مذہب حنفیہ کا جو اول سے التزام ہے اور اس جگہ امام بخاری نے اعتراض مذہب حنفیہ پر کئے ہیں اور ان کے جواب لکھنے معلوم ہے کہ کتنے مشکل ہیں اب جس کا جی چاہے اس جگہ کو دیکھ لے اور سمجھ لے کہ کیسا حاشیہ لکھا ہے اور اس حاشیہ میں یہ بھی التزام تھا کہ کوئی بات بے سند کتاب کے محض اپنے فہم سے نہ لکھی جائے۔[۱]

(بقیہ صفحہ گزشتہ) یہ مطبع ہندوستان میں سب سے پہلا مطبع ہے جس میں کتب حدیث طبع ہوئیں، چنانچہ ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۸ء میں جامع ترمذی، ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳ء میں صحیح بخاری اور ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء میں مشکوٰۃ المصابیح نہایت اہتمام سے شائع ہوئیں۔ اس مطبع کو حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری ؒ نے حجاز سے واپس آکر ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۵ء میں قائم کیا تھا، ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد یہ مطبع میرٹھ منتقل ہو گیا، مطبع احمدی کی چھپی ہوئی صحیح بخاری اور مشکوٰۃ المصابیح کے نسخے راقم سطور نے کتب خانہ دارالعلوم میں دیکھے ہیں، ان کے حواشی کے متعلق میرا خیال ہے کہ یہ خود حضرت محدث سہارنپوری ؒ نے اپنے قلم سے لکھے ہیں، البتہ متنِ حدیث کاتب کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

سید محبوب رضوی

[۱] سوانح قاسمی ص ۹ مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۴ء۔

حضرت نانوتویؒ کی کسی سوانح میں اس کی صراحت موجود نہیں ہے کہ انھوں نے تعلیم سے کب فراغت حاصل کی؟ اور صحیح بخاری کی تصحیح اور تحشیہ کا واقعہ کس سن میں پیش آیا؟

سوانح قاسمی سے اجمالی طور پر صرف اتنی بات کا پتہ چلتا ہے کہ مروّجہ نصاب کی تحصیل کے بعد انھوں نے مطبع احمدی دہلی میں تصحیح کا کام شروع کر دیا تھا، اس عرصے (۱۲۶۷ھ / ۱۸۵۱ء) کے اواخر میں حضرت مولانا مملوک علیؒ کا انتقال ہو گیا، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ سوانح قاسمی میں لکھتے ہیں:۔

"اس عرصے میں والد مرحوم کا ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ / ۱۸۵۱ء کو انتقال ہو گیا، بعد انتقال والد مرحوم احقر اپنے مکان مملوک میں جا رہا، مولوی صاحب (حضرت مولانا محمد قاسمؒ) بھی میرے پاس آ رہے۔ کوٹھے پر ایک جھلنگا پڑا ہوا تھا اس پر پڑے رہتے تھے، ایک سال کے قریب بعد انتقال والد مرحوم احقر دہلی رہا، پھر اجمیر کی نوکری کے سبب دہلی چھوٹی، مولوی صاحب چند روز تنہا اس مکان میں رہے، پھر چھاپہ خانہ میں رہے، پھر دار البقاء میں چند روز رہے، اس زمانے میں جناب مولوی احمد علی صاحب سہارنپوریؒ نے تحشیہ اور تصحیح بخاری شریف کی کہ پانچ چھ سپارے آخر کے باقی تھے مولوی صاحب کے سپرد کیا۔"[1]

حاشیہ بخاری کا زمانہ تحریر

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کے بیانِ واقعہ کی ترتیب سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ۱۲۶۷ھ / ۱۸۵۱ء سے قبل حضرت نانوتویؒ تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے، ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ / ۱۸۵۱ء کے بعد ایک سال کے قریب انھوں نے حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کے ساتھ مکان پر گذارا، ۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۲ء کے آخر میں جب وہ ملازمت پر اجمیر چلے گئے تو کچھ دن دوسرے مقامات میں رہے، اور اسی زمانے میں تحشیہ کا کام اُن کے سپرد ہوا۔

حضرت نانوتویؒ کے رفیقِ درس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے متعلق یقینی طور پر معلوم

۱؎ سوانح قاسمی ص ۹ مطبوعہ مجتبائی دہلی۔

ہے کہ دہلی میں ان کا قیام چار سال رہا اور ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۸ء میں وہ فارغ ہو کر وطن چلے گئے[1] اس لئے حضرت نانوتویؒ کا سنِ فراغت بھی یہی سال (۱۲۶۵ھ) ہو سکتا ہے۔ اس طور پر گویا اپنی عمر کے سترھویں سال میں وہ تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے۔

صحیح بخاری کا جو نسخہ ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء میں دہلی کے مطبع مجتبائی میں چھپا ہے اس کے آخر میں لکھا ہے کہ:۔

"در سنہ ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء طبع کنانیدہ اشاعتِ عام فرمودند بعد ازاں صاحبزدگان ایشاں کہ از علوم نقلیہ و عقلیہ و اخلاقِ محمدیہ بہرۂ وافی دارند در ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء ہجری باز در ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء حلیہ طبع پوشانیدند۔"

حیاتِ شبلی میں ہے کہ صحیح بخاری پہلی مرتبہ ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۰ء میں چھپی تھی، لکھا ہے کہ:۔

"مولانا سہارنپوریؒ کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ حدیث کی قلمی کتابوں کو سخت محنت سے صحیح کر کے چھاپ کر عام کیا، چنانچہ ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۹ء میں جامع ترمذی اور ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۰ء میں صحیح بخاری شائع کی۔ مولانا شبلی مرحوم فرماتے تھے کہ استاذ مرحوم نے بیس برس کامل بخاری کی تصحیح و تحشیہ میں بسر کئے۔"[2]

راقم سطور کے نزدیک صحیح بخاری کا سنِ طباعت جو مجتبائی[3] ایڈیشن میں لکھا گیا ہے زیادہ

---

[1] تذکرۃ الرشید جلد اول ص ۳۵ [2] حیاتِ شبلی طبع ثانی ص ۵۰۰ مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ

[3] مطبع مجتبائی دہلی، ہندوستان کا مشہور مطبع رہا ہے، اس مطبع کو اولاً منشی ممتاز علی نے میرٹھ میں قائم کیا تھا۔ ۱۸۵۷ء/۱۲۷۴ھ کے ہنگامہ خیز انقلاب میں مطبع احمدی دہلی کے ختم ہو جانے کے بعد حضرت نانوتویؒ کی تصحیح کتب کا تعلق اس مطبع سے قائم ہو گیا تھا۔ ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء میں منشی صاحب حج کے لئے گئے تو مطبع مجتبائی کے حقوق مولوی عبدالہادی صاحب (وفات ۱۹۱۲ء) نے حاصل کر لئے۔ مولوی عبدالہادی صاحب نے منشی ممتاز علی کی اشرفی والی شمائل شریف کا ترجمہ چھاپا۔ اس کے علاوہ ملفوظات شاہ عبدالعزیز دہلویؒ اور شاہ صاحبؒ کی ایک دوسری کتاب میزان العلم وغیرہ شائع کیں۔ ان کے بعد ان کے فرزند مولانا قاضی بشیرالدین صاحب (وفات ۱۹۳۵ء) اس مطبع کو چلاتے رہے اور بعض مفید کتابیں تذکرہ عزیزیہ وغیرہ طبع ہوئیں۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

عہ جدِ امجد مولانا قاضی زین العابدین سجاد۔

قرین صحت ہے صحیح بخاری کے آخر میں جو مادہ تاریخ درج ہے اس میں لکھا ہے: ـ ۱هذه مادة

تاریخ ختم الطبع استخرجها المولوی محمد عمر بن المولوی احمد سعید المجددی

قد طبع اصح کتب بعد کتب اللہ ۱۲۷۰

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ملک کی تقسیم کے بعد یہ مطبع بند ہوگیا۔

۱۲۸۶ھ / ۱۸۶۹ء میں منشی ممتاز علی نے حج سے واپس آکر میرٹھ کے بجائے دہلی میں مطبع مجتبائی از سر نو قائم کیا۔ ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۶ء میں منشی صاحب ہجرت کر کے مکہ مکرمہ چلے گئے، اور اپنا مطبع مولوی عبدالاحد صاحب کو پانچسو روپے میں فروخت کر دیا۔ ۱۹۲۰ء / ۱۳۳۹ھ میں مولانا عبدالاحد کے انتقال کے بعد مطبع مجتبائی ان کے کئی فرزندوں میں تقسیم ہوگیا۔ ۱۹۴۷ء / ۱۳۶۶ھ میں جب اس خاندان کے افراد پاکستان چلے گئے تو مطبع ختم ہوگیا۔ مطبع مجتبائی دہلی میں جامع مسجد کے قریب محلہ چوڑی والان میں واقع تھا۔

مولوی عبدالاحد مرحوم نے مطبع مجتبائی دہلی کو بہت ترقی دی، اس مطبع کی چھپی ہوئی کتابیں صحت کے لحاظ سے بڑی قابلِ قدر سمجھی جاتی تھیں، لوگ مطبع مجتبائی کی مطبوعات کو تلاش کر کے فراہم کرتے تھے۔

مطبع مجتبائی دہلی سے عربی، فارسی اور اُردو کی ہزاروں کتابیں طبع ہو کر شائع ہوئیں، درسِ نظامی کی تقریباً سبھی کتابیں اس مطبع میں چھپی تھیں، غرض کہ اس مطبع نے اسلامی علوم و فنون کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔

مطبع مجتبائی میں جید اور مستند علماء تصحیح و تالیف اور حواشی کا کام انجام دیتے تھے۔ مولانا محمد احسن نانوتویؒ، مولانا محمد منیر نانوتویؒ، مولانا نظام الدین کیرانوی، مولوی خلیل الرحمٰن برہانپوری، مولوی محمد اسحاق اور مولوی محمد بیگ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

یوسف بخاری دہلوی نے لکھا ہے کہ: "مطبع نول کشور لکھنؤ کے بعد اگر کسی مطبع نے لازوال شہرت پائی تو وہ واحد مطبع مجتبائی دہلی تھا، سیکڑوں مذہبی، تاریخی اور ادبی کتابوں کے درجنوں ایڈیشن اور لاکھوں نسخے چھاپ ڈالے، یہ ایسا عظیم کارنامہ ہے کہ آج ہمارے کتب خانے مختلف علوم و فنون کی کتابوں سے معمور نظر آتے ہیں۔"

(مولانا محمد احسن نانوتوی ص ۱۶۱ و سوانح قاسمی اور یہ دلّی ہے" از یوسف بخاری دہلوی ص ۱۰۳۔

سید محبوب رضوی

مذکورہ بالا تفصیلات کی رُو سے ۱۲۶۹ھ ۱۸۵۲ء ہی وہ زمانہ ہو سکتا ہے جس میں حضرت نانوتویؒ نے صحیح بخاری کے آخری پانچ یا چھ پاروں کی تصحیح کی اور تحشیہ لکھا ہے۔

حضرت نانوتویؒ کا سال ولادت ۱۲۴۸ھ ۱۸۳۲ء ہے۔ اس لئے تصحیح اور حاشیے کی تحریر کے وقت اُن کی عمر زیادہ سے زیادہ اکیس سال ہوتی ہے۔ حضرت مولانا سید مناظر حسن گیلانیؒ نے مبہم طور پر بائیس تیئیس سال کی عمر بتائی ہے لکھا ہے کہ "غالباً بائیس تیئیس سال سے زیادہ حضرت والا کی عمر نہ ہوگی" ۔ ؎

جو لوگ حضرت نانوتویؒ کی عبقریت سے واقف نہ تھے اُن کو صحیح بخاری کی تصحیح و تحشیہ کا جیسا مہتم بالشان علمی کام ایک نو عمر کے سپرد کئے جانے پر تعجب ہونا ہی چاہیے تھا، مگر حضرت مولانا احمد علیؒ کی بالغ نظر نے اپنے اس شاگرد کی غیر معمولی ذہانت و ذکاوت اور تبحر علم کو کما حقہٗ پہچان لیا تھا۔

درسِ حدیث کا طریقہ

درسِ حدیث میں مذہبِ حنفیہ کے اثبات و ترجیح کا وہ طریقہ اور تنقیحات و تشریحات کا وہ انداز جو آج دارالعلوم دیوبند کا طرۂ امتیاز ہے اور کم و بیش مدارسِ عربیہ کے درسِ حدیث میں مروج و متداول ہے اسے فروغ دینے میں حضرت نانوتویؒ کا بڑا حصہ ہے، تیرھویں صدی ہجری کے وسط تک درسِ حدیث میں صرف حدیث کا ترجمہ اور مذاہب اربعہ کا بیان کر دینا کافی سمجھا جاتا تھا، مگر جب اہلِ حدیث کی جانب سے احناف پر شد و مد کے ساتھ یہ الزام لگایا گیا کہ ان کا مذہب حدیث کے مطابق نہیں ہے تو حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحبؒ اور اُن کے بعض تلامذہ نے مذہبِ حنفی کے اثبات و ترجیح پر توجہ فرمائی، دارالعلوم میں حضرت نانوتویؒ، حضرت شیخ الہندؒ اور دوسرے حضرات نے اس کو یہاں تک فروغ دیا کہ آج حدیث کی کوئی معروف درس گاہ اس سے خالی نظر نہیں آتی۔

؎ سوانح قاسمی جلد اول ص ۳۵۱ مطبوعہ مشنل پریس دیوبند۔

حضرت نانوتویؒ کے درس سے کما حقہٗ استفادہ صرف وہی طلبار کر سکتے تھے جو خود ذی استعداد اور ذہین و ذکی ہوں نیز پہلے سے کتاب کا بغور مطالعہ کر چکے ہوں، حضرت نانوتویؒ کی ذہانت و ذکاوت و بالغ نظری اور قوتِ استدلال کا فی الجملہ اندازہ اُن کی تصانیف سے کیا جا سکتا ہے، اُن کا یہ قول تھا کہ "کتاب و سنت کے تمام احکام سراسر عقلی ہیں، البتہ ہر شخص کی عقل کو وہاں تک رسائی نہیں ہو سکتی" حکیم منصور علی خاں مراد آبادی جو حضرت نانوتویؒ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں اپنی تصنیف مذہبِ منصور میں حضرت کے درس و تقریر کی خصوصیات کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ:

"حقیقت یہ ہے کہ حضرت نانوتویؒ جب کسی اہم اور مشکل مسئلہ کو جمہور کے تصورات کے خلاف ثابت فرماتے تو بڑے بڑے اربابِ علم و فضل حیران اور انگشت بدنداں رہ جاتے تھے جو حکم ظاہر میں قطعاً بے دلیل و برہان معلوم ہوتا وہ تقریر کے بعد عقل کے عین مطابق معلوم ہونے لگتا تھا، آپ کے پیش کردہ دلائل کے خلاف بڑے بڑے اربابِ علم و فضل کو جرأت نہ ہوتی تھی۔"[1]

ارواحِ ثلاثہ میں حضرت شیخ الہندؒ کا یہ بیان مذکور ہے، فرماتے ہیں:-

"میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تصنیفات دیکھ کر حضرت نانوتویؒ کے درس میں حاضر ہوتا تھا اور وہ باتیں پوچھتا تھا جو شاہ صاحبؒ کی تصنیفات میں غائت مشکل ہوتی تھیں، شاہ صاحبؒ کے یہاں جو آخری جواب ہوتا تھا وہ حضرت اوّل ہی مرتبہ فرما دیتے تھے، میں نے بارہا اس کا تجربہ کیا۔"[2]

دارالعلوم کے ابتدائی زمانے میں چند دن چھتہ کی مسجد میں اُقلیدس کا درس دیا ہے، دورانِ درس میں جب طلبار کو کسی شکل کے سمجھانے کی ضرورت پیش آتی تو بغیر آلات کی مدد کے انگلی سے زمین پر شکل کھینچ کر سمجھا دیتے تھے، دراں حالیکہ ریاضی اور اقلیدس کا مطالعہ آپ نے دہلی کالج میں

---

[1] مذہبِ منصور جلد دوم ص ۸۰، [2] ارواحِ ثلاثہ حکایت نمبر ۲۴۴۔

بغیر استاد کی رہنمائی کے بطور خود کیا تھا، حضرت نانوتویؒ کا درس بالعموم مطابع ہی کی چہار دیواری میں ہوتا تھا جس میں صرف خاص خاص لوگ شریک ہوتے تھے، آپ کے فیضِ تعلیم نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ۔ مولانا احمد حسن امروہیؒ اور مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ وغیرہم جیسے باکمال نامور علماء کی ایسی جماعت پیدا کی جس کی نظیر حضرت شاہ عبدالغنیؒ کے بعد نظر نہیں آتی، اور پھر دارالعلوم جیسے مرکزی تعلیمی ادارے کے ذریعے سے علوم دینیہ کا نظام قائم کیا، جو اب اپنی گوناگوں نوعیت کے لحاظ سے ایشیا کی سب سے بڑی دینی درس گاہ ہے۔

حضرت مولانا نانوتویؒ کی تعلیم و تدریس کی چند خصوصیات نہایت اہم ہیں۔ ایک بڑی خصوصیت تو یہ تھی کہ انھوں نے درس و تدریس کو کبھی حصولِ معاش کا ذریعہ نہیں بنایا۔ دولت مند نہ ہونے کے سبب سے مجبوراً حصولِ معاش کے لئے ملازمت اختیار کی، مگر تعلیمی کے بجائے مطبع میں تصحیح کتب کی، اور پھر تنخواہ میں بھی عام روش کے برخلاف اضافے کے بجائے تخفیف پر اصرار فرماتے تھے اور اس قدر کم تنخواہ پر قناعت فرماتے جس میں بدقت اور بمشکل گذر کیا جا سکے۔ دس پندرہ روپے سے زیادہ کبھی تنخواہ لینا قبول نہ کیا، وقت کا بڑے سے بڑا عہدہ جو کسی ہندوستانی کو دیا جا سکتا تھا وہ بقول حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ آپ کی چشم و ابرو کے ادنیٰ اشارہ پر مل سکتا تھا، چناں چہ آپ کے تعلیمی زمانے کے معاصرین جو علمی استعداد میں آپ سے کہیں فروتر تھے محکمہ تعلیم میں بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز ہو گئے، مگر آپ نے تعلیمی ملازمت قبول کرنا پسند نہیں فرمایا، آپ کے والد مختصر سی زمین رکھتے تھے اور یہ اُمید لگائے بیٹھے تھے کہ بیٹا لکھ پڑھ کر جب عالم بن جائے گا تو معقول تنخواہ کی کوئی ملازمت ملجائیگی مولانا کے معاصرین جب اچھے اچھے عہدوں پر فائز ہو گئے اور مولانا نے ملازمت کی جانب التفات نہ فرمایا تو والد کو بہت افسوس ہوا اور بر سبیل شکایت حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ سے عرض کیا کہ "میرے یہی تو ایک بیٹا تھا اور اس سے بہت کچھ اُمیدیں وابستہ تھیں کچھ کماتا اور نوکری کرتا تو ہمارا افلاس دور ہو جاتا، خدا جانے آپ نے کیا کر دیا کہ نوکری کے لئے

نیاز نہیں ہوتا" حضرت حاجی صاحبؒ اس وقت تو سُن کر چپ ہو رہے، مگر دوسرے وقت کہلا بھیجا کہ "تم تنگی کی شکایت کرتے ہو، حق تعالےٰ ان کو نوکری کے بغیر ہی اتنا کچھ عنایت فرمائیگا کہ نوکری سے اچھے رہیں گے، اور بڑے بڑے عہدے والے اُن کی خدمت پر فخر کیا کریں گے"۔

علوم عربیہ کی تعلیم و تعلم، مدارس اور جماعت بندی وغیرہ کا جو طریقہ آج مُروّج و متداول ہے علمائے سلف کا طریق اس سے مختلف تھا، عام طور پر علماء اپنے مکانوں اور مساجد میں بیٹھ کر بطور خود لوجہ اللہ تعلیم دیتے تھے، حصولِ معیشت کے لئے تجارتی کاروبار کرتے یا متوکلانہ زندگی گذارتے تھے، اکثر یہ بھی ہوتا تھا کہ ایسے علماء جو بغیر کسی کاروبار معیشت کے متوکلانہ تعلیم و تدریس میں مشغول رہتے تھے حکومت کی جانب سے اُن کے لئے معقول وظائف مقرر ہو جاتے تھے، حضرت نانوتویؒ نے حالات کی سخت نامساعدت کے باوجود سلف کی اس متاعِ عزیز کو جس ہمت و استقلال اور استغنائے قلب کے ساتھ برقرار رکھا وہ آپ ہی کا حصہ تھا، حضرت حاجی صاحبؒ آپ کی نسبت فرمایا کرتے تھے کہ "پہلے زمانے میں کبھی ایسے لوگ ہوا کرتے تھے، اب مدتوں سے نہیں ہوتے"۔

تحصیل علم سے فراغت کے بعد حضرت نانوتویؒ نے ذریعۂ معاش کے لئے مطبع احمدی دہلی میں تصحیح کتب کا کام اختیار فرمایا اور پھر آخر تک یہی ذریعۂ معاش رہا، تصحیح کتب کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی ہمیشہ جاری رہا، صحاح ستہ کے علاوہ مثنوی مولانا رومؒ اور دوسری کتابیں بھی پڑھاتے تھے، مگر درس کسی مدرسہ کے بجائے مطابع کی چہار دیواری، مسجد یا مکان پر ہوتا تھا، جہاں خاص خاص تلامذہ زانوئے ادب تہ کرتے تھے۔

تواضع اور استغناء

مزاج میں استغناء اور عجز و انکسار اس درجے کا تھا کہ علماء کی مخصوص وضع جبہ و دستار وغیرہ کا کبھی استعمال نہیں کیا، تعظیم سے بہت گھبراتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ "اس نام کے علم نے خراب کیا ورنہ اپنی وضع کو ایسی خاک میں

ملتا کہ کوئی یہ بھی نہ جانتا کہ قاسم نامی کوئی شخص پیدا بھی ہوا تھا جن امور میں نمایاں ہونے کا موقع ہوتا اُن سے عموماً دور رہتے تھے۔ [1]

۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء میں حج کے لئے تشریف لے گئے واپسی کے بعد مطبع مجتبائی میرٹھ میں تصحیح کتب کی ملازمت کرلی ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء تک اسی مطبع سے وابستہ رہے، اسی زمانے میں دوسری مرتبہ حج کے لئے جانا ہوا اور اُس کے بعد مطبع ہاشمی میرٹھ سے تعلق قائم ہوگیا، اس دوران میں درس و تدریس کا مشغلہ برابر جاری رہا مگر کسی مدرسہ کی ملازمت کبھی پسند نہیں کی، سوانح مخطوط کے مصنف نے لکھا ہے۔

"یہ سب کو معلوم ہے کہ مدرسہ اسلامی دیوبند آپ ہی کا ساختہ پرداختہ ہے اور کیا کچھ اس کا کارخانہ ایک چھوٹی سی سرکار، مگر ہرگز کسی چیز سے نفع نہیں اٹھایا، اوائل میں اہل شوریٰ نے درخواست کی کہ آپ بھی اس مدرسہ کی مدرسی قبول فرمایئے اور اس کے عوض کسی قدر تنخواہ، مگر قبول نہ فرمایا اور کبھی کسی طور اور ڈھنگ سے ایک حبہ تک کے لئے مدرسے سے رُوادار نہ ہوئے۔ حالاں کہ رات دن مدرسے کی خوش اُسلوبی میں مصروف رہتے اور تعلیم میں مشغول، اور اگر کبھی مدرسے کے قلم دوات سے اپنا کوئی خط لکھ لیتے تو فوراً ایک آنہ مدرسے کے خزانہ میں داخل کردیتے۔" [2]

تحفظ اسلام کیلئے خدمات اور اجرائے مدارس

حضرت نانوتوی کا سب سے بڑا اور عظیم کارنامہ ہندوستان میں علوم دینیہ کی نشاۃ ثانیہ کے لئے تعلیمی تحریک کا احیاء اور مدارس دینیہ کے لئے وہ رہنما اصول وضع کرنا ہے جن پر مدارس دینیہ کی بقا کا انحصار ہے۔ اُن کی توجہ اور ترغیب سے مختلف مقامات پر دینی مدارس جاری ہو گئے چناں چہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر، گلاؤٹھی ضلع بلند شہر، کیرانہ ضلع مظفر نگر، دان پور ضلع بلند شہر اور میرٹھ و مراد آباد وغیرہ میں مدارس قائم ہو گئے، جن میں سے اکثر اب تک موجود ہیں، اور اپنے گرد و نواح میں علمی اور دینی خدمات انجام دے رہے ہیں، ان کی تفصیل باب سوم میں آئے گی۔

---

[1] سوانح قاسمی ص ۱۰ [2] سوانح مخطوط بحوالہ سوانح قاسمی جلد اول ص ۵۳۲ -

ہندوستان میں انگریزی اقتدار کے دوش بدوش عیسائیت نے بھی بڑا فروغ حاصل کیا تھا۔ اور ہر ممکن صورت سے ہندوستان کے لوگوں خصوصاً مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی زبردست کوشش کی گئی، کمپنی کی تائید و اعانت سے ملک کے طول و عرض میں مسیحی تبلیغ و تنظیم کے آثار قائم کئے گئے اور انقلاب ۱۸۵۷ء ۱۲۷۳ھ کے بعد تو اس سلسلے کو بڑی وسعت ہوئی پادری بازاروں میلوں اور عام مجموں میں اسلام اور آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر اعتراضات کرنے لگے، حضرت نانوتویؒ نے دلی کے قیام کے زمانے میں جب یہ صورت حال دیکھی تو اپنے شاگردوں سے فرمایا کہ وہ بھی اسی طرح کھڑے ہو کر بازاروں میں وعظ کہا کریں اور پادریوں کا رد کریں، ایک روز خود بھی بغیر تعارف اور اظہار نام مجمع میں پہونچے اور پادری تاراچند سے مناظرہ کیا اور اس کو سر بازار شکست دی، اس کے بعد ان کا تعارف مشہور مناظر اسلام مولانا ابوالمنصور ناصرالدین علی دہلوی (وفات ۱۳۲۰ھ ۱۹۰۲ء) سے ہوا، یہ ربیع الاول ۱۲۹۳ھ تا جمادی الثانیہ ۱۲۹۳ھ کے درمیان کا واقعہ ہے۔

اس زمانے میں حضرت نانوتویؒ منشی ممتاز علی کے مطبع مجتبائی دہلی میں مقیم تھے۔

میلہ خداشناسی شاہجہاں پور

انگریزی حکومت نے ایک خطرناک سازش یہ کی کہ ہندوؤں کو مسلمانوں کے مقابلے میں لا کھڑا کیا، ہندوستان میں مسلمانوں کو سیاسی اہمیت حاصل رہی تھی، انگریزوں نے اپنی پالیسی کے تحت ہندوؤں کو بڑھایا اور مسلمانوں کو گھٹایا، جب معاشی و سیاسی میدان میں ہندو آگے بڑھ گئے تو ان کو مذہبی برتری کی راہ سجھائی اور ہندوؤں کو مسلمانوں کے مقابلے میں مناظرہ کے لئے تیار کیا اور اس کے مواقع بھی بہم پہنچائے گئے کہ ہندو مسلمانوں سے کھلے عام مناظرے کریں۔

شاہجہاں پور (یوپی) کے قریب چاندا پور گاؤں میں وہاں کے زمیندار پیارے لال کبیر پنتھی پادری نولس کی سربراہی اور رابرٹ جارج کلکٹر شاہجہاں پور کی تائید و اجازت سے ۸ رمئی ۱۸۷۶ء کو ایک میلہ خداشناسی منعقد ہوا جس میں عیسائی ہندو اور مسلمان تینوں مذاہب

کے نمائندوں کو بذریعے اشتہارات دعوت دی گئی کہ وہ اپنے اپنے مذاہب کی حقانیت کو ثابت کریں مولانا محمد منیر نانوتوی اور مولوی الٰہی بخش رنگین بریلوی کی تحریک پر حضرت نانوتوی مولانا محمود الحسن، مولانا رحیم اللہ بجنوری اور مولانا فخرالحسن کے ہمراہ اس میلے میں پہونچے، حضرت مولانا نانوتوی کے علاوہ مولانا ابوالمنصور دہلوی، مرزا موحد جالندھری، مولوی احمد علی دہلوی، میر حیدر دہلوی مولوی نعمان بن لقمان اور مولانا رنگین بریلوی بھی شریک ہوئے، ان تمام علماء نے اس میلے میں تقریریں کیں اور ان کا خاطر خواہ اثر ہوا، حضرت نانوتوی نے ابطالِ تثلیث و شرک اور اثبات توحید میں ایسا بیان کیا کہ حاضرین جلسہ مخالف و موافق سب مان گئے،

ایک اخبار لکھتا ہے :-

۸ مئی سنہ حال (۱۸۷۶ء) کے جلسہ میں مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے درس دیا اور فضائلِ اسلام بیان کئے، پادری صاحب نے تثلیث کا بیان عجیب طور سے ادا کیا کہ ایک خط میں تین اوصاف پائے جاتے ہیں، طول، عرض، عُمق سو تثلیث ہر طرح ثابت ہے، مولوی صاحب موصوف نے اس کا رد اسی وقت کر دیا پھر پادری صاحب اور مولوی صاحب تقریر کے معاملہ میں بحث کرتے رہے، اس میں جلسہ برخاست ہو گیا، تمام قرب و جوار اور چاروں طرف شور و غل مچ گیا کہ مُسلمان جیت گئے، جہاں ایک عالم اسلام کا کھڑا ہوتا اس کے اردگرد ہزاروں آدمی جمع ہو جاتے تھے اول روز کے جلسے میں جو اعتراضات اہلِ اسلام کے تھے ان کا جواب عیسائیوں نے کچھ نہ دیا، مُسلمانوں نے عیسائیوں کے جوابات حرف بحرف دیئے اور فتح یاب ہوئے ۔ [1]

دوسرے سال مارچ ۱۸۷۷ء میں یہ میلہ پھر منعقد ہوا، اس مرتبہ منشی اندرمن مرادآبادی

---

[1] اخبار "خیرخواہ عالم" دہلی مورخہ ۱۹ مئی ۱۸۷۶ء بحوالہ تاریخ صحافت اُردو جلد دوم حصہ اول ص ۱۳۱-۱۳۲ نیز دیکھیے "دی آریہ سماج" انگریزی از دیوان چند ص ۱۲۲ ۔

اور آریہ سماج کے بانی پنڈت دیانند جی (متوفی ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء) بھی شریک ہوئے، دیانند جی نے سنسکرت آمیز ہندی میں تقریر کی، پادری نولس نے ایک دوسرے پادری اسکاٹ کو بھی بلایا تھا۔ حضرت نانوتوی کی تقاریر بحثِ وجود اور توحید اور تحریف پر ہوئیں اور نہایت کامیاب رہیں۔

اس مرتبہ علمائے اسلام کے طعام و قیام کے فرائض محمد طاہر موتی میاں[1] نے انجام دئے۔

حضرت نانوتوی نے میلہ خداشناسی میں دونوں سال شریک ہو کر عیسائیوں کی سازش کو ناکام بنا دیا۔ اس موقع پر پروفیسر محمد ایوب قادری نے مولانا احمد حسن نانوتوی کی سوانح میں لکھا ہے:—

"ایک بات یہاں خاص طور پر غور طلب ہے کہ میلہ خداشناسی شاہجہاں پور اعلان و اشتہار کے ساتھ دو سال منعقد ہوا اور اس میں ایک طرح سے مذہبِ اسلام کو چیلنج کیا گیا تھا، شاہ جہاں پور سے بریلی اور بدایوں بالکل قریب اور متصل اضلاع ہیں مگر اس میلے میں علمائے بدایوں و بریلی کی کسی دل چسپی کا سراغ نہیں ملتا۔"[2]

مناظرہ رڑکی

شوال ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء میں مولانا محمد قاسم نانوتوی علمائے کرام کی ایک جماعت کے ساتھ حج کے لئے تشریف لے گئے ربیع الاول ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء میں واپس

---

[1] محمد طاہر موتی میاں کو مولانا مناظر احسن گیلانی نے شاہ مدن شاہ آبادی (وفات ۱۱۸۲ھ) کی اولاد لکھا ہے، جو صحیح نہیں ہے، موتی میاں مولوی مدن (مجد الدین) (وفات ۱۲۳۸ھ) کے پرپوتے تھے، موتی میاں ابن مولوی عبد اللہ بن مولوی نظام الدین بن مولوی مجد الدین عرف مولوی مدن، (ملاحظہ ہو تاریخ شاہجہاں پور از میاں صبیح الدین ص ۱۴۷ - ۱۵۷ مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۳۲ء)

[2] مولانا محمد احسن ص ۲۲۱ -

ہوئے، واپسی میں جدہ سے حضرت نانوتویؒ کی طبیعت خراب ہوگئی، وطن آکر طبیعت کسی قدر سنبھل گئی مگر مرض رفع نہ ہوا، اسی سال شعبان ۱۲۹۵ھ میں رڑکی سے اطلاع ملی کہ پنڈت دیانند جی یہاں پہنچے ہیں اور مذہب اسلام پر اعتراض کرتے ہیں، مولانا نانوتویؒ باجود کمزوری اور بیماری کے رڑکی پہنچے، ہر چند چاہا کہ مجمع عام میں پنڈت جی سے گفتگو ہو جائے۔ مگر وہ اس کے لئے تیار نہ ہوئے اور رڑکی سے چلے گئے، حضرت نانوتویؒ کے ایما پر حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ اور مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے عام جلسوں میں تقریریں کیں اور پنڈت جی کو چیلنج کیا، حضرت مولانا نانوتویؒ نے جلسۂ عام میں اُن کے اعتراضات کے جواب دیئے اور استقبالِ قبلہ کے جواب میں ایک رسالہ لکھا ہے [1]

اس کے بعد پنڈت جی میرٹھ پہنچے انھوں نے وہاں بھی وہی انداز اختیار کیا مسلمانانِ میرٹھ کی درخواست پر حضرت نانوتویؒ میرٹھ تشریف لے گئے، پنڈت جی نے وہاں بھی گفتگو کرنا منظور نہ کیا، مجبوراً حضرت نانوتویؒ نے میرٹھ کے جلسۂ عام میں اپنی پُر زور تقریر کے ذریعے سے اعتراضات کے جواب دئے۔

تحریکِ اصلاح عقدِ بیوگان

عقدِ بیوگان کی ترویج بھی اُن کا ایک عظیم الشان معاشرتی اور اصلاحی کارنامہ ہے، تیرھویں صدی کے آخر تک عقدِ بیوگان بہت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ لوگ اس کی شناعت کو محسوس کرتے تھے مگر اس کو ختم کرنے کی کسی میں ہمت نہ تھی، سید احمد شہیدؒ۔ مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ دہلوی۔ مولانا مملوک علی نانوتویؒ۔ مولانا مظفر حسین کاندھلوی۔ مولانا محمد احسن نانوتویؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی مساعی جمیلہ سے عقدِ بیوگان کو خوب شیوع ہوا، حضرت نانوتویؒ نے اپنی بیوہ بہن کو جو عمر میں اُن سے بہت بڑی تھیں اور بوڑھی ہو چکی تھیں نکاح پر آمادہ کر کے اس قبیح رسم

---

[1] ملاحظہ ہو انتصار الاسلام از مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ص ۲۔، مطبوعہ دیوبند ۱۹۵۲ء۔

کو اس طرح توڑ دیا کہ اب کوئی یہ بھی نہیں جانتا کہ یہاں کبھی یہ رسم موجود بھی تھی۔

جنگِ آزادی میں شرکت

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انھوں نے مردانہ وار حصہ لے کر شاملی ضلع مظفر نگر کی تحصیل فتح کرڈالی مگر اس وقت کے بگڑے ہوئے سیاسی حالات نے شاملی سے آگے بڑھنے کا موقع نہ دیا۔ جنگِ شاملی کا یہ واقعہ اتنا مشہور ہے کہ یہاں اُس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے:

حضرت نانوتویؒ کی دو درجن سے زیادہ تصانیف اُن کی یادگار ہیں، انھوں نے اپنے زمانے میں اُن مسائل پر قلم اٹھایا ہے جو اس وقت زیادہ تر زیر بحث تھے، اُن کی تمام کتابیں کسی نہ کسی کے استفسار کے جواب میں لکھی گئی ہیں، منشی ممتاز علیؒ[۱] مالک مطبع مجتبائی دہلی نے ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء میں حضرت نانوتویؒ کی تصانیف کی اشاعت کا ایک پروگرام بنایا تھا، اس پروگرام کی اطلاع کیلئے انھوں نے جو اشتہار چھاپا تھا اس میں لکھتے ہیں:-

---

[۱] منشی ممتاز علی ابن شیخ امجد علی میرٹھی اپنے زمانے کے مشہور خطاط تھے، نزہت رقم اُن کا لقب تھا، فنِ خطاطی میں بہادر شاہ ظفر کے شاگرد تھے، اُن کے لکھے ہوئے قرآن مجید صحت اور املا کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں، منشی صاحب کے تلامذہ کا حلقہ بڑا وسیع تھا، منشی صاحب پہلے دہلی میں مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ کے مطبع احمدی میں کتابت کرتے تھے، ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد انھوں نے میرٹھ میں اپنا مطبع مجتبائی کے نام سے قائم کیا، حضرت نانوتویؒ اُنہی کے مطبع میں کام کرتے تھے، ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء میں جب منشی صاحب حج کے لئے گئے تو مطبع مجتبائی کے حقوق مولوی عبدالہادی مرحوم نے حاصل کر لئے، اگلے سال حج سے واپس آکر انھوں نے ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء میں میرٹھ کے بجائے دہلی میں مطبع مجتبائی قائم کیا، ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء میں منشی صاحب نے مکہ مکرمہ ہجرت کا ارادہ کیا تو پانچ سو روپے میں مطبع مجتبائی دہلی مولوی عبدالاحد مرحوم کو فروخت کر دیا۔ مرزا غالب کے خطوط میں منشی ممتاز علی مرحوم کا ذکر کیا گیا ہے۔ غالب کی عودِ ہندی کو سب سے پہلے انھوں نے مطبع مجتبائی میرٹھ میں چھاپا تھا۔ سید محبوب رضوی

"جناب مولوی محمد قاسم صاحب کو اکثر اصحاب جانتے ہوں گے، مناقشہ مجادلہ کو حذر کرتے ہیں اور عالم بے تعلقی میں آزادانہ بسر کرتے ہیں، اگر کسی صاحب نے بلاد دُور دست سے کسی مسئلہ مشکل میں کچھ استفسار کیا تو اُس کا جواب لکھدیا ورنہ کسی سے کچھ کام نہیں اور کیوں کر ہو نفسانیت کا نام نہیں، بندہ اُن کی وضع آزادانہ کا عاشق اور اُن کے کلام محققانہ کا شائق ہے، مدت سے اس فکر میں تھا کہ کسی طرح آپ کا کلام حاصل کیجئے اور چھاپ کر عالی طبعانِ روزگار کو تماشا قدرت کا دکھا دیجئے۔ شرعی مسائل کو عقلی دلائل سے ثابت کرنے اور فلاسفہ کے مسائل عقلی دلائل سے رد کرنے میں اُن کو زبردست کمال حاصل تھا۔"[۱]

وفات

حضرت نانوتوی ؒ نے ۴۹ سال کی عمر میں ۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء کو پنجشنبہ کے دن وفات پائی، دارالعلوم کے شمالی جانب آپ کا مزار پرانوار ہے، قبر طریقِ سنت کے مطابق کچی ہے، یہ جگہ قبرستانِ قاسمی کے نام سے موسوم ہے، یہاں بے شمار علماء طلباء اور صلحاء اور دوسرے بہت سے لوگ آسودۂ خواب ہیں۔

حضرت نانوتوی ؒ کی وفات پر بہت سے لوگوں نے تاریخی قطعات لکھے، ذیل میں حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانی ؒ کا قطعۂ تاریخ درج کیا جاتا ہے، یہ قطعۂ تاریخ اب تک دارالاہتمام میں آویزاں ہے۔ اس کے سرنامہ کی عبارت انہی کے الفاظ میں یہ ہے :-

"قطعۂ تاریخ وفات نبلہ اربابِ دین کعبہ اصحابِ یقین حضرت مولانا مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی ؒ قدس سرہٗ بانی و سرپرست مدرسہ اسلامیہ دیوبند بتاریخ ۴ جمادی الاولیٰ یوم پنجشنبہ وقت صلوٰۃ ظہر ۱۲۹۷ھ کو دار آخرت کی طرف رحلت فرمائی۔ قطعہ تاریخ وفات یہ ہے :-

---

[۱] مولانا محمد احسن نانوتوی ص ۲۲۵۔

وہ غم ہے قاسم بزمِ ہُدیٰ کی رحلت کا — کہ جرعہ نوشِ الم جس سے ہر درد نہ ہے
یہ ایسا غم ہے کہ جس غم سے بزمِ عرفاں کا — مثالِ خُم فلک جام واژ گو نہ ہے
کچھ اک زمیں ہی نہیں زرد رنگ اس غم سے — لباس چرخ بھی ماتم میں نیلگو نہ ہے
ہے حامیانِ شریعت کو گو غم بے حد — تو سالکانِ طریقت کو اوس سے دو نہ ہے
کہاں ہے، مدرسۂ دین کا، حامیٔ برحق — کہ ملکِ علم و عمل اوس بغیر سو نہ ہے
نہ پوچھ حال دلِ زار تشنگانِ علوم — کہ اون کی زیست تیرے ہجر میں جگو نہ ہے
کیا ہے شعلۂ ہجراں نے گر جگر کو کباب — تو آتشِ غمِ فرقت نے دل کو بھونا ہے
نگر مزارِ مقدس سے تیرے اے خوش خُو — تیرے فدائیوں کو صبر ایک گو نہ ہے
سرِ الم سے لکھی، فضلؔ نے سِنینِ وفات — وفات سرورِ عالم کا یہ نمو نہ ہے
۱۲۹۷ھ

اکابرِ ستّہ

جو حضرات شروع سے دارالعلوم کے قیام اور اس کے نظام کو چلانے میں شریک رہے اُنکے اسمائے گرامی یہ ہیں :۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، حضرت حاجی سید محمد عابد صاحب دیوبندیؒ، حضرت مولانا رفیع الدین دیوبندیؒ، حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندیؒ اور حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانی دیوبندیؒ۔ حضرت نانوتویؒ کے حالات اوپر گذر چکے ہیں، بقیہ اول الذکر اکابرِ ثلاثہ کے حالات آئندہ ابواب میں پیش کئے جائیں گے، آخر الذکر دو حضرات کے حالات درج ذیل ہیں :۔

مولانا ذوالفقار علیؒ

حضرت مولانا ذوالفقار علیؒ، حضرت مولانا محمود حسنؒ کے والد ماجد تھے، دہلی کالج میں حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ (وفات ۱۲۶۷ھ / ۱۸۵۱ء) سے پڑھا، فراغت کے بعد بریلی کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے، چند سال کے بعد محکمہ تعلیم میں ڈپٹی انسپکٹر ہوگئے۔ عربی زبان و ادب پر بڑی دسترس تھی، دیوان حماسہ کی شرح تسہیل الدراسہ، دیوان متنبی کی شرح تسہیل البیان، سبعہ معلقہ کی شرح التعلیقات

علی السبع المعلقات، قصیدہ بانت سعاد کی شرح ارشاد اور قصیدہ بردہ کی شرح عطرالورد ہ اردو میں تحریر فرمائیں مولانا نے ان شروح میں عربی کے غریب اور مشکل الفاظ اور محاورات کا ایسا سلیس و بامحاورہ ترجمہ اور ایسی دل نشین تشریح کی ہے جس کی بدولت عربی ادبیات کی یہ سنگلاخ کتابیں طلبا ر کے لئے نہایت سہل اور آسان ہوگئی ہیں۔ معانی و بیان میں تذکرۃ البلاغت اور ریاضی میں تسہیل الحساب اُن کی یادگاریں ہیں۔

۱۳۰۷ھ میں عربی زبان میں ایک مختصر رسالہ الہدیۃ السنیہ فی ذکر المدرسۃ الاسلامیہ الدیوبندیہ کے نام سے لکھا ہے جس میں بزرگان دارالعلوم کے اوصاف و کمالات اور سرزمین دیوبند کی خصوصیات پر بڑے لطیف اور ادیبانہ انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے۔

مولانا ذوالفقار علیؒ کے متعلق فرانس کا مشہور مصنف گارسان دتاسی لکھتا ہے کہ:۔

"وہ دہلی کالج کے طالب علم تھے، چند سال کے لئے بریلی کالج میں پروفیسر ہو گئے، ۱۸۵۷ء میں میرٹھ میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے، مسٹر ٹیلر ان سے واقف تھے، اُن کا بیان ہے کہ ذوالفقار علی ذہین اور طباع ہونے کے علاوہ فارسی اور مغربی علوم سے بھی واقف تھے۔ انھوں نے اُردو میں تسہیل الحساب کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، جو بریلی میں ۱۸۵۲ء میں چھپی ہے[۱]

مولانا ذوالفقار علیؒ پنشن پانے کے بعد دیوبند میں آنریری مجسٹریٹ رہے، وہ دارالعلوم دیوبند کے اولین بانیوں میں سے تھے، ۱۳۲۲ھ / ۱۹۰۴ء میں بعمر ۸۰ سال انتقال ہوا، حضرت نانوتویؒ کے پہلو میں جانب مشرق اُن کی قبر ہے، اُن کی بائیں جانب مولانا محمد احسن نانوتویؒ مدفون ہیں، مولانا فضل الرحمن عثمانیؒ کے ایک شعر سے اس کی دلچسپ نشان دہی ہوتی ہے، شعر یہ ہے

ہاں بجنب آسودہ تر ما بین دویاران خویش ❊ قاسم بزم مودت، احسن شائستہ خو

---

[۱] گارسان دتاسی بحوالہ مولانا محمد احسن نانوتوی ص ۲۷۔

مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ

حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ نے بھی دہلی کالج میں حضرت مولانا مملوک علیؒ سے تعلیم پائی تھی، دارالعلوم کے بانیوں میں سے تھے، مجلس شوریٰ کے آخر تک رکن رہے، فارسی و اُردو کے بلند پایا شاعر تھے متعدد نظمیں، قصیدے اور مرثیے وغیرہ اُن کے ذوقِ شعری کے آئینہ دار ہیں، دیوبند میں ۱۳۰۱ھ ۱۸۸۴ء میں ایک زبردست پلیگ پھیلا تھا، اس پلیگ کی تباہ کاریوں کو انھوں نے فارسی زبان میں نظم کیا ہے، اس نظم کا تاریخی نام "قصۂ غمِ دیوبن" (۱۳۰۱ھ) ہے، دیوبند کے حالات میں یہ ایک تاریخی دستاویز ہے، حضرت مولانا فضل الرحمٰنؒ کو مادۂ تاریخ کے نکالنے میں بھی بڑا کمال حاصل تھا، دارالعلوم کی رودادوں میں اُن کی بہت سی نظمیں اور تاریخی قطعات درج ہیں، محکمۂ تعلیم میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے پر فائز تھے، بریلی، بجنور اور سہارنپور وغیرہ اضلاع میں تعینات رہے ۱۸۵۷ء میں بریلی میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے، اس ہنگامے میں جب مولانا محمد احسن نانوتویؒ کو بریلی چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا تو اپنے بعض معاملات اُنہی کے سپرد کئے تھے۔[1]

حضرت مولانا فضل الرحمٰن نے ۱۳۲۵ھ ۱۹۰۷ء میں رحلت پائی، انھوں نے اپنے بعد اپنے فرزندوں میں حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ مفتیٔ اعظم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند جیسے مشاہیر اور یگانۂ روزگار علماء چھوڑے، ندوۃ المصنفین دہلی کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اُنہی کے پوتے ہیں، حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ کے اخلاف نے عظیم علمی اور دینی خدمات انجام دی ہیں، جن کا سلسلہ بحمداللہ اب تک جاری ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

دارالعُلوم سے حضرت گنگوہیؒ کے رسمی تعلق کا سراغ اگرچہ ۱۲۸۵ھ سے پہلے نہیں

---

[1] مولانا محمد احسن نانوتویؒ ص ۵۲۔

ملتا۔ لیکن اکابرِ دار العلوم کے ساتھ انھیں شروع ہی سے جو گہرا تعلق رہا ہے اس کی موجودگی میں یہ کیسے ممکن ہے کہ دار العلوم کی تحریک سے وہ بے تعلق رہے ہوں۔ قیام دار العلوم کے بعد بعض طلبار دار العلوم سے فراغت حاصل کر کے گنگوہ حاضر ہوتے اور حضرت گنگوہیؒ کے درس حدیث میں شریک ہو کر استفادہ کرتے تھے۔ اس لئے اکابرِ دار العلوم کے ساتھ حضرت گنگوہیؒ کا تذکرہ لازمی اور ضروری ہوجاتا ہے۔

حضرت گنگوہیؒ ۶ ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ کو دوشنبہ کے دن گنگوہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد مولانا ہدایت احمد اپنے زمانے کے جید عالم تھے، وہ دہلی کے حضرت شاہ غلام علی مجددیؒ سے مجاز تھے۔

حضرت گنگوہیؒ قرآن شریف وطن میں پڑھکر اپنے ماموں کے پاس کرنال چلے گئے، اور اُن سے فارسی کی کتابیں پڑھیں، پھر مولوی محمد بخش رام پوری سے صرف و نحو کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۲۶۱ھ میں دہلی پہنچکر حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا یہیں

ل ۱۲۸۵ھ کی روداد میں حضرت گنگوہیؒ کا یہ معائنہ درج ہے:۔

آج ۳ رجب ۱۲۸۵ھ کو یہ عاجز مدرسہ دیوبند میں حاضر ہوا، اور اتفاق ملاحظہ حال مدرسہ و مدرسین و طلبار ہوا، تو نقشے سے ہونا ۸۰ طلبار عربی خواں سوائے فارسی و قرآن خواں سے معلوم ہوا، کچھ کچھ جماعت متفرقہ کا جو سنا گیا تو فی الواقع اہتمام مہتمین اور حسن سعی مدرسین اور کوشش و محنت طلبار کو قابل تحسین و آفرین پایا، اگر ایسی ہی سعی کرتے رہیں گے تو یقین غالب ہے کہ چند مدت میں تحصیل عربی سے فراغت پاکر فیض رسانِ علوم دینیہ ہوں گے فقط العبد الراجی رحمت اللہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ

ع گنگوہ ضلع سہارنپور کا قدیم قصبہ ہے، جو قدیم ہندوستان کے راجہ گنگ کے نام سے منسوب ہے، یہ سہارنپور سے تقریباً ۳۴ میل بجانب جنوب واقع ہے، مشائخ چشت میں حضرت شیخ عبدالقدوسؒ (وفات ۹۴۵ھ ۱۵۳۸ء) کی نسبت سے اس کو تاریخی شہرت حاصل ہے۔

حضرت نانوتوی ؒ سے تعلق قائم ہوا، جو پھر ساری عمر قائم رہا، دہلی میں معقولات کی بعض کتابیں مفتی صدر الدین آزردہ[۱] سے بھی پڑھیں، آخر میں حضرت شاہ عبدالغنی مجددی ؒ کی خدمت میں رہ کر علم حدیث کی تحصیل کی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ ؒ کی خدمت میں رہ کر بیعت کا شرف حاصل کیا، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی ؒ نے سوانح قاسمی میں لکھا ہے کہ "جناب مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی اور مولوی محمد قاسم صاحب سے اسی زمانے سے ہم سبقی اور دوستی رہی ہے، آخر میں حدیث جناب شاہ عبدالغنی صاحب ؒ کی خدمت میں پڑھی اور اسی زمانے میں دونوں صاحبوں نے جناب قبلہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب دام ظلہٗ سے بیعت کی اور سلوک شروع کیا۔" انھوں نے بڑی تیز رفتاری سے سلوک کی منزلیں طے کرلیں، چنانچہ صرف ۴۲ دن کی قلیل مدت میں خلافت سے سرفراز ہو گئے، اور گنگوہ واپس آکر حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی ؒ کے حجرے[۲] کو اپنی قیام گاہ بنایا، اس دوران میں مطب ذریعۂ معاش رہا۔

---

[۱] مفتی صدر الدین آزردہ، ۱۲۰۴ھ / ۱۷۸۹ء میں دہلی میں پیدا ہوئے، حضرت شاہ عبدالعزیز ؒ، شاہ عبدالقادر ؒ اور شاہ محمد اسحٰق ؒ سے علوم کی تکمیل کی، دہلی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے صدر الصدور اور مفتی کے منصب پر فائز تھے، طلباء کو مکان پر پڑھاتے تھے، ۱۸۵۷ء میں فتویٰ جہاد پر دستخط کرنے کے الزام میں جائداد اور تین لاکھ کی مالیت کا کتب خانہ ضبط ہوگیا، کئی مہینے کی نظربندی کے بعد رہائی ہوئی اور کچھ جائداد واپس مل گئی۔

عربی فارسی اور اُردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، آزردہ تخلص تھا، انھوں نے دہلی کے قدیم مدرسہ دارالبقاء کو از سرِ نو جاری کیا، طلباء کے جملہ مصارف کی خود کفالت کرتے تھے۔

۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء بروز پنجشنبہ وفات پائی۔

[۲] حضرت قطب العالم گنگوہی ؒ کی خانقاہ کا یہ حجرہ صدیوں سے غیر آباد اور ویران (باقی صفحہ آئندہ پر)

۱۸۵۷ء میں خانقاہِ قدوسی سے مردانہ وار نکل کر انگریزوں کے خلاف صف آرا ہو گئے اور اپنے مرشد حضرت حاجی صاحبؒ اور دوسرے رفقاء کے ساتھ شاملی کے معرکۂ جہاد میں شامل ہو کر خوب دادِ شجاعت دی، جب میدانِ جنگ میں حافظ ضامن شہید ہو کر گرے تو آپ اُن کی نعش اٹھا کر قریب کی مسجد میں لے گئے اور پاس بیٹھ کر قرآن شریف کی تلاوت شروع کر دی۔

معرکۂ شاملی کے بعد گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوا اور اُن کو گرفتار کر کے سہارنپور کی جیل میں بھیجدیا گیا، پھر وہاں سے مظفر نگر منتقل کر دیا گیا، چھ مہینے جیل میں گزرے وہاں بہت سے قیدی آپ کے معتقد ہو گئے اور جیل خانے میں جماعت کے ساتھ نماز ہونے لگی،

رہائی کے بعد گنگوہ میں آپ نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع فرمایا، ۱۲۹۹ھ میں تیسرے حج کے بعد آپ نے یہ التزام کیا کہ ایک سال کے اندر اندر پوری صحاح ستہ کو ختم کرا دیتے تھے. معمول یہ تھا کہ صبح سے ۱۲ بجے تک طلباء کو پڑھاتے تھے، آپ کے درس کی شہرت سن سن کر طالبانِ حدیث دور دور سے آتے تھے کبھی کبھی اُن کی تعداد ستر اسی تک پہنچ جاتی تھی جن میں ہند و بیرونِ ہند کے طلباء شامل ہوتے تھے، طلباء کے ساتھ غایت محبت و شفقت سے پیش آتے تھے، درس کی تقریر ایسی ہوتی تھی کہ ایک عامی بھی سمجھ لیتا تھا، آپ کے درسِ حدیث میں ایک خاص خوبی یہ تھی کہ حدیث کے مضمون کو سن کر اُس پر عمل کرنے کا شوق پیدا ہو جاتا تھا، جامع ترمذی کی درسی تقریر الکوکب الدری شائع ہو چکی ہے، جو مختصر ہونے کے باوجود ترمذی

پڑا ہوا تھا، گردشِ زمانہ سے دھوبیوں کے گھوڑوں گدھوں کا مسکن بن گیا تھا، حضرت گنگوہیؒ نے حجرے کو غلاظت سے صاف کیا، گندی اور ناپاک مٹی کھود کر اس کی جگہ نئی پاک مٹی ڈالی، دیواروں کو لیپا پوتا، اس طرح تقریباً تین سو سال کے بعد یہ حجرہ چودھویں صدی ہجری کے شیخ وقت کی قیام گاہ بنا از سرِ نو آباد ہوا۔

کی نہایت جامع شرح ہے، ۱۳۱۴ھ تک آپ کا درس جاری رہا، تین سو سے زائد حضرات نے آپ سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی، درسِ حدیث میں آپ کے آخری شاگرد حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کے والد ماجد حضرت مولانا محمد یحییٰ کاندھلویؒ تھے، آخر میں نزول الماء کی وجہ سے درس بند ہوگیا تھا مگر ارشاد وتلقین اور فتاویٰ کا سلسلہ برابر جاری رہا، ذکر اللہ کی تحریص وترغیب پر بڑی توجہ تھی، جو لوگ خدمت میں حاضر ہوتے رغبتِ آخرت کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور لے کر جاتے، اتباعِ سنت کا غائت اہتمام فرماتے تھے۔

۱۲۹۷ھ میں حضرت نانوتویؒ کی وفات کے بعد دارالعلوم دیوبند کے سرپرست ہوئے، مشکل حالات میں دارالعلوم کی گتھیوں کو سلجھادینا ان کی ایک بڑی خصوصیت تھی، ۱۳۱۴ھ سے مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کی سرپرستی بھی قبول فرمائی تھی۔

فقہ اور تصوف میں تقریباً ۱۴ کتابیں تصنیف فرمائیں۔

باختلاف روایت ۸ یا ۹ جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء بروز جمعہ اذان جمعہ کے بعد ۷۸ سال کی عمر میں وفات پائی، آپ کے تلامذہ کا ایک وسیع حلقہ ہے، جس میں بڑے بڑے نامور علماء شامل ہیں، اسی طرح آپ کے خلفاء کی بھی ایک طویل فہرست ہے، آپ کے تفصیلی حالات تذکرۃ الرشید مصنفہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی میں درج ہیں، یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے۔

دیوبند، سرزمینِ دارالعلوم

دیوبند اور دارالعلوم میں چولی دامن کا ساتھ ہے دارالعلوم کا دیوبند سے گہرا تعلق اور رابطہ ہے، دیوبند کی تاریخ دارالعلوم کے مجد وشرف کا ایک حصہ ہے، دیوبند ایک بہت پرانی آبادی ہے، یہ نام "دیوی" اور "بن" سے مرکب ہو کر بنا ہے، پہلے دیوی بن بولا جاتا تھا، پھر کثرتِ استعمال سے دیبن بولا جانے لگا۔ بعد ازاں تصرفِ متکلمین سے دیوبند نام ہوگیا

دیوبند شمالی ہندوستان میں ۲۹ درجے ۵۸ دقیقے عرض البلد اور ۷۷ درجے ۴۵ دقیقے

طول البلد پر واقع ہے۔ دیوبند کے جنوب مغرب سے ناردرن ریلوے گذرتی ہے، دیوبند کا ریلوے اسٹیشن دہلی سے شمال کی جانب ۱۴۴ کیلومیٹر پر ہے۔ اُتر پردیش میں دیوبند ضلع سہارنپور کی ایک تحصیل ہے۔ سلطنتِ مغلیہ کے زمانے میں بھی اس کی یہی حیثیت تھی، یہاں ایک قدیم قلعے کے آثار بھی پائے جاتے ہیں، شہنشاہ اکبر (۹۶۳ھ/۱۵۵۵ء - ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء) کے عہد کا یہاں پختہ اینٹوں سے بنا ہوا ایک قلعہ موجود تھا۔ اس قلعہ کی نسبت ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں لکھا ہے:۔

دیوبند، قلعہ از خشت پختہ دارد[1]

امپیریل گزیٹر آف انڈیا میں لکھا ہے کہ:۔

"پانڈونے ملک بدر ہونے کی پہلی مدت یہیں گذاری تھی، یہاں کا قلعہ سالار مسعود غازی کے اوّلین مفتوحہ قلعوں میں سے تھا"[2]

دیوبند میں مُسلمانوں کی آبادی کا پتہ ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) سے چلتا ہے، خواجہ عثمان ہارونیؒ (وفات ۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء) کے ایک مُسترشد قاضی دانیال قُطری قطب الدین ایبک (۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء - ۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء) کے عہد میں یہاں عرصے تک مقیم رہے ہیں، محدثِ جلیل ابن جوزیؒ کے ایک تلمیذ التلمیذ شاہ علاؤ الدّین جنگل باش (وفات ۷۴۲ھ/۱۳۴۱ء) کا مزار دیوبند کے جنوب مشرق میں زیارت گاہ خاص و عام ہے، دیوبند کی مردم شماری چالیس ہزار کے قریب ہے۔ اس میں مُسلمان نصف سے کچھ زیادہ ہیں۔

دیوبند میں کچھ مسجدیں جو اسلامی عہدِ حکومت کی تعمیر ہیں، اب تک موجود ہیں، ان میں مسجدِ قلعہ سلطان سکندر لودی (۸۹۴ھ/۱۴۸۹ء - ۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء) مسجد خانقاہ شہنشاہ اکبر (۹۶۳ھ/۱۵۵۵ء - ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء) اور مسجد ابوالمعالی اورنگ زیب (۱۰۶۸ھ/۱۶۵۰ء - ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۶ء) کے عہد کی

---

[1] آئینِ اکبری جلد دوم ص ۱۴۳۔ [2] امپیریل گزیٹر آف انڈیا جلد ۱۱ ص ۲۴۲ مطبوعہ ۱۹۰۸ء۔

یادگار ہیں، یہ وہ مسجدیں ہیں جن میں کتبے لگے ہوئے ہیں، بعض مسجدیں ان سے بھی زیادہ قدیم بتائی جاتی ہیں، مگر ان کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا۔[1]

اتر پردیش کے شمالی مغربی اضلاع کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ سرزمین ہمیشہ مذہبی روایات کی حامل رہی ہے، گنگ و جمن کا یہ شاداب اور زرخیز خطہ قدیم زمانے سے مقدس سمجھا جاتا رہا ہے، تیرھویں صدی ہجری کے اواخر میں دارالعلوم کے قیام نے دیوبند کی عظمت کو چار چاند لگا دیئے، جس سے اس کی شہرت تمام دنیا میں پھیل گئی، اور برّ اعظم ایشیا اور افریقہ سے کھنچ کھنچکر طلبا یہاں آنے لگے، ایک سو سال سے کچھ زیادہ مدت سے دیوبند دینی علوم اور اسلامی ثقافت کا مرکز بنا ہوا ہے، غرض کہ دین کی خدمت اور علم کے فروغ میں اس شہر نے بڑا کام کیا ہے، اور اب برِ صغیر میں دیوبند ایک تحریک کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے، ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں دارالعلوم دیوبند نے ایک عظیم و جلیل تعلیم گاہ کی حیثیت سے جو بے مثال تعلیمی علمی اور فکری کردار ادا کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے، اسکے فیض یافتہ فرزند کم و بیش ایک صدی سے اسلام اور دینی علوم کی جو ولولہ انگیز خدمت انجام دے رہے ہیں دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی اتنی عظیم خدمت کی نظیر مشکل سے ملے گی، یہاں کے علماء اپنے علم و عمل کے چشمۂ صافی سے برِ صغیر کے علاوہ ایشیا کے اسلامی ملکوں کو بھی سیراب کرتے رہے ہیں،

دارالعلوم دیوبند، ہندوستان میں مسلمانوں کی دینی تعلیم کا صرف ایک مرکز ہی نہیں ہے بلکہ اسے بہت سی دینی تحریکات کا سرچشمہ بھی ہونے کا فخر حاصل ہے۔ مجلۂ علوم الدین علی گڈھ کے مقالہ نگار نے لکھا ہے:۔

"علمی میدان میں اس کے فضلاء نے عظیم کارنامے انجام دیئے ہیں، جن میں مفید

---

[1] دیوبند کے تفصیلی حالات کے لئے راقم سطور کی تاریخ دیوبند سے مراجعت کی جائے۔

(سید محبوب رضوی)

کتابوں کی تصنیف و تالیف کے علاوہ قدیم علمی ذخیروں کی دریافت، مفید اور پر معنیٰ شروح و حواشی اور بے شمار کتابوں کے ترجمے سب شامل ہیں۔

اس کے علاوہ دارالعلوم دیوبند مسلمانان ہند کی سیاسی رہبری کا بھی مرکز رہا، اس کے فضلاء نے نہ صرف مختلف تحریکوں کے ساتھ وابستہ ہوکر کام کیا ہے بلکہ متعدد تحریکوں کے عالم وجود میں آنے کا ذریعہ بنے۔ اس طرح وہ برابر مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کرتے رہے ہیں، یہاں تک کہ ملک کو آزاد کرالیا۔[1]

دارالعلوم نے بے شمار طالبانِ علمِ دین کو اپنی آغوش میں لے کر اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ علمی حیثیت سے برِّ صغیر ہند و پاک اور بنگلہ دیش میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کا فریضہ باحسن وجوہ انجام دے سکیں، چنانچہ آج ہند و پاک وغیرہ میں جو دینی بیداری پائی جاتی ہے، اس میں علمائے دیوبند کی جد و جہد کو ممتاز مقام حاصل ہے۔

دارالعلوم کے قیام اور اس کی بقاء و ترقی میں اہلِ دیوبند نے جس فراخ حوصلگی، فیاضی اور علم دوستی کا ثبوت دیا ہے، اس کی مثال اگر نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے، دیوبند کے اہلِ خیر نے بیرونی طلباء کے قیام و طعام اور دوسری ضروریات[2] میں جس طرح بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور دارالعلوم کو ترقی کرنے کے مواقع بہم پہنچائے وہ اہلِ دیوبند کا بہت بڑا کارنامہ ہے، حضرت نانوتویؒ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ: ۔

---

[1] مجلّہ علوم الدین ۷۲-۱۹۷۱ء ص ۱۸۶

[2] ۱۲۸۴ھ کی روداد میں اہلِ دیوبند کی جانب سے ۴۹ طلباء کے کھانے کے انتظام کی تفصیل دی ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ: "ان طلباء کے دھوبی اور حجام وغیرہ کا صرف بھی بہت جگہ انھیں لوگوں کے ذمہ ہے جنکے یہاں اُن کا کھانا مقرر ہے۔

(روداد دارالعلوم دیوبند ۱۲۸۴ھ ص ۳۶ و ۳۷)

"جو دل سوزی یہاں کے باشندوں نے کی وہ اتنی نہیں کہ ہم زبان سے ادا کریں، اگر فرشتوں نے طالبانِ علوم کے قدم کے نیچے پر بچھائے تو انھوں (اہلِ دیوبند) نے اُنکے سَر پر دستِ شفقت رکھا، ماں باپ کو بھلا دیا، دیوبند کو گھر بنا دیا، یہ وہ خاص بات ہے جس میں شرکائے چندہ میں سے ان کا کوئی شریک وسہیم نظر نہیں آتا۔"[1]

حضرت مولانا سیّد مناظر احسن گیلانی نے اپنے زمانۂ طالب علمی کے حالات میں لکھا ہے:۔

"باشندگانِ دیوبند کے قلوب میں طلباء کا جو احترام تھا اور اس علمی احترام کے جو مظاہرے روزمرہ سامنے آتے رہتے تھے اُن کو دیکھ کر اس کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ بنی آدم کے قلوب جس الرحمٰن کی انگلیوں کے نیچے دبے ہوئے تھے اس کے باطنی اشاروں کی یہ کرشمہ سازیاں تھیں، اس زمانے میں عام دستور دیوبند والوں کا یہ تھا کہ بیریوں کے باغ میں طلباء کی دعوت کرتے آموں کی بھی دعوت ہوتی تھی۔"[2]

اہلِ دیوبند کے دینی جذبات اور دارالعلوم کے ساتھ ان کے غیر معمولی تعلق کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ۱۲۸۵ھ میں جبکہ دارالعلوم کی شہرت ملک کے بہت سے مقامات تک پہونچ چکی تھی اور اس کے چندہ دہندگان کا دائرہ بھی خاصا وسیع ہو چکا تھا، اس سال کی آمدنی میں تقریباً نصف حصہ باشندگانِ دیوبند کا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے:۔

۱۲۸۵ھ کی کل آمدنی	۲۱۹۰ روپے[3]
باشندگان دیوبند کا چندہ	۳ — ۱۴ — ۶۳۸ روپے[4]

---

[1] روداد دارالعلوم ۱۲۹۰ھ ص ۱۲ مطبوعہ مطبع فاروقی دہلی۔ [2] حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی کا مضمون "احاطۂ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن" مندرجہ رسالہ دارالعلوم محرم ۱۳۷۳ھ ص ۲۷۔

[3] [4] روداد ۱۲۸۵ھ ص ۶۸ و ۶۹

۱۲۸۵ھ کے چندہ دہندگان کی تعداد ۲۳۵ ہے جسمیں اہلِ دیوبند کی تعداد ۱۱۲ ہے[1]۔

اہلِ دیوبند کی جانب سے نقد چندے کے علاوہ ۳۴ طلباء کے خور و نوش کا انتظام بھی تھا[2]۔ اگر اس زمانے کی ارزانی کے پیشِ نظر ایک شخص کے ماہانہ کھانے کی قیمت کم از کم ایک روپیہ بھی لگائی جائے تو ۳۴ طلباء کے سال بھر کے کھانے کی قیمت ۴۰۸ روپے ہوتی ہے، اس میں ۶۲۹ روپے چندے کی رقم شامل ہو کر یہ مقدار ۱۰۳۷ روپے ہو جاتی ہے جو گویا پوری آمدنی کے لحاظ سے نصف کے قریب ہے۔

طلباء کے ساتھ اہلِ دیوبند کا یہ معاملہ بدستور اب تک جاری ہے، ہمیشہ طلباء کی معتدبہ تعداد شہر کی مساجد میں مقیم رہتی ہے اور وہیں اُن کے خورد و نوش کا بندوبست ہوتا چلا آرہا ہے۔

آج مدارس کا قیام معمولی بات معلوم ہوتا ہے، لیکن اگر سوا سو برس پہلے کے حالات کا خیال کیا جائے جب اس طرح کے مدارس قائم کرنے کا رواج نہ تھا اور نہ لوگ اس طریقِ کار سے واقف تھے اور نہ کوئی نمونہ موجود تھا، تو بلاشبہ اس وقت کے اکابر رحمہم اللہ کا یہ ایک محیر العقول کارنامہ معلوم ہوتا ہے!

⁂

---

[1] و [2] روداد ۱۲۸۵ھ ص ۲۰ و ۲۶۔

اکابرِ دارالعلوم کی عمریں قیامِ دارالعلوم کے وقت

آپ کو یہ معلوم ہو کر شاید تعجب ہوگا کہ قیام دارالعلوم کے وقت اکابرِ دارالعلوم کچھ زیادہ مُسن اور معمر نہ تھے۔ بلکہ ان کا تعلق عمر کے اس دَور سے تھا جسے "دورِ شباب" کہا جاتا ہے۔ نوجوانوں کے لئے یہ مثال بڑی سبق آموز ہے۔ اس سے "بزرگی بعقل است نہ بسال" کی جہاں تصدیق ہوتی ہے، وہیں اس سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ مردانِ کار کسی بڑے کام کا آغاز کرنے کے لئے اپنے کُہن سال اور معمر ہونے کا انتظار نہیں کیا کرتے، ہمتِ بلند ماہ و سال کے حساب کی پابند نہیں ہوتی، انھوں نے اس کام کی تکمیل کا فیصلہ کر لیا۔ اور اس کے لئے اپنی تمام صلاحیتیں وقف کر دیں۔ دارالعلوم کے اکابرِ بستہ کی اس جماعتِ مقدسہ میں سب سے زیادہ معمر حضرت مولانا ذوالفقار علیؒ (عمر ۴۵ سال) تھے، اُن کے علاوہ کسی کی عمر ۳۵ سال سے زیادہ نہ تھی، یہ نقشہ اُن لوگوں کو چونکا دینے والا ہے جو اکابرِ دارالعلوم کی نسبت یہ تصوّر رکھتے ہیں کہ وہ سب بزرگ کُہن سال اور عمر رسیدہ ہوں گے۔

تفصیل کے لئے ذیل کا نقشہ ملاحظہ فرمایئے۔

نمبر شمار	اسمائے گرامی	سنِ ولادت	عمر بوقت تحریک دارالعلوم ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۲ھ
۱	حضرت مولانا ذوالفقار علیؒ	سنہ ۱۲۳۷ھ	۴۵ سال
۲	〃 〃 فضل الرحمٰنؒ	سنہ ۱۲۴۷ھ	۳۵ سال
۳	〃 〃 محمد قاسم نانوتویؒ	سنہ ۱۲۴۸ھ	۳۴ سال
۴	〃 〃 محمد یعقوب نانوتویؒ	سنہ ۱۲۴۹ھ	۳۳ سال
۵	〃 حاجی محمد عابدؒ	سنہ ۱۲۵۰ھ	۳۲ سال
۶	〃 〃 رفیع الدینؒ	سنہ ۱۲۵۲ھ	۳۰ سال

نصب العین

اسلام میں علم سے مراد وہ علم ہے جو نبوت سے مستفاد ہو اور انسان کی دینی و دنیوی اور مادّی و روحانی دونوں زندگیوں کے لئے مفید ہو، اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق علم ایک فرض ہے، جس کو پورا کر کے مسلمان دنیوی بھلائی اور اخروی نجات حاصل کرتا ہے، چنانچہ اسی مقصد کے پیش دار العلوم دیوبند کی تعلیم کی بنیاد بھی عقائد و اعمال کی اصلاح پر رکھی گئی ہے، علم برائے حصولِ منصب کبھی اس کا مقصد نہیں رہا ہے! تاریخ شاہد ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں مسلمانوں کے قدم پہنچے ان کے ذوقِ علم نے چپے چپے پر مدرسوں اور تعلیم گاہوں کا جال بچھا دیا تھا، اسلامی آبادی کا کوئی قابل ذکر گوشہ ایسا نہ تھا جو ان کی سرگرمیوں سے خالی رہا ہو، یہی کیفیت ہندوستان کی بھی تھی مُسلمانوں کے دورِ حکومت کا کوئی دور ایسا نہ تھا جس کی ممتاز ترین خصوصیت علم و فضل کی اشاعت نہ رہی ہو، مسلمانوں کا ایک ایک امیر اپنی علمی فیاضی سے ملک کے گوشے گوشے میں فضل و کمال کی روح پھونکتا رہتا تھا، سلاطین و امرا علمی فیاضی اور علما، نوازی اور طلبا پروری میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانا اپنے لئے فخر و مباہات کا باعث اور نجاتِ اُخروی کا ذریعہ سمجھتے تھے، مگر سلطنت کا ہاتھ سے نکلنا تھا کہ علم کی وہ شمع جو چھ سو سال سے ہندوستان میں روشن تھی رفتہ رفتہ گُل ہو گئی، اور ملک پر انگریزوں کا تسلط مکمل ہو گیا، اس طرح انگریزی حکومت کے ساتھ ہی اُن کی تہذیب، مذہب اور مغربی علوم و فنون رائج ہونے لگے۔ انگریز چونکہ ۱۸۵۷ء

کی جنگِ آزادی کا مسلمانوں کو ذمہ دار سمجھتے تھے اس لئے انھیں مسلمانوں سے خصوصیت کے ساتھ دشمنی تھی، انگریز حکمراں اپنے ساتھ جدید علوم وفنون لے کر آئے تھے۔ انھوں نے جو نیا نظام تعلیم جاری کیا اس میں قدیم علوم کے بجائے انھوں نے اپنے جدید علوم کو جگہ دی تھی، اسکا نتیجہ ایک بالکل نئی شکل میں نمودار ہوا، انیسویں صدی عیسوی کا یہ زمانہ مسلمانوں کی زندگی کا نہایت پُر آشوب دَور تھا اس دور میں مسلمانوں کی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جو تیز وتند بادہائے مخالف کے تھپیڑوں سے متاثر نہ ہوا ہو، ہندوستان میں مغل سلطنت کے زوال اور طوائف الملوکی نے سیاست کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے عقائد اور فکر ونظر کی بنیادیں ہلادی تھیں، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنے زمانے کے حکمرانوں اور خواص وعوام کو اپنی تصانیف میں سخت تنبیہ کی ہے اور خبردار کیا ہے کہ وہ زوال کے آخری سرے پر پہنچ چکے ہیں، وہ جس راہ پر گام زن ہیں اس سے بچنے کی سخت ضرورت ہے، تفہیماتِ الٰہیہ میں لکھتے ہیں:۔

"ہم نے اپنی آنکھوں سے وہ ضعیف الایمان مسلمان دیکھے ہیں جنھوں نے علماء کو اربابٌ مِن دُونِ اللہ بنا لیا ہے، اور یہود ونصاریٰ کی طرح اپنے اولیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا رکھا ہے، ہم نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو شارع کے کلام میں تحریف کرتے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ قول منسوب کرتے ہیں کہ نیک لوگ اللہ کے لئے ہیں اور گناہگار میرے لئے، یہ اس قسم کی بات ہے جیسے یہودی کہتے تھے کہ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً (ہم دوزخ میں نہ جائیں گے اور گئے تو بس چند روز کے لئے) سچ پوچھو تو آج ہر گروہ میں دین کی تحریف پھیلی ہوئی ہے، صوفیا کو دیکھو تو اُن میں ایسے اقوال زبان زد ہیں جو کتاب وسنت سے مطابقت نہیں رکھتے، خصوصاً مسئلہ توحید میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کی انھیں بالکل پرواہ ہی نہیں ہے، فقہاء کو دیکھو تو اُن میں اکثر ایسی باتیں ملتی ہیں جن کے ماخذ کا پتہ ہی نہیں ہے، رہے اصحابِ معقول اور شعراء اور اصحاب ثروت

اور عوام تو اُن کی تحریفات کا ذکر کہاں تک کیا جائے۔[1]

غرض کہ حالات دن بدن بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے مسلمانوں کی زبون حالی اور ان سے انگریزوں کی عداوت اور دشمنی روز افزوں تھی۔ حضرت شاہ محمد اسحٰق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے جب حالات کو روبراہ ہوتے نہ دیکھا تو بالآخر مجبور ہو کر ۱۲۵۷ھ / ۱۸۴۱ء میں مکہ مکرمہ میں ہجرت فرمائی، پھر جب ۱۸۵۷ء / ۱۲۷۴ھ میں دہلی پر انگریزوں کا تسلط ہو گیا تو حضرت شاہ عبد الغنی مجددی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہجرت فرما کر مدینہ منورہ چلے گئے، دہلی جو چھ سو سال سے علوم و فنون کا مرکز چلی آ رہی تھی اور جس کے آخری دور میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے علمِ حدیث کا چمن لگایا تھا وہ انقلاب کی بادِ سموم سے مرجھا گیا، ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں جو غدر کے نام سے موسوم ہے بے شمار علماء انگریزوں کے جذبۂ انتقام کی نذر ہو گئے، یہ انقلاب اپنے جلو میں مسلمانوں کے لئے بڑی بڑی تباہیاں اور خرابیاں لے کر آیا تھا، اوقاف جو مدارس کے لئے رگِ جاں تھے برطانوی دورِ حکومت میں ضبط کر لئے گئے اور سیکڑوں سال کا تعلیمی نظام برباد ہو گیا۔ برطانوی پارلیمنٹ کے ایک ممبر برک نے اپنی اُس یادداشت میں جو پارلیمنٹ میں پیش کی گئی تھی لکھا ہے کہ:۔

"اُن مقامات میں جہاں علم کا چرچا تھا اور جہاں دُور دُور سے طالب علم پڑھنے کے لئے آتے تھے آج وہاں علم کا بازار ٹھنڈا پڑ گیا ہے"۔[2]

انگریز اپنے ساتھ جو نیا نظامِ تعلیم لے کر آئے تھے وہ یکسر سابقہ نظام سے مختلف تھا، ڈبلیو، ڈبلیو ہنٹر لکھتا ہے:۔

"ہمارے طریقِ تعلیم میں مسلمان نوجوانوں کے لئے مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے،

---

[1] تفہیماتِ الٰہیہ جلد دوم ص ۱۳۴ و ۱۳۵ مطبوعہ مدینہ پریس بجنور ۱۳۵۵ھ / ۱۹۳۶ء۔

[2] بحوالہ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت جلد اول ص ۳۹۲۔

بلکہ وہ قطعی طور پر مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہے[1]۔

انگریزوں کے لائے ہوئے اس تعلیمی نظام کا بنیادی مقصد ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کو عیسائی بنانا تھا۔ مولانا فضل حق خیرآبادی جو اس زمانے میں دہلی میں انگریز ریزیڈنٹ کے میر منشی (پیشکار) تھے اور جنھیں ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے جرم میں کالے پانی کی سزا دی گئی تھی اپنی اسیری کے زمانے کی تصنیف الثورۃ الہندیہ میں لکھتے ہیں:۔

"انگریزوں نے تمام باشندگانِ ہند کو نصرانی بنانے کی اسکیم بنائی۔ اُن کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کو کوئی مددگار اور معاون نصیب نہ ہو سکے گا اس لئے انقیاد و اطاعت کے سوا سرتابی کی جراءت نہ ہو سکے گی۔ انگریزوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر حکمرانوں کا باشندوں سے اختلاف تسلّط و قبضے کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہوگا۔ اس لئے پوری جانفشانی اور تن دہی کے ساتھ مذہب و ملّت کے مٹانے کے لئے طرح طرح کے مکر و حیلے سے کام لینا شروع کیا۔ انھوں نے بچوں اور نافہموں کی تعلیم اور اپنی زبان و دین کی تلقین کے لئے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کئے اور پچھلے علوم و معارف کے مٹانے کی پوری کوشش کی[2]"

غرض کہ تیرھویں صدی ہجری میں ہندوستان کے مسلمان سنگین ترین حالات سے دوچار تھے ایک طرف حکومت کے ساتھ ساتھ ان کا تعلیمی نظام برباد ہو چکا تھا۔ اور دوسری طرف ان کے عقائد و افکار متزلزل ہو رہے تھے۔ اس پر مستزاد یہ تھا کہ انگریزی حکومت ان کو عیسائی بنانے کا عزم کئے ہوئے تھی۔ انگریزوں سے قبل ہندوستان میں جو تعلیمی نظام رائج تھا اُس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ دینی علوم کے ساتھ بڑے

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۲۵۲ ۔

[2] الثورۃ الہندیہ ص ۲۵۶ و ص ۲۵۰ مطبوعہ مدینہ پریس بجنور ۔

سے بڑے ملکی اور فوجی منصب کے لئے بھی طلبار کو تیار کرتا تھا حتیٰ کہ اُن ہی مدارس کے تعلیم یافتہ طلبار وزارت وحکمرانی تک کے فرائض نہایت کامیابی، خوش اسلوبی اور قابلیت کے ساتھ انجام دیتے تھے، اور وہی شخص جو علوم دینیہ پر دسترس رکھتا تھا بڑے سے بڑے ملکی اور انتظامی منصب کے لئے وہی منتخب ہوتا تھا چنانچہ شیر شاہ سوری (۹۴۷ھ/۱۵۴۰ء - ۹۵۲ھ/۱۵۴۵ء) نے جون پور کے مدرسہ میں زانوئے تلمذ تہ کیا تھا، شیر شاہ کا مختصر سا دور حکومت اپنی سیاسی اور تمدنی اصلاحات کے لحاظ سے ہندوستان کی تاریخ میں ایک ممتاز دور سمجھا گیا ہے اکبر (۹۶۳ھ/۱۵۵۵ء - ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء) کے عہدِ حکومت کی بہت سی آئینی اصلاحات کا آغاز درحقیقت شیر شاہ سوری ہی کے عہد میں ہو چکا تھا۔

جدید نظامِ تعلیم کے جاری ہونے سے مسلمانوں کا علمی اور عملی شیرازہ منتشر اور پراگندہ ہو گیا، عقائد اور فکر ونظر سے لے کر عمل وکردار تک ان کی زندگی کا ہر ہر گوشہ متاثر ہو گیا، نئے تعلیمی نظام کے جاری ہونے پر مسلمانوں کے لئے سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند ہو گئے تھے، اس وقت مسلمان سخت ترین اقتصادی اور معاشی بدحالی کا شکار ہو چکے تھے، اس سنگین صورت حال سے نمٹنے کے لئے ضرورت تھی کہ بڑے پیمانے پر کوئی تحریک چلائی جائے تاکہ مسلمانوں کی زندگی میں جو خوفناک رخنے پڑ گئے ہیں اُن کا فی الجملہ انسداد ہو سکے۔

دارالعلوم دیوبند صرف ایک دینی تعلیم گاہ ہی نہیں ہے بلکہ درحقیقت ایک مؤثر اور فعال تحریک ہے، اس تحریک نے مسلمانوں کے عقائد اور اعمال کے خس وخاشاک کو جدا کر کے ان کو صاف اور بے میل اسلام سے روشناس کیا، شرک اور توہمات سے انھیں نجات دی، مسلمانوں کے دلوں سے خوف اور ڈر کو دور کر کے سیاسی اعتبار سے انھیں اس لائق بننے میں مدد بہم پہنچائی تاکہ وہ آزادی کی تحریک میں قائدانہ طور پر

حصہ لے کر مسلمانوں کے قومی وقار کو بلند کر سکیں۔ تعلیمی، اصلاحی اور سیاسی لحاظ سے زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس میں انھوں نے اپنی عظیم الشان خدمات کا نقش قائم نہ کیا ہو۔ اس تحریک کی افادیت صرف اندرونِ ملک تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ دُور دُور تک اس کے حلقۂ اثر کا دائرہ وسیع ہو گیا، اس لئے صرف برِّ صغیر ہی کا نہیں بلکہ ایشیا کا بھی دارالعلوم دیوبند ایک انقلاب آفریں مرکز بن گیا۔

تیرھویں صدی ہجری کے ہندوستان میں مُسلمانوں کے سامنے دو اہم مسئلے تھے، ایک مسئلہ مسلمانوں کے عقائد و اعمال کا تھا، اور دوسرے کی نوعیت سیاسی تھی، جس کا مقصد ہندوستان کو سامراجی اقتدار سے نجات دِلانا تھا، اوپر بتا چکا ہوں کہ ہندوستان میں مغل سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ اسلامی زندگی کی قدریں بھی تباہ ہو گئی تھیں، اسلام کے سیدھے سادے فطری اصولوں کی جگہ شرک و بدعت اور رسوم و رواج نے لے لی تھی، توحید کا وہ خالص اعتقاد جو اسلامی عقیدے کی جان ہے، اسلامی تعلیم کی یہ روح شرک و بدعت کے پیہم حملوں سے مضمحل ہو گئی تھی۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے بعد حضرت سیّد احمد شہید، حضرت مولانا محمد اسمٰعیل شہید حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہم اللہ نے اسلامی روح کی حفاظت کی اور تحریک کو آگے بڑھانے کی کامیاب کوشش فرمائی۔ حضرت نانوتویؒ نے اعتقادی اور معاشرتی اصلاح کی زبردست جد و جہد کی، انھوں نے اسلامی مسائل کو عقلی دلائل سے مستحکم کیا، تباہ کن رسم و رواج کی مخالفت کی، بیواؤں کے نکاح، عورتوں کے حقِ وراثت اور معاشرتی اونچ نیچ کے خاتمے کی بھرپور کوشش کی، اور حقیقت یہ ہے کہ اُنکی مساعی کا ہندوستان کے ہر گوشے پر اثر پڑا، اور مُسلمانوں کی بڑی تعداد اس سے متاثر ہوئی، یہ حالات تھے جن میں اکابر دارالعلوم نے اسلامی عقائد، سماجی رسوم، دینی تعلیم و تربیت اور سیاسی جد و جہد کے گوناگوں مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے دینی مدارس کے

کے قیام کو ضروری قرار دیا اس سلسلے میں سب سے پہلے دارالعلوم دیوبند منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا۔ اللہ تعالےٰ نے دارالعلوم کی تحریک کو شرفِ قبول عطا فرمایا ملک کے طول و عرض میں ہر طرف لوگوں نے اس کی آواز پر لبیک کہا، اوہام ورسوم اور شرک و بدعت کے جو گھرے بادل ہندوستان کی فضاؤں میں چھائے ہوئے تھے رفتہ رفتہ چھٹنے شروع ہو گئے اور ان کی جگہ کتاب و سنت کے احکام پر عمل کیا جانے لگا۔

دارالعلوم دیوبند کا قیام جن مقاصد کے لئے عمل میں لایا گیا، اُن کی تفصیل دارالعلوم کے قدیم دستورِ اساسی میں حسبِ ذیل بیان کی گئی ہے:۔

۱۔ قرآن مجید، تفسیر، حدیث، عقائد و کلام اور ان کے علوم کے متعلقہ ضروری اور مفید فنونِ آلیہ کی تعلیم دینا، اور مسلمانوں کو مکمل طور پر اسلامی معلومات بہم پہنچانا، رشد و ہدایت اور تبلیغ کے ذریعے اسلام کی خدمت انجام دینا۔

۲۔ اعمال و اخلاقِ اسلامیہ کی تربیت اور طلبار کی زندگی میں اسلامی روح پیدا کرنا۔

۳۔ اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور دین کا تحفظ و دفاع، اور اشاعتِ اسلام کی خدمت بذریعہ تحریر و تقریر بجالانا اور مسلمانوں میں تعلیم و تبلیغ کے ذریعے سے خیرالقرون اور سلفِ صالحین جیسے اخلاق و اعمال اور جذبات پیدا کرنا۔

۴۔ حکومت کے اثرات سے اجتناب و احتراز اور علم و فکر کی آزادی کو برقرار رکھنا۔

۵۔ علوم دینیہ کی اشاعت کے لئے مختلف مقامات پر مدارس عربیہ قائم کرنا اور ان کا دارالعلوم سے الحاق۔

یہ وہ مقاصد ہیں جو اگرچہ اسلامی روایات و تاریخ کے دامن سے ہمیشہ وابستہ رہے ہیں، مگر اُس وقت اُن کے احیاء و تجدید کی ضرورت اس لئے درپیش تھی کہ تیرھویں صدی ہجری کے نصف آخر میں حکومت کی تبدیلی اور محرومی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے علم و عمل اور فکر و نظر میں جو اختلال اور رخنہ پیدا ہو گیا تھا اس کے انسداد کے لئے ناگزیر تھا کہ آئندہ

کے لئے ایسے وسائل اختیار کئے جائیں جن کے ذریعہ سے اسلام، اسلامی علوم اور اسلامی تہذیب و معاشرت کی حفاظت کی جا سکے، دارالعلوم کا نصب العین انہی مقاصد کا احیاء اور ان کی تجدید ہے، دارالعلوم کے مقاصد اور اس زمانے کے مسلمانوں کی پراگندہ حالی کی نسبت حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحؒ نے ۱۳۰۱ھ کے جلسۂ انعام میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

"اس مدرسہ کی بنار محض علوم دین کے احیار کے لئے ہوئی، یہ وہ زمانہ تھا جس میں بعد غدر ہندوستان نے تھوڑا وقت گذار لیا تھا اور مجموعۂ حال کے دیکھنے سے یوں نظر آتا تھا کہ اب علم دین کا خاتمہ ہے، نہ کوئی پڑھ سکے نہ پڑھا سکے، بڑے بڑے شہر کہ مرکز اس دائرہ کے تھے خراب ہو گئے تھے، علمار پریشان، کتب مفقود، جمعیت ندارد اگر کسی قلب میں شوقِ علم اور طلب کی ہمت ہوئی تو کہاں جائے اور کس سے سیکھے اور یوں نظر آتا تھا کہ بیس تیس برس میں جو علمار بقیدِ حیات ہیں اپنے وطنِ اصلی جنت کو سدھار جائیں گے، تب کوئی اتنا بتلانے والا بھی نہ رہے گا کہ وضو کے کتنے فرض اور نماز میں کیا واجب ہے، ایسی پریشانی اور مایوسی اور نومیدی میں فضلِ الٰہی نے جوش مارا اور رحمتِ خداوندی کا دریا اُمنڈ آیا اور ابر فیض قدرتِ کامل کا موسلا دھار برسا اور اپنے بندگانِ مقبول کو اس کام کی طرف متوجہ فرمایا، اور اپنا ابرِ کرم اس مدرسہ کی بنار میں ظاہر فرمادیا" [1]

کار زلفِ تست مشک افشانی اما عاشقاں ✲ مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے الفاظ میں دارالعلوم کے نصب العین کی تشریح یہ ہے:۔

---

[1] روداد جلسہ دستار بندی ۱۳۰۱ھ ص ۱

اوّل مذہبیت ۔ دارالعلوم مذہبی قوت کا سرچشمہ ہے اور اول سے آخر تک اسلام کے دستور وآئین کا پابند ہے، یہی وجہ ہے کہ یہاں کا ہر فرد اسلام کا نمونۂ کامل ہے ۔

دوئم آزادی ۔ جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ یہ دارالعلوم مکمل طور پر بیرونی غلامی کے خلاف ہے، اس کا نظام تعلیم و تربیت، اس کا نظام مالیات اور اس کا نظام اجتماعی سرتاسر آزاد ہے، دنیا میں یہ پہلی جامعہ ہے جس کے سامنے حکومت نے بارہا پیش کش کی مگر اس نے لاکھوں روپے کی پیش کش قبول کرنے سے انکار کر دیا ۔

سوم سادگی اور محنت پسندی ۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ یہاں کے علماء اور فضلاء جہادِ زندگی میں بڑی سے بڑی مصیبت برداشت کرنے کے عادی ہیں ۔

چہارم کردار (بلند اخلاقی) جس کا مفہوم یہ ہے کہ یہاں کے طلباء اُس کردارِ بلند کا نمونہ کامل ہیں جس کو انھوں نے اپنے اکابر سے پایا ہے، یہ کردار سرتاسر روحانی ہے ۔

پنجم علمی اور تعلیمی وابستگی ۔ یہ وہ خصوصیت ہے جسے دارالعلوم کو دیکھنے والا اولین لمحات میں محسوس کر سکتا ہے، یہ نہ کہنے کی بات ہے نہ سننے سے متعلق ہے دارالعلوم کی ہر خصوصیت کو اس کی زندگی کے آئینہ میں دیکھا جا سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں دنیا کے ہر حصے کے طلبہ موجود ہیں، دارالعلوم کے اساتذہ دنیا کے بہترین اساتذہ ہیں اور دارالعلوم کے خدّام ایثار وقربانی کا زندہ نمونہ ہیں، مسلمانوں کو ان لوگوں پر اعتماد ہے اور دنیا کے ہر حصے سے اس دارالعلوم کیلئے مالی امدادیں وصول ہوتی ہیں ۔

دارالعلوم کی داغ بیل اُن علمائے ربانین نے ڈالی تھی جو سراپا خلوص وللہیت تھے، ان کا دل و دماغ ملّتِ اسلامیہ کے شاندار مستقبل کے لئے بے چین تھا، انھوں نے

اپنے کو اشاعتِ دین اور ترویج علوم دینیہ کے لئے وقف کر دیا تھا، رب العالمین نے دار العلوم اور اس کی خدمت کو مقبولیت عطا فرمائی اور اس نے ملک اور بیرونِ ملک کی دینی، علمی، اخلاقی اور اصلاحی جو خدماتِ عظیم انجام دی ہیں وہ کبھی بھلائی نہیں جا سکتی ہیں۔ یہاں سے ہزاروں علماء اور صوفیاء پیدا ہوئے جن میں بہترین محدثین، فقہا، مصنفین اور مبلغین کا جمِ غفیر بھی ہے، اور رُشد و ہدایت اور تزکیۂ باطن کرنے والوں کی ایک لمبی جماعت بھی ہے، بلکہ ان میں وہ لوگ بھی بڑی تعداد میں ہیں جنھوں نے ملک کی آزادی اور یہاں کے باشندوں کی اصلاح کے لئے بے مثال قربانیاں پیش کی ہیں۔[1]

---

[1] منقول از اخبار "مدینہ" بجنور بابت ۹ جنوری ۱۹۴۶ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب دوم

دارالعلوم دیوبند کا قیام

اور سالانہ حالات وکوائف

ہندوستان میں علوم عربیہ دوسری صدی ہجری میں اسلامی فتوحات کے ساتھ داخل ہوئے، یہاں ملتان کو پہلا مدینۃ العلم بننے کا شرف حاصل ہوا، علماء نے اس سرزمین کو علم کی روشنی سے رونق بخشی، پھر سلاطینِ غزنویہ کے عہد میں لاہور مرکزِ علم بنا، اس کے بعد ساتویں صدی ہجری میں دہلی علوم وفنون کا گہوارہ بنی، بعدازاں دہلی کے فضل وکمال سے جونپور میں علم کی مسند بچھی، جون پور کے علم کی روشنی سے لکھنؤ منور ہوا، جہاں آفتابِ علم اس آب وتاب سے چمکا کہ اس نے پورب کے ہر قصبے کو انوارِ علم سے جگمگا دیا، علمی دنیا میں بلگرام، سندیلہ، گوپامؤ، خیرآباد اور بہار وبنگال کی علمی سرگرمیوں سے کون واقف نہیں، شاہجہاں فخریہ لہجے میں کہا کرتا تھا:۔

"پورب شیرازِ ماست"

دہلی جس کو اسلامی علوم وفنون کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی، ملک کے گوشے گوشے سے تشنگانِ علوم اپنی پیاس بجھانے کے لئے وہاں کا قصد کرتے تھے، مغل سلطنت کے

آخری دور میں اس سرزمین سے حضرت شاہ ولی اللہ (۱۱۱۴ھ/۱۷۰۲ء - ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) جیسا یگانۂ روزگار عالم اٹھا جس کے علمی فیض سے ایشیا کے اکثر ممالک آج تک سیراب ہو رہے ہیں، اس وقت ہندوستان میں علوم دینیہ بالخصوص تفسیر و حدیث کے جس قدر سلسلے موجود ہیں ان سب کا آغاز حضرت شاہ ولی اللہؒ سے ہوتا ہے، اس برصغیر میں دینی علوم کا جو کچھ ذوق پایا جاتا ہے وہ سب اس خاندانِ ولی اللہی کا فیض ہے، مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے ایک غیر ہندوستانی عالم کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ اُسے سارے ہندوستان کی سیاحت میں کوئی ایسا عالم نہیں ملا جو حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ (۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء - ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۳ء) کے واسطے سے حضرت شاہ ولی اللہؒ کا شاگرد نہ ہو[1]

اس دور میں نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیائے اسلام میں دینی علوم زوال کے آخری سرے پر پہنچ چکے تھے، چنانچہ مصر کے مشہور عالم سید رشید رضا لکھتے ہیں :-

لولا عناية اخواننا علماء الهند بعلوم الحديث فی هذا العصر لقضی علیها بالزوال من امصار الشرق فقد ضعفت فی مصر والشام والعراق والحجاز منذ القرن العاشر للهجرة حتی بلغت منتهی الضعف فی اوائل هذا القرن الرابع عشر[2]

اگر ہندوستان کے علماء کی توجہ اس زمانے میں علم الحدیث کی طرف مبذول نہ ہوتی تو مشرقی ممالک سے یہ علم ختم ہو چکا ہوتا، کیونکہ مصر، شام، عراق اور حجاز میں دسویں صدی ہجری سے چودھویں صدی کے اوائل تک حدیث کا علم ضعف کی آخری منزل تک پہنچ گیا تھا۔

خود ہندوستان کے ہمسایہ ملک افغانستان کی اس وقت جو حالت تھی اور اب تک باقی ہے، اُس کا اندازہ مولانا منصور انصاریؒ کے مندرجہ ذیل خط سے ہو سکتا ہے

---

[1] شاہ ولی اللہؒ کی سیاسی تحریک از مولانا عبید اللہ سندھی ص ۸۲ ۔

[2] مقدمہ مفتاح کنوز السنۃ، سید رشید رضا، ص "ق" مطبوعہ مصر ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۴ء ۔

لکھا ہے کہ:۔

"افغانستان میں علوم اسلامی علی الخصوص علوم قرآن و حدیث نہایت کس مپرسی اور زوال کی حالت میں ہیں، ایک اسلامی حکومت میں علوم اساسیہ اسلامی سے بے اعتنائی نہایت ہی قبیح امر ہے[۱]۔"

۱۸۵۷ء کے خونیں انقلاب میں جب دہلی اُجڑی اور اس کی سیاسی بساط اُلٹ گئی تو دہلی کی علمی مرکزیت بھی ختم ہو گئی، اور علم و دانش کا کارواں وہاں سے رخت سفر باندھنے پر مجبور ہو گیا، اُس وقت کے اہل اللہ اور خصوصیت سے اُن بزرگوں میں جو اس خونیں انقلاب سے خود بھی گزر چکے تھے اور مسلمانوں کی نعشوں کو خاک و خون میں تڑپتا ہوا دیکھ چکے تھے یہ فکر و اضطراب لاحق ہوا کہ علم و معرفت کے اس کارواں کو کہاں ٹھکانا دیا جائے؟ اور ہندوستان میں بے سہارا مسلمانوں کے دین و ایمان کو سنبھالنے کے لئے کیا صورت اختیار کی جائے؟ اسے بخت و اتفاق کہئے یا تقدیر الٰہی کہ اُس وقت اِس راہِ عمل کے لئے مذاکروں کا مرکزی مقام دیوبند کی مسجد چھتہ[۲] بن گئی، یہ وہی مسجد ہے جس میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا ورود دیوبند کے

---

[۱] مکتوب مولانا منصور انصاریؒ مہاجر افغانستان موسومہ حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند مؤرخہ ۱۱ صفر ۱۳۵۳ھ مشمولہ مسل نمبر ۳۴ سفر کابل۔

[۲] مسجد چھتہ، شہر کے مغربی جانب دارالعلوم کے جنوب مشرقی گوشے میں واقع ہے، یہ مسجد ہندوستان میں مسلمانوں کے ابتدائی طرز تعمیر کا نہایت سادہ اور دلنواز نمونہ ہے، چھوٹی اینٹ کی بغیر چونے اور پلاسٹر کی عمارت ہے، دیوبند میں یہ مسجد اکثر مشائخ اور اہل اللہ کی جائے قیام اور سرچشمۂ فیوض رہ چکی ہے، صحن مسجد کے جنوب مشرقی گوشے میں انار کا وہ چھوٹا سا تاریخی درخت اب تک موجود ہے جس کے سائے میں دارالعلوم کا مبارک آغاز ہوا تھا، مسجد کے قدیم حجرے جو شمال اور جنوب کی سمتوں میں تھے، اب اُن کی جگہ نئی تعمیر ہو گئی ہے، البتہ مسجد اپنی قدیم حالت میں موجود ہے۔

موقع پر قیام رہتا تھا، حضرت نانوتویؒ کی سسرال دیوبند کے محلہ دیوانؒ میں تھی، اس لئے اکثر یہاں تشریف آوری ہوتی رہتی تھی، دیوبند میں حضرت مولانا ذوالفقار علیؒ، حضرت مولانا فضل الرحمٰنؒ اور حضرت حاجی محمد عابدؒ سے مودّت و محبت کا رشتہ قائم تھا، ان حضرات کے وقت کا اکثر حصہ اسی ذکر و فکر میں صرف ہونے لگا، سوانح مخطوطہ کے مصنّف نے لکھا ہے کہ :-

"اُس زمانے میں جناب مولوی رفیع الدین صاحب اور جناب حاجی محمد عابد صاحب رحمہما اللہ چھتہ کی مسجد میں قیام پذیر تھے، مولانا نے ان بزرگوں کی وجہ سے اسی مسجد میں قیام کیا اور ان دونوں بزرگوں سے کمال درجے کا ربط ضبط قائم ہوگیا" [1]

اُس وقت بنیادی نقطۂ نظر یہ قرار پایا کہ مسلمانوں کے دینی شعور کو بیدار رکھنے اور ان کی ملّی شیرازہ بندی کے لئے ایک دینی و علمی درس گاہ کا قیام ناگزیر ہے، اس مرکزی فکر کی روشنی میں حضرت نانوتوی اور ان کے رفقاء خاص حضرت مولانا ذوالفقار علی، حضرت مولانا فضل الرحمٰن اور حضرت حاجی محمد عابد رحمہم اللہ نے یہ طے کیا کہ اب دہلی کے بجائے دیوبند میں یہ دینی درس گاہ قائم ہونی چاہیئے۔

یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اسلامی عہدِ حکومت میں مدارس کے لئے حکومت کی جانب سے اوقاف مقرر ہوتے تھے، جن سے مدارس کے اخراجات پورے کئے جاتے تھے والیانِ ریاست اور امرائے حکومت بھی پوری فیّاضی کے ساتھ مدارس کی سرپرستی کرتے تھے مگر جب دارالعلوم قائم ہوا تو اسلامی حکومت کی وہ شمع جو چھ سو سال سے ہندوستان میں روشن تھی، گُل ہوچکی تھی، اسلامی حکومت نے عوام کو اس سے بے نیاز کر دیا تھا کہ وہ اپنے

---

[1] یہ محلہ چھتہ کی مسجد کے شرق میں واقع ہے، اب اس محلّے کا خاصا حصّہ دارالعلوم میں شامل ہوچکا ہے دارالعلوم کا مہمان خانہ اور اساتذہ کے لئے مکانات اسی جگہ تعمیر ہوئے ہیں۔

[2] سوانح قاسمی جلد دوم ص ۲۳۱ و ۲۳۲

بچوں کی تعلیم کی ذمہ داری اپنے سر پر اٹھائیں، اس لئے اس وقت کا سب سے یہ تھا کہ آئندہ بچوں کی تعلیم کا کس طرح انتظام کیا جائے۔

۱۸۵۷ء (۱۲۷۴ھ) کی جنگ آزادی کی جد وجہد کے جرم میں انگریزوں نے مسلمانوں پر جہاں بے پناہ مظالم توڑے تھے وہیں اسلامی علوم وفنون اور مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کو بھی تباہ وبرباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی، اوقاف ضبط کر لئے گئے تھے، جن کی وجہ سے قدیم مدارس قریب قریب ختم ہو گئے تھے، اس لئے اب ضرورت تھی کہ اوقاف کے سابقہ طریقے پر بھروسہ کرنے کے بجائے کوئی دوسرا طریق اختیار کیا جائے، حضرت نانوتویؒ کے اصول ہشتگانہ سے واضح ہوتا ہے (جن کی تفصیل آگے آرہی ہے) کہ یہ طریقہ عوامی چندے کا تھا جس میں نہ حکومت کی مالی امداد شامل ہو اور نہ جاگیرداروں کی، تاکہ سرکاری اثرات سے یہ تعلیم گاہ آزاد رہے۔

چندے کی تحریک

چندے کی فراہمی کے سلسلے میں جس نے سب سے پہلے عملی اقدام کیا وہ حضرت حاجی محمد عابدؒ تھے، حاجی فضل حق صاحب نے حضرت نانوتویؒ کی سوانح مخطوطہ میں دارالعلوم کے لئے چندے کا طریقہ اختیار کرنے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

"ایک دن بوقت اشراق حضرت حاجی سید محمد عابدؒ سفید رومال کی جھولی بنا اور اس میں تین روپے اپنے پاس سے ڈال چھتے کی مسجد سے تن تنہا مولوی مہتاب علی مرحوم[1] کے پاس تشریف

---

[1] مولانا مہتاب علی (وفات ۱۲۹۳ھ) مولانا ذوالفقار علیؒ کے بڑے بھائی تھے، تیرھویں صدی ہجری کے اوائل میں دیوبند کے خاص استادوں میں تھے، دیوبند کے رئیس شیخ کرامت حسین کے دیوان خانہ میں جو مدرسہ قائم تھا اس میں عربی پڑھاتے تھے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی عربی تعلیم کا آغاز اسی مدرسہ سے ہوا تھا، قیام دارالعلوم کے لئے پہلا چندہ حاجی محمد عابدؒ کا تھا اور دوسرا چندہ انہی مولانا مہتاب علیؒ نے دیا تھا، قیام دارالعلوم کے بعد اس کی مجلس شوریٰ کے رکن قرار پائے، دارالعلوم کے سالانہ امتحانات میں انھیں ممتحن بنایا جاتا تھا۔ (تاریخ دیوبند طبع دوم ص ۲۳۱ و ۲۳۲)

لائے، مولوی صاحب نے کمال کشادہ پیشانی سے چھ روپے عنایت کئے اور دعا کی، اور بارہ روپے مولوی فضل الرحمٰن صاحب نے اور چھ روپے اس مسکین (سوانح مخطوطہ کے مصنف حاجی فضل حق صاحب) نے دیئے، وہاں سے اٹھ کر مولوی ذوالفقار علی سلمہ اللہ تعالیٰ کے پاس آئے، مولوی صاحب ماشاءاللہ علم دوست ہیں فوراً بارہ روپے دیئے، اور حسن اتفاق سے اُس وقت سید ذوالفقار علی ثانی دیوبندیؒ[1] وہاں موجود تھے، اُن کی طرف سے بھی بارہ روپے عنایت کئے، وہاں سے اُٹھ کر یہ درویش بادشاہ صفت محلہ ابوالبرکات پہنچے، دو سو روپے جمع ہو گئے، اور شام تک تین سو روپے، پھر تو رفتہ رفتہ خوب چرچا ہوا، اور جو پھل پھول اس کو لگے وہ ظاہر ہیں، یہ قصہ بروز جمعہ دوم ماہ ذی قعدہ ۱۲۸۲ھ میں ہوا۔[2]

آج سے سوا سو سال پہلے بلاشبہ یہ ایک عجیب و غریب اور نئی بات تھی کہ عوامی چندے کی بنیاد پر ایک ایسا تعلیمی ادارہ قائم کیا جائے جو حکومت کے اثرات سے آزاد ہو،

---

[1] سید ذوالفقار علی پنجاب میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے، اُن کی شاندار حویلی کے ایک حصے میں آج کل اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول جاری ہے، اُن کے فرزند مولوی ممتاز علی نامور عالم گزرے ہیں، جن کا لاہور میں قیام رہا "تہذیب نسواں" کے نام سے خواتین کا ایک ماہانہ رسالہ نکالتے تھے، مولانا ممتاز علی کئی کتابوں کے مصنف ہیں، اُن کی ایک اہم کتاب "البیان فی مقاصد القرآن" ہے، اُس میں قرآنی مضامین کی تبویب چار جلدوں میں کی گئی ہے، اردو کے مشہور ادیب سید امتیاز علی تاج اُنہی کے فرزند تھے۔ (تاریخ دیوبند ص ۳۲۲ و ۳۲۳)

[2] سوانح مخطوطہ بحوالہ سوانح قاسمی مصنفہ مولانا مناظر احسن گیلانی جلد دوم۔ سوانح مخطوطہ حاجی فضل حق مرحوم کی تصنیف ہے، مصنف حضرت نانوتوی قدس سرہٗ سے بیعت تھے، سوانح قاسمی مصنفہ مولانا گیلانی میں جابجا سوانح مخطوطہ کے حوالے ملتے ہیں، افسوس ہے کہ اس سوانح حیات کے شروع اور آخر کے اوراق ضائع ہو گئے ہیں، جو حصہ باقی بچا ہے اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سوانح حیات کے معیار پر نہایت جامع اور مکمل سوانح حیات ہوگی۔ سید محبوب رضوی

آنے والے عوامی دور کے پیشِ نظر یہ ایک زبردست پیش بینی تھی، تحریک خلافت کے موقع پر جب مولانا محمد علی جوہر مرحوم دارالعلوم میں آئے اور اُنھوں نے حضرت نانوتویؒ کے اصول ہشتگانہ دیکھے تو مولانا مرحوم کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور فرمایا کہ "ان اصول کا عقل سے کیا تعلق! یہ تو خالص الہام و معرفت کے سرچشمے سے نکلی ہوئی باتیں ہیں، سو برس کے بعد دیکھئے کہ ہم جس نتیجے پر پہنچے ہیں، حیرت ہے کہ یہ بزرگ پہلے ہی اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے"۔

اب جب کہ بڑی بڑی ریاستیں خواب و خیال بن چکی ہیں، اور زمینداریاں ختم ہوگئی ہیں، مگر کشمیر سے آسام تک ہزاروں دینی مدرسے چل رہے ہیں اور اُن پر حکومت کی تبدیلیوں کا کوئی اثر نہیں ہے، اس سے عوامی چندے کی افادیت اور مدارس کی بنیادوں کے استحکام کا اندازہ کیا جا سکتا ہے!

اوقاف کے سابقہ طریقے کے بجائے عوامی چندے کا یہ طریقہ بہت کامیاب اور بڑا نتیجہ خیز ثابت ہوا، دینی مدارس کے قیام اور دینی تعلیم کی نشر و اشاعت کے لئے یہ ایک ایسا مفید اور مستحکم طریقہ تھا جس نے دینی تعلیم کے فروغ کو عوامی چندے کی تحریک میں تبدیل کر دیا، چندے کی نسبت دارالعلوم کا شروع سے طے شدہ اصول یہ رہا ہے کہ اس میں نہ تو چندے کے لئے کوئی لازمی مقدار مقرر کی گئی ہے نہ مذہب و ملّت کی تخصیص روا رکھی گئی ہے، چندے کی اس دفعہ کے الفاظ یہ ہیں:-

"چندے کی کوئی مقدار مقرر نہیں ہے اور نہ خصوصیتِ مذہب و ملّت ہے"

بانیٔ دارالعُلوم کا دستور العمل

قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ (۱۲۴۸ھ/۱۸۳۲ء - ۱۲۹۷ھ/۱۸۷۹ء) جو اس تعلیمی تحریک کے قافلہ سالار اور روحِ رواں تھے، اُنھوں نے علمی، تعلیمی، تبلیغی، تصنیفی، سیاسی، اور معاشرتی امور میں برِّ صغیر کے مسلمانوں کی عظیم الشان اور گراں قدر خدمات انجام دی ہیں

اُنھوں نے دینی مدارس خصوصاً دارالعلوم کے قیام وبقا کے لئے جو دستورالعمل تجویز فرمایا ہے اس میں اسلامی دورِ حکومت کے سابقہ طریق کے برعکس اسی عوامی چندے اور جمہوری طرز کے اختیار کرنے کی پُرزور تلقین کی گئی ہے۔ اس دستورالعمل میں حضرت نانوتوی قدس سرہٗ نے بتلایا ہے کہ دینی مدارس کے قیام کے لئے بنیادی طور پر یہ اصول ضروری قرار دئے جائیں :۔

(۱) اصل اوّل یہ ہے کہ تا مقدور کارکنانِ مدرسہ کو ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے، آپ کوشش کریں، اوروں سے کرائیں، خیر اندیشانِ مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے۔

(۲) ابقائے طعامِ طلبہ بلکہ افزائش طلبہ میں جس طرح ہو سکے خیر اندیشانِ مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں۔

(۳) مشیرانِ مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور خوش اسلوبی ہو اپنی بات کی پچ نہ کی جائے۔ خدانخواستہ جب اس طرح کی نوبت آئے گی کہ اہلِ مشورہ کو اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنیاد میں تزلزل آجائے گا۔ القصہ تہہ دل سے بروقت مشورہ اور نیز اس کے پس و پیش میں اسلوبی مدرسہ ملحوظ رہے، سخن پروری نہ ہو۔ اور اس لئے ضروری ہے کہ اہلِ مشورہ اظہارِ رائے میں کسی وجہ سے متأمل نہ ہوں اور سامعین بہ نیتِ نیک اس کو سنیں، یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائے گی تو اگرچہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہ ہو بدل وجان قبول کریں گے، اور نیز اسی وجہ سے یہ ضرور ہے کہ مہتمم اُمور مشورہ طلب میں اہلِ مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے، خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیرِ مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی وارد وصادر جو علم وعقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو، اور نیز اس وجہ سے ضرور ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے اہلِ مشورہ سے مشورے کی نوبت نہ آئے اور بقدرِ ضرورت اہلِ مشورہ کی مقدارِ معتدبہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر اس وجہ سے

ناخوش نہ ہوکر مجھ سے کیوں نہ پوچھا، ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر اہلِ مشورہ معترض ہوسکتا ہے۔

(۴) یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں اور مثل علماء روزگار خود بین اور دوسروں کے درپئے توہین نہ ہوں، خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔

(۵) خواندگی مقررہ اس انداز سے جو پہلے تجویز ہوچکی ہے یا بعد میں کوئی اور انداز مشورہ سے تجویز ہو پوری ہوجایا کرے، ورنہ یہ مدرسہ اول تو خوب آباد نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔

(۶) اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا، اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانہ، تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امدادِ غیبی موقوف ہوجائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہوجائے گا، القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

(۷) سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

(۸) تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے امید ناموری نہ ہو، بالجملہ حسن نیت اہلِ چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔

ان اصولِ ثمانیہ کی نہایت ہی بلیغ تشریح حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ نے فرمائی ہے، جو ایک مستقل پمفلٹ میں بنام "آزادئ ہند کا خاموش رہنما" شائع ہوچکی ہے۔

اس دستور العمل کی پہلی، دوسری، اور چھٹی ساتویں اور آٹھویں دفعہ میں واضح طور پر عوامی چندے کو اوقاف کا بدل تجویز کیا گیا ہے، اور اسی کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی پورا

زور دیا گیا ہے کہ آمدنی کے یقینی ذرائع سے احتراز کرنا ضروری ہے، ورنہ خوف و رجا جو اصل سرمایۂ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا![1]

دارالعُلوم کا افتتاح

۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۶ء، برِ صغیر کے مسلمانوں کے لئے وہ مبارک و مسعود سال ہے جس میں شمالی ہند کی اس قدیم تاریخی بستی میں ان کی دینی و علمی اور ملّی و تہذیبی زندگی کی نشأۃ ثانیہ کا آغاز ہوا۔ ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء بروز پنجشنبہ، چھتے کی قدیم مسجد کے کھلے صحن میں انار کے ایک چھوٹے سے درخت کے سائے میں نہایت سادگی کے ساتھ کسی رسمی تقریب یا نمائش کے بغیر دارالعلوم کا افتتاح عمل میں آیا، حضرت مولانا ملا محمود دیوبندیؒ[2] کو جو علم و فضل میں بلند پایہ عالم تھے مدرس مقرر کیا گیا، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کے وہ اولین شاگرد تھے جنھوں نے استاد کے سامنے کتاب کھولی، یہ عجیب اتفاق ہے کہ استاد اور شاگرد دونوں کا نام محمود تھا، اس وقت رب السموات والارض کے التفات اور چشم کرم پر بھروسہ کرنے کے سوا اور کوئی ظاہری ساز و سامان نہ تھا، اخلاص و خدمتِ دین اور توکل علی اللہ کے جذبات کے سوا ہر سرمائے سے ان حضرات کا دامن خالی تھا، چنانچہ اس بے سر و سامانی کے ساتھ افتتاح عمل میں آیا کہ نہ کوئی عمارت موجود تھی اور نہ طلبا کی جماعت، صرف ایک طالب علم اور ایک استاد، یہ تھی کل کائنات اس ادارے کی جو آج کل "ازہرِ ہند دارالعلوم دیوبند" کے نام سے پوری دنیا میں مشہور و معروف ہے

---

[1] بنارِ دارالعلوم کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی کتاب "بانیٔ دارالعلوم دیوبند"۔

[2] ملا محمود، دیوبند کے باشندے اور جید عالم تھے، میرٹھ میں پڑھاتے تھے، حضرت نانوتویؒ نے انھیں پندرہ روپے ماہوار پر مقرر کر کے دیوبند بھیجا اور حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ کو اُن کے خط کے جواب میں تحریر فرمایا کہ مدرسہ شروع کر دیا جائے، میرے آنے کا انتظار نہ کیا جائے، میں بھی ساعی رہوں گا۔

اگرچہ بظاہر یہ ایک مدرسہ کا بہت ہی مختصر اور محدود پیمانے پر افتتاح تھا، مگر در حقیقت ہندوستان میں دینی تعلیم کی ایک عظیم تحریک کے نئے دور کا آغاز تھا، جس کو پورے غور و فکر کے ساتھ شروع کیا گیا تھا، جیسا کہ بعد میں دارالعلوم کی عظیم الشان ترقی سے واضح ہوتا ہے، دارالعلوم کے بزرگوں نے برِّ صغیر میں ملّت کی دینی اور اجتماعی زندگی کی بقا اور تحفظ کے لئے کتاب اللہ کی مشعل روشن کی اور تفسیر و حدیث، فقہ اور اسلامی علم و ادب اور عقائد و اعمال کے ذریعے سے اس تاریک دور کے چھا جانے والے خطرات سے بچانے کے لئے ایک ایسا مضبوط دفاعی حصار تیار کیا جس نے مسلمانوں کو روحانی اور علمی شکست سے بچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے، اس کی تفصیل آئندہ اوراق میں پیش کی جائے گی۔

قیامِ دارالعلوم کا اعلان

اکابر دارالعلوم کی جانب سے قیام دارالعلوم کے موقع پر جو اعلان شائع کیا گیا وہ یہ ہے:۔

"الحمد للہ دیوبند میں اکثر اہل ہمت نے جمع ہو کر کسی قدر چندہ جمع کیا، اور ایک مدرسہ عربی پندرہ تاریخ محرم ۱۲۸۳ھ سے جاری ہوا، اور مولوی محمد محمود صاحب بالفعل بمشاہرہ پندرہ روپیہ ماہوار پر مقرر ہوئے، چونکہ لیاقت مولوی صاحب کی بہت کچھ ہے اور تنخواہ بسبب قلّتِ چندہ کے کم، ارادہ ہتممان مدرسہ کا ہے کہ بشرط وصول زر چندہ قابل اطمینان جس کی امید کر رکھی ہے، تنخواہ مولوی صاحب کی زیادہ کی جاوے اور ایک مدرس فارسی و ریاضی کا مقرر ہو۔

جملہ اہل ہمت و خیر خواہانِ ہند خصوصاً مسلمانان سکنائے دیوبند و قرب و جوار دیوبند پر واضح ہو کہ جو لوگ اب تک شریک چندہ نہیں ہوئے بدل شریک ہو کر امداد کافی دیویں، اور واضح ہو کہ سوائے چندہ فہرست ہذا کے جس کی میزان ۴۰۱ روپے آٹھ آنے ہے، دوسرا چندہ واسطے خوراک و مدد خرچ طلبائے بیرو نجات کے جمع ہوا ہے اور سولہ طالب علموں کا صرف جمع ہو گیا ہے، اور

انشاء اللہ روز بروز جمع ہوتا جاتا ہے، اس میں سے طلبہ بیرونجات کو کھانا پکا پکایا اور مکان رہنے کو ملے گا، کتابوں کا بندوبست بھی متعاقب ہوگا، نام مہتمان کے درج ذیل ہیں، جن صاحبوں کو روپیہ چندہ بھیجنا منظور ہو تو بنام ان کے بذریعہ خط بیرنگ ارسال فرمادیں، رسیدان کی بصیغہ بیرنگ بھیجی جاوے گی۔ فقط۔

حاجی عابد حسین صاحب۔ مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی۔ مولوی مہتاب علی صاحب، مولوی ذوالفقار علی صاحب۔ مولوی فضل الرحمن صاحب۔ منشی فضل حق صاحب، شیخ نہال احمد صاحب

العبد فضل حق سربراہ کار مدرسہ عربی و فارسی و ریاضی قصبہ دیوبند

تحریر بتاریخ ۱۹ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ روز دوشنبہ

یہ حضرات مجلس شوریٰ کے صرف رکن ہی نہ تھے بلکہ یہ دارالعلوم کے اولین معمار تھے ان میں حضرت نانوتوی قدس سرہٗ دارالعلوم کے سب سے پہلے سرپرست تھے، اور حضرت حاجی عابد حسین رحمۃ اللہ علیہ پہلے مہتمم تھے۔

دارالعلوم کی حیرت انگیز کامیابی

قیام دارالعلوم کا زمانہ بڑی بے سروسامانی کا تھا، نہ پڑھانے کے لئے مناسب جگہ تھی اور نہ طلباء کے رہنے کا کوئی انتظام تھا، مگر تہی دستی اور بے مائیگی میں بھی فراغ بالی اور اس پریشان حالی میں بھی عجب دل جمعی تھی، چناں چہ دارالعلوم نے قائم ہوتے ہی حیرت انگیز طور پر ترقی کی جانب قدم بڑھانا شروع کردیا، قرب وجوار کے علاوہ دور دراز مقامات بنارس، پنجاب اور افغانستان سے طالبانِ علم آنے شروع ہوگئے، اور چندہی دنوں میں یہ معمولی مدرسہ

ایک اقامتی درس گاہ میں تبدیل ہوگیا، مدرسین میں بھی اضافہ کیا گیا، آخر سال میں جو روداد شائع ہوئی اس میں لکھا ہے:۔

الحمد للہ کہ ۱۲۸۳ھ بخیریت تمام ہوا، یہ وہ مبارک سال ہے جس میں بناء مدرسۂ عربی دیوبند قائم ہوئی، اور اس عرصۂ قلیل میں اتنی رونق پکڑی کہ ہرگز امید نہ تھی، ابتداء میں خیال نہیں آتا تھا کہ اس قدر طلباء جمع ہوں گے، چندہ اور خرچ اتنا ہو جاوے گا، جمعیت چند تو در کنار لوگوں کو تامل تھا کہ پڑھنے والے عربی کے کہاں سے آویں گے، مگر عنایتِ الٰہی سے بفور شروع ہونے کے طالب علم اطراف و جوانب سے اور ممالک دور دراز سے ایسے جمع ہو گئے کہ گویا منتظر بیٹھے ہوئے تھے، فقط قصبات ضلع سہارنپور و اضلاع ممالک مغربی کے طلبہ ہی نہیں آئے بلکہ پنجاب و کابل و بنارس وغیرہ تک کے لوگ جمع ہو گئے، اور چونکہ ان کے کھانے اور مکان وغیرہ کی طرف سے یہاں بالکل اطمینان رہا، بفارغ بالی تمام تحصیل علم میں مصروف رہے، ہر چند اہل دیوبند کا یہ خیال اور ارادہ ہر آئینہ قابل تحسین و آفریں ہے کہ انھوں نے باوجود کم استطاعتی کے محض براہ نیک نیتی اور خیر خواہی اہل وطن کے بناء اس مدرسہ کی ڈالی اور طلبہ بیرونی کا خرچ خوراک وغیرہ اپنے ذمے لے کر ان کو کمال عزت سے رکھا، اور شرکاء چندہ نقد نے نہایت خوشی اور اخلاص سے چندہ ۱۲۸۴ھ پیشگی دیا اور چندہ سال آئندہ بکمال کشادہ پیشانی دے رہے ہیں اور جن سے چندہ ہنوز ادا نہیں ہوا اُن کو روز و شب فکر ادا ہے، لیکن کمال شکر ہے، اُن صاحبوں غیر اہل دیوبند کا جنھوں نے اس کام کو محض مفید عام سمجھ کر خود شریک چندہ ہوئے اور لوگوں کو اس طرف راغب کیا۔ فی الحقیقت یہ مدرسہ ظاہر میں اگرچہ خاص بمقام دیوبند معلوم ہوتا ہے لیکن فائدہ اس کا دُور، دُور تک پہنچتا ہے، اس لئے امداد و اعانت اس کی جملہ اہل ہند پر واجب ہے، پس امید ہے کہ جو صاحب شریک چندہ ہیں، چندہ ۱۲۸۴ھ جلد عنایت فرمادیں، اور ترقی کار اور زیادتی خرچ مدرسہ پر نظر کر کے جہاں تک ممکن ہو زیادتی چندہ کا فکر کریں اور اپنے احباب و اقارب کو بھی شامل اس کار خیر کے فرمادیں۔

اب واسطے انکشاف حال ترقی مدرسہ جمع و خرچ چندہ و انتظام خواندگی و امتحان و انعام سالانہ ۱۲۸۳ھ کی مجملاً کیفیت لکھتے ہیں تاکہ شرکا کو فرحت اور سامعین کو رغبت ہووے اور یقین ہوجاوے کہ چندہ کو نہایت امانت و کفایت سے صرف کیا ہے، اس سال میں ۶۴۹ روپیہ چار آنے وصول ہوئے اور منجملہ وصول شدہ کے ۳۹۳ روپے بارہ آنے تین پائی تنخواہ مدرسین و سائر خرچ مدرسہ میں صرف ہوا، اور ۲۵۵ روپیہ سات آنے نو پائی آخر ذی الحجہ ۱۲۸۳ھ کو باقی رہے، وجہ اس قدر بچ رہنے کی یہ ہے کہ ابتدا میں خرچ مدرسہ تھوڑا تھا، صرف ایک مدرس اور دو نائب رہے، بعدہٗ مدرس زیادہ ہوئے، آج کل خرچ ماہوار تخمیناً پچاس روپیہ کا ہے، اور تخمینہ خرچ ۱۲۸۴ھ سات سو روپیہ سے کم نہیں ہے۔

محرم ۱۲۸۳ھ میں تعداد طلبا ۲۱ تھی اور آخر ذی الحجہ ۱۲۸۳ھ میں ۷۸ ہوگئے، منجملہ اُن کے ۵۸ طلبہ بیرونجات کے ہیں، جن میں ۵۲ کو اہلِ دیوبند کی جانب سے کھانا ملتا ہے اور ۶ طلبہ اپنے پاس سے کھاتے ہیں، اِس سال کی تعلیمی کارگزاری کی نسبت روداد میں لکھا ہے :-

کارگذاری اور محنت ہر آئینہ قابلِ تعریف ہے، یہ ایک عمدہ نتیجہ حُسن سعی مدرسان ہے کہ بعض طلبہ جو میزان پڑھتے ہوئے داخل مدرسہ ہوئے تھے وہ کافیہ پڑھتے ہیں، اور چند متوسط الاستعداد قریب فارغ تحصیل ہونے کے ہو گئے۔

مولوی محمد یعقوب صاحب مدرس نانوتوی اور مولوی محمد محمود صاحب دیوبندی کی محنت اور توجہ کا شکریہ ہم پر واجب ہے کہ اُن کی توجہ سے اس تھوڑے سے عرصہ میں بہت کچھ ترقی تعداد اور استعداد ہوئی، اور دیگر مدرسان مولوی محمد فاضل، مولوی میر باز خاں، و مولوی فتح محمد و حافظ احمد حسن نے بھی بہت سرگرمی سے اپنے کام کو انجام دیا، ہمارا ارادہ ہے کہ تنخواہ حال مدرسان پر اضافہ کیا جاوے، مگر یہ امر ترقی چندہ پر موقوف ہے، اہلِ چندہ ہماری اس تمنا کے پوری کرنے کا خیال رکھیں۔

ماہِ شعبان ۱۲۸۳ھ میں فاضل کامل مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی نے بشمول مولوی مہتاب علی صاحب و مولوی ذوالفقار علی صاحب نہایت مستعدی اور سرگرمی سے امتحان لیا اور جلسۂ اخیر بحضور اکثر رؤسائے دیوبند ہوا، کتب انعام قیمتی ۷۲ روپیے بتجویز ممتحنان صاحبان نے اپنے پاس سے طلبہ کو تقسیم کیں۔[1]

تعلیمی اور انتظامی اقدامات

آغازِ تعلیم کے موقع پر صرف ایک مدرس مولوی محمد محمود صاحب تھے، دورانِ سال میں جب طلبہ بڑھ گئے تو حسبِ ضرورت چار مدرس اور رکھے گئے، جن کے نام اوپر گذر چکے ہیں، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کو جو اجمیر، بنارس اور سہارنپور وغیرہ میں محکمۂ تعلیم میں ڈپٹی انسپکٹر رہ چکے تھے، صدارتِ تدریس تفویض کی گئی۔

دارالعلوم کا نظم و نسق شروع ہی سے وامرھم شوریٰ بینھم کے اُصول پر رائے

---

[1] یہ حالات روداد سال اول ۱۲۸۳ھ کے صفحہ اول، دوم، سوم سے ماخوذ ہیں، دارالعلوم کے تاریخی حالات کے لئے سالانہ رودادوں کے علاوہ محافظ خانہ کے غیر مطبوعہ دفتری ریکارڈ سے بھی مدد لی گئی ہے، سالانہ شائع ہونے والی روداد دارالعلوم بلحاظ ترتیب تین حصوں پر مشتمل ہوتی ہے، پہلا حصہ اُن اہم کوائف و حالات کا ہوتا ہے جو اس سال پیش آئے ہیں، دوسرے حصے میں آمد و صرف کے گوشوارے، چندہ دہندگان کی فہرست اور اساتذہ و کارکنان کی تفصیل ہوتی ہے، تیسرے حصے میں طلبہ کے سالانہ امتحان کے نتائج پیش کئے جاتے ہیں۔

حالاتِ سنویّہ کے لئے روداد کے پہلے حصے کو ماخذ قرار دیا گیا ہے، بقیہ اُمور کے لئے آخر میں گوشوارے شامل کر دیئے گئے ہیں، جن سے ہر سال کی آمد و صرف کی تفصیل، تعمیرات کے مصارف، اساتذہ، کارکنان اور طلبہ کی تعداد وغیرہ کی کیفیت معلوم ہو سکتی ہے۔ مذکورہ بالا ماخذ کے علاوہ جہاں کسی دوسرے ماخذ سے مدد لی گئی ہے وہاں اس کا حوالہ دے دیا گیا ہے۔ سید محبوب رضوی

اور شوریٰ کی بنیاد پر قائم ہے، چنانچہ نظم و نسق کے لئے ایک جماعت مجلس شوریٰ کے نام سے قائم کی گئی، قیام دارالعلوم کے بعد جو اعلان شائع کیا گیا اُس میں مجلس شوریٰ کے تمام اراکین کے نام درج ہیں، یہ ابتدائی مجلس شوریٰ حسب ذیل سات ارکان پر مشتمل تھی، حسب ترتیب اسمائے گرامی یہ ہیں :-

حضرت حاجی عابد حسین صاحبؒ ۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ

حضرت مولانا مہتاب علی صاحبؒ ۔ حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ ،

حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ ۔ منشی فضل حق صاحبؒ ۔ شیخ نہال احمد صاحبؒ ،

مجلس شوریٰ کی زیر ہدایت آمد و صرف کے حسابات رکھنے اور تعلیمی امور کے نظم و نسق کے لئے حضرت حاجی عابد حسین صاحب کو جو مجلس شوریٰ کے رکن بھی تھے مہتمم مقرر کیا گیا، اور دفتری کاموں کی انجام دہی کے واسطے حاجی فضل حق صاحب کو سربراہ کار بنایا گیا۔

سالانہ امتحان

پہلے سال کا سالانہ امتحان جس میں منجملہ ۷۸ طلبہ کے ۳۷ طلبہ شریک امتحان ہوئے، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ، حضرت مولانا مہتاب علی صاحب اور حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب نے لیا، ان حضرات نے نتیجے کے ساتھ روداد میں حسب ذیل تاثرات کا اظہار فرمایا :-

"ہم نے کئی روز تک امتحان مفصل ہر دفعہ کا لیا اور حتی الوسع سوالات مشکل پوچھے اور نمبر ہر طالب علم کے ہر ایک کتاب کے بابت لگائے، حال مدرسہ بالعموم قابل تعریف پایا، مدرسان کی سعی اور طلبہ کی محنت اس امتحان سے بخوبی ثابت ہے۔"

۱۲۸۴ھ کے حوادث

ابھی دارالعلوم کے قیام کا دوسرا ہی سال تھا کہ اچانک دو واقعے ایسے پیش آئے جن سے یہ خطرہ محسوس ہونے لگا کہ یہ ننھا سا پودا پھلنے پھولنے سے پہلے ہی کہیں نذرِ حوادث نہ ہو جائے، پہلا حادثہ دیوبند میں

وبائی مرض کی شدت کا تھا، جس میں اکثر اساتذہ اور طلبہ مرض وبائی میں مبتلا ہو گئے، اور بعض اپنے اپنے وطن چلے گئے، اس سبب سے دو مہینے تک تعلیم بند رہی، مگر خدا کا شکر ہے کہ وبائی مرض کے دور ہونے کے بعد اساتذہ اور طلبہ کی غیر معمولی محنت اور سعی نے اس نقصان کی تلافی کر دی اور مقررہ خواندگی پوری ہو گئی، حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وبائی مرض کی شدت کے باوجود بیرونی طلبہ کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا، گذشتہ سال طلبہ کی تعداد ۸۰ تھی اور اس سال میں ۲۰۰ تک پہنچ گئی، چندے میں بھی سال گذشتہ کے مقابلے میں دوگنا اضافہ ہوا، ۱۲۸۳ھ میں چندے کی مقدار ۶۴۹ روپیہ تھی، اس سال میں زرچندہ کے ۱۲۷۵ روپیہ وصول ہوئے۔

دوسرا واقعہ جسے روداد میں "امر عظیم اور حادثۂ فخیم" سے تعبیر کیا گیا ہے، یہ تھا کہ دفعۃً حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ نے سفر حج کا ارادہ فرمایا۔ روداد میں مذکور ہے کہ "یہ ایسا زلزلہ تھا کہ اگر بنیاد مدرسہ بیخ برکندہ ہو جاتی تو عجب نہ تھا، کیونکہ باشندگان دیوبند میں بظاہر کوئی ایسا نظر نہ آتا تھا کہ اس کام کا متکفل ہوتا، لیکن خدا خود میر سامان است ارباب توکل را بعض ارکان کو جنھیں لیاقت کامل اور اخلاص نیت حاصل ہے یہ القا ہوا کہ اس کام کے واسطے مولوی رفیع الدین نہایت مناسب ہیں، چنانچہ ابتدائے شعبان ۱۲۸۴ھ سے یہ کام ان کے سپرد ہوا اور انتظام مدرسہ کی طرف سے بالکل اطمینان ہو گیا۔

گذشتہ سال جب مدرسین کو رکھا گیا تھا تو اُن کے مشاہرے بہت کم تھے، اُن سے وعدہ کیا گیا تھا کہ آمدنی میں اضافہ کے ساتھ مشاہروں میں ترقی دی جائے گی، چونکہ اس سال میں آمدنی بڑھ گئی تھی اس لئے حسب وعدہ ترقی دی گئی، صدر مدرس کی تنخواہ میں دس روپیے کا اضافہ ہوا، مدرس دوم کے ۱۵ سے ۲۰ ہو گئے، اور نائبوں کی تنخواہ تین کے بجائے چھ روپیے کی گئی۔

درجۂ قرآن اور درجۂ فارسی کا آغاز

سال گذشتہ میں قرآن شریف اور فارسی و ریاضی کی تعلیم کا انتظام نہ ہو سکا تھا اس لئے

مقامی بچے ابتدائی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے دارالعلوم سے مستفیض نہ ہو سکتے تھے، اس دِقت کو رفع کرنے کے لئے درجۂ قرآن شریف اور درجۂ فارسی و ریاضی کا اجرا کیا گیا، اور دونوں درجوں میں ایک ایک استاد پانچ پانچ روپے پر مقرر ہوا۔

دارالعلوم کی روز افزوں ترقی کے پیشِ نظر اسی سال میں ایک محاسب کا تقرر بھی عمل میں آیا۔

کتب درسیہ کی فراہمی

دینی مدارس کی دارالعلوم کے نقش قدم کے مطابق یہ خصوصیت رہی ہے کہ ان میں تعلیم یکسر مفت ہوتی ہے، حتیٰ کہ درسی کتابوں کی فراہمی کا بار بھی طالب علم پر نہیں ڈالا جاتا، دارالعلوم جب قائم ہوا تو اس کے پاس ضرورت کے مطابق نہ تو کتابیں موجود تھیں اور نہ اُن کے حاصل کرنے کے لئے سرمایہ تھا، اس لئے یہ تدبیر کی گئی کہ دیوبند اور قرب و جوار کے جن اہلِ علم حضرات کے پاس درسی کتابیں موجود تھیں اُن سے کچھ مدت کے لئے عارضی طور پر کتابیں مستعار حاصل کر لی گئیں، اس سال کی روداد میں مستعار کتابیں دینے والے حضرات کی ایک طویل فہرست درج ہے، جب آئندہ سالوں میں دارالعلوم کے پاس کتابوں کا معقول ذخیرہ فراہم ہو گیا تو مستعار کتابیں واپس کر دی گئیں۔ بیرونی لوگوں میں دارالعلوم کے لئے کتابیں فراہم کرنے والوں میں شیخ الٰہی بخش میرٹھی، باشندگان داناپور اور عبدالرحمٰن خاں صاحب مہتمم مطبع نظامی کانپور کو اوّلیت کا شرف حاصل ہے۔

تعلیمی کیفیت

دارالعلوم کی تعلیمی ترقی شروع ہی سے بلند، عمدہ اور نتیجہ خیز رہی ہے، ابھی اس نے اپنی عمر کی دوسری منزل ہی طے کی تھی کہ یہاں ایسے طلبہ تیار ہو گئے جو تدریسی خدمات انجام دے سکتے تھے، چنانچہ دارالعلوم کے ایک فاضل مولوی میرباز خاں مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں مدرس مقرر ہو گئے، روداد میں لکھا ہے کہ مدرسین کی سعی اور محنت کے نتیجے میں یہ امر بالخصوص قابلِ ذکر ہے کہ باوجود موانع مذکور بالا کے خواندگی میں ترقی ہوئی، فی الحال اس مدرسہ میں چند طلبہ ایسے ہیں جو فراغت کے قریب ہیں اور عربی و فارسی کی تعلیم کو بخوبی

انجام دے سکتے ہیں، چنانچہ حسب طلب مہتمم صاحب مدرسہ عربی سہارنپور مولوی میر باز خاں کو مدرس دوم مقرر کر کے بھیجا گیا ہے۔

۱۲۸۵ھ میں حضرت گنگوہیؒ کا معائنہ

اس سال کے حالات میں یہ واقعہ خاص اہمیت رکھتا ہے کہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کے ملاحظہ کے لئے تشریف لائے۔ دارالعلوم کو دیکھا، طلبہ کا امتحان لیا اور بعد ازاں حسب ذیل معائنہ تحریر فرمایا:۔

"آج ۳۰ر صفر ۱۲۸۵ھ کو یہ عاجز مدرسہ دیوبند میں حاضر ہوا اور اتفاق ملاحظہ حال مدرسہ و مدرسین و طلبہ ہوا تو نقشہ سے ۸۰ طلبہ عربی خواں سوائے فارسی خواں و قرآن خواں کے معلوم ہوا، مگر اس وقت ۷۴ طلبہ موجود و حاضر مدرسہ تھے، کچھ کچھ جماعت متفرقہ کا جو سنا گیا تو فی الواقع اہتمام مہتممین اور حسن سعی مدرسین اور کوشش و محنت طلبہ کو قابلِ تحسین و آفریں پایا، اگر ایسی ہی سعی کرتے رہیں گے تو یقین غالب ہے کہ چند مدت میں تحصیل عربی سے فراغت پا کر فیض رسان علوم دینیہ ہوں گے"۔

اواخر سال میں جلسہ تقسیم انعام منعقد کیا گیا، جس میں اطراف و جوانب کے لوگوں کو شرکت کی دعوت دی گئی، حضرت مولانا نانوتویؒ نے کامیاب طلبہ کو انعامی کتابیں عطا کیں، حاضرین کو سال بھر کی تعلیمی روداد سنائی گئی، انھوں نے دارالعلوم کی کارگذاری کو بنظرِ استحسان دیکھا، اور اپنی امداد و اعانت کا یقین دلایا۔

مختلف مقامات میں مدارسِ دینیہ کا اجراء

دارالعلوم کے قیام کے تقریباً ۶ ماہ بعد سہارنپور میں مدرسہ مظاہر علوم جاری ہو گیا تھا، اس سال میں مختلف مقامات میں مدارسِ دینیہ جاری ہوئے، روداد میں مرقوم ہے:۔

"اکثر حضرات باہمت نے اجراء مدارسِ عربی کو توسیع دینے میں کوشش کر کے مدارس بمقاماتِ مختلف دہلی و میرٹھ و خورجہ و بلند شہر و سہارنپور وغیرہ میں جاری فرمائے

اور دوسری جگہ مثل علی گڈھ وغیرہ اس کار خیر کی تجویزیں ہو رہی ہیں"۔[1]

۱۲۸۶ھ ، وبا اور قحط کی مشکلات

۱۲۸۴ھ کی طرح اس سال میں بھی دارالعلوم کو گوناگوں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ، تپ ولرزہ نے وبائی شکل اختیار کرلی ، اساتذہ اور طلبہ سبھی تپ ولرزہ کا شکار ہو گئے ، مرض نے اس قدر طول کھینچا کہ مسلسل پانچ ماہ تک تعلیم نہ ہو سکی ، اسی کے ساتھ ہمدردانِ دارالعلوم ملک گیر قحط کی وجہ سے بھی پریشان رہے ، بہت سے طلبہ اور اساتذہ مرض کے طول سے پریشان ہو کر اپنے وطن چلے گئے مگر مرض کے رفع ہوتے ہی طلبہ جمع ہو گئے اور مدرسین کی انتھک سعی و کوشش سے آخر سال میں خواندگی پوری ہو گئی ۔

اہتمام میں تبدیلی

اس سال اہتمام میں پھر تبدیلی ہوئی ، حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ حج کے لئے تشریف لے گئے ، اُن کے بجائے حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ کو دوبارہ مہتمم بنایا گیا ۔

۱۲۸۷ھ میں سابقہ عوارض کے اثرات

پچھلے سال کے عوارض تپ ولرزہ اور قحط کے اثرات اس سال کے آخر تک باقی رہے ، طلبہ کی تعداد کم ہو کر ۷۸ رہ گئی ، سالانہ امتحان بھی بیماری کی وجہ سے حسب معمول شعبان میں نہ ہو سکا ، رمضان المبارک کے بعد نئے داخلہ کے بجائے سال گذشتہ کی تعلیم کی تکمیل کرائی گئی ، شب و روز کی غیر معمولی محنت کے بعد ذی الحجہ میں سالانہ امتحان لیا گیا ، اس کے باوجود کہ ملک قحط اور گرانی کی مشکلات سے دوچار تھا ، مگر آمدنی کا توازن فی الجملہ برقرار رہا ۔

---

[1] دارالعلوم دیوبند کے نقشِ قدم پر قائم ہونے والے مدارس کی تفصیل بابِ سوم میں ملاحظہ فرمائیے ۔

۱۲۸۸ھ کا سالِ ترقی

اس سال طلبہ کی تعداد گذشتہ سال کے مقابلے میں زیادہ رہی مگر اس کے ساتھ خرچ بھی آمدنی کے مقابلے میں بڑھ گیا طلبہ کی تعداد ۱۰۶ ہو گئی، طلبہ کی مختلف جماعتوں کے سبب سے وسیع مکان کی ضرورت محسوس کی گئی، اوپر یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ دارالعلوم ابتداءً چھتے کی مسجد میں قائم ہوا تھا، یہ ایک مختصر سی قدیم مسجد ہے، جب طلبہ کی کثرت ہوئی تو دارالعلوم کو ایک دوسری قریبی مسجد میں منتقل کیا گیا جو قاضی مسجد کہلاتی ہے، یہ مسجد کسی قدر کشادہ تھی، مگر کچھ دنوں کے بعد جب یہ بھی ناکافی ثابت ہوئی، تو قاضی مسجد کے قریب ایک مکان کرایہ پر لے لیا گیا، اس موقع پر اکابرِ دارالعلوم نے یہ محسوس کیا کہ اب دارالعلوم کے لئے ایک وسیع اور کشادہ عمارت کی ضرورت ہے، اس زمانے میں دیوبند کی جامع مسجد زیرِ تعمیر تھی، اس لئے یہ طے پایا کہ جامع مسجد میں اس مقصد سے حجرے اور دالان بنائے جائیں، چنانچہ اس کا اعلان کر دیا گیا اور چندے کے لئے اپیل کی گئی اور رجب ۱۲۹۰ھ میں جامع مسجد تیار ہو گئی تو دارالعلوم کو اس میں منتقل کر دیا گیا۔

مولانا رفیع الدینؒ کی واپسی

دارالعلوم کے اہتمام کے علاوہ جامع مسجد کی تعمیر کا کام بھی حاجی سید محمد عابدؒ کی نگرانی میں ہو رہا تھا، دونوں کام کافی وقت چاہتے تھے، اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ حاجی صاحبؒ کے کاموں کے بار کو ہلکا کیا جائے لہٰذا دارالعلوم کا اہتمام پھر مولانا رفیع الدینؒ کے سپرد کر دیا گیا جو حج سے واپس تشریف لا چکے تھے البتہ اہم اُمور کی نگرانی حاجی صاحب سے متعلق رکھی گئی۔

۱۲۸۹ھ، عطائے اسناد

قیامِ دارالعلوم کے بعد پہلی مرتبہ اس سال میں طلبہ کو سندِ فراغت دی گئی۔ ۱۲۸۵ھ سے ۱۲۸۹ھ تک پانچ سالوں میں فراغت حاصل کرنے والے فضلاء کی تعداد اگرچہ ۲۵ تھی، مگر جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر جو فارغین موجود تھے ان کی تعداد ۹ ہے، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:۔

مولانا احمد حسن امروہیؒ، مولانا خلیل احمد انبیٹھویؒ، مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ۔

مولانا عبداللہ انصاری انبہٹویؒ، مولانا فتح محمد تھانویؒ، مولانا محمد فاضل پھلتیؒ، مولانا احمد حسن دیوبندی، قاضی جمال الدینؒ، مولانا عبداللہ جلال آبادیؒ۔ ان میں سے متعدد حضرات کا شمار ہندوستان کے علمائے مشاہیر میں ہوتا ہے۔

دورۂ حدیث میں بعض علماء کی شرکت

دارالعلوم میں علم حدیث کی تعلیم کی شہرت سن کر اس سال میں چند ایسے حضرات نے بھی تکمیلِ حدیث کی غرض سے دارالعلوم میں داخلہ لیا جو اگرچہ فارغ التحصیل تھے مگر دارالعلوم کے درسِ حدیث سے مزید استفادہ کرنا چاہتے تھے، اُن کے اسمائے گرامی یہ ہیں:-

مولوی عبداللہ جونپوری، مولوی سلامت اللہ جونپوری، مولوی معشوق علی جونپوری مولوی عبدالرحیم علی گنج، مولوی برکت اللہ دہلوی۔

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ جونپور اور دہلی دونوں ایسے مقامات تھے جو قریبی زمانے میں علم و فن کے مشہور مرکز رہ چکے تھے اور پرانے علماء کے باقیات الصالحات کے نشانات اگر کہیں ملتے تھے تو وہ یہی مقامات تھے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دارالعلوم اپنے ابتدائی چند سالوں میں ہی ہندوستان میں کس قدر وقیع علمی مقام حاصل کر چکا تھا، اور اس کی عظمت کا شہرہ قرب و جوار ہی میں نہیں بلکہ دور دراز مقامات اور قدیم علمی مرکزوں تک پہنچ چکا تھا۔

درسی کتابوں کے عطیات

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ جب دارالعلوم قائم ہوا تو اس کے پاس طلبہ کو دینے کے لئے درسی کتابیں موجود نہیں تھیں، اس کا حل یہ نکالا گیا تھا کہ قرب و جوار کے اہلِ علم سے کچھ مدت کے لئے کتابیں مستعار حاصل کر لی گئی تھیں، مگر اس کے ساتھ کتابوں کی فراہمی کے لئے اہلِ ملک سے اپیل کی گئی، چنانچہ اس اپیل کا ملک میں خاطر خواہ اثر ہوا، اہلِ مطابع نے اس موقع پر اپنی مطبوعات بڑی فراخ دلی سے دارالعلوم کو پیش کیں، حتیٰ کہ بعض ہندو مالکان مطابع نے بھی بفراخ دلی کتابوں سے دارالعلوم کی اعانت کی، چنانچہ روداد میں اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

ارباب مشورۂ مدرسہ نہایت شکر گذار ہیں جناب منشی نول کشور صاحب مالک مطبع اعظم لکھنؤ کے جنھوں نے مثل سابق کمال دریا دلی فرمائی اور چند کتب مفید سے امداد مدرسہ میں ہمت فرمائی، فہرست ان کی مندرج ہے، ان میں خاص کر نسخہ قاموس کہ کتب لغت میں بے نظیر ہے، اور منشی صاحب نے اپنے مطبع میں اس کتاب کو نہایت خوبی اور صحت سے طبع فرمایا ہے، مدرسہ میں اس سے پہلے کوئی نسخہ اس کتاب کا نہ تھا، یہ کتاب ایسی محتاج الیہ ہے کہ ہر مدرس اور طالب علم کو اس کی حاجت رہتی ہے حاجی مولا بخش صاحب نے علاوہ دو صد روپیہ برائے صرف طلبہ کے، سو روپیہ واسطے خرید کتب کے جداگانہ عنایت فرمائے، مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب مالک مطبع نظامی کانپور نے کتب مندرجہ ذیل واسطے تقسیم طلبہ کے عنایت فرمائیں۔

یہ عطیات بڑے نیک فال ثابت ہوئے، بعد میں مسلسل ہر سال مطابع میں چھپنے والی کتابیں دارالعلوم میں آتی رہیں، اور آج ہزاروں درسی اور غیر درسی کتابوں کا جو عظیم الشان ذخیرہ دارالعلوم میں موجود ہے یہ اس کا ابتدائی نمونہ تھا، بہرحال اس سلسلے میں پیش قدمی اور دوسروں کے لئے نمونہ بننے کی سعادت عبدالرحمٰن خاں مالک مطبع نظامی کانپور اور منشی نول کشور آنجہانی کے حصے میں آئی۔ عبدالرحمٰن خاں صاحب اور منشی نول کشور جب تک زندہ رہے برابر اپنے مطبع سے چھپنے والی کتابوں کے نسخے دارالعلوم میں بھیجتے رہے، رودادوں میں نہ صرف ان کی دی ہوئی کتابوں کا ذکر موجود ہے بلکہ جابجا ان کا شکریہ بھی ادا کیا گیا ہے اور لکھا ہے کہ "منشی نول کشور صاحب مالک چھاپا خانہ اعظم لکھنؤ اس امر میں زیادہ قابل مشکوری ہیں کہ باوجود بُعدِ مسافت بہت سی کتب کارآمد سے معاونت کی"۔

۱۲۹۴ھ کی روداد میں لکھا ہے:۔

"جناب منشی نول کشور مالک "اودھ اخبار" لکھنؤ، اور جناب راؤ امر سنگھ صاحب مالک اخبار "سفیر بدعانہ" کا بالخصوص شکریہ کہ باوجودیکہ یہ دونوں صاحب اہل ہنود سے ہیں، مگر آفریں صد ہزار آفریں اُن کی سخاوت اور عنایت پر کہ اپنے اپنے اخبارات گراں بہا اس مدرسہ کو مفت عنایت فرماتے ہیں

جملہ ارباب شوریٰ مدرسہ ہٰذا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں، اور سب صاحبوں کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ ان کے اخبارات اور کارخانہ جات کو دمبدم ترقی عطا فرما دے اور ان کی قوت و آزادی کو قائم رکھے، اور آئندہ کو بھی ان حضرات سے امید کی جاتی ہے کہ اس طرح ہمیشہ کو ایسی ہی عنایات سے مدرسہ کو ممنون و مشکور فرماتے رہیں، اور جملہ اہالیانِ مدرسہ ہٰذا کو اپنا دعاگو و خیر خواہ سمجھیں۔

سنہ ۱۲۹۰ھ، جلسہ تقسیم انعام

اس سال میں پانچ طلبہ نے مجوزہ نصاب کی تکمیل کر کے سندِ فراغت حاصل کی، فارغین کی اس جماعت میں حضرت شیخ الہندؒ بھی شامل تھے، ۱۹ ذیقعدہ سنہ ۱۲۹۰ھ یومِ جمعہ کو جامع مسجد میں (جہاں دار العلوم منتقل ہو گیا تھا) جلسہ عطائے سند و تقسیمِ انعام منعقد ہوا، جس میں مختلف مقامات کے بہی خواہانِ دار العلوم نے شرکت فرمائی، شرکائے جلسہ میں قابلِ ذکر حضرات یہ تھے، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت قاضی محمد اسمٰعیل صاحب منگلوری، مولوی محمد ہاشم صاحب مالک مطبع ہاشمی میرٹھ، مولانا ذوالفقار علی صاحب ڈپٹی انسپکٹر مدارس ضلع سہارنپور، حکیم ضیاء الدین صاحب رامپوری، منشی محمد صدیق صاحب ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نہر جمن شرقی، مولانا محمد مظہر صاحب مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور، خواجہ ابوالحسن صاحب دہلوی، منشی محمد حیات صاحب مہتمم نجم الاخبار وغیرہم۔

بعد نماز جمعہ حضرت نانوتویؒ نے ایک معرکۃ الآرا تقریر فرمائی، جس میں دار العلوم کے قیام کی ضرورت و اہمیت اور اس کے نصابِ تعلیم پر بڑی دیدہ وری اور ژرف نگاہی کے ساتھ بحث کی گئی ہے، چونکہ اس تقریر میں دار العلوم کے مقصدِ تعلیم اور اس کے نصاب کی افادیت پر بڑی جامعیت کے ساتھ کلام کیا گیا ہے، اس لئے ذیل میں اس تقریر کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

"چند خیر خواہانِ بے غرض نے بنامِ خدا اس قصبہ دیوبند میں مدرسہ کی طرح ڈالی، اور تمام بنی آدم خصوصاً اہلِ اسلام کی بہبودی کی صورت نکالی، سو بحمد اللہ اپنے

خیال سے بڑھ کر اس نے رونق پائی، اور یہاں کی دیکھا بھالی جا بجا مدرسے مقرر ہوئے اور اس آخری زمانے میں علم کا پھر اس طرح چرچا ہوا جیسا کہ گل ہوتے ہوئے چراغ سنبھالا لیا کرتا ہے، اور بحمد اللہ سینکڑوں آدمی اس دولتِ عظمیٰ سے اس مدرسہ میں آکر مستفید ہوئے اور تھوڑا بہت اپنی لیاقت کے موافق حصہ لے اڑے، مگر سب دور و نزدیک کے رہنے والے جانتے ہوں گے کہ اس مدرسہ کی بنیاد دیوبند والوں نے ڈالی، اس امر میں وہ سب کے امام ہیں، ہر چند اور باہر کے صاحب بھی اس کارِ خیر میں شریک ہوئے مگر جو کچھ ہے وہ دیوبند والوں ہی کا طفیل ہے، اور اس وجہ سے اگر یوں کہا جائے کہ جتنا اور سب کو اس کارِ خیر کا ثواب ملے گا اتنا ہی تنہا دیوبند والوں کو ملے گا تو عین مطابق قولِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ سَنَّ سُنَّۃً حَسَنَۃً فَلَہٗ اَجْرُھَا وَ اَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِھَا اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ۔ اوکما قال، واقعی اہلِ دیوبند نے وہ کام کیا ہے کہ قیامت تک صفحۂ روزگار پر ان کی یادگاری رہے گی، یہ نامی مدرسہ ہمیشہ اہلِ دیوبند کی یادگاری کا باعث رہے گا، چونکہ اور اکثر مدارس اس مدرسہ کی دیکھا بھالی مقرر کئے گئے یا کئے جاتے ہیں تو کوئی مدرسہ اس سے ترقی پا جائے پر اہلِ عقل کے نزدیک وہ بھی دیوبند ہی کا پرتو ہوگا، اور اس پر جب یہاں کے باشندوں کی شکستہ حالی اور پریشان روزگاری پر نظر کی جائے تو یہ ان کی ہمت کی بات کسی طرح ان کاموں سے کم نہیں جو اہلِ سلطنت نے برفاہِ عام کئے ہیں، بایں ہمہ کھانے کی امداد میں طالب علموں کے ساتھ جو دل سوزی یہاں کے باشندوں نے کی وہ اتنی نہیں کہ ہم زبان سے ادا کریں، فرشتوں نے اگر طالبانِ علوم کے قدم کے نیچے پر بچھائے تو انھوں نے ان کے سر پر دستِ شفقت رکھا، ماں باپ کو بھلا دیا، دیوبند کو مثل گھر بنا دیا، یہ وہ خاص بات ہے جس میں شرکائے چندہ میں سے کوئی ان کا شریک و سہیم نظر نہیں آتا، اس کے عوض خداوندِ کریم یہاں کے

باشندوں کو دارین میں جزا کامل عطا کرے، بالجملہ اس دولت بے زوال سے بدولت اہلِ دیوبند عالم مستفید ہے۔ ہند کے چند طالب علم جو شوقِ علم سے مکہ معظمہ میں پڑھتے تھے، دیوبند کے مدرسہ کا چرچا سن کر گرتے پڑتے مدرسہ دیوبند میں آپہنچے۔

جمیع علومِ عقلیہ و نقلیہ کی تعلیم اور ان کی استعدادوں کے حاصل کرنے کے لئے یہ مدرسہ اور سہارنپور کا مدرسہ بلا تأمل عمدہ سامان ہے اور انشاء اللہ یہاں کے طالب علم بشرطِ تکمیل باقی علومِ قدیمہ اور جدیدہ کو بوجہ قوتِ استعداد بسہولت جلد حاصل کر سکتے ہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ ان مدارس میں علاوہ تعلیم مذہبی غرضِ اعظم قوتِ استعداد کے فقط علومِ دینی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ فنون دانشمندی کی تکمیل بھی حسبِ قاعدۂ سابقہ کی گئی ہے، جس کا عمدہ نتیجہ پہلے زمانوں میں یہ ہوا تھا کہ بڑے بڑے عالم بڑی بڑی استعداد اور قوت کے اہلِ اسلام میں بکثرت ہوئے، اس لئے ہم اس بات کو بالیقین سمجھتے ہیں کہ یہاں کے طالب علم اگرچہ بعض علوم و فنونِ جدیدہ سے کامیاب نہ ہوئے ہوں پر اُن کے حق میں یہ اُن کی استعداد مثل استاد کامل تحلیم کے لئے کافی ہو، اور مدارس میں اگرچہ بعض علومِ جدیدہ کی کثرت کے باعث طالب علموں کو ایک مشق تازہ ان علوم کی ایسی ہو جو یہاں کے طالب علموں کو نہ ہو، پر بوجہ قوتِ استعداد اہلِ انصاف کے نزدیک بالمعنیٰ ان علوم میں بھی اُن مدارس کے طالب علموں سے زیادہ ہی یہاں کے طالب علم سمجھے جائیں گے، بایں ہمہ اگر بالفرض بوجہ مشق نہ ہونے بعض علوم جدیدہ کے کچھ نقصان بھی متصور ہو تو بوجہ مفقود ہونے قوتِ استعدادِ علمی اور نہ ہونے علومِ دینی کے اُن مدارس کے طالب علم بدرجہا یہاں کے طالب علموں سے ناقص ہونے چاہئیں۔

اب ہم اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں جس سے یہ معلوم ہو جاوے کہ درباب تحصیل یہ طریقہ خاص کیوں تجویز کیا گیا اور علومِ جدیدہ کو کیوں نہ شامل کیا منجملہ دیگر اسباب بڑا سبب اس بات کا ایک تو یہ ہے کہ تربیت عام ہو یا خاص ہو، اس پہلو کا

لحاظ چاہئے کہ جس طرف سے کمال میں رخنہ پڑا ہوا ہو ادھر توجہ ہو، سو اہل عقل پر روشن ہے کہ آج کل تعلیم علومِ جدیدہ تو بوجہ کثرتِ مدارس سرکاری اس ترقی پر ہے کہ علومِ قدیمہ کو سلاطین زمانۂ سابق میں بھی یہ ترقی نہ ہوئی ہوگی، ہاں علوم نقلیہ کا تنزل ہوا کہ ایسا تنزل کبھی کسی کارخانہ میں نہ ہوا ہوگا، ایسے وقت میں رعایا کو مدارسِ علوم جدیدہ کا بنانا تحصیل لاحاصل نظر آیا، اور صرف بجانب علوم نقلی اور نیز ان علوم کی طرف جن سے استعداد علومِ مروجہ اور استعداد علوم جدیدہ یقیناً حاصل ہوتی ہیں ضروری سمجھا گیا۔

دوسرے یہ کہ زمانۂ واحد میں علومِ کثیرہ کی تحصیل سب علوم کے حق میں باعث نقصان استعداد رہتی ہے، ہاں بعد تحصیل فنون دانشمندی جس کو خاص تحصیل استعداد ہی کے لئے تجویز کیا ہے اگر اور فنون قدیمہ و جدیدہ کو حاصل کیا جائے گا تو البتہ مقدار زمانہ تحصیل برابر رہے گا، اس تقدیم و تاخیر سے مطلب بخوبی حاصل ہوگا اور استعداد ہر علم کی بخوبی حاصل ہوگی، اس لئے علوم نقلیہ اور ان کے ساتھ علومِ دانشمندی کو داخل تحصیل کیا، اس کے بعد اگر طلبہ مدرسہ ہٰذا مدارس سرکاری میں جاکر علومِ جدیدہ کو حاصل کریں تو ان کے کمال میں یہ بات زیادہ مؤید ہوگی، کاش گورنمنٹ ہند بھی قید عمر طلبۂ نو داخل کو اڑا دے تاکہ رفاہِ عام رہے اور سرکار کو بھی معلوم ہو کہ استعداد اسے کہا کرتے ہیں، بالجملہ یہ مدرسہ ایک ذخیرۂ خیر اور سرمایہ علم و ادب و استعداد ہے، جس کے طفیل سے آج خداوندِ ذوالجلال نے یہ دن دکھلایا کہ چند طالب علموں نے یہاں تعلیم پاکر استعدادِ کامل حاصل کی، ہر فن میں مناسبت معقول اور ہر علم میں لیاقت مناسب پیدا کرکے اقران و امثال میں ممتاز ہوئے۔"

دارالعلوم کے حسابات کے بارے میں حضرت نانوتویؒ نے فرمایا :-

"مدرسہ کا آٹھ برس کا حساب کتاب مثلِ آئینہ صاف ہے، ہر صاحب کو اجازت ہے کہ آئیں اور اطمینان کر جائیں، اور اس آنے میں ہم کو ممنونِ احسان سمجھیں کیونکہ اپنی برأت اور مدرسہ کی ترقی اور اہلِ اسلام کی بہبودی کا باعث ہے، علاوہ ازیں ہم یہ جانتے ہیں کہ دیوبند کے باہمت لوگوں کا نام جنہوں نے مال سے یا کھانے سے اس مدرسہ کی امداد فرمائی ہے اور نیز اور شرکاء کا نام خوب روشن ہو جائے اور اہلِ عقل و فہم کو یہ بات معلوم ہو کہ یہ کارخانہ کس غرض سے برپا ہو رہا ہے۔ بھائیو! جو لوگ اس مدرسہ کے حق میں ساعی ہیں ان کو کوئی مطلب ذاتی نہیں جس کے باعث سے کسی صاحب کو اور کچھ خیال ہو، ہاں یہ کہئے کہ آپ صاحبوں کی بہبودی میں ہمارا بھی مطلب ہے"۔

جلسہ میں حسبِ ذیل حضرات کے سروں پر دستارِ فضیلت باندھی گئی۔

مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا عبدالحق پورقاضوی، مولانا فخر الحسن گنگوہی، مولانا فتح محمد تھانوی اور مولانا عبداللہ جلال آبادی۔

۱۲۹۱ھ، دارالعلوم کی بین الاقوامی شہرت

دارالعلوم کی عمر کا ابھی نواں سال ہی تھا کہ اس کی شہرت و عظمت کا آوازہ ہندوستان سے گذر کر ممالکِ اسلامیہ تک پہنچ گیا تھا، اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ قسطنطنیہ کا ایک مؤقر اخبار "الجوائب" اعزازی طور پر دارالعلوم میں آنے لگا، عالمِ اسلامی کا یہ ایک وقیع اخبار تھا۔

مدارس کے الحاق کا آغاز

سالِ گذشتہ کے آخر میں مدرسہ تھانہ بھون کے منتظمین نے درخواست کی کہ ان کے مدرسہ کا دارالعلوم سے الحاق کر لیا جائے روداد میں مذکور ہے:۔

"تھانہ بھون ضلع مظفر نگر میں ایک مدرسہ عربی بسعی و کوشش اہلِ اسلام مدت سے جاری ہے جس کی نسبت وہاں کے مہتمم منشی عبدالرزاق صاحب اور مولوی فتح محمد (صدر مدرس) کی رائے ہے

کہ یہ مدرسہ، شاخ مدرسہ عربی دیوبند کیا جاوے، اور اس کی خواندگی کا انتظام اور آمد و صرف کی نگرانی معرفت مہتمم صاحب مدرسہ دیوبند ہوا کرے، اس لئے حسب مشورہ مدرسہ تھانہ بھون کو شاخ مدرسہ ہذا کرلینا مستحسن معلوم ہوا، چنانچہ محرم ۱۲۹۱ھ سے انتظام اس کا سپرد مہتمم مدرسہ ہذا کیا گیا۔

اس سلسلے نے آگے چل کر خاصی ترقی کی اور اب ملک کے بہت سے مدارسِ عربیہ باضابطہ طور پر اپنا الحاق دارالعلوم سے کئے ہوئے ہیں۔

حضرت شیخ الہندؒ مسندِ تدریس پر

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ جن کی تعلیم کا آغاز ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم کے افتتاح سے ہوا تھا، سنہ ۱۲۹۰ھ میں دارالعلوم کے نصاب کی تکمیل سے فارغ ہو چکے تھے، فراغت کے دوسرے سال ۱۲۹۱ھ میں مجلس شوریٰ نے ان کو معین المدرس مقرر کیا، ابتداءً یہ تقرر اعزازی طور پر بلا تنخواہ تھا، مگر دوسرے سال ہی ان کو مدرس چہارم بنا دیا گیا، اور پھر کچھ مدت کے بعد وہ صدارت تدریس کے منصب پر فائز ہو گئے، اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

دارالعلوم کے لئے موجودہ جگہ کی تجویز

اوپر بتلایا جا چکا ہے کہ چھتہ کی مسجد میں جگہ تنگ ہو جانے پر مدرسہ کو قاضی مسجد میں منتقل کیا گیا اور جب کچھ عرصے کے بعد وہ جگہ بھی کم ثابت ہوئی تو جامع مسجد میں مدارس کے قدیم طرز کے مطابق حجرے اور دالان بنائے گئے، جہاں سنہ ۱۲۹۰ھ میں دارالعلوم منتقل کیا گیا، مگر دارالعلوم کی روز افزوں ترقی کے باعث بہت جلد یہ جگہ بھی ناکافی ہو گئی تو حضرت نانوتویؒ کے ایماء پر مجلسِ شوریٰ نے یہ طے کیا کہ آبادی سے باہر ایک کشادہ اور وسیع عمارت دارالعلوم کے لئے تعمیر کی جائے، ۱۹، ذوالقعدہ سنہ ۱۲۹۱ھ کو جلسہ انعام کے موقعہ پر یہ تجویز پیش کی گئی جس کو حاضرینِ جلسہ نے پسند کرتے ہوئے ضروری قرار دیا اور اس کے لئے اسی وقت چندہ جمع ہونا شروع ہو گیا، چنانچہ ایک قطعۂ زمین آبادی کے شمال مغرب میں خرید لیا گیا، یہ جگہ چھتہ کی مسجد سے ملحق اور آبادی سے قریب ہونے کے باوجود ایسی تھی جس میں دارالعلوم کے بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے لئے گنجائش موجود تھی، روداد میں لکھا ہے:-

"اللہ کا شکر ہے کہ مثل دیگر تائیداتِ غیبی کے اس آرزو دیرینہ میں بھی جس کی سالہا سال سے امید بھی تائید غیبی نے جوش مارا اور رحمت الٰہی شاملِ حال ہوئی، یعنی اربابِ شوریٰ کی رائے میں یہ تجویز قرار پا گئی کہ ایک مکان وسیع تعلیم و سکونت و دیگر حاجات طلبۂ مدرسہ کے لئے تیار کیا جائے، چنانچہ ۱۹ ذیقعدہ ۱۲۹۱ھ بروز جمعہ عین جلسہ انعام طلبہ میں اس کے لئے گذارش کیا، اسی وقت بہت سے ذی ہمتوں نے ایک فرد چندہ تیار کی اور بہت سے عالی ہمتوں کے نام اس میں تحریر کئے گئے، برابر فرد چندہ پر دستخط ہوتے جاتے ہیں جس میں بہت سا روپیہ وصول ہوتا جاتا ہے، چنانچہ ایک قطعہ نہایت وسیع واسطے تعمیر مکانات کے خرید لیا گیا، اب حضرات باہمت کی ہمت درکار ہے تاکہ روپیہ فراہم ہونے پر کارِ تعمیر جاری ہو اور یہ صدقۂ جاریہ آپ کا جاری رہے، کوئی صاحب قلیل و کثیر پر نظر نہ فرماویں، قطرہ قطرہ بہم شود دریا توجہ اور ہمت شرط ہے، آپ صاحبوں کی ہمت ہوئی تو فضلِ الٰہی سے یہ کام بہت سہل انجام پاوے گا۔

ایک انگریز جاسوس کے دلچسپ مشاہدات

دارالعلوم دیوبند جس زمانے میں قائم ہوا اس وقت ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی پر صرف ۹ سال گذرے تھے، چونکہ عام مسلمان اور دارالعلوم کے اکابر جنگ آزادی میں انگریزوں کے خلاف صف آرا رہ چکے تھے اس لئے انگریزی حکومت مسلمانوں کے سخت خلاف اور اُن سے بدظن و برگشتہ تھی، مسلمانوں کی حرکات و سکنات پر کڑی نگرانی رکھی جاتی تھی، اِس بنا پر دارالعلوم کی نسبت مدت تک خفیہ و علانیہ تحقیقات کا سلسلہ جاری رہا، چنانچہ ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۵ء میں صوبہ متحدہ (اترپردیش) کے گورنر سرجان اسٹریچی نے اپنے ایک معتمد جان پامر کو اس غرض سے دارالعلوم میں بھیجا کہ وہ خفیہ طور پر تحقیقات کر کے رپورٹ پیش کرے کہ دارالعلوم کے قیام کا مقصد کیا ہے؟ اور مسلمان علماء دارالعلوم کے پس پردہ کس فکر و عمل میں مصروف ہیں، جان پامر نے دارالعلوم کو دیکھ کر جو رپورٹ تیار کی اور

جو تأثرات اُس نے اخذ کئے وہ اُس نے اپنے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے نہایت تفصیل سے بیان کئے ہیں، جان پامر نے دارالعلوم کی تعلیمی کیفیت کا انگریزی یونیورسٹیوں سے موازنہ کرتے ہوئے اپنے مشاہدات و تأثرات کا جس دلچسپ اور عالمانہ انداز میں اظہار کیا ہے وہ دارالعلوم کے علمی موقف کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتا ہے۔ یہ واقعہ دارالعلوم کی ابتدائی زندگی کا ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی معیار شروع ہی سے کیا رہا ہے، یہ خط جہاں دارالعلوم کی تعلیمی اور بعض دوسری جزئیات کی تفصیل اور نقد و تبصرے پر مشتمل ہے، وہیں ایک ایسے شخص کی زبان سے جو مخالفانہ نقطۂ نظر رکھتا تھا دارالعلوم کی تعلیمی خصوصیات اور اس کے خد و خال کا ایک دلچسپ مرقع سامنے آجاتا ہے، جو نہایت گہرے تأثرات پر مبنی ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خط کا پورا متن پیش کر دیا جائے۔

جان پامر لکھتا ہے کہ:-

"لیفٹیننٹ گورنر ممالکِ مغربی و شمالی کے ساتھ دورے میں ۳۰ رجنوری ۱۸۷۵ء کو دیوبند میں قیام ہوا، گورنر نے مجھ سے کہا کہ "یہاں دیوبند میں مسلمانوں نے گورنمنٹ کے خلاف ایک مدرسہ جاری کیا ہے، تم اجنبیانہ طور پر اس مدرسہ میں جاکر پتہ لگاؤ کہ کیا تعلیم ہوتی ہے اور مسلمان کس فکر و خیال میں لگے ہوئے ہیں"۔ چنانچہ ۳۱ رجنوری کو اتوار کے دن میں آبادی میں پہنچا، قصبہ نہایت صاف ہے یہاں کے باشندے خلیق اور نیک ہیں مگر غریب اور فلاکت زدہ ہیں، پوچھتے پوچھتے مدرسہ میں پہنچا یہاں پہنچکر میں نے ایک بڑا کمرہ دیکھا جس میں چٹائی کے فرش پر لڑکے کتابیں سامنے رکھے ہوئے بیٹھے تھے اور ایک بڑا لڑکا اُن کے درمیان میں بیٹھا ہوا تھا، میں نے لڑکوں سے دریافت کیا کہ تمہارا استاد کون ہے؟ ایک لڑکے نے اشارہ سے بتایا، معلوم ہوا کہ جو شخص درمیان میں بیٹھا ہوا تھا وہی استاد ہے، مجھے تعجب ہوا کہ یہ کیا استاد ہوگا[1]، میں نے اس سے پوچھا آپ کے لڑکے کیا پڑھتے ہیں؟

---

[1] یہ مولانا منفعت علی دیوبندی مدرس فارسی تھے، جن کا اسی سال (۱۲۹۱ھ) میں تعلیم سے فراغت کے بعد تقرر ہوا تھا، یہ ابتداءً مدرس فارسی رہے، پھر چند سال کے بعد مدرس عربی بنائے گئے، اور ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء تک دارالعلوم میں تدریسی خدمات انجام دیں۔

جواب دیا "یہاں فارسی پڑھائی جاتی ہے"۔ یہاں سے آگے بڑھا تو ایک جگہ ایک صاحب میانہ قد نہایت خوبصورت بیٹھے ہوئے تھے، سامنے بڑی عمر کے طلبہ کی ایک قطار تھی، قریب پہنچ کر سنا تو علم مثلث کی بحث ہو رہی تھی، میرا خیال تھا کہ مجھے اجنبی سمجھ کر یہ لوگ چونکیں گے۔ مگر کسی نے مطلق توجہ نہ کی، میں قریب جاکر بیٹھ گیا اور استاد کی تقریر سننے لگا، میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ علمِ مثلث کے ایسے ایسے عجیب اور مشکل قاعدے بیان ہو رہے تھے جو میں نے کبھی ڈاکٹر اسپرنگر سے بھی نہیں سُنے تھے، یہاں سے اٹھ کر دوسرے دالان میں گیا تو دیکھا کہ ایک مولوی صاحب[1] کے سامنے طالب علم معمولی کپڑے پہنے بیٹھے ہوئے ہیں، یہاں اُقلیدس کے چھٹے مقالے کی دوسری شکل کے اختلافات بیان ہو رہے تھے اور مولوی صاحب اس برجستگی سے بیان کر رہے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اقلیدس کی روح اُن میں آگئی[1] ہے۔ میں منھ تکتا رہ گیا، اسی دوران میں مولوی صاحب نے جبر و مقابلہ ٹاڈ ہنٹر سے مساوات درجۂ اول کا ایک ایسا مشکل سوال طلبہ سے پوچھا کہ مجھے بھی اپنی حساب دانی پر پسینہ آگیا اور میں حیران رہ گیا، بعض طلبہ نے جواب صحیح نکالا، یہاں سے اٹھ کر میں تیسرے دالان میں پہنچا، ایک مولوی صاحب حدیث کی کوئی موٹی سی کتاب پڑھا رہے تھے اور ہنس ہنس کر تقریر کر رہے تھے[2]۔ یہاں سے میں ایک زینے پر چڑھ کر دوسری منزل میں پہنچا، اس کے تین طرف

---

[1] یہ حضرت مولانا سید احمد دہلویؒ تھے جو ۱۲۸۵ھ میں مدرسِ دوم مقرر ہوئے اور ۱۳۰۲ھ میں حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کی وفات پر صدر مدرس بنائے گئے اور ۱۳۰۷ھ تک مسندِ تدریس پر فائز رہے، علومِ ریاضی میں یگانہ روزگار تھے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ فرماتے ہیں کہ "مولوی سید احمد صاحب کو خداوندِ کریم نے فنونِ ریاضی میں وہ استعداد اور مناسبت عطا فرمائی ہے کہ ان علوم کے موجدوں کو بھی شاید اتنی ہی ہو"۔

(روداد ۱۲۹۳ھ، ص ۱۳)

[2] غالباً حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، صدر المدرسین کی جانب اشارہ ہے، مولانا موصوف دارالعلوم کے آغاز ہی سے صدارتِ تدریس کی مسند پر فائز تھے۔ سید محبوب رضوی

مختلف مکان تھے، بیچ میں ایک چھوٹی سی صحنچی تھی جس میں دو اندھے بیٹھے بڑبڑا رہے تھے، میں یہ سننے کے لئے کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں دبے پاؤں اُن کے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ علم ہیئت کی کسی کتاب کا سبق یاد کر رہے ہیں، اتنے میں ایک اندھے نے دوسرے اندھے سے کہا "بھائی! کل کے سبق میں شکل عروسی اچھی طرح میری سمجھ میں نہیں آئی، اگر تم سمجھے ہو تو بتلاؤ!" دوسرے اندھے نے پہلے دعوی بیان کیا اور اس کی ہتھیلی پر لکیریں کھینچ کر ثبوت شروع کیا، پھر جو آپس میں اُن کی بحث ہوئی تو میں دنگ رہ گیا، اور مسٹر برگیر پرنسپل کی تقریر کا سماں میری آنکھوں میں پھر گیا۔ وہاں سے اٹھ کر ایک چھپرے میں گیا، چھوٹے چھوٹے بچے صرف ونحو کی کتابیں نہایت ادب سے استاد کے سامنے بیٹھے پڑھ رہے تھے، تیسرے درجہ میں علم منقول کا درس ہو رہا تھا۔

میں دوسرے زینے سے اتر کر نیچے آیا، میرا خیال تھا کہ مدرسہ بس اسی قدر ہے، اتفاق سے ایک شخص سے ملاقات ہوئی، میں نے اس سے اپنے خیال کی تصدیق چاہی، اُس نے کہا "نہیں! قرآن شریف دوسری جگہ پڑھایا جاتا ہے"۔ میں نے پوچھا کہاں؟ وہ مجھ کو مسجد میں لے گیا، مسجد کے دالان میں بہت سے چھوٹے چھوٹے بچے ایک نابینا حافظ[1] کے سامنے قرآن شریف پڑھ رہے تھے حافظ نے ایک چھوٹے سے بچے کو پکڑ کر بڑی بے رحمی سے پیٹا، بچہ چلایا۔ میں نے اپنے رہنما سے کہا کہ ننھے ننھے بچوں سے ایسی سخت محنت لینا بڑا ظلم ہے۔ اُس نے ہنس کر جواب دیا "بظاہر تو یہ ظلم نظر آتا ہے

---

[1] یعنی حافظ نامدار خاں، حافظ صاحب مرحوم نبی ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے، قیام دارالعلوم کے دوسرے سال ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۶ء میں جب درجۂ قرآن کا اجراء عمل میں آیا تو حافظ نامدار خاں اس کے معلم مقرر ہوئے، اور ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۱ء تک تقریباً ۵۵ سال درجہ قرآن شریف کی خدمات انجام دیں، ان کے شاگردوں کا حلقہ بڑا وسیع ہے، ناظرہ پڑھنے والوں کے علاوہ ان کے فیض تعلیم نے سینکڑوں بچوں کو حافظ قرآن بنا دیا، جن میں دارالعلوم کے بعض بہت سے اساتذہ بھی شامل ہیں۔

سید محبوب رضوی

مگر درحقیقت یہ شفقت ہے بچوں کو شروع ہی سے محنت شاقہ کا عادی بنا دینا اُن کے حق میں عین حکمت اور آئندہ زندگی میں پیش آنے والی مشکلات پر قابو پانے کے لئے بہت ضروری ہے آج کل مسلمانوں میں یہی تو ایک بات ہمت اور محنت کی رہ گئی ہے اور اسی لئے کچھ ٹوٹا پھوٹا دین ان کے پاس باقی ہے"!

میں نے پوچھا گذشتہ سال اخباروں میں دیکھا تھا کہ چار طالب علموں کے دستارِ فضیلت باندھی گئی تھی[1]؟ اُن میں سے یہاں کوئی موجود ہے؟ وہ بولا کہ "ہاں ایک صاحب ہیں، چلئے میں ملائے دیتا ہوں"! وہ مجھے ایک مکان میں لے گیا جہاں ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا، ایک موٹی سی کتاب سامنے رکھی تھی، اور دس بارہ طالب علم بیٹھے پڑھ رہے تھے، ایک طرف دو بندوقیں پڑی ہوئی تھیں، میں نے سلام کیا، اس نے کمالِ اخلاق سے جواب دیا، میں نے پوچھا کہ سال گذشتہ آپ ہی کے دستارِ فضیلت بندھی ہے؟ بولے کہ "اساتذہ کی عنایت ہے"۔ میں نے کہا کہ یہ کیا کتاب ہے؟ فرمایا کہ "عربی زبان میں ایک فنی کتاب ہے، ایک مطبع کے مہتمم نے ترجمے کے لئے بھیجی ہے، اس کی اجرت ایک ہزار روپے ٹھہری ہے، مجھے ترجمہ کرتے ہوئے تین مہینے ہوئے ہیں اور تین چوتھائی کے قریب ہو چکا ہے، بقیہ انشاء اللہ ایک مہینے میں ہو جائے گا۔ میں نے پوچھا یہ بندوقیں کیسی ہیں؟ کہنے لگے "مجھے شکار کا شوق ہے، سات بجے سے دس بجے تک پڑھاتا ہوں، گیارہ سے ایک تک شکار کھیلتا ہوں اور دو سے چار بجے تک ترجمہ کرتا ہوں"۔

میں نے دریافت کیا، آپ نوکری کیوں نہیں کرتے؟ بولے کہ "خدائے تعالیٰ گھر بیٹھے بٹھائے

---

[1] دارالعلوم کی زندگی کا یہ بالکل ابتدائی زمانہ تھا، مگر جان پامر کے اس فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ دارالعلوم کے حالات وکوائف اُس زمانے کے اخبارات میں شائع ہوتے تھے اور اخبارات میں دارالعلوم کی خبروں کو اہمیت دی جاتی تھی، اس کا مطلب یہ ہے کہ ملک میں اُسی وقت دارالعلوم مرکزی اور امتیازی حیثیت سے دیکھا جانے لگا تھا۔

ڈھائی سو روپیے مہینہ دیتا ہے، پھر کس لیے نوکری کروں[1]؟"

یہاں سے اُٹھ کر کتب خانہ میں آیا، منتظمِ کتب خانہ نے میرا خیر مقدم کرتے ہوئے فہرست دکھلائی، میں حیران رہ گیا، کوئی فن ایسا نہ تھا جس کی کتاب موجود نہ ہو، ایک دوسرا رجسٹر دکھلایا جو طلبہ کی حاضری کا تھا، اور نہایت صاف، خوش خط لکھا ہوا تھا، من جملہ ۲۱۰ طلبہ کے ۲۰۸ طلبہ حاضر تھے۔

میں اٹھنے والا ہی تھا کہ ایک صاحب سبزہ رنگ آئے اور سلام کر کے بیٹھ گئے۔ میں نے پوچھا آپ کی تعریف؟ بولے کہ "میں مہتمم ہوں[2]"۔ اور تین بڑے بڑے رجسٹر میرے سامنے رکھ دیے اور بتلایا کہ "یہ سال بھر کے آمد و صرف کا حساب ہے، ملاحظہ کیجیے"؟

میں نے دیکھا تو تاریخ وار نہایت صحت کے ساتھ حساب لکھا ہوا تھا، گوشوارے سے معلوم ہوا کہ گذشتہ سال کے آخر میں خرچ کے بعد کچھ روپیہ بچ گیا تھا۔

طبیعت چاہتی تھی کہ کتابوں کی کچھ سیر کروں، مگر وقت تنگ ہو گیا تھا، اور شام ہونے کو تھی، مجبوراً واپس ہوا۔

میری تحقیقات کے نتائج یہ ہیں کہ یہاں کے لوگ تعلیم یافتہ، نیک چلن اور نہایت سلیم الطبع ہیں کوئی ضروری فن ایسا نہیں جو یہاں پڑھایا نہ جاتا ہو، جو کام بڑے بڑے کالجوں میں ہزاروں کے صرف سے ہوتا ہے وہ یہاں ایک مولوی چالیس روپیے میں کر رہا ہے، مسلمانوں کے لیے اس سے

---

[1] غالباً یہ حضرت شیخ الہندؒ تھے، ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء میں فارغ ہوئے تھے اور ۱۲۹۱ھ میں بلا تنخواہ کے مدرس مقرر ہوئے ۱۲۹۰ھ کے فارغ ہونے والے حضرات میں صرف حضرت شیخ الہندؒ ہی دیوبند کے رہنے والے تھے، شکار کا بیحد شوق تھا، جان یا مرنے جس زیر ترجمہ کتاب کی طرف اشارہ کیا ہے افسوس ہے کہ اس کا پتہ نہیں چل سکا۔

[2] یعنی حضرت مولانا رفیع الدینؒ مہتمم دار العلوم دیوبند ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء سے ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء تک اور پھر دوبارہ ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء سے ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۸ء تک مسند اہتمام پر فائز رہے۔

بہتر کوئی تعلیم گاہ نہیں ہو سکتی! اور میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی غیر مسلمان بھی یہاں تعلیم پائے تو نفع سے خالی نہیں، انگلستان میں اندھوں کا اسکول سنا تھا، مگر یہاں آنکھوں سے دیکھا کہ دو اندھے تحریر اقلیدس کی شکلیں کفِ دست پر اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ باید و شاید! مجھے افسوس ہے کہ آج سر ولیم میور موجود نہیں ہیں، ورنہ بکمالِ ذوق و شوق اس مدرسہ کو دیکھتے اور طلبہ کو انعام دیتے[۱]۔

۱۲۹۲ھ، دس سالہ حالات کا خلاصہ

یہ وہ سال ہے جس میں دار العلوم نے ابتدائی دشوار گذار مرحلوں کو طے کرتے ہوئے دسویں منزل میں قدم رکھا، روداد میں گذشتہ دس سال کے حالات و نتائج کا یہ خلاصہ بیان کیا گیا ہے:۔

"اگرچہ تاریخ اجرا مدرسہ ہذا سے آج تک کا حساب جمع خرچ کمالِ احتیاط اور نہایت شرح و بسط سے لکھا جاتا ہے، چنانچہ اکثر شرکاء چندہ نے بچشم خود ملاحظہ فرمایا، اور مجملاً حساب سالانہ درج کیفیت ہو کر ہر سال کے ختم پر شائع ہوتا ہے اور کوئی رقم ایسی نہیں جو اس کے اندر درج نہ ہو اور جو صاحب شریکِ چندہ یا خیر خواہ مدرسہ اس مدرسہ کے حساب کو ملاحظہ فرمانا چاہتے ہیں بندۂ مہتمم ان کا نہایت شکر گذار ہوتا ہے اور درخواست کرتا ہے جملہ اہلِ اسلام کی خدمت میں کہ جب کبھی بسبب اتفاق دیوبند تشریف لاویں تو حساب و کتاب مفصّل تاریخ وار مدرسہ کو ملاحظہ فرما کر بندہ کو ممنون فرماویں، اب نیاز مند کے دل میں یہ آیا کہ بعض خیر خواہانِ مدرسہ جن کو ابھی اس طرف توجہ ہوئی ہے اول سے حال جمع و خرچ مدرسہ کا معلوم نہیں ہے، لہٰذا بنظرِ تفریحِ طبع خیر خواہان مدرسہ و شرکاء چندہ دو گوشوارے دہ سالہ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں، جن سے کل آمد و صرف ہر قسم کا تاریخِ اجرائے مدرسہ سے آخر ۱۲۹۲ھ تک کا صاف صاف

---

[۱] جان پامر کا خط مشمولہ روداد ۱۳۰۲ھ، بعنوان "بشارت"

معلوم ہوتا ہے، خیر خواہانِ مدرسہ اس بات کو خیال فرمادیں کہ زرِ چندہ کو کیسی احتیاط اور کفایت سے خرچ کیا جاتا ہے اور اس تھوڑے سے خرچ سے کیسے کیسے بڑے کام نکلتے ہیں کہ باید و شاید اور کسی قدر مجملاً حال نتیجہ تعلیم کا بھی عرض کیا جاتا ہے کہ اس عرصہ دس سال میں دس طلبہ کو جو جملہ علوم و فنون سے فارغ ہوئے، دستارِ فضیلت مجمع عام میں بندھی اور پندرہ ایسے طلبہ جن کی ایک دو کتاب کسی فن کی باقی رہی تھی اور زمانہ نے ان کو زیادہ فرصت نہ دی اور مجبوراً مدرسہ چھوڑنا پڑا، اُن کو اسناد تحصیل علوم کی دی گئی گویا یہ بھی قریب فارغ التحصیل کے تھے، تو کل پچیس طلبہ پورے پورے عالم ہوئے، اوسطاً فی سال ۲ ½ ہوتے ہیں اور ماسوائے ان کے جو اکثر تھوڑا بہت پڑھ کر چلے گئے ان کا حساب و اندازہ نہیں ہے، اگرچہ جو نتیجہ اب تک حاصل ہوا بہت عمدہ اور اعلیٰ نتیجہ ہے، مگر انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ کو زیادہ امید ہے، اور ایک یہ بھی قابل عرض ہے کہ بالفعل مدرسہ ہذا میں کوئی ایسا طالب علم نہیں ہے جو شروع مدرسہ یا قریب شروع سے داخل ہوا ہو اور اب تک مدرسہ میں موجود ہو، یعنی جو شروع میں داخل ہوئے وہ فارغ التحصیل ہو گئے۔

جلسہ تقسیمِ اسناد

ابتدا میں دارالعلوم کا یہ معمول تھا کہ جب کوئی طالب علم تحصیلِ علم سے فارغ ہوتا تو علماء کے مجمع میں اس کا امتحان لیا جاتا تھا، اور کامیابی کے بعد کسی بڑے عالم سے دستارِ فضیلت بندھوائی جاتی تھی، چنانچہ اس سال ۲ ذی الحجہ یوم جمعہ کو ایک بڑا جلسہ جامع مسجد میں منعقد ہوا، یہ جلسہ دارالعلوم کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا جلسہ تھا، دیوبند کی گلی گلی اور کوچہ کوچہ قال اللہ وقال الرسول کی آوازوں سے معمور نظر آتا تھا، ہر جگہ تفسیر و حدیث کا چرچا تھا، جامع مسجد کے صحن میں طلبہ کے لئے بانسوں کا احاطہ بنایا گیا تھا، مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی، بعد نماز جمعہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ کی ایک مؤثر تحریر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ نے پڑھ کر سنائی، جس میں قیام دارالعلوم کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ:۔

"اس آخری زمانے میں بایں وجہ کہ اہلِ اسلام کے سر پر کوئی دردمندِ اسلام نہ رہا

یہ علم خاص کر اس ملک سے بالکل اٹھ گیا، اس علم کے سب سامان گم ہو گئے، اول تو معیشت میں عام امیر و غریب ایسے پریشان کہ اس علم کی تحصیل کی اُن کو فرصت کہاں، امیروں کو اپنے اموال کا مشغلہ ہی بہت اور غریبوں کو نانِ شبینہ کا خیال جان کا وبال، باوجود اس کے کسی نے کچھ ہمت بھی کی تو کوئی ٹھکانا ایسا نہ تھا جہاں سبق ہو تو طبق بھی ہو، اس لئے جتنا زوال آیا اسی علم پر آیا"۔

پھر آگے چل کر دارالعلوم میں علوم دنیوی کے داخل نصاب نہ کئے جانے کی نسبت فرمایا:۔

"اگر یہ خیال سدِّ راہ ہے کہ یہاں علوم دنیویہ کی تعلیم کا چنداں اہتمام نہیں تو اس کا جواب اول تو یہ ہے کہ مرض کا علاج چاہئے، جو مرض نہ ہو اس کی دوا کھانی فضول ہے، دیوار کے رخنہ کو بند کرنا چاہئے، بھٹے کا بھرنا لازم ہے، جو اینٹ ابھی گری ہی نہیں اس کا فکر بجز نادانی کیا ہے؟ مدارس سرکاری اور کس لئے ہیں؟ ان میں علوم دنیوی نہیں پڑھائے جاتے تو اور کیا ہوتا ہے؟ یہ مدارس اگر قدرِ ضرورت سے کم ہوتے تو مضائقہ بھی نہ تھا، مگر سب جانتے ہیں کہ سرکاری توجہ سے شہر تو شہر گاؤں گاؤں میں مدرسے جاری ہو گئے، اُن کے ہوتے ہوئے اور مدارسِ دنیوی کا اہتمام کرنا اور علوم دینی سے غفلت کا رِ عقلِ دور اندیش نہیں"۔

بعد ازاں حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ کے دستِ مبارک سے فارغ التحصیل طلبہ کے سروں پر دستارِ فضیلت بندھوائی گئی، شرکائے چندہ اور حاضرین جلسہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا، آج اُن کے چندوں کا صحیح مصرف اور ربانی اعانتوں کا لائق فخر و مسرت نتیجہ اُن کی آنکھوں کے سامنے تھا۔

دارالعلوم کی اولین عمارت کا سنگِ بنیاد

جلسہ تقسیم اسناد کے بعد مجمع جامع مسجد سے اُٹھ کر اس جگہ پہنچا جہاں دارالعلوم کی عمارت کے لئے بنیاد رکھی جانے والی تھی، سنگِ بنیاد حضرت مولانا احمد علی محدثؒ

سہارنپوریؒ کے دستِ مبارک سے رکھوایا گیا، اس کے بعد ایک ایک اینٹ حضرت نانوتویؒ، حضرت گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد مظہر نانوتویؒ نے رکھی، یہ نام تو روداد میں مذکور ہیں، ارواحِ ثلٰثہ کی روایت میں مزید دو نام حضرت میاں جی منّے شاہؒ اور حضرت حاجی محمد عابدؒ کے بھی لکھے ہیں۔[۱]

اس موقع کی ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ جب بنیاد رکھی جا چکی تو سب لوگوں نے دارالعلوم کی بقاء و ترقی کے لئے نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ بارگاہِ ایزدی میں دعا کی۔ حضرت نانوتویؒ نے فرمایا کہ "عالمِ مثال میں اس مدرسہ کی شکل ایک معلّق ہانڈی کے مانند ہے، جب تک اس کا مدار توکّل اور اعتماد علی اللہ پر رہے گا یہ مدرسہ ترقی کرتا رہے گا"۔

اس واقعے کو حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ نے ذیل کے اشعار میں نظم کیا ہے[۲]:۔

اس کے بانی کی وصیّت ہے کہ جب اس کے لئے
کوئی سرمایہ بھروسے کا ذرا ہو جائے گا

پھر یہ قندیلِ معلّق اور توکّل کا چراغ
یہ سمجھ لینا کہ بے نور و ضیا ہو جائے گا

ہے توکّل پر بِنا اس کی تو بس اس کا معیں
ایک گر جائے گا، پیدا دوسرا ہو جائے گا

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ نے تعمیر کا مادۂ تاریخ "اشرفِ عمارات" سے نکالا[۳]،

---

[۱] ارواحِ ثلٰثہ، حکایت ۲۵۲۔ [۲] القاسم دارالعلوم نمبر محرم ۱۳۴۷ھ، ص ۳۳

[۳] "اشرفِ عمارات" کے اعداد بحساب جمل ۱۲۹۲ آتے ہیں، سنگِ بنیاد ۲ ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ کو رکھا گیا تھا، چونکہ یہ سال تقریباً ختم ہو رہا تھا، اس لئے تعمیر کا آغاز ۱۲۹۳ھ سے ہوا اور اسی کو آغازِ تعمیر قرار دیا گیا، ایک دوسرے مادۂ تاریخ سے بھی یہی سن برآمد ہوتا ہے، قطعۂ تاریخ یہ ہے:۔

از تماشائے درس گاہِ علوم	چشمہا روشن ست و دلہا شاد
جوشش تاریخ ایں خجستہ بناء	گفت بیت الشرف مبارک باد

آٹھ سال کی مدت میں ۲۳۰۰۰ روپیے کے صرف سے یہ عمارت "نودرہ" کے نام سے بن کر تیار ہوئی، اس عمارت کے دو درجے ہیں، ہر ایک درجے میں نو، نو دروازے ہیں، اس کا طول ۲۶ گز اور عرض ۱۲ گز ہے، دارالعلوم کی یہ سب سے پہلی عمارت ہے، نودرے کی یہ عمارت سادہ ہونے کے باوجود شاندار ہے، روداد میں لکھا ہے کہ "اس عمارت میں سادگی اور استواری کو مقدم رکھا گیا ہے، اس کا نقشہ منجانب اللہ قلوب پر الہام ہوا تھا"۔[1]

حضرت مولانا رفیع الدینؒ نے (جن کے زمانۂ اہتمام میں یہ عمارت تعمیر ہوئی) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپؐ ارشاد فرمار ہے ہیں کہ: "یہ احاطہ تو بہت مختصر ہے"۔ یہ فرما کر خود عصائے مبارک سے ایک طویل و عریض نقشہ کھینچ کر بتلایا کہ ان نشانات پر تعمیر کی جائے، چنانچہ اسی کے مطابق بنیاد کھدوا کر تعمیر شروع کرائی گئی، نودرے کی تعمیری خصوصیات کی نسبت روداد میں لکھا ہے:۔

"اس کی تعمیر میں ہندوستانی اور انگریزی عمارتوں کا لطف موجود ہے، اس کی پشت پر ایک عمدہ تالاب اور بجانب جنوب سبزہ زار اور بجانب شمال باغ مدرسہ ہے، اور وسط صحن میں ایک مختصر اور نفیس چمن نہایت خوش نما جنگلے کے بیچ میں شگفتہ ہے، اور جنگلے کے چاروں طرف گملوں میں ہر قسم کے مختلف الالوان پھولوں کے درخت موجود ہیں"۔[2]

دارالعلوم کا یہ مقام احاطۂ مولسری کے نام سے موسوم ہے، اسی احاطے میں وہ تاریخی کنواں ہے جو نودرے کے ساتھ بنا تھا، یہ کنواں بڑا بابرکت سمجھا جاتا ہے، اس کا پانی نہایت شیریں اور ٹھنڈا ہے، مشہور عالم و مصنف مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے اس کنویں کے پانی کی نسبت اپنا

---

[1] روداد ۱۳۰۱ھ / ۱۸۸۲ء، ص ۱۲

[2] روداد جلسۂ دستار بندی ۱۳۰۱ھ ص ۷ و روداد جلسہ انعام ۱۳۶۶ھ / ۱۹۴۷ء، مندرجہ ماہ نامہ دارالعلوم دیوبند بابت ماہ رمضان ۱۳۶۶ھ / ۱۹۴۷ء، ص ۱۱ و ۱۲

یہ تأثر بیان کیا ہے کہ "اتنا لذیذ"، اتنا خوش گوار، اتنا شیریں، صاف وسبک اور خنک پانی میں نے اس سے پہلے نہیں پیا تھا۔[۱]

حضرت مولانا رفیع الدینؒ ہی نے ایک دوسرے خواب میں یہ بھی دیکھا تھا کہ کنواں دودھ سے بھرا ہوا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیالے سے دودھ تقسیم فرما رہے ہیں، بعض لوگوں کے پاس چھوٹے برتن ہیں اور بعض کے پاس بڑے، ہر شخص اپنا اپنا برتن دودھ سے بھروا کرلے جا رہا ہے مولاناؒ نے برتنوں کے چھوٹے بڑے ہونے کی یہ تعبیر دی کہ اس سے ہر شخص کا "ظرفِ علم" مراد ہے۔[۲]

۱۲۹۳ھ، فتاویٰ کا آغاز

اگرچہ دارالعلوم کی جانب سے فتاویٰ کے متعلق کوئی اعلان نہیں کیا گیا، مگر اس کی عالم گیر مرکزیت اور شہرت عامہ نے لوگوں کو شروع ہی سے شرعی امور میں طلب فتاویٰ کی جانب رجوع کر دیا تھا، اس سال کی روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ کثرت سے استفتاء موصول ہونے لگے تھے، دارالعلوم نے بھی اس کو ایک اہم دینی خدمت سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔

مدارسِ ملحقہ کے امتحانات

۱۲۹۱ھ میں تھانہ بھون کے مدرسہ کا الحاق ہوا تھا، اس سال میں انبہٹہ (ضلع سہارنپور) منظفر نگر اور گلاؤٹھی (ضلع بلند شہر) میں تین مدرسے پایا، حضرت نانوتویؒ قائم ہوئے، تینوں کا دارالعلوم سے الحاق کیا گیا، اس لئے ان مدارس کے سالانہ امتحان کا دارالعلوم کی جانب سے انتظام کیا گیا، چنانچہ دارالعلوم کے اساتذہ نے ان مدارس میں پہنچ کر امتحانات لئے۔

---

[۱] مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کا سلسلۂ مضامین "احاطۂ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن" مندرجہ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، بابت ماہ ربیع الثانی ۱۳۷۱ھ ص ۴۳

[۲] روداد جلسۂ انعام ۱۳۶۶ھ / ۱۹۴۷ء، مندرجہ ماہنامہ دارالعلوم بابت ماہِ رمضان ۱۳۶۶ھ / ۱۹۴۷ء، ص ۱۲

۱۲۹۴ھ، ترک مجروحین کے لئے طلبہ کا چندہ

دارالعلوم میں شروع ہی سے امتحان میں کامیاب ہونے والے طلبہ کو انعام میں کتابیں دیئے جانے کا دستور رہا ہے، گذشتہ سال طلبہ نے کتب انعام لینے کے بجائے فیصلہ کیا تھا کہ کتب انعام کی پوری رقم جو ستر روپے کے قریب تھی، ترک مجروحین اور یتامیٰ کے لئے قسطنطنیہ بھیج دی جائے، اس کے علاوہ ساٹھ روپے جو خود طلبہ نے اپنے طور پر چندہ کر کے جمع کئے تھے، قسطنطنیہ بھیجے گئے تھے، اس سال بھی اس پر عمل کیا گیا، یہ واقعہ پلیونا کی جنگ کے زمانے کا ہے جو ۱۸۷۷ء میں روس اور ترکی کے مابین ہوئی تھی۔

حضراتِ اکابر کا سفرِ حج

۱۲۹۴ھ کے اواخر میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ کی معیت میں حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ صدر مدرس، حضرت مولانا رفیع الدین مہتممؒ اور حضرت مولانا محمود حسنؒ حج کے لئے تشریف لے گئے، اس دوران میں اہتمام کے فرائض حاجی فضل حقؒ نے انجام دیئے۔

۱۲۹۵ھ، ثمرۃ التربیت کا قیام

اس سال میں دارالعلوم کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ فضلائے دارالعلوم نے آپس کے مشورے سے ایک جماعت ثمرۃ التربیت کے نام سے قائم کی، جس کا مقصد یہ تھا کہ جو حضرات دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہو چکے ہیں اور مختلف کاموں میں لگے ہوئے ہیں اُن پر اپنی مادرِ علمی کا بڑا حق ہے، اس لئے اُن کو چاہئے کہ وہ سال بھر میں کم از کم ایک مرتبہ اپنی ایک ماہ کی آمدنی کا چوتھائی حصہ اپنی مادرِ علمی کو ضرور پیش کیا کریں، یہ جماعت ابتداءً ۱۹ افراد پر مشتمل تھی، اس کی سالانہ پیش کش کی مقدار ۹۶ روپے آٹھ آنے تھی۔

مدرسہ کے بجائے دارالعلوم

دارالعلوم دیوبند شروع شروع میں مدرسہ اسلامی عربی دیوبند کے نام سے موسوم رہا، دارالعلوم ایک اصطلاحی لفظ ہے جس کا اطلاق عموماً اُس تعلیم گاہ پر ہوتا ہے جس میں جمیع علومِ عقلیہ و نقلیہ کی اعلیٰ تعلیم

دی جاتی ہو، اور علوم و فنون کے ماہر اساتذہ کی جماعت طلبہ کی تکمیلِ علم و فن کے لئے موجود ہو، دارالعلوم اور یونیورسٹی ایک ہی معنی میں مستعمل ہیں، اس تعریف کے لحاظ سے تو یہ مدرسہ شروع ہی سے دارالعلوم تھا، مگر یہ لفظ اس وقت تک استعمال نہیں کیا گیا جب تک دارالعلوم نے علومِ شرعیہ اور علومِ معقولہ کا مناسب اور ضروری نصاب طلبہ کو ختم نہیں کرا دیا، جب ملک میں جا بجا اس کی شاخیں قائم ہو گئیں اور عام طور پر اس کی تعلیم کو مستند مان لیا گیا اور علمی حلقوں میں اس کی مرکزیت تسلیم کی جانے لگی تو یکم صفر ۱۲۹۶ھ کو جلسۂ انعام کے موقع پر حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ:۔

"خداوندِ کریم کا شکر کس زبان سے ادا کیا جائے کہ تیرھواں سال اس مدرسہ کا جس کو دارالعلوم کہنا بجا ہے، بخیر و خوبی پورا ہوا، اس تھوڑے سے عرصے میں اسلام اور اہلِ اسلام کو بے شمار نفع پہنچا ، بے اختیار اس کے حق میں یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے ؎

تم سلامت رہو، ہزار برس   اور ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار[1]

۱۲۹۶ھ، تعلیمِ طب کا اجراء

دارالعلوم میں طبی تعلیم جاری کرنے کی نسبت گذشتہ سال اپیل کی گئی تھی، جس میں کہا گیا تھا کہ دارالعلوم میں تعلیمِ طب کی کمی ہے، جب کہ اس فن کی تعلیم ضروریات بلکہ واجبات سے ہے، کیونکہ اس سے فائدہ عام ہے، اس سال کی روداد میں لکھا ہے کہ گذشتہ سال ہم نے طبی تعلیم کی نسبت عرض کیا تھا اس وقت سے اربابِ ہمت کے اس طرف متوجہ ہونے کے امیدوار ہیں مگر کوئی صورت ظہور نظر نہیں آئی، اب توکلاً علی اللہ فنِ طب کی تعلیم شروع کر دی گئی ہے، چنانچہ سدیدی اور شرح اسباب سے طبی تعلیم کا آغاز کر دیا گیا ہے، اگر حضرات خیر خواہان نے اس طرف توجہ فرمائی اور قوم کی فلاح و

---

[1] روداد ۱۲۹۵ھ ص ۱۶، و ۱۲۹۶ھ ص ۱۱

بہبود کے لئے توجہ دی تو انشاء اللہ آئندہ طلبہ کو طریقۂ مطب، فنِ جراحی، اور دواسازی کے سکھانے کا بندوبست بھی کیا جائے گا۔

ہر چند اس سال میں مختلف امراض اور قحطِ عام کے سبب سے طلبہ اور چندے میں نسبۃً کمی رہی، مگر الحمد للہ کہ دارالعلوم کے پائے ثبات میں کوئی لغزش نہیں ہوئی۔

۱۲۹۷ھ حضرت نانوتویؒ کی وفات

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نوراللہ مرقدہٗ کی وفات حسرت آیات دارالعلوم کے لئے بڑا حادثہ تھا، اس سال کی روداد میں اراکینِ دارالعلوم کی جانب سے اس حادثے پر جن گہرے تأثرات کا اظہار کیا گیا ہے وہ روداد دارالعلوم کے الفاظ میں یہ ہیں:۔

"پندرہویں سال کا ختم ہونا اور سولھویں سال کا شروع ہونا اس قدر باعثِ خوشی نہیں جس قدر اس کے مربّی و سرپرست حضرت فخر العلماء مولانا مولوی محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کا اس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کو تشریف لے جانا باعثِ حسرت و افسوس ہے، اگرچہ صفحۂ جہان پر اس قسم کے وقائع اکثر درج ہیں مگر یہ واقعۂ جان کاہ بھی ایسا نہیں ہے کہ یکایک زمانہ و اہلِ زمانہ بھول جاویں، مولانا مرحوم کے اوصافِ حمیدہ اور اخلاقِ پسندیدہ اطرافِ عالم میں اظہر من الشمس ہیں، حاجتِ بیان نہیں ہے، مگر مختصر یہ ہے کہ مدّت العمر اسلام اور اہلِ اسلام کی خیر خواہی میں مصروف رہے اور اپنی تمام عمر اعلاء کلمۃ اللہ میں صرف فرمائی، واقعی ایسے عالی قدر، اولوالعزم صاحب کمال خیر خواہ کافۂ اہلِ اسلام کا انتقال فرمانا عموماً اہلِ اسلام پر ایک سخت حادثہ ہے، اور خصوصاً اس مدرسہ کو کیونکہ اس چشمۂ فیض کے منبع اور اس آبِ حیات کے مصدر اور اس آفتابِ عالم تاب کے مظہر آپ ہی تھے، اللہ اللہ اس کارخانۂ خیر کی ترقی میں کیسی کیسی ہمتیں لگائیں، حق تو یہ ہے کہ اس شمس الاسلام ہی کے حسنِ سعی کا یہ نتیجہ ہے کہ ملک ہند میں بایں ہمہ ضعفِ اسلام و اسلامیان علمِ دین کو کس زور و شور سے پھیلایا کہ باید و شاید، مولانا مرحوم کی یہ عمدہ کرامت نہیں ہے تو کیا ہے؟، مدرسہ و اہلِ مدرسہ جس قدر اس واقعۂ غم ناک سے غم گین ہوں کم ہے، اور یہ واقعہ ہول ناک ایسا ہی ہے کہ اس کو

خوب شرح و بسط کے ساتھ لکھا جاوے، مگر کہاں تک اور کب تک، اس لئے بالاجمال عرض کیا جاتا ہے کہ چوتھی جمادی الثانی[1] ۱۲۹۷ھ، روز پنجشنبہ بعد زوال بمرض ضیق النفس ۴۹ سال کی عمر میں بمقام دیوبند اس عالم ربانی کا اس عالم فانی سے انتقال ہوا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

---

[1] روداد ۱۲۹۷ھ میں تاریخ وفات "چوتھی جمادی الثانی" اور دن پنجشنبہ لکھا ہے، مولانا حکیم منصور علی خاں صاحب جو حضرت نانوتویؒ کے تلمیذ رشید تھے اور وفات کے وقت دیوبند میں موجود تھے انھوں نے بھی اپنی تصنیف مذہب منصور میں ۴ جمادی الثانی کی یہی تاریخ لکھی ہے (مذہب منصور جلد دوم ص ۱۸۹، ۱۹۰) مگر یہ صحیح نہیں ہے، وفات کا مہینہ درحقیقت جمادی الاولیٰ ہے، چنانچہ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ نے سوانح قاسمی میں چوتھی جمادی الاولیٰ کی تاریخ لکھی ہے، البتہ دن انھوں نے بھی پنجشنبہ ہی لکھا ہے جو روداد میں مرقوم ہے، حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب کا لکھا ہوا ایک قلمی قطعۂ تاریخ وفات جو دارالاہتمام میں آویزاں ہے اس میں بھی ۴ جمادی الاولیٰ یوم پنجشنبہ لکھا ہوا ہے، گویا دو جگہ مہینہ جمادی الثانی لکھا ہے اور دو ہی جگہ جمادی الاولیٰ لکھا گیا ہے، یہ چاروں ہم عصر مآخذ ہیں، بعد کے لوگوں نے انھیں کا تتبع کیا ہے۔

یہ اختلاف صرف مہینہ کی تعیین میں ہے، چار تاریخ اور پنجشنبہ کے دن پر سب متفق ہیں، تقویم اور حساب کی رو سے پنجشنبہ کو جمادی الاولیٰ کی چار تاریخ نکلتی ہے، جمادی الثانی سے پنجشنبہ کی مطابقت نہیں ہوتی، حسب روایت سوانح قاسمی حضرت نانوتویؒ کی وفات حضرت مولانا احمد علی محدثؒ سے دو دن قبل ہوئی حضرت محدث سہارنپوری کی وفات کی تاریخ ۶ جمادی الاولیٰ اور دن شنبہ کا ہے (تاریخ مظاہر علوم ص ۲۸) اس لئے بھی یہ مہینہ جمادی الثانی کے بجائے جمادی الاولیٰ ہی ہونا چاہئے۔

اس کے علاوہ سرسید مرحوم نے اپنے تعزیتی مضمون مطبوعہ علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کی اشاعت مؤرخہ ۲۴ اپریل ۱۸۸۰ء (یوم شنبہ) میں حضرت نانوتویؒ کی تاریخ وفات ۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء لکھی ہے (علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ ص ۴۶۷) اس کی مطابقت بھی چوتھی جمادی الاولیٰ یوم پنجشنبہ سے ہوتی ہے، گویا وفات کا صحیح مہینہ وہی ہے جو سوانح قاسمی اور حضرت مولانا فضل الرحمٰن کے قطعۂ تاریخ وفات میں مرقوم ہے، روداد ۱۲۹۷ھ اور مذہب منصور میں ماہ وفات جمادی الثانی لکھنے میں تسامح ہوا ہے۔

سید محبوب رضوی

مدرسہ و اہلِ مدرسہ کو جیسی یہ مصیبت پیش آئی ایسی کوئی اور کبھی پیش نہ آئی تھی، ہر چند تواریخ اس حادثہ کی اکثر تحریر ہوئی مگر ایک قطعہ جو غایت درجہ اس واقعہ سے مناسبت رکھتا ہے طبع زاد جناب مولوی فضل الرحمٰن صاحب ڈپٹی انسپکٹر مدارس بجنور نذرِ ناظرین کیا جاتا ہے ؎

وہ غم ہے قاسمِ بزمِ ہدیٰ کی رحلت کا — کہ جرعہ نوش الم جس سے ہر در و زنہ ہے
یہ ایسا غم ہے کہ جس غم سے بزمِ عرفاں کا — مثال خم فلکِ جام واژگونہ ہے
کچھ اک زمیں ہی نہیں زرد رنگ اس غم سے — لباسِ چرخ بھی ماتم میں نیلگونہ ہے
سن وفات لکھی فضل نے زروئے الم — وفات سرورِ عالم کا یہ نمونہ ہے

حضرت گنگوہیؒ کی سرپرستی

حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی وفات کے بعد مجلس شوریٰ کے ارکین نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو ۱۲۹۷ھ سے دار العلوم کا سرپرست تجویز کیا، یہ بتلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کے ہم درس اور خواجہ تاش تھے، دونوں حضرات نے ایک ہی جگہ تعلیمی مراحل طے کئے تھے، دونوں کو حضرت شاہ عبد الغنی مجددی دہلویؒ سے حدیث میں شرفِ تلمذ حاصل تھا، اور دونوں کو شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ سے خلافت حاصل کرنے والے حضرات میں ممتاز ترین مقام حاصل تھا، خود حضرت شیخ المشائخؒ کو اپنے ان مریدین پر فخر تھا، روداد میں لکھا ہے کہ حضرت مولانا گنگوہیؒ مثل حضرت نانوتویؒ کے ہیں اور ہمیشہ دار العلوم کی ظاہری و باطنی امداد فرماتے رہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے دار العلوم کو نعم البدل عطا فرمادیا ہے، اس بات سے بڑی امید ہے کہ دار العلوم کے کاموں میں انشاء اللہ اختلال نہیں آئے گا، چنانچہ حضرت گنگوہیؒ سے جو امید باندھی گئی تھی، دار العلوم کی تاریخ شاہد ہے کہ وہ بدرجۂ اتم پوری ہوئی۔

شیخ المشائخؒ کی ہدایت

حضرت نانوتویؒ کی وفات پر شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ نے اپنے مسترشدین کو جو ہدایت فرمائی تھی اس میں لکھا ہے کہ "اس زمانے میں جو مقبولیت بارگاہِ الٰہی میں کارخانۂ علم کو ہے اور اُمر کو

نہیں"۔ ہدایت نامہ کا متن یہ ہے:۔

"بعد حمد و صلوٰۃ کے فقیر امداد اللہ عفا اللہ عنہ اُن کی خدمت میں جو صاحب اس فقیر سے علاقۂ محبت و ارادت اور قرابت رکھتے ہیں، خواہ قرابت حسبی ہو یا نسبی، عرض ہے کہ مدرسہ عربیہ دیوبند جو اس وقت میں اپنی خوبی سے نہایت رونق اور شہرت پر ہے فقیر کو اس سے ایک علاقۂ خاص ہے بلکہ یہ مدرسہ اپنا ہی مدرسہ سمجھتا ہے اس جہت سے سب صاحب اس مدرسہ کو اپنا ہی مدرسہ سمجھیں اور جو کچھ اعانت اس مدرسہ کی اپنی ذات سے ہو سکے یا سعی اور سفارش سے ممکن ہو اس میں ہمیشہ ساعی رہیں اور نگرانی اس مدرسہ کی اپنے ذمہ ضروری سمجھیں، کیونکہ اس آخری زمانے میں جو مقبولیت بارگاہِ الٰہی میں کارخانۂ علم کو ہے اور اَمر کو نہیں، اور سب صاحب اس مدرسہ کے باب میں بلکہ ہر اَمر میں متفق و یک دل و یک جہت ہو کر ہمت فرماویں کیونکہ اتفاق اللہ جل شانہٗ کے نزدیک نہایت مقبول اور ہر کام میں موجبِ انجام نیک ہے۔ فقط"[1]

۱۲۹۸ھ / ۱۲۹۹ھ، جلسہ تقسیمِ انعام و دستار

پچھلے دو تین سالوں سے سالانہ معمول کے مطابق جلسۂ دستار بندی نہیں کیا جا سکا تھا، اس سال بڑے پیمانے پر شوال میں جلسہ کیا گیا، اطراف و جوانب کے علاوہ دور دراز مقامات کے علماء و رؤسا اور عوام بڑی تعداد میں شریکِ جلسہ ہوئے، باہر سے آنے والے مہمانوں کی تعداد کم و بیش بارہ سو کے قریب تھی، اُن کے کھانے کا انتظام اہلِ شہر کی جانب سے کیا گیا تھا، اس جلسے کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ جامع مسجد کے بجائے جہاں اب تک جلسہ ہائے انعام منعقد ہوا کرتے تھے، یہ جلسہ خود دارالعلوم کی اپنی عمارت میں منعقد ہوا، ۱۴ طلبہ مستحق سند و دستار تھے، جن میں ۷ حاضر تھے، ان کے سروں پر حضرت گنگوہیؒ نے اپنے دستِ مبارک سے دستار باندھی، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ نے تقسیمِ انعام کی تقریر

---

[1] حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کی یہ تحریر گرامی دارالاہتمام دارالعلوم دیوبند میں محفوظ ہے۔

میں مدارسِ دینیہ کی ضرورت اور دارالعلوم کی مقبولیت کی تفصیل بتلاتے ہوئے فرمایا :۔

اس زمانے میں علم اُٹھ جانے سے مراد علم دین ہے، نہ اور علم، اس وقت میں ایسے اسباب جمع ہو گئے تھے کہ اس چراغ کے گل ہو جانے کا گمان غالب تھا، چنانچہ علوم دینیات، عقائد، فقہ، حدیث تفسیر اور اُن کے مؤید علوم صرف و نحو، معانی و بیان، ادب اور اصولِ فقہ کیسے کیسے مندرس ہو گئے تھے، اور علومِ دانش مندی علم کلام، منطق، ریاضی، ہیئت کا کیا حال ہو گیا تھا، اور علوم دین کی جس قدر ضرورت ہے اس سے ہر مسلمان آگاہ ہے، عقائد کی درستی، طہارت کا سامان، نماز کی اسلوبی زکوٰۃ کی ادائیگی، صیام رمضان کا انجام، ارکان و شعائر حج کا پورا کرنا، نکاح و طلاق کے احکام، تقسیم مواریث، خوبی و خرابی معاملات بدون علم کے کب حاصل ہو سکتے ہیں؟ ہر چند ترجمے ہر قسم کی کتابوں کے ہو گئے ہیں، مگر ظاہر ہے کہ مسائل دینیہ بے استاد پورے سمجھ میں نہیں آسکتے۔ ایسے وقت میں دریائے رحمتِ الٰہی جوش میں آیا، فضل خداوندی نے دست گیری فرمائی کہ سامانِ علم چندے باقی رہنے کا فرمایا جس سے اس گل ہوتے چراغ نے سنبھالا لیا اور ڈوبتے کا طریق رحمت نے تنکے کے سہارے کچھ دم درست کیا، یعنی اس مدرسہ کی بنا کرنے کی ہمت بعض اپنے خاص بندوں کے جی میں ڈالی اور ان کی سعی مشکور سے جو کچھ وہم و گمان میں نہ تھا سامان درست فرمایا، اس عرصے میں مدرسہ سہارنپور کی بھی بنا ہوئی اور پھر تو بہت جگہ مدرسے قائم ہوئے اور انشاء اللہ ہوں گے اور نفع ان کا ایک عالم کو پہنچتا رہے گا، مگر اول ہونے کا اس مدرسہ کو ایسا شرف ہے کہ اس نعمتِ الٰہی کو کسی طرح بھولنا نہ چاہیئے، اور دیوبند اس مدرسہ پر جو کچھ فخر کرے بجا اور درست ہے، اور نام نیک اس بستی کا کہاں کہاں تک پہنچا، پھر تو طالبانِ علوم کا ہجوم ہونا شروع ہوا، اگر مقدرت ہوتی اور طلبہ آنے والوں کے کھانے اور مکان اور لباس وغیرہ کا انتظام ہو جاتا تو خیال ہوتا ہے کہ ہزار پندرہ سو سے طالب علم کم نہ ہوتے، مگر بنا ناچاری آنے والوں کو جواب ہی دیا جاتا ہے کہ یہاں اور زیادہ گنجائش نہیں ہے اب بھی اس مدرسہ میں قریب ڈھائی سو طلبہ کے فراہم ہیں، اور کتنے ہی طلبہ کی یہ کیفیت ہے کہ ایک جائے کے کھانے پر دو، دو اور تین، تین نے اکتفا کر رکھا ہے اور بعض محض توکل اور فاقہ کشی پر ہمت

لگائے ہوئے طلب علم کے شوق میں پڑے ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اپنی ہمت عالی کا ثمرہ عنایت فرمائے۔[1]

دارالعلوم کے ہندو معاونین

دارالعلوم سے تعاون اور چندے کے سلسلے میں شروع ہی سے یہ عمل رہا ہے کہ اس میں ہر مذہب و ملت کے لوگوں کے چندے کو قبول کیا جاتا رہا ہے، دارالعلوم کے آئین چندے کی پہلی دفعہ یہ ہے:-

"چندے کی کوئی مقدار مقرر نہیں اور نہ خصوصیت مذہب و ملت۔"

چنانچہ دارالعلوم کی روداوں میں جابجا اہل ہنود اور دوسرے غیر مسلم چندہ دہندگان کے نام درج ہیں، اور یہ سلسلہ شروع سے لے کر اب تک جاری ہے، اس کے علاوہ دارالعلوم کے ابتدائی سالوں میں فارسی وریاضی کے درجات میں مسلمان بچّوں کے دوش بدوش ہندو بچّے بھی نظر آتے ہیں، دارالعلوم میں ہندو بچّوں کی تعلیم کا سلسلہ ایک عرصے تک جاری رہا ہے، جب برطانوی حکومت نے سرکاری ملازمتوں کے لئے سرکاری اسکولوں کی سند کو ضروری قرار دے دیا تو سرکاری ملازمتوں کے خواہشمند مسلم بچوں کی طرح ہندو بچوں کی تعلیم کا رُخ بھی سرکاری اسکولوں کی طرف پھر گیا۔

نقد چندے کے علاوہ کتابوں کی فراہمی میں بھی غیر مسلموں اور بالخصوص ہندوؤں کا بڑا حصہ رہا ہے، اس سلسلے میں ہندوستان کے مشہور مطبع نول کشور لکھنؤ کے مالک آں جہانی منشی نول کشور صاحب کے نام کو دارالعلوم کی تاریخ میں نمایاں مقام حاصل ہے، منشی نول کشور جب تک زندہ رہے اپنے پریس کی مطبوعات کے نسخے دارالعلوم کو ضرور عنایت کرتے رہے۔ بسلسلہ ۱۲۸۶ھ کے حالات میں اوپر گزر چکا ہے کہ :-

"امداد کتب کی نسبت جو سال گذشتہ میں لکھا گیا تھا بہت سے اہل ہمت نے

---

[1] روداد جلسہ انعام ۱۲۹۵ھ ص ۱۱ و ۱۲

اس طرف توجہ فرمائی، کتب قیمتی و کارآمد سے امداد فرمائی، بالخصوص منشی نول کشور صاحب مالک چھاپہ خانہ اعظم مقام لکھنؤ، اس امر میں زیادہ تر قابلِ مشکوری ہیں کہ باوجود بُعدِ مسافت بہت سی کتب کارآمد سے معاونت کی۔"

۱۲۸۹ھ کی روداد میں منشی نول کشور صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"اربابِ مشورہ مدرسہ نہایت شکرگذار ہیں جناب منشی نول کشور صاحب مالک مطبع اعظم لکھنؤ کے جنھوں نے کمال دریا دلی کا کام فرمایا اور چند کتب مفید سے امداد مدرسہ میں ہمت فرمائی، خاص کر نسخہ قاموس سے کہ لغت میں بے نظیر ہے اور منشی صاحب نے اس کتاب کو نہایت خوبی اور صحت سے طبع فرمایا ہے، مدرسہ میں اس سے پہلے کوئی نسخہ اس کتاب کا نہ تھا، یہ کتاب ایسی محتاج الیہ ہے کہ ہر مدرس اور طالب علم کو اس کی حاجت رہتی ہے۔"

غرض کہ دارالعلوم کی روداد میں جابجا اُن کے عطیاتِ کتب کا ذکر ہے، اور بار بار ان کا شکریہ ادا کیا گیا ہے، نول کشور پریس سے شائع ہونے والا مشہور "اودھ اخبار" بھی ہمیشہ اعزازی طور پر دارالعلوم میں آتا رہا ہے، ۱۲۹۴ھ کی روداد میں لکھا ہے:۔

"جناب منشی نول کشور مالک "اودھ اخبار" لکھنؤ اور جناب راؤ امر سنگھ صاحب مالک اخبار "سفیر" بڈھانہ کا بالخصوص شکریہ، باوجودیکہ یہ دونوں صاحب اہل ہنود سے ہیں مگر آفریں ہزار آفریں ان کی سخاوت اور عنایت پر کہ اپنے اپنے اخبارات گراں بہا اس مدرسہ کو عنایت فرماتے ہیں، جملہ اربابِ مشورہ مدرسہ ہٰذا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور سب صاحبوں کے حق میں دعا کرتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ ان کے اخبارات اور کارخانہ جات کو دم بدم ترقی عطا فرماوے اور ان کی قوت و آزادی کو قائم رکھے۔"

۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ء میں پنجاب یونیورسٹی کے انگریز رجسٹرار ڈاکٹر جی، ڈبلیو لیٹر نے بھی مختلف علوم و فنون کی تقریباً دو درجن کتابیں کتب خانے کے لئے بھیجیں۔

۱۳۰۰ھ ، دار العلوم کے ثمرات اور ۱۸ سالہ نتائج کا خلاصہ

۱۳۰۰ھ کی روداد میں دار العلوم کے ثمرات و نتائج کا ذکر کرتے ہوئے اہلِ خیر اور علم دوست حضرات سے اپیل کی گئی ہے اور اُن کو مزید امداد و اعانت پر توجہ دلاتے ہوئے لکھا ہے کہ "جیسی امیدیں اس نہال سرسبز سے ثمر خوش لذت کی تھیں وہ عام مسلمانوں کو بخوبی حاصل ہوتی رہی ہیں اور ہوتی جاتی ہیں، یہاں کے اساتذہ کی محنت اور اخلاص دلی نے ایک جہان کے طلبہ کو اس مدرسہ کی طرف کھینچ لیا ہے، ہندوستان کے دور دراز مقامات سے حصول علم دینیہ کے لئے چلے آتے ہیں، اکثر غریب مسلمان با اخلاص نے اس کی تائید اور امداد میں بہت کچھ ہمتیں لگائیں اور اپنی حتی المقدور زر نقد سے، کتابوں سے، خوراک سے، پوشاک سے مدرسہ کی معاونت اور طلبہ بیرونجات کی خبر گیری کی، جزاہم اللہ خیر الجزاء، مگر چونکہ باب تعلیم نہایت وسیع اور یہ صحرائے عظیم بہت فراخ ہے، پورے پورے سامانِ تعلیم کے لئے ابھی ہنوز روزِ اول ہے، جب تک اہلِ دُوَل مسلمان اس طرف توجہ نہ کریں گے اور پورا سامان مہیا نہ کریں گے جیسا چاہیے ویسا فروغ اس کا ممکن نہیں۔

۱۳۰۰ھ میں دستار بندی کا چوتھا جلسہ حسب معمول عظیم الشان پیمانے پر منعقد ہوا، جلسے میں دو ڈھائی ہزار بیرونی حضرات نے شرکت کی، مہمانوں کے کھانے کا انتظام اہلِ شہر کی جانب سے کیا گیا، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ نے دار العلوم کی ۱۸ سالہ کارگذاری کی تفصیل اور اس کے نتائج بیان فرمائے، روداد میں مذکور ہے :۔

"باوجود پریشانی اور بے سروسامانی کے طلبہ کو علم میں ایسی ترقی ہوئی کہ دہلی کے مدرسے یاد آگئے، اور سعادت و نیکوکاری ان سعید نوجوانوں کی اور تہذیب نو عمروں کی ایسی ظاہر ہوئی کہ مدرسہ خانقاہ کا نمونہ ہو گیا، اور کیوں نہ ہو اللہ کے کام کی یہی علامت ہے کہ نو تر کے بود سے بڑھ کر اثر اور تخم کے اندازہ سے زائد نشو و نما ہو، برکت اسی کا نام ہے اور اللہ کا ایسا ہی کام ہے۔

آج اس نونہال کو انیسواں سال ہے، پچھلے اٹھارہ سال میں ہزاروں بندگانِ خدا تھوڑا

بہت فیض پاکر راہی مقصود ہوئے، تین بار یہ جلسہ دستار بندی پہلے ہو چکا ہے، پہلا ۱۲۹۰ھ میں سات سال کے بعد ہوا، اس میں پانچ مولویوں کی دستار بندی ہوئی، دوسرا جلسہ ۱۲۹۲ھ میں ہوا، اس میں بھی پانچ ہی کے سروں پر دستار باندھی گئی، تیسرا ۱۲۹۶ھ میں ہوا، اس میں سات طلبہ کی دستار بندی ہوئی، اب ۱۳۰۱ھ میں گیارہ صاحب فارغ التحصیل قابلِ دستار بندی موجود ہیں، جن کی دستار بندی میں آپ صاحبوں کو تکلیف قدم رنجہ فرمانے کی دی گئی ہے، اس اٹھارہ سال میں سترہ پہلے اور گیارہ اس مرتبہ کے اٹھائیس مولوی ہوئے، اور یہ امر بھی قابلِ گذارش ہے کہ ہر مرتبہ میں چند مولوی فارغ لائق اس شرف کے اس مدرسہ کے تحصیل یافتہ اور بھی تھے جو اپنے وطنوں کو چلے جانے کے سبب سے نہ آسکے، اگر ان کا عدد بھی لیا جائے تو وہ بھی اس عدد سے کم نہیں، اب یہ امر قابلِ ملاحظہ ہے کہ اٹھارہ سال کو ملاحظہ فرماؤ اور چھپن مولوی ہونے کو خیال فرمادیں۔

۱۳۰۱ھ کے آخر تک پچاس حافظ تیار ہوئے، اسی طرح مکتب فارسی سے بہت سے طلبہ نے اچھی اچھی استعداد حاصل کی، ہر چند کہ یہ عدد اس مدرسہ کی نسبت بڑا عدد ہے، مگر تمام ہندوستان کی نسبت اتنا بھی نہیں جیسے آٹے میں نمک، اگرچہ بہت سے مدارس چندے کے جا بجا مقرر ہیں، اور اُن میں بھی یہ سلسلۂ فیض جاری ہے، مگر ضلع کے ضلع اور ملک کے ملک علم دین سے خالی ہیں [۱]

شعبۂ طب کا قیام

پچھلے چند سالوں سے دارالعلوم میں شعبۂ طب کے قیام کا مسئلہ زیرِ غور رہا تھا، اگرچہ ۱۲۹۶ھ سے طب کی تعلیم جاری کر دی گئی تھی مگر مستقل طور پر اس کے لئے کوئی انتظام نہ تھا، ۱۳۰۱ھ میں مجلس شوریٰ کی حسبِ ذیل تجویز کی رو سے شعبۂ طب کا قیام عمل میں آیا:-

---

[۱] روداد جلسہ دستار بندی ۱۳۰۱ھ ص ۱۱ و ۱۲

ایک عرصے سے واسطے تعلیم طب کے ایک معلم طب کے تقرر کا مسئلہ زیر غور ہے، اس کا تذکرہ چند بار روداددں میں کیا گیا ہے، طلبہ تعلیم طب کے خواہش مند بھی ہیں، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی رائے ہے کہ اس کے لئے مستقل طور پر کسی طبیب کا تقرر کیا جائے، اس لئے بہتر ہے کہ اس شعبہ کو قائم کر دیا جائے، طبیب کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ وہ اسباق پڑھانے کے علاوہ فرصت کے اوقات میں طلبہ کے علاج کی خدمت بھی انجام دیا کرے۔

۱۳۰۲ھ، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کی وفات

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ

دارالعلوم کے سب سے پہلے شیخ الحدیث تھے، اس وقت یہ منصب صدر مدرس کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، ۱۲۸۳ھ میں جو دارالعلوم کا پہلا سال ہے دیوبند تشریف لائے، دارالعلوم کی شہرت و عظمت میں حضرت ممدوح کے علم و فضل کا بڑا حصہ ہے، دارالعلوم سے اُن کے شغف اور تعلق کا کسی قدر اندازہ ان تقریروں سے کیا جا سکتا ہے جو گذشتہ سالوں کے حالات میں جا بجا پیش کی جا چکی ہیں، اٹھارہ سال کے قریب دارالعلوم کے شیخ الحدیث رہے، اس دوران میں ۷۷ طلبہ دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہوئے، جن میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی حضرت مولانا احمد حسن امروہی، حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہی، حضرت مولانا خلیل احمد انبہٹوی۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندی، حضرت مولانا حافظ محمد احمد نانوتوی، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، حضرت مولانا رحیم اللہ بجنوری رحمہم اللہ جیسے آفتاب علم و فضل اور صاحب کمال علماء شامل ہیں۔

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ وفات سے کچھ دن قبل اپنے وطن نانوتہ تشریف لے گئے تھے، ۳ ربیع الاول ۱۳۰۲ھ کو مرض فالج داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون[1]!

---

[1] تفصیلی حالات کے لئے باب پنجم ملاحظہ فرمائیے۔

۱۳۰۳ھ تعلیمی اعداد و شمار

اس سال کی روداد میں دارالعلوم کے اُس وقت تک کے نتائج کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے کہ ابتدائے قیامِ دارالعلوم سے اب تک ۲۱ سال ہوئے ہیں، اس مدت میں ۱۴۱ طلبہ فارغ التحصیل اور قریب بفراغ ہیں، وہ طلبہ ان کے علاوہ ہیں جو دوران تعلیم میں تھوڑا بہت پڑھ کر چلے گئے، ان کا شمار نہیں کیا جا سکا، ۴۲ طلبہ نے حفظ قرآن شریف کی سعادت حاصل کی ہے، جن طلبہ نے صرف ناظرہ پڑھا ہے وہ اس کے علاوہ ہیں، روداد میں ان سب حضرات کی نام وار فہرست بھی دی گئی ہے، جس کو بخوفِ طوالت یہاں پیش نہیں کیا جا سکا، اس بات کا افسوس ہے کہ روداد میں درجاتِ فارسی و ریاضی سے استفادہ اور فراغت حاصل کرنے والوں کا کوئی تذکرہ درج نہیں ہے، ظاہر ہے کہ ان درجات سے فیضیاب ہونے والوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہو سکتی ہے۔

۱۳۰۴ھ، حیدرآباد میں ایک امدادی انجمن کا قیام

دارالعلوم کا یہ بیسواں سال ہے، اتنی کم مدت میں اس کا دائرۂ فیض ہندوستان کی حدود سے گذر کر قندھار اور بخارا تک پہنچ چکا تھا، اور ان دور دراز ممالک سے طلبہ کھنچے چلے آتے تھے، سنین گذشتہ کی رودادوں میں ان مقامات کے طلبہ جا بجا نظر آتے ہیں، اس طرح اس کے ہمدردوں اور معاونین کا حلقہ وسیع ہو چکا تھا، چنانچہ حیدرآباد دکن میں ایک انجمن "معین الاسلام" کے نام سے وہاں کے لوگوں نے دارالعلوم کی امداد کے لئے قائم کی اس انجمن کی تفصیلی کارروائی اس سال کی روداد میں درج ہے، جس میں دینی تعلیم کی اہمیت کو بڑے پُرجوش انداز میں بیان کیا گیا ہے، اور آخر میں غیرتِ قومی سے اپیل کرتے ہوئے دارالعلوم کو چندہ دینے والوں کا نقشہ بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے، چند جملے ملاحظہ ہوں:-

"آپ نہایت متحیر ہوں گے جب یہ سنیں گے کہ کیسے کیسے باحمیت لوگ اس کا چندہ دیتے ہیں اور کس کس مقدار میں دیتے ہیں، ایک بیوہ چکّی پیسنے والی ہے کہ وہ صرف آدھ آدھ آنہ سال تمام میں دیتی ہے، ایک غریب لوہار کا لڑکا ہے وہ ایک آنہ

سال بھر میں نذر کرتا ہے، کوئی بڑھئی ہے وہ وہ آنے نذر اللہ پہنچاتا ہے، ایک صاحب ہمت ہیں کہ وہ اپنی منت پورا ہونے پر کچھ ٹکے لئے چلے آتے ہیں، کہ اس سے تیل بتی کا خرچ ہی نکل آئے گا، کوئی بندۂ خدا دو چار کتابیں ہی طالب علموں کو پیش کر دیتا ہے، غرض جس سے جو بن پڑتا ہے محض للہ اور خالصاً فی سبیل اللہ دامے، درمے، قدمے، قلمے اس مدرسہ کی ترقی میں ساعی ہوتا ہے اور تہِ دل سے چاہتا ہے کہ یہ چراغِ ہدایت کسی طرح روشن رہے۔"

انجمن معین الاسلام نے حیدرآباد میں امداد دارالعلوم کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ مستقبل میں بہت پھلا پھولا اور طویل مدت تک جاری رہا۔

ریاست حیدرآباد کی امداد

حیدرآباد میں انجمن معین الاسلام کے ذریعے سے دارالعلوم کے لئے امدادی تحریک کا گذشتہ سال آغاز ہوا تھا، ۱۳۰۵ھ میں ریاست حیدرآباد کے صدر اعظم نواب سر آسمان جاہ نے دولت آصفیہ کی جانب سے سو روپیہ ماہانہ چندہ دوامی مقرر کیا۔ حیدرآباد سے اس امداد کے جاری کرانے میں نواب وقارالملک مولوی مشتاق حسین مرحوم نے جو کوشش کی تھی روداد میں بڑے وقیع انداز سے اس کا تذکرہ اور شکریہ ادا کیا گیا ہے[۱]۔ حیدرآباد کے اس چندے میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا رہا اور حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کی مساعی سے یہ رقم بتدریج ایک ہزار ماہانہ تک پہنچ گئی تھی، اس زمانے میں دولت آصفیہ کی جانب سے تین ہزار روپیے بمد تعمیر بھی دیئے گئے تھے۔ سقوطِ حیدرآباد تک یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔

یہاں یہ اعتراف نہ کرنا بڑی نا انصافی ہوگی کہ بیسویں صدی کے نصف اول میں دولت آصفیہ کی گوناگوں تعلیمی سرپرستیوں اور علمی فیاضیوں نے اسلامی تاریخ کے دور گذشتہ کے

---

[۱] روداد ۱۳۰۶ھ ص ۹۰

سلاطین واُمراء کی یاد تازہ کردی تھی، اس دور میں دولتِ آصفیہ کی جانب سے جو علمی کارنامے انجام پائے وہ تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ زرّیں حروف سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔

مولانا رفیع الدینؒ کا سفرِ حج

حضرت مولانا رفیع الدینؒ جو کم وبیش ۲۰ سال تک مہتمم رہ چکے تھے، ۱۳۰۶ھ میں حج کے لئے تشریف لے گئے، ان کا یہ سفرِ حج بقصدِ ہجرت تھا، چنانچہ دو سال مدینہ منورہ میں قیام کے بعد وہیں ۱۳۰۸ھ میں وفات پائی، اراکینِ شوریٰ نے حضرت حاجی محمد عابدؒ سے اہتمام کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کی درخواست کی، جیساکہ اوپر گذرچکا ہے حاجی صاحبؒ شروع ہی سے مجلسِ شوریٰ کے رُکن تھے اور ۱۲۸۳ھ اور ۱۲۸۶/۸۷ھ میں دو مرتبہ مہتمم رہ چکے تھے۔

۱۳۰۸ھ، شیخ الہندؒ مسندِ صدارت پر

قیامِ دارالعلوم کے موقع پر عرض کیا جاچکا ہے کہ جب دارالعلوم کا افتتاح عمل میں آیا تو سب سے پہلے طالبِ علم شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ تھے، ۱۲۹۰ھ میں اُنھوں نے تعلیم سے فراغت حاصل کی اور اس کے اگلے سال اُن کو مدرس بنایا گیا، بعدازاں ۱۳۰۸ھ میں حضرت مولانا سیّد احمد دہلویؒ کے مستعفی ہوجانے پر حضرت شیخ الہندؒ کو صدارتِ تدریس تفویض کی گئی۔

۱۳۰۹و۱۰ھ، معاونِ اہتمام

۱۳۰۹ھ کی روداد میں تعلیمی نتائج کی نسبت لکھا ہے کہ ۲۷ سال کی مدت میں ۲۳۴ عالم اور ۱۰۸ حافظ فارغ ہوچکے ہیں۔

۱۳۱۰ھ میں حضرت حاجی محمد عابدؒ کی غیر معمولی مصروفیات کی وجہ سے اہتمام میں تغیر کرنا پڑا، روداد میں لکھا ہے کہ "چونکہ حضرت حاجی محمد عابد صاحب مدظلہ العالی کو بوجہ ہجوم خلق اللہ جو اُن کی خدمتِ بابرکت میں نزدیک و دور سے جوق در جوق واسطے دعائے حلِّ مشکلات و دفعِ امراض کے شبانہ روز حاضر ہوتے ہیں اور حضرت ممدوح بوجہ شفقت واخلاقِ حسنہ کسی کا ناکام

جانا پسند نہیں فرماتے، اس قدر فرصت نہیں ملتی کہ امورِ اہتمام میں زیادہ وقت صرف فرما سکیں لہٰذا حضرت ممدوح نے یہ مناسب سمجھا کہ حاجی فضل حق صاحب کو اہتمام کا کام سپرد فرمادیں اور خود اُن کے کاموں کی نگرانی فرماتے رہیں، اہلِ شوریٰ نے بخیالِ تخفیف تصدیع حضرت موصوف اس کو تسلیم کیا، اس لئے باتفاق اہلِ شوریٰ قرار پایا کہ حاجی فضل حق صاحب مہتمم مقرر ہوں۔"

دارالافتاء کا قیام

دارالافتاء کے قیام کی نسبت لکھا ہے کہ "مدرسہ کی شہرت کی وجہ سے دور دراز مقامات سے بکثرت استفتاء آتے ہیں اور مدرسین کو تعلیم سے اس قدر فرصت نہیں ہوتی کہ بلا حرج تعلیم اُن کے جوابات لکھ سکیں، تعلیم علومِ دینیہ کا بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ عام مسلمانوں کو مسائلِ شرعیہ دریافت ہوں اور تحقیقِ حق میں سہولت ہو، لہٰذا بنظرِ مصلحت یہ قرار پایا کہ مولوی عزیز الرحمٰن صاحب نائب مہتمم کو خدمتِ افتاء پر مقرر کیا جائے تاکہ عام مسلمانوں کو فتاویٰ میں دشواری پیش نہ آئے۔

۱۳۱۱ھ، فضلاء دارالعلوم ملک کے دینی مدارس میں

دارالعلوم کے قیام پر ابھی چوتھائی صدی ہی گذری تھی کہ برِّ صغیر کے دینی مدارس میں جا بجا فضلائے دارالعلوم تعلیم و تدریس کی مسندوں پر رونق افروز نظر آنے لگے تھے۔ ۱۳۱۱ھ کی روداد میں لکھا ہے کہ اکثر مدارس اسلامیہ میں اس مدرسہ کے فارغ التحصیل مدرسی پر مامور ہیں۔ بحمداللہ یہ مدرسہ خوبیٔ تعلیم و حسنِ انتظام و کثرتِ طلبہ و کمال مدرسین کی وجہ سے ہمیشہ سرفراز رہا، مدرسین مدرسہ ہٰذا بحمداللہ جمیع علومِ عقلیہ و نقلیہ میں فائق و کامل ہیں اور کارِ مدرسہ کو مثل اپنے اساتذۂ کرام کے جن کی ذات قدسی آیات سے اس مدرسہ کی بنیاد اور ترقی ہوئی، للہ و اخلاص سے کرتے ہیں اور باوجودیکہ دیگر بلاد میں ان کو زیادہ تنخواہ پر بلایا جاتا ہے مگر وہ حضرات اس مدرسہ کی قلیل تنخواہ کو گوارہ کر کے بدل و جان سرگرم مساعی درسِ طلبہ میں مصروف ہیں، مدرسہ دیوبند کا فیض جس قدر عالم میں پہنچا اور اس کی روشنی نے ایک عالم کو ظلمتِ جہالت سے نکال کر صراطِ مستقیم پر قائم کیا وہ کسی پر مخفی نہیں، اس تھوڑے سے

عرصے میں شرق سے غرب تک اس کا آوازۂ کمال پہنچا اور اس کے فیض یافتہ علماء جا بجا ہدایت خلق اللہ میں مصروف ہوئے، یہ احسان اس مدرسہ کا ایسا نہیں جس کو کوئی فراموش کر سکے اور اس کے بارِ منت سے سبکدوش ہو سکے۔

۱۲و۱۳۱۳ھ اہتمام میں تبدیلی

سالِ گذشتہ میں حضرت حاجی محمد عابدؒ کی مصروفیات کے باعث حضرت ممدوح کے بجائے حاجی فضل حق صاحب کو مہتمم مقرر کیا گیا تھا، ایک سال کے بعد انھوں نے استعفا پیش کر دیا، اس لئے اُن کے بجائے مولانا محمد منیر نانوتویؒ کو مہتمم مقرر کیا گیا، ابھی بمشکل ایک سال ہی گذرا تھا کہ وہ بھی مستعفی ہو گئے، اس لئے ضرورت تھی کہ اہتمام کے لئے کسی ایسی شخصیت کا انتخاب کیا جائے جو مستقل مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ تجربہ کار، صاحب علم اور منتظم بھی ہو، تاکہ دار العلوم کے ابتدائی دور کی روایات کو نہ صرف یہ کہ برقرار رکھ سکے بلکہ اُن میں اپنی علمی اور عملی صلاحیتوں سے تازہ رُوح پھونک دے، یہ سب خصوصیات حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب ابن حضرت قاسم العلوم نانوتویؒ کی شخصیت میں کماحقہ موجود تھیں، حضرت گنگوہیؒ نے اس منصب کے لئے حافظ صاحبؒ کا انتخاب فرمایا، یہ انتخاب دار العلوم کے لئے کتنا موزوں اور مفید ثابت ہوا، اس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

حضرت گنگوہیؒ کی تشریف آوری

پچھلے چند سالوں میں اہتمام میں جو آئے دن تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں اُن سے دار العلوم کے نظام میں اختلال پیدا ہو گیا تھا، حضرت مولانا گنگوہیؒ جو اُس وقت دار العلوم کے سرپرست تھے دیوبند تشریف لائے اور ایک ہفتہ قیام فرمایا، دورانِ قیام کی جو کیفیت روداد میں درج ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ اکثر مسلمانوں اور معاونین مدرسہ کو حضرت مولانا گنگوہیؒ کی تشریف آوری کا عرصے سے انتظار تھا، اس لئے اطراف و جوانب دہلی، مراد آباد، میرٹھ، مظفر نگر، سہارنپور وغیرہ سے علماء و صلحاء و دیگر اہلِ اسلام ذی وجاہت جوق در جوق تشریف لائے، نواب محمود علی خاں صاحب رئیس چھتاری (علی گڈھ) اپنے ہمراہ شیخ بشارت علی صاحب منصرم ریاست کو لائے تھے، غرض کہ ایک عجیب

بابرکت اور پُرشوکت مجمع اہلِ اسلام کا جمع ہوگیا تھا، نواب صاحب نے مدرسہ کے اندرونی و بیرونی حالات کی کما حقہ تحقیق فرمائی اور جملہ حساب و کتاب و کاغذات دفتر و کتب خانہ وغیرہ کی جانچ خود اور بواسطہ شیخ بشارت علی صاحب فرمائی اور موجوداتِ خزانہ کو بھی بہت تدقیق و جزرسی سے دیکھا، الحمد للہ سب طرح سے درست پایا۔"

اس کے بعد حضرت مولاناؒ نے انتظامِ مدرسہ کی جانب توجہ فرمائی اور حسب اتفاق رائے چھ حضرات کو جو علم وعقل اور وجاہتِ ظاہری اور علمی و انتظامی لیاقت کے اعتبار سے ممتاز ہیں داخل اہلِ مشورہ کیا، اُن کے اسمائے گرامی یہ ہیں، مولوی میر احمد حسن صاحب امروہی مدرس اول مدرسہ اسلامیہ امروہہ۔ نواب مولوی محی الدین خاں صاحب مرادآبادی مہتمم مدرسہ اسلامیہ مرادآباد مولوی عبد الحق صاحب پورقاضی وکیل ریاست رتلام، مولوی شاہ منظر حسن گنگوہی قدوسی، حکیم محمد اسمٰعیل صاحب گنگوہی مقیم بمبئی المعروف بہ حکیم اجمیری، شاہ سعید احمد صاحب انبھٹوی آتالیق ولی عہد ریاست مالیر کوٹلہ، نیز دار العلوم کے مہتمم اور صدر مدرس کو بھی بحیثیت عہدہ اہلِ مشورہ میں شامل فرمایا۔

دار الاقامہ کی تعمیر کے لئے حیدرآباد کی مساعی

دار العلوم میں بیرونی طلبہ کے قیام کے لئے کمروں کی تعمیر کی غرض سے

حیدرآباد میں دار العلوم کے ہمدردوں نے بڑی گرم جوشی کا اظہار کیا، مولوی شوکت حسین صاحب مددگار صوبیدار ورنگل، حیدرآباد میں اس تحریک کے روحِ رواں تھے، انھوں نے دار العلوم کی اپیل پر اپنی جدوجہد سے سات ہزار روپے چندہ کر کے کمروں کی تعمیر کے لئے بھیجے، اس زمانے میں موصوف نے علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں ایک طویل مضمون لکھا تھا جس میں اُنھوں نے بڑے مؤثر انداز میں یہ بتلایا تھا کہ دار العلوم کی امداد کیوں ضروری ہے؟ ذیل میں اس مضمون کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت دار العلوم کے متعلق ملک میں کیا خیالات پائے جاتے تھے، موصوف لکھتے ہیں :-

"اب بحث طلب یہ امر ہے کہ یہ چندہ جو جمع ہوگا اس سے آیا کوئی جدید بنیاد کسی مدرسہ کی علیحدہ اٹھائی جائے گی یا کسی جمی جمائی بنیاد پر ہی عمارت بڑھائیں، لیکن جہاں تک غور کیا ہمارا خیال یہ ہے کہ بہ نسبت کسی جدید بنیاد کے بنی بنائی بنیاد پر ہی کیوں نہ قبضہ کیا جائے، ورنہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ ہونے کا تو پھر وہی خرابہ ہوگا جو ہوتا چلا آیا ہے، جس نے قومی ایوان کی اینٹ سے اینٹ بجادی ہے، پھر نہ معلوم کہ سرمایہ کی مقدار بھی کب اس درجے کو پہنچے کہ ہم اپنا نقشہ اپنی خواہش کے موافق جما سکیں، اور کچھ معلوم نہیں کہ کل تک کیا ہونے والا ہے، قوم کی بے پرواہی اور چندے کی مشکلات بھی کھلی ہوئی باتیں ہیں، تو واقعی حصولِ مدعا کی صورت جہاں تک ہے وہ اس میں پائی جاتی ہے کہ جیسے جیسے رقم ملتی جائے وہ کسی بھی ایک جمے جمائے مدرسہ ہی پر لگائی جائے تاکہ بالفعل وہی ایک مدرسہ دم بدم ترقی اور فروغ پاکر قوم کے لیے سرمایۂ عزت اور فخر ہو سکے، تو وہ ایک مدرسہ دیوبند ہے، جس کو ہم نے اس ارادے کے لیے منتخب کر لیا ہے، ہم نے اقطاعِ ہند کے موجودہ مذہبی مدارس پر ایک نظر کی، لیکن یہی ایک مدرسہ دیوبند ایسا پایا جو بہت غنیمت کہا جا سکتا ہے اور ۳۰۔۳۲ سال سے بجائے خود روز بروز کچھ نہ کچھ ترقی ہی کرتا چلا آتا ہے اور اپنی قدامت اور استقلال اور فائدہ رسانی کے خیال سے تمام مدارسِ مذہبی ہندوستان میں اس وقت شایانِ صدارت ہے تو یہی ہے، بندگانِ عالی کے خزانۂ شاہی سے بھی یہی مدرسہ ہے جس کو سرآسمان جاہ بہادر کی وزارت کے زمانے سے بارہ سو روپیہ سالانہ نذر کیا جاتا ہے۔

الحاصل زمانۂ دراز سے باوجود ایک غیر مستقل اور جزوی آمدنی کے یہ مدرسہ ہمیشہ سے کچھ نہ کچھ ترقی یافتہ حالت ہی کے ساتھ قائم چلا آتا ہے، اور یہ بے شک کسی مقبول دعا ہی کا اثر ہے کہ اب تک ایک مختصر مکان بھی مدرسہ نے بطورِ خود تعمیر کر لیا ہے، کچھ کتب خانہ بھی ہو گیا ہے، جہاں تک ہو سکتا ہے طلبہ کو بھی بھوکوں مرنے نہیں دیتا اور جیسے کچھ بھی ہوں ہر سال حافظ، مولوی اور عالم بھی بناتا ہی رہتا ہے۔

غرض کہ ہندوستان میں اس وقت یہی ایک مدرسہ ہے جو تمام مدارس کے مقابل ہر ایک

پہلو سے ممتاز اور ہماری کوششوں اور تائید سے مستفیض ہونے اور فائدہ پہنچانے کی قابلیت رکھنے والا نظر آتا ہے"۔[1]

۱۳۱۸ھ، دار الطلبہ کی تعمیر گذشتہ سالوں میں دار الطلبہ کی تعمیر کے لئے جو اپیل کی گئی تھی وہ نتیجہ خیز ثابت ہوئی، نواب شاہ جہاں بیگم والیٔ بھوپال نے دار الطلبہ کی تعمیر کے لئے ایک گراں قدر رقم عنایت فرمائی، روداد میں تعمیرات کی تفصیل یہ بیان کی گئی ہے کہ بہت سے حجرے طلبہ کے لئے مدرسے کے متصل ایک علیحدہ احاطہ میں تیار ہو گئے ہیں جو دار الطلبہ کے نام سے موسوم ہیں، اس کے علاوہ دروازہ کلاں کے اوپر اس کے گرد و پیش میں دفتر اور مہمان خانہ وغیرہ کی عمارتیں مکمل ہو گئی ہیں، ان پر بارہ ہزار روپے صرف ہوئے ہیں، اس خوشی میں مستری اور مزدوروں کو شیرینی بانٹی گئی، حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب رکن مجلس شوریٰ نے اس موقع پر حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

> "ہم کو یہ موقع نہایت خوشی اور شکر کا ہے کہ جس طرح اس ناچیز قصبہ کو محض بتائیدِ ایزدی تعلیمِ علومِ دین کی عزت حاصل ہوئی اسی طرح یہ بھی مسرت ملی کہ ایسی عالی شان، خوش وضع اور مستحکم عمارت بلا تجویز کسی نقشے اور تخمینے کے یہیں کے ایک معمار کے ہاتھوں سے تیار ہوئی ہے، جس کو بڑے بڑے ذی علم اور صاحبِ تجربہ انجینیر بھی دیکھ کر پسند کرتے اور اظہارِ خوشنودی فرماتے ہیں"۔[2]

۱۳۱۹ھ، کتب خانہ کا ذخیرہ کتب جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے دار العلوم کے کتب خانہ کی ابتدا تو ۱۲۸۳ھ ہی میں ہو چکی

---

[1] علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ مؤرخہ ۱۸ ستمبر ۱۸۹۷ء ص ۸

[2] روداد مجلس شوریٰ ۱۳۱۸ھ ص ۱۴۹ و ۱۵۰

تھی، جس میں وقتاً فوقتاً کتابوں کا اضافہ ہوتا رہا، ابتداً درسیات اور اُن کی متعلقہ شروح وغیرہ سے آغاز ہوا تھا، پھر رفتہ رفتہ درسیات کے علاوہ عام کتابیں بھی فراہم کی جاتی رہیں ۱۳۱۹ھ کی روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال تک مختلف علوم و فنون کی کتابوں کا معتدبہ ذخیرہ فراہم ہو چکا تھا، چنانچہ روداد میں لکھا ہے، بفضلہ تعالیٰ مدرسہ میں ذخیرۂ کتب درسیہ وغیر درسیہ اس قدر جمع ہو گیا ہے کہ ضروریاتِ مدرسہ کو ہر طرح سے کافی ہے، یعنی جس قدر کسی جماعت میں طلبہ ہوتے ہیں اُن سب کو ایامِ درس تک مدرسہ سے کتابیں مل سکتی ہیں، ہر فن کی ضروری کتابیں، شروح و حواشی موجود ہیں، بعض بعض نایاب کتابیں بھی جمع ہو گئی ہیں، مجموعی حیثیت سے یہ بڑا عالی شان کتب خانہ ہے، مگر بایں ہمہ مصنفاتِ اسلامی کے وسیع اور بے انتہا ذخیرے کو ابھی مکمل ہونے میں بہت سے مراحل باقی ہیں، اگر یہ کتب خانہ مکمل ہو گیا تو مسلمانوں کی اولوالعزمیوں اور فیاضیوں کی قیامت تک قائم رہنے والی یادگار ہوگی، مولوی عابد حسین صاحب آنریری مجسٹریٹ جونپور مسلمانوں کے شکریہ کے مستحق ہیں، اُنھوں نے اپنا بیش قیمت کتب خانہ جو بعض نادر کتابوں سے معمور ہے دارالعلوم کو عطا فرما دیا ہے۔

اسی سال میں نواب سلطان جہاں بیگم بھوپال نے ازراہِ علم دوستی تین سو روپے سالانہ کا چندہ دارالعلوم کے لئے مقرر کیا، ریاست بھوپال ماضی میں اپنی علم پروری کی وجہ سے خاص شہرت و عظمت کی مالک رہی ہے، آئندہ سالوں میں بھوپال کے چندے کی مقدار ڈھائی ہزار تک پہنچ گئی تھی جو سقوطِ ریاست تک برابر جاری رہی۔

حضرت تھانویؒ اور رائے پوریؒ کی رکنیتِ مجلسِ شوریٰ

۱۳۲۰ھ میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور حضرت مولانا عبدالرحیم رائے پوریؒ کو مجلسِ شوریٰ کا رُکن بنایا گیا۔

۱۳۲۱ھ شعبۂ تجوید کا اجراء

دارالعلوم میں عرصے سے تجوید و قرأت کی تعلیم جاری کرنے کی تجویز تھی اور متعدد مرتبہ اس کے لئے سعی

کی جاچکی تھی، مگر خاص اس مد میں آمدنی نہ ہونے کے باعث شعبۂ تجوید کے اجراء میں کامیابی نہ ہو سکی تھی، اس سال میں ادھر تو مجلس شوریٰ نے توکلاً علی اللہ اس شعبے کے جاری کر دینے کی تجویز منظور کی اور اُدھر غیب سے اللہ تعالیٰ نے یہ سامان پیدا کر دیا کہ قاضی علیم الدین صاحب رئیس شاملی نے اپنی جائیداد دارالعلوم کے لئے وقف کر دی جس کی آمدنی پچاس روپے ماہانہ تھی واقف نے اس آمدنی کو تجوید و قرأت کی تعلیم کے لئے مخصوص قرار دیا، قاری عبدالوحید خاں الہ آبادی کو جو قاری عبدالرحمٰن مکی کے ارشد تلامذہ میں تھے دارالعلوم میں قرأت کی تعلیم پر مامور کیا گیا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح دارالعلوم کا افتتاح ایک طالب علم اور ایک استاد سے ہوا تھا، بالکل اسی طرح شعبۂ تجوید کا آغاز بھی ایک استاد اور ایک طالب علم سے ہوا، یہ طالب علم جس نے دارالعلوم کی فضا میں سب سے پہلے قرآن مجید کو تجوید سے پڑھا، آگے چل کر اپنے عہد کا مشہور ترین قاری اور عالم بنا اور آج وہ حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے نام سے عالمِ اسلام میں روشناس ہیں۔

قاری عبدالوحید خاںؒ کے فیضانِ تعلیم کا حلقہ بڑا وسیع ہے، دارالعلوم میں تجوید کی تعلیم مدت سے لازمی ہے، اس لئے فضلائے دارالعلوم میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو تجوید و قرأت سے محروم اور قاری عبدالوحید صاحب یا اُن کے تلامذہ سے مستفیض نہ ہو۔

انگریزی تعلیم کی تجویز

اس سال کی روداد میں دارالعلوم کی جانب سے ایک تجویز یہ پیش کی گئی کہ ایسے طلباء کو جو کم از کم انٹرنس پاس ہوں اور دارالعلوم میں داخلہ لینا چاہیں اُن کو دس پندرہ روپیہ ماہانہ کے وظائف دیئے جائیں، اسی طرح دارالعلوم سے فراغت کے بعد جو طلبہ انگریزی تعلیم حاصل کرنا چاہیں اُن کے لئے بھی وظائف مقرر کئے جانے کی ضرورت ہے، روداد کے الفاظ یہ ہیں کہ "دونوں صورتوں میں مسلمانوں کے لئے بہت سے فوائد ہیں"۔ افسوس ہے کہ اس مد میں عطیات نہ ہونے کی

وجہ سے یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔

۱۳۲۲ھ، صُوبہ متّحدہ کے گورنر کا ورود

سرجیمس ڈگس لیٹوش گورنر صوبہ متحدہ، ۱۳۲۲ھ میں دارالعلوم کو دیکھنے کے لئے آئے، دارالعلوم کی مختلف عمارتوں، درس گاہوں اور کتب خانہ کو دیکھا، سب سے زیادہ کتب خانہ کو پسند کیا، قرآن مجید کے قلمی نسخے نکلوا کر دیکھے، اساتذہ اور طلبہ سے بات چیت کی، اُن کا وطن پوچھا، اور طلب علم کی غرض وغایت دریافت کی، طلبہ نے بتلایا کہ ہمارا نصب العین احیائے دین اور خدمتِ ملک وملّت ہے! غیر ملکی طلبہ سے دور دراز مقامات سے آنے کا سبب معلوم کیا، اُنھوں نے بتلایا کہ ہمارے یہاں آنے کا سبب دارالعلوم کی بے نظیر تعلیمی خوبی ہے، اس علمی کشش نے ہمیں کھینچ بلایا ہے، قرآن مجید کی درس گاہ میں ایک بچّے سے سورۂ رحمٰن کا ایک رکوع پڑھوا کر سُنا، عصرانہ کے بعد گورنر نے جلسہ گاہ میں سپاس نامہ کے جواب میں شُستہ اردو میں تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

"مجھے مدرسہ کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، یہاں ہر جگہ سے طلبہ آتے ہیں، یہ اس مدرسہ کی ہر دل عزیزی کا ثبوت ہے، میں نے یہ بھی سُنا کہ یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ معاش سے پریشان نہیں ہیں، یہاں علم کے علاوہ تہذیب، اخلاق، راست بازی اور صداقت سکھائی جاتی ہے، آپ صاحبان مدرسہ کی ترقی میں کوشاں ہیں، یہ اچھی علامت ہے، ترقی کی یہی صورت ہوا کرتی ہے، جب کسی کام میں نئی ضرورتیں پیدا نہ ہوں تو خیال کیا جاتا ہے کہ ترقی رُک گئی ہے، مجھ سے ایک نالے کی بابت کہا گیا ہے جو مدرسہ کے قریب سے گذرتا ہے میں اس پر غور کروں گا۔"[1]

---

[1] وہ گندہ نالا جس کی طرف دارالعلوم نے توجہ دلائی تھی بعد میں ایک دوسرے گورنر کے حکم سے ہٹا دیا گیا، یہ نالا نودرے کے عقب سے گذرتا تھا، اس کی وجہ سے دارالعلوم کی عمارتوں کو آگے بڑھانے میں رکاوٹ پیدا ہو رہی تھی۔

گورنر کی تقریر کے بعد مولانا سید احمد امام شاہی جامع مسجد دہلی اور مولوی عبد الاحد مالک مطبع مجتبائی دہلی نے علم حدیث اور ادب عربی میں کامیاب ہونے والے دو طلبہ کو ایک سال تک دس روپے ماہانہ وظیفہ دینے کا اعلان کیا۔

مولانا ذوالفقار علیؒ کی وفات

حضرت مولانا ذوالفقار علیؒ (والد ماجد حضرت شیخ الہندؒ) اُن اکابر میں سے تھے جو دارالعلوم کی بناء و تاسیس میں شروع ہی سے شریک رہے تھے، دارالعلوم کے قیام کے بعد تمام عمر مجلس شوریٰ کے رُکن رہے دارالعلوم کا خزانہ اُنھیں کی تحویل میں رہتا تھا، نہایت امانت و دیانت کے ساتھ اُنھوں نے اس خدمت کو انجام دیا، علم و فضل، تدین، وجاہتِ دنیوی اور خوش خلقی میں یگانۂ روزگار تھے، تحصیل علوم دہلی کالج میں کی تھی، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ سے نسبتِ تلمذ حاصل تھی، محکمۂ تعلیم میں ڈپٹی انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھے، عربی ادب سے خاص شغف تھا چنانچہ دیوان حماسہ، دیوان متنبی، سبع معلقہ اور قصیدہ بانت سعاد کے جو اردو ترجمے اور شرح انھوں نے کئے ہیں وہ بہت مقبول ہیں، فنّ بلاغت میں تذکرۃ البلاغت ان کی مشہور تصنیف ہے

۱۵ رجب ۱۳۲۲ھ بروز دوشنبہ بیاسی سال کی عمر میں انتقال فرمایا، قبر کی نشاندہی کے لئے حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ کا یہ شعر بڑا دلچسپ ہے ؎

ہاں بجُسپ آسودہ تر، مابین دو یاران خویش
قاسم[1] بزم مودّت، احسن[2] شائستہ خو!

۱۳۲۳ھ، حضرت گنگوہیؒ کی وفات

گزشتہ سال ہی حضرت مولانا ذوالفقار علیؒ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا تھا، ابھی ایک سال بھی پورا نہ ہونے پایا تھا کہ ۸ رجمادی الآخر ۱۳۲۳ھ یوم جمعہ کو حضرت گنگوہیؒ[3] نے چند دن

---

[1] حضرت نانوتویؒ [2] مشہور مصنف حضرت مولانا محمد احسن نانوتویؒ
[3] روداد ۱۳۲۲ھ صفحہ آخر

کی علالت کے بعد ۸۰ سال کی عمر میں رحلت فرمائی، حضرت نانوتویؒ کی وفات کے بعد دارالعلوم میں یہ سب سے بڑا حادثہ تھا، رو داد میں اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

"مولانا مرحوم اُسی صدف کے اعلیٰ دُرِ یتیم تھے جس سے حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ جیسے اعلیٰ حضرات نکلے تھے، حضرت مرحوم نے اپنے وجود با جود کی بدولت مدرسہ دیوبند کو اس اعلیٰ ترقی پر پہنچایا تھا جس کی نظیر آج بمشکل کسی دوسری جگہ مل سکے گی، آج صرف حضرت مرحوم ہی کی وفات نہیں ہوئی بلکہ گویا آج تمام حضراتِ اکابرِ مدرسہ دیوبند مثل حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کی وفات ہوئی ہے، جن کی وفات کو حضرت مولانا کی نعمت وجود سے مسلمان فراموش کئے ہوئے تھے، اس لئے جس قدر فکر اہل اسلام کو مدرسہ دیوبند کی طرف سے پیدا ہو وہ تھوڑا ہے[1]۔"

حضرت نانوتویؒ کی وفات کے بعد اراکین دارالعلوم نے متفقہ طور پر حضرت ممدوح کو دارالعلوم کا سرپرست اور مرجع الامر بنا لیا تھا، اور حضرت کا معاملہ بھی دارالعلوم کے ساتھ بالکل اُسی طرح رہا جیسے حضرت نانوتویؒ فرماتے تھے، اکثر سالانہ امتحان اور تقسیم انعام کے وقت دیوبند تشریف لاتے اور اپنے دستِ مبارک سے طلبہ کو انعام عطا فرماتے اور فارغ التحصیل طلبہ کے سر پر دستار باندھتے تھے۔

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اُن قدیم طرز کے علماء میں تھے جن کا حلقۂ درس ملازمت دو ظائف سے بے نیاز تھا، حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں قیام رہتا تھا، تزکیۂ قلب اور تزکیۂ نفس کے حلقے کے ساتھ ساتھ طلبہ کا مجمع بھی موجود رہتا تھا، علم حدیث سے خاص طور پر غیر معمولی شغف تھا، تقریر نہایت جامع اور مختصر ہوتی تھی، اس کا کسی قدر اندازہ جامع ترمذی کی اُس تقریر سے ہو سکتا ہے جو الکوکب الدری کے نام سے شائع ہو چکی ہے، دارالعلوم سے فارغ التحصیل

---

[1] روداد ۱۳۲۳ھ صفحہ آخر۔

علماء میں جن حضرات نے حضرت گنگوہیؒ کے درس میں شریک ہو کر استفادہ کیا ان میں حضرت علامہ کشمیریؒ جیسے یگانۂ روزگار علماء شامل ہیں۔

۱۳۲۴ھ جلسہ تقسیم انعام

دارالعلوم کے اکابر نے آغاز کار ہی سے یہ قرار دیا تھا کہ ہر سال شعبان میں سالانہ امتحان کے بعد تقسیم انعام کا جلسہ منعقد کیا جایا کرے، جس میں طلبہ کے علاوہ مقامی اور بیرونی لوگوں کو بھی شرکت کی دعوت دی جاتی تھی، جلسہ کی غایت یہ ہوتی تھی کہ مجمع عام میں مدرسین وطلبہ کی سال بھر کی محنت اور سعی و کوشش کے نتائج سامنے آجائیں تاکہ کامیاب طلبہ کی انعام ملنے پر حوصلہ افزائی ہو اور ناکام طلبہ میں شوق ورغبت کی تحریک پیدا کی جائے۔ اس کے ساتھ دوسری غرض یہ بھی تھی کہ قوم اور بالخصوص چندہ دینے والوں کو برائے العین اپنے چندے کے مَصرف کا علم ہو جائے اور وہ بطورِ خود اطمینان حاصل کر سکیں کہ انھوں نے اپنی جس نسل اور سرمائے کو دارالعلوم کے حوالے کیا تھا اس میں دارالعلوم کہاں تک کامیاب ہو سکا ہے، چنانچہ اس قسم کے جلسہ ہائے انعام ہر سال دارالعلوم میں ہوتے رہے ہیں مگر کبھی کبھی ان جلسوں کو وسیع پیمانے پر بھی منعقد کیا جاتا تھا، جس میں قرب وجوار کے علاوہ دور دراز مقامات کے لوگوں کو بھی دعوت دی جاتی تھی، اس نوع کا سب سے پہلا جلسہ ۱۲۹۰ھ میں ہوا تھا، دوسرا ۱۲۹۲ھ میں، تیسرا ۱۲۹۸ھ میں اور چوتھا ۱۳۰۱ھ میں، یہ پانچواں جلسہ تھا اور اب تک تمام جلسوں سے زیادہ عظیم الشان تھا، قرب وجوار کے علاوہ علی گڈھ، مرادآباد، شاہجہانپور، بریلی، لاہور اور بھوپال وغیرہ مقامات کے بہت سے مسلمانوں نے اس میں شرکت کی، بیگم صاحبہ بھوپال کے نمائندے بھی آئے تھے، مہمانوں کو دارالعلوم اور شہر کے مکانات میں ٹھہرایا گیا، دیوبند کے لوگوں نے حسبِ معمول مہمانوں کی راحت رسانی اور مدارات میں زیادہ سے زیادہ حصّہ لیا،

جلسے میں اہتمام کی جانب سے کارگذاری کی رپورٹ پیش کی گئی، اور حضرت مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ایک نظم سُنائی جس میں دارالعلوم سے قبل کی

علمی حالت اور قیام دارالعلوم کا نقشہ نہایت مؤثر انداز میں کھینچا گیا ہے، اس نظم کے چند شعر درج ذیل ہیں ؎

کل کی ہے بات، کہ تھی جہل کی گھنگھور گھٹا — جس طرف آنکھ اُٹھاتے تھے محیطِ عالم

آبِ حیواں کی طرح، علم ہوا تھا مخفی — ظلمتِ جہل سے مخلوق تھی اعمیٰ و اَصَم

حافظِ علم تھا، اک سینۂ صندوق فقط — نہ کوئی حامیٔ و غم خوار، نہ کوئی ہمدم

رحمتِ حق ہوئی حامی، تو یکا یک اُٹھے — چند مردانِ خدا باندھ کے صف ٹھوک کے خم

یوسفِ علمِ شریعت کے خریدار بنے — جمع کرکے سرِ اخلاص سے معدود درم

سلسلہ ڈالا فقیرانہ بنامِ ایزد — کوردہ میں کہ جہاں بیٹھے ہیں اربابِ ہِمَم

شوق کہتا تھا بڑھو، ضعف یہ کہتا تھا ٹھہرو — ناتوانوں کا تھا کیا کہیے عجب ضیق میں دم

اتنے میں دیکھیے بس کیا ہیں، کہ اک مردِ خدا — آرہا تیز روی سے ہے لیے ساتھ عَلَم

کس بلا کی تھی نظر پڑتے ہی جس کے فی الفور — پڑ گئی جان میں جاں، آہی گیا دم میں دَم

تھی نرالی ہی کچھ اس مردِ صفا کی سج دھج — تھے عجائب ہی کچھ اس شیرِ خدا کے دم خم

گاڑ کر اس نے عَلَم ایک ندا کی ایسی — یک بیک چونک پڑے اہلِ مدر اہلِ خِیَم

اس کی آواز تھی یا بانگِ خلیلِ الٰہی — کہہ کے لبیک چلے اہلِ عرب اہلِ عجم

باندھ کر چُست کمر کہتے ہوئے نحنُ معک — پیچھے پیچھے ہوئے سب اس کے بنا سر کو قدم

اس مربیٔ دل و جاں کی مسیحائی سے — علمِ دیں زندہ ہوا، جہل نے لی راہِ عدم

ابرِ علم و عمل و فضل کا بادل برسا — جس جگہ اس یمِ رحمت کا پڑا نقشِ قدم

دولتِ علم سے سیراب کیا عالم کو — قاسمِ علم بھلا کیوں نہ ہو پھر اس کا عَلَم

اُس کی آواز تھی بے شک قُمِ عیسیٰ کی صدا — جس کے صدقے سے لیا علم نے دوبارہ جنم

پھر تو کیا تھا، دی خدا نے وہ ترقی اس کو — دیکھ لیں آپ! کہیں اپنی زباں سے کیا ہم

کلفتیں جھیلیں سبھی پر نہ ہوا چیں بجبیں — دِقتیں دیکھیں ٹلا اپنی جگہ سے نہ قدم

آخری شعر میں دارالعلوم کے ہمدردوں کو امداد کی تلقین فرماتے ہیں:-

بیروی کرتے رہو، سعی کو ہاتھوں سے نہ دو ٭ بدمے یا درمے یا قدمے یا بقلمٍ[1]

حضرت مولانا حبیبُ الرحمٰن صاحب مسندِ اہتمام پر

۱۳۲۴ھ میں اس وقت کے مہتمم حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ نے دارالعلوم کے ملیے کو بڑھانے اور اُس کو بڑے پیمانے پر ترقی دینے کی ایک عظیم الشان اسکیم تیار کی مگر اس کے لئے دائرہ اہتمام میں ایک ایسے شخص کے تعاون اور خدمات کی ضرورت تھی جو ذی علم، صائب الرائے، بیدار مغز اور اعلیٰ درجے کی انتظامی صلاحیت کا مالک ہو، تاکہ اسکیم کو بارآور بنانے میں مدد دے سکے اور انتظامی امور میں اہتمام کا ہاتھ بٹائے، مجلسِ شوریٰ نے اہتمام کی درخواست پر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی کا انتخاب کیا، جو حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب کے فرزندِ رشید تھے، اور اُن جملہ اوصاف سے بدرجۂ اتم متصف تھے جو اس اہم منصب کے لئے ضروری ہیں۔

کتب خانہ کی عمارت

کتب خانہ کی موجودہ عمارت سے قبل کتب خانہ نودرہ کے قریب جانبِ جنوب کے کمروں میں تھا، لیکن کتابوں میں روز افزوں اضافہ ہوجانے کے سبب یہ عمارت ضرورت کے لئے ناکافی ہوگئی تھی، اس لئے پچھلے چند سالوں سے کتب خانہ کے لئے ایک وسیع عمارت کی شدید ضرورت محسوس کی جارہی تھی دارالعلوم کے ہمدردوں میں نواب یوسف علی خاں صاحب رئیس مینڈھو نے اس اہم ضرورت کی جانب توجہ فرمائی اور سات ہزار روپیہ کی گراں قدر رقم کتب خانہ کی تعمیر کے لئے دارالعلوم کو عطا کی اسی لئے تکمیلِ تعمیر کے بعد اس دور میں اس کا نام کتب خانۂ یوسفی پڑگیا تھا جو بہت عرصہ تک چلا نواب صاحب ممدوح کے بعد میرٹھ کے چند اہل خیر حضرات نے بھی کتب خانہ کی تعمیر میں حصہ لیا

---

[1] روداد جلسۂ انعام ۱۳۲۴ھ۔

۲؍صفر المظفر ۱۳۲۴ھ کو ایک بڑے مجمع میں اس عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا گیا، یہ عمارت دو منزلہ ہے، نیچے دارالصنائع وغیرہ ہیں اور اوپر کی منزل میں کتب خانہ ہے جس میں فرش سے چھت تک الماریاں لگی ہوئی ہیں۔

۱۳۲۵ھ، حوادثِ وفات

اس سن میں دارالعلوم کے کئی ہمدردوں نے سفرِ آخرت اختیار کیا، نواب یوسف علی خاں صاحب رئیس مینڈھو دارالعلوم کے قدیم ہمدرد اور مخلص معاون تھے، ہمیشہ بڑی بڑی رقموں سے اپنے والد بزرگوار (نواب محمود علی خاں صاحب) کی طرح دارالعلوم کی امداد فرماتے تھے، چنانچہ گذشتہ سال ہی کتب خانہ کی عمارت کے لئے سات ہزار روپیہ عطا فرمایا تھا، مرضِ وفات میں جو جائیداد وقف فرمائی اس میں ایک معقول حصہ دارالعلوم کے لئے مخصوص کر دیا تھا، شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ سے شرفِ بیعت حاصل تھا، نواب صاحب موصوف نے ربیع الاول ۱۳۲۵ھ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

(۲) مولانا محمد یٰسین صاحب شیرکوٹی مدرس دارالعلوم، فنِ ہیئت وریاضی کے زبردست فاضل تھے، مولانا کو ہیئت کے آلات بنانے میں یدِ طولیٰ حاصل تھا، حج سے واپسی پر جدہ میں وفات پائی۔

(۳) حاجی ظہور الدین صاحب دیوبندی نے بھی اسی سال میں انتقال فرمایا، حاجی صاحب حضرت نانوتوی قدس اللہ سرہٗ کے مخلص خدام میں تھے اور اپنی سنجیدگیٔ مزاج اور سلامتِ طبع کے سبب سے منتخب و ممتاز لوگوں میں شمار ہوتے تھے، موصوف ۱۳۱۱ھ سے مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔

(۴) ابھی یہ زخم مندمل نہ ہونے پائے تھے کہ شنبہ ۳؍جمادی الاولیٰ ۱۳۲۵ھ کو حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے جو بانئے دارالعلوم کے شریک کار تھے سفرِ آخرت اختیار فرمایا ۱۳۲۴ھ کی روداد میں تحریر ہے کہ:-

"مولانا فضل الرحمٰن صاحب اُن مقدس ارکان میں سے تھے جن کے متبرک ہاتھوں سے مدرسہ کی ابتدا ہوئی تھی، مولانا کی تمام عمر مدرسہ کی خدمت گذاری اور خبر گیری، جاں نثاری اور خیر خواہی میں صرف ہوئی، اور ہر حالت میں جد و جہد وسعی اور جانفشانی کے ساتھ مدرسہ کے معاملات میں بدل و جان سرگرم رہے امورِ مدرسہ میں ہمیشہ احتیاط و دیانت داری، راست بازی اور انجام بینی سے کام لیا"۔

مولانا موصوف نے دہلی کالج میں حضرت استاذ العلماء مولانا مملوک علی صاحب قدس سرہٗ کی خدمت میں تحصیلِ علوم کی تھی، علمِ ادب میں خاص ملکہ تھا، فارسی میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے تھے، عربی و فارسی کی نظم و نثر نہایت پاکیزہ و متین ہوتی تھی، تاریخ گوئی میں بڑا ملکہ تھا، ابتداءِ عمر میں ایک بزرگ سے بیعت کی تھی، آخر میں حضرت گنگوہیؒ کے حلقۂ بیعت میں شامل ہو گئے تھے، بیالیس سال تک مجلس شوریٰ کے رُکن رہے۔

تعمیرِ مسجد کی تجویز

اس وقت تک دارالعلوم کے احاطہ میں مسجد نہ تھی، طلباء قرب و جوار کی مساجد میں نماز پڑھتے تھے، اس میں طلباء کے اوقات کا حرج بھی ہوتا تھا اور دقتیں بھی پیش آتی تھیں، اس کے علاوہ خود دارالعلوم کی حیثیت کا بھی تقاضا تھا کہ اس کے احاطے میں مسجد ہو، یہ تجویز عرصے سے سامنے تھی، چنانچہ ۱۳۱۶ھ میں دارالطلباء کی تعمیر کے مجوّزہ نقشہ کے ساتھ اس اہم ضرورت کا بھی اعلان کیا جا چکا تھا، مگر کل امرٍ مرھونٌ باوقاتھا کے مطابق اب تک اس کی نوبت نہ آسکی تھی کہ رجب ۱۳۲۵ھ میں میرٹھ کے ایک "اہلِ خیر" حاجی فصیح الدین صاحب نے سبقت کی اور ابتدائی ضرورتوں کے لئے ڈیڑھ ہزار روپیہ پیش کر دیا، جس سے صدر دروازے کے شمال میں مسجد کے لئے زمین کا ایک قطعہ خرید لیا گیا۔

۱۳۲۶ھ حیدرآباد اور بھوپال کے چندے میں اضافہ

حیدرآباد جس نے ایک زمانے میں علم و فن کی سرپرستی کرنے میں ہمارے قدیم سلاطین کی رسمِ کہن تازہ کردی تھی، ۱۳۰۵ھ میں دارالعلوم کی جانب متوجہ ہوا اور ابتداءً سو روپیہ ماہانہ چندے سے دارالعلوم کی امداد کا آغاز ہوا، گذشتہ سالوں میں اس پر ۲۵ روپیہ کا اضافہ ہوا، اور سالِ رواں میں یہ چندہ المضاعف ہوکر ۲۵۰ روپیہ ہوگیا

اسی طرح بھوپال کے چندے میں بھی معتدبہ اضافہ ہوا، بھوپال کا چندہ ابتداءً چھ سو روپیہ سالانہ تھا، اس میں پہلے ۲۰۰ روپیہ سالانہ کا اضافہ ہوا، مگر چند ہی مہینوں کے بعد رمضان ۱۳۲۷ھ سے اس کی تعداد تین ہزار روپیہ سالانہ کردی گئی۔

ایک مبصّر کا تبصرہ

مولوی رحیم بخش پریسیڈنٹ ریاست بھاول پور دارالعلوم کے خاص معاونین میں تھے، موصوف نے دارالعلوم کو دیکھ کر جو اظہارِ خیال فرمایا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اقتباس ذیل میں پیش کردیا جائے، موصوف لکھتے ہیں :-

"میں نے آج دیوبند کے عربی کالج کا معائنہ کیا اور جو کچھ میں نے دیکھا اس سے میں ہر طرح مطمئن ہوا، فی زمانہ ہندوستان میں بہت سے ایسے مدارس اور کالج موجود ہیں جن میں صرف عربی ہی پُرانے طریقے پر پڑھائی جاتی ہے لیکن بہت باتوں میں یہ کالج اپنا نظیر نہیں رکھتا، اس کے ثبوت میں میں چاہتا ہوں کہ اس کالج کی گذشتہ تاریخ پر ایک عمیق نظر ڈال کر اس کے متعلق چند مشہور واقعات کا بالاختصار بیان کردوں۔

یہ کالج ہندوستان کے بڑے حکماء اور مقدّس اشخاص کی کوششوں کا نتیجہ ہے، جس کا منشاء یہ ہے کہ خالص مذہب اہل السنّت والجماعت کے اُن اغراض و فوائد کو ہندوستان میں محفوظ و مصئون رکھے جن کی نسبت

سالہا سال سے داخلی اور خارجی طور پر زوال کا قوی اندیشہ تھا، جو مضامین اس کالج میں سکھلائے جاتے ہیں وہ متعدد اقسام اور مختلف انواع کے ہیں، کالج کی کل مدتِ تعلیم آٹھ سال کی رکھی گئی ہے، جس میں املا، صرف و نحو، عروض فلسفہ، منطق، تاریخ، کلام، فقہ، ریاضی، قانونِ شریعت، علم الٰہی اور ہر ایک خیالی و دماغی سائنس شامل ہیں، لیکن اگرچہ یہ سب علوم جو کالج کی روداد میں درج ہیں باہم نہایت مختلف ہیں، تاہم ان سب کا ایک خاص مقصد ہے جو سب میں اشتراک رکھتا ہے، یہ سب علوم عربی زبان میں سکھلائے جاتے ہیں جس کی بڑی غرض یہ ہے کہ طلباء کو کافی طور پر عربی کی استعداد حاصل ہو اور اس کے بعد وہ لوگ دماغی درس و تدریس، قانونِ شریعت اور مذہب میں قوت حاصل کریں، فی الواقع یہ علوم اس امر کے لئے ذریعہ ٹھہرائے گئے ہیں کہ مذہب۔ اسلام کے متعلق کامل درجے کی تعلیم ہو سکے، کیونکہ خالص مذہبی تعلیم ہی کی غرض سے اس کالج کی بنیاد قائم کی گئی ہے۔

ہندوستان میں اور کوئی ایسا خوش قسمت کالج نہیں ہے جس میں طالب علموں کی یہ کثرت اور تعلیم کی اس قدر عمدہ حالت ہو، جیسی کہ مدرسہ دیوبند میں دیکھی جاتی ہے، تمام واعظین اور پروفیسر ہندوستان کے مقدس اور دانا اہلِ اسلام میں سے ہیں، اور قدیم زمانے کی یادگار ہیں، ان لوگوں کی قابلیت مُسَلَّم اور مشہور رہے مذہبی معاملات میں ان کے فیصلے اور فتوے کو ہندوستان کے اندر اور باہر اہلِ اسلام کی بڑی تعداد بلا پس و پیش قبول کرتی ہے، ان لوگوں کی شہرت خصوصاً جناب مولانا محمود حسن کی صرف ہندوستان تک ہی محدود نہیں ہے منجملہ دیگر امور کے ایک یہ بھی سبب ہے جس نے اس کالج کو دنیا کے تمام حصوں کے اہلِ اسلام میں مشہور کر دیا ہے، فی الحال ۳۵۰ طلبا زیرِ تعلیم ہیں، جن میں سے

زیادہ تر بورڈنگ ہاؤس میں رہتے ہیں اور کالج ان کے خرچ کا متکفل ہے اور یہ خرچ اُس کی آمدنی کے لحاظ سے کچھ تھوڑا نہیں ہے، طلبا ہندوستان کے مختلف صوبہ جات اور دیگر ممالک سے جوق جوق آتے ہیں، یہ امر ظاہر کرتا ہے کہ کالج اُن کی ضروریات کو کافی ہے، اور یہ امر صرف ہندوستان کے مسلمانوں ہی کے واسطے باعثِ فخر نہیں ہے بلکہ سرکار انگریزی کے لئے بھی ہے کیونکہ ملک میں یہ مشہور اور فیض پہنچانے والا کالج ہے، اس کالج سے سند حاصل کرنے کے بعد جو طلبا نکلتے ہیں وہ اپنی جماعت یا گروہ میں نہایت وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، اور اعلیٰ درجے کا مرتبہ حاصل کر کے فوراً ہی اپنے پیرؤں کی ایک کثیر جماعت کے ہادی اور رہنما بن جاتے ہیں اور اُن کی رائے کو ہر مسلمان نہایت عزت و وقعت کے ساتھ سنتا ہے، اس طرح وہ بہت سی جماعتوں کو ایک ہی رائے پر لاسکتے ہیں، خود اُن کی ذات کے واسطے شاذ و نادر ہی روزی کی کمی پیش آتی ہوگی، یہ لوگ آسانی سے گورنمنٹ کے محکمۂ تعلیم میں داخل ہوسکتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بیان کر چکا ہوں اس مدرسہ کی تعلیم زمانۂ قدیم کے موافق مشرقی طور پر خالص مذہبی تعلیم ہے، عمارات صاف ستھری اور نہایت خوبصورت ہیں لیکن تعمیرات کے علاوہ اور ضروریات بھی ہیں اور کالج کو مزید امداد اور روپے کی سخت ضرورت ہے، تاکہ اُس کی حالت کو ضرورتِ موجودہ کے مطابق ترقی دی جاسکے، میں نہایت خوشی کے ساتھ مدرسہ کے چندہ دہندگان کی فہرست میں ایک ہزار روپیہ چندہ دے کر اپنے نام کا اضافہ کرتا ہوں۔

۱۳۲۷ھ مسجد کی تعمیر

دار العلوم کی مسجد کے لئے زمین کی خریداری کا ذکر ۱۳۲۵ھ کے حالات میں کیا جا چکا ہے، اس سال میں راندیر ضلع سورت

کے ایک مخیر تاجر حاجی غلام محمد اعظم صاحب نے مسجد کے مجوزہ تخمینے کے مطابق انیس ہزار روپے عطا فرمائے، ۲۴ ربیع الاول ۱۳۲۷ھ کو مسجد کا سنگِ بنیاد رکھا گیا، روداد میں سنگِ بنیاد کی تقریب کی نسبت تحریر ہے :۔

" طلباء کے عام مجمع میں بزرگانِ دین نے بنیاد رکھی، اور پھر ہر ایک طالب علم نے اپنے اپنے ہاتھ سے اینٹیں رکھیں اور نہ صرف اینٹیں رکھیں بلکہ اس دیوار کی کل بنیاد جو بہت ہی گہری تھی، طلباء نے خود اپنے ہاتھوں سے بھری، طلباء کے ساتھ کل مدرسین وارا کینِ مدرسہ نہایت ذوق وشوق سے خود اینٹیں اپنے سروں اور ہاتھوں پر لاتے تھے، اور بجائے معماروں کے تعمیر کرتے تھے حضرت مولانا حکیم مسعود احمد صاحبؒ خلف الصدق حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ، جناب مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری، حضرت مولانا محمود حسن صاحب صدر المدرسین اور حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب بھی دیگر طلباء کے ساتھ اینٹیں اور گارہ اٹھانے میں شریک تھے، سبحان اللہ! طلباء کا جوشِ مسرت کے ساتھ سنتِ خلیل اللّٰہی میں مشغول ہونا، اور ساتھ میں اشعارِ رجزیہ اور تعمیر بیت اللہ کے وقت کی حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی دعائیں پڑھنا عجیب مؤثر اور پُر جوش سماں تھا، شرقی دیوار کی بنیاد حضرت مولانا خلیل احمد صاحب وحضرت مولانا اشرف علی صاحب وحضرت حافظ قمر الدین صاحب وجناب مولانا احمد صاحب رامپوری ومولانا سعید الدین صاحب وجناب مولانا عبدالحق صاحب پورقاضوی وجناب مولانا ظہور علی صاحب وکیل سرکار بھوپال نے اپنے مبارک ہاتھوں سے رکھی، غرض کہ اس وقت بہت ہی اچھا مجمع علماء وصلحاء کا موجود تھا، والحمد للہ علیٰ ذٰلک "

مسجد کے دو درجے مسقّف ہیں، مشرقی بیرونی دیوار پتھر کی ہے جس میں نہایت نفیس نقش ونگار بنے ہوئے ہیں، مینار بھی منقّش پتھر کے بنائے گئے ہیں، صحن کے آخری حصے میں سنگین حوض ہے، اور کار پر سنگِ مرمر کا کتبہ نصب ہے، جس میں مندرجہ ذیل اشعار رشحۂ فکر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ کندہ ہیں :۔

در مدرسہ مسجدے بنا شد | ایں مژدہ ز دوستاں شنیدم
بر لوحِ جبینش اسمِ اعظم | خواندم چو بصحن او رسیدم
در سجدۂ شکر چوں فتادم | در گوش رسید ایں نشیدم
مقرون شدہ عبادت و علم | در مدرسہ خانقاہ دیدم

۱۳۲۸ھ

حضرت شاہ صاحبؒ اور حضرت مولانا مدنی مسندِ تدریس پر

حضرت العلامہ محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے جو سنینِ ماضیہ میں دارالعلوم سے فراغت حاصل کر چکے تھے، تدریس کے لئے اعزازی طور پر بلا معاوضہ اپنی خدمات چند سالوں کے واسطے پیش کیں، چنانچہ حسبِ خواہش دونوں حضرات کو تدریس کا کام سپرد کر دیا گیا، حضرت مولانا مدنی پچھلے چند سالوں میں حرمِ نبویؐ میں درس دے چکے تھے، جس نے حضرت ممدوح کی شخصیت کو بہت جلد چار چاند لگا دئے تھے۔

جمعیۃ الانصار کا قیام

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی تحریک پر ۲۷؍ رمضان المبارک ۱۳۲۷ھ کو "الانصار" کے نام سے فضلائے دارالعلوم کی ایک جمعیت کا قیام عمل میں آیا[1]، یہ جمعیت جن اغراض و مقاصد کے لئے قائم ہوئی ان میں سب سے اہم مقصد دارالعلوم کے اثرات کی اشاعت و ترویج اور ان کو ہمہ گیر بنانا تھا اس کے ساتھ مالی امداد و اعانت بھی اس کے مقاصد میں شامل تھی، ۱۳۲۹ھ میں جمعیۃ الانصار نے مؤتمر الانصار کے نام سے ایک عظیم الشان اجلاس مراد آباد میں منعقد کیا، اور زیادہ عرصہ نہ گذرنے پایا تھا کہ ملک میں جا بجا قاسم المعارف کے نام سے جمعیۃ الانصار کی شاخیں قائم ہو گئیں، جمعیۃ الانصار کے اغراض و مقاصد میں بتلایا گیا ہے کہ اس جمعیۃ کی غرض مدرسہ عالیہ

۱؎ تفصیل کے لئے دیکھئے روداد جمعیۃ الانصار ۱۳۲۷ھ، رفاہ عام پریس لاہور ص ۲ و ۳

دیوبند کے مقاصد کی تائید وحمایت اور اس کے پاک اثر کی ترویج واشاعت ہے، لکھا ہے کہ :-

"مدرسہ کے اثر کی ترویج واشاعت کلام اللہ اور احادیث رسولؐ کے صحیح معانی اور حضرت مولانا محمد قاسم قدس سرہٗ کی علمی تحقیقات ہیں، جن کی اشاعت کرنے اور اطرافِ عالم میں پہنچا دینے سے بہت سے کام بن سکتے ہیں، میرا خیال ہے کہ جو شکوک فلسفۂ جدیدہ سے اب پیدا ہو رہے ہیں ان کو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ نے عرصہ ہوا کہ رفع فرما دیا ہے، ہمارے لئے جدید کلام یہی ہے کہ ہم مولانا مرحوم کی تالیفات کو اسی نظر وتحقیق سے پڑھیں جیسے کہ فلسفۂ ومنطق کی کتابیں پڑھتے ہیں، یہ تجربہ ہے کہ جب مولانا مرحوم کی تحقیقات کو کبھی کسی فلسفی کے روبرو پیش کیا گیا تو اُس کا اطمینان ہو گیا اور مولانا مرحوم کی ہر بات اچھی طرح دل نشین ہو گئی، مولانا کی تحقیقات کے ذریعے سے خدمتِ اسلام کرنا جمیعت کا فرض ہوگا۔"[1]

اس کے علاوہ متعدد بڑے بڑے اور اہم علمی مقاصد جمیعۃ الانصار کے پیش نظر تھے جن کی تفصیل دارالعلوم اور خود جمیعت کی رودادوں میں مذکور ہے، مگر جمیعت کی عمر کا پیمانہ اتفاقاتِ زمانہ سے بہت جلد لبریز ہو گیا اور اس کا وہ خواب جو اُس نے دارالعلوم کی فلاح وترقی کی بابت دیکھا تھا شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

دستار بندی کا عظیم الشان جلسہ

فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی مدارسِ عربیہ کا قدیم معمول ہے، چنانچہ ابتدائی سالوں کے حالات میں جا بجا اس کا ذکر گذر چکا ہے، مگر ۱۳۰۱ھ کے بعد سے سلسلہ کچھ ایسے

---

[1] روداد دارالعلوم دیوبند ۱۳۲۰ھ، ص ۲۱

اتفاقات پیش آتے رہے کہ گذشتہ ۲۶ سالوں میں کوئی جلسہ نہ ہوسکا، اس سال میں گذشتہ سالوں کی تلافی کے طور پر ربیع الآخر کی ۶۔ ۷۔ ۸ تاریخوں میں نہایت عظیم الشان پیمانے پر جلسۂ دستار بندی منعقد کیا گیا، ہندوستان کے مدارس عربیہ کی تاریخ میں ایسے زبردست اجتماع کی نظیر بمشکل مل سکے گی، اس جلسے کی عظمت کا اندازہ صرف اس بات سے ہوسکتا ہے کہ اس میں باہر سے شریک ہونے والوں کی تعداد تیس ہزار سے اوپر تھی، جس میں ملک کے ہر خطے سے مسلمانوں کے ہر طبقے کے لوگ شریک تھے، قرب و جوار کے قصبات و دیہات سے پیدل آنے والوں کی تعداد اس میں شامل نہیں ہے، روداد میں مرقوم ہے کہ "جس کشادہ پیشانی اور مسرت کے ساتھ دور و نزدیک کے لوگ آکر جمع ہوئے اور جو اثرات اپنے دلوں میں لے گئے اس کی مثال بمشکل مل سکے گی، علماء اور رؤسا اور اعلیٰ عہدیدار سے لے کر ادنیٰ کاشتکار اور معمولی مزدور تک سب ایک ہی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے، کسی کو کسی پر فوقیت اور برتری کا خیال تک نہ تھا۔ جلسے میں سب کی نشست یکساں تھی، سب لوگ مواعظِ حسنہ سے محظوظ، پُر اثر نظارہ سے متاثر اور اس دل فریب منظر پر فریفتہ نظر آتے تھے، روحانی برکات و کرامات کا نزول بھی ایسا کھلا ہوا تھا کہ غیر حساس اشخاص تک اُسے محسوس کئے بغیر نہ رہ سکے!

جلسے کے دوران میں عجیب طرح کی اسلامی شان نمایاں تھی، دارالعلوم کی مغربی جانب تالاب کے کنارے دور تک خیموں کا طویل سلسلہ پھیلا ہوا تھا، نماز کے لئے خیموں کے سامنے میدان میں ہزارہا آدمیوں کی بڑی بڑی صفیں قائم ہوتی تھیں، راتوں کو ذکر و شغل کی آوازوں سے جنگل گونجتا تھا، ہر شخص کو برکت اور روحانی مسرت محسوس ہوتی تھی، جلسے کے ایام میں بعض صلحائے نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ اہل جلسہ سے مصافحہ فرما رہے ہیں، اس طرح کے بے شمار خواب جلسے سے قبل اور جلسے کے دوران میں لوگوں نے دیکھے، ایک بزرگ جو لوگوں سے بالکل الگ تھلگ رہتے تھے اور کسی سے بات کرنا پسند نہ کرتے تھے، جلسے سے قبل دیوبند آئے، جلسے کی ہر چیز کو بغور دیکھتے رہے، نہایت مستعدی سے ہر وقت چلتے پھرتے رہتے تھے اور جلسہ

ختم ہوتے ہی یہاں سے چلے گئے، لوگوں کا خیال ہے کہ یہ جلسے کی خدمت کے لئے روحانی طور پر مامور تھے۔"

اس اجتماع کی معمولی کرامت یہ بیان کی گئی ہے کہ اس قدر بڑے مجمع میں ایک بھی ناخوش گوار واقعہ پیش نہیں آیا، اور نہ کسی کو اپنے اموال کے نقصان یا چوری ہوجانے کی شکایت پیش آئی[۱]، کھانا ہر شخص کو بروقت مل جاتا تھا، جس کا منجانب دارالعلوم مفت انتظام تھا۔

اس جلسۂ دستاربندی کے زمانے میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ دارالعلوم کے مہتمم تھے، ممدوح نے اس موقع پر ایک طویل خطبہ "دارالعلوم کا زریں ماضی و مستقبل" کے عنوان سے تحریر فرمایا تھا، جس میں دارالعلوم کے قیام اور اس کی خدمات کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے، اور ۴۵ سال کے آمد و خرچ کا موازنہ کرتے ہوئے بتلایا گیا ہے کہ سب سے بڑی بات جس پر مدرسہ اسلامیہ دیوبند فخر کرے تو بجا نہیں یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کے روپے کو اچھی طرح ٹھکانے سے لگایا، تھوڑے خرچ میں وہ کام کر دکھایا جو دوسری جگہ دس گنا خرچ کرنے کے بعد بھی حاصل نہ ہوتا، خیال فرمائیے کہ اس ۴۵ سال کے عرصے میں مدرسے کے جملہ قسم کے مصارف کی میزان جس میں تعمیرات مدرسہ و مسجد و کتب خانہ، خرید کتب، انعام طلبہ سب ہی کچھ شامل ہے، مبلغ تین لاکھ تین سو تریپن روپے ہے، اس میں اگر اسّی ہزار روپیہ کو جو تعمیر میں صرف ہوئے علیحدہ کردیا جائے اور دس ہزار کتب کی قیمت جو تخمیناً بیس ہزار روپے ہے نکال دی جائے تو گویا تعلیم پر دو لاکھ روپیہ صرف ہوئے، اب ہم اس دو لاکھ کو ایک ہزار فیض یافتہ طلبہ پر تقسیم کرتے ہیں تو فی طالب علم دو سو روپیہ آتے ہیں، اللہ اکبر، کیا حوصلہ افزا نتیجہ ہے کہ صرف مبلغ دو سو روپیہ میں ایک مکمل عالم دین تیار کردیا جائے جو مدرس بھی ہو، مفتی بھی ہو، واعظ و خطیب بھی اور جامع منقول و

---

[۱] لوگ اپنے ٹرنکوں کو کھلا چھوڑ کر قیام گاہوں سے باہر چلے جاتے تھے، کارکن جو ڈیوٹی پر ہوتے وہ پورے احساس ذمہ داری سے اپنے فرض کو انجام دیتے تھے۔

معقول بھی ہو۔ یہ ہے واقعی کامیابی، لیکن اگر اس کے ساتھ یہ بھی دیکھا جائے کہ اس مقدار سے صرف ایک ہزار عالم ہی تیار نہیں ہوئے بلکہ کئی سو حافظ قرآن بھی اسی صرف میں تیار ہوئے ہیں، صدہا طلبہ نے فن تجوید و قرأت بھی حاصل کیا ہے، ہزارہا مستفیتوں کو اسی صرف میں سے ہر وقت جواب بھی ملتے رہے ہیں، بہت سے طلبہ جو تھوڑا سا فائدہ حاصل کر کے قبل از تکمیل چلے گئے وہ بھی اسی میں ہیں، صدہا باشندگان دیوبند نے اسی صرفہ میں فارسی و ریاضی کی تعلیم بھی پائی ہے تو خرچ کا اوسط اور بھی گھٹ جاتا ہے[1]۔

۱۳۲۸ھ، مطبخ کا اجراء دارالعلوم کے آغاز سے اب تک بیرونی طلبہ کے کھانے کا انتظام یہ تھا کہ کچھ طلبہ کا کھانا شہر میں مقرر ہو جاتا تھا، اہل شہر حسب مقدرت ایک ایک دو دو طالب علموں کے کھانے کی کفالت کرتے تھے، کچھ طلبہ کو دارالعلوم سے خورد و نوش کے لئے نقد وظیفہ دیا جاتا تھا، جس سے اُن کو بطور خود اپنے کھانے کا انتظام کرنا پڑتا تھا، یہ دوسری صورت طلبہ کے لئے بہت زیادہ تکلیف دہ اور پریشان کن تھی، اس لئے عرصے سے یہ ضرورت بشدّت محسوس کی جا رہی تھی کہ طلبہ کو نقد وظائف کے بجائے پکا ہوا کھانا دیا جائے، اس سلسلے میں گذشتہ چند سالوں سے قرب و جوار کے اضلاع سے غلّہ بھی بطور چندہ آنے لگا تھا، چنانچہ محرم ۱۳۲۸ھ سے مطبخ کا افتتاح کیا گیا، مطبخ کے قیام سے نہ صرف اُن طلبہ کو سہولت ہو گئی جن کو نقد وظیفہ ملتا تھا بلکہ جو طلبہ اپنے خورد و نوش کی خود کفالت کرتے تھے اُن کے لئے بھی یہ آسانی ہو گئی کہ وہ بسہولت مطبخ سے قیمتاً اپنے کھانے کا انتظام کر لیں، جہاں سے اُن کو نہایت کفایت اور عمدگی سے مقررہ وقت پر کھانا دستیاب ہو جاتا تھا۔

شعبۂ تبلیغ کا قیام قیام دارالعلوم کے مقاصد میں ایک اہم مقصد اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور تحفّظ و دفاع کا کام بھی شامل تھا، چنانچہ شروع ہی سے

---

[1] مدارس اسلامی عربی دیوبند کا زرّیں ماضی و مستقبل صہ ۳۰

اس پر عمل بھی جاری تھا، مگر اب تک یہ کام رسمی قیود وضوابط سے آزاد تھا، اور اس کا دائرہ صرف مسلمانوں میں اقدامی تبلیغ کی حد تک محدود تھا، دارالعلوم کے اساتذہ اور طلباء حسب ضرورت اور تا بحدِ استطاعت بطور خود یہ خدمت انجام دیتے تھے، ۱۳۲۵ھ میں جب آریہ سماج کی غیر معمولی جارحانہ سرگرمیاں بڑھ گئیں تو ضرورت ہوئی کہ تبلیغ کے لئے ایک مستقل شعبہ قائم کر کے تبلیغ کے دائرے کو اس کی ضروری حد تک وسیع کر دیا جائے، اس کے علاوہ دارالعلوم میں بھی ایسے طلباء تیار کئے جائیں، جو وعظ و پند کے علاوہ تقریر و مناظرہ میں معترضین و مخالفین کا کما حقہٗ مقابلہ کر سکیں، چنانچہ اس کے لئے مختلف مذاہب سے واقفیت بہم پہنچانے کے لئے شعبۂ تبلیغ کا اجراء عمل میں لایا گیا، اور ایک مدت تک اس میں سنسکرت کے بعض فضلاء بطور معلم کے رکھے گئے۔

۲۹۔ ۱۳۳۰ھ، دارالحدیث کی تعمیر

جس طرح دارالعلوم دیوبند کو یہ شرف داعیانہ حاصل ہے کہ ہندوستان بھر میں یہ پہلی درسگاہ ہے جو عین زوالِ علم کے وقت مسلمانوں کے عام چندے سے قائم ہوئی، اسی طرح اس کو یہ تقدم و فضیلت بھی حاصل ہے کہ دارالعلوم کا دارالحدیث، ہندوستان میں پہلی عمارت ہے جو اس نام سے عالم وجود میں آئی، اس میں شک نہیں کہ اسلامی عہد کے ہندوستان میں جابجا مدارس موجود تھے، اور ایک ایک ذرہ علم کی روشنی سے منور تھا، لیکن مدارس کی اس کثرت و بہتات کے باوجود ہندوستان میں کوئی عمارت دارالحدیث کے نام سے اس سے پیشتر نہیں بنی۔ ہندوستان کی سرزمین پر یہ پہلا موقع تھا کہ دارالحدیث کے نام سے ایک بڑی عمارت بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔

دارالعلوم میں دارالحدیث کا سنگِ بنیاد رکھنے کی تقریب میں ۲۰ ربیع الآخر ۱۳۳۰ھ کو ایک عام جلسہ منعقد کیا گیا، جس میں ملک کے مختلف مقامات کے لوگوں نے کثرت سے شرکت کی، طلبہ نے باصرار مزدوروں کے بجائے نہایت ذوق و شوق کے ساتھ والہانہ انداز میں خود بنیاد کھودی، حضرت تھانوی، حضرت شیخ الہند، حضرت مولانا خلیل احمد اور حضرت مولانا عبدالرحیم

نور اللہ مرقدہم نے سنگِ بنیاد رکھا، حضرت تھانویؒ نے مجمع سے فرمایا کہ "سب صاحب ایک ایک دو دو اینٹ اپنے ہاتھ سے رکھدیں، نہ معلوم حق تعالیٰ کے یہاں کس کا خلوص قبول ہو جائے" چنانچہ تمام شرکائے جلسہ نے دو دو اینٹیں رکھیں۔

بنیاد دارالحدیث میں طلباء کی مخلصانہ ہمت

دارالحدیث کے لئے بنیاد تیار کرنے میں طلباء نے جس مخلصانہ ہمت و محبت اور جوشِ عمل کا مظاہرہ کیا وہ طلباء کی زندگی کا ایک ایسا واقعہ ہے جسے بھلایا نہیں جا سکتا، اس سال کی روداد میں مذکور ہے کہ "جلسہ دارالحدیث کے دن سنگِ بنیاد تو رکھ دیا گیا تھا مگر بنیاد تعمیر کرنے کے لئے پہلے کنکریٹ کٹوانا ضروری تھا، اس کے علاوہ کسی قدر بنیاد بھی کھدنی باقی رہ گئی تھی، ابھی کنکریٹ ڈال کر کوٹنا ہی شروع کیا گیا تھا کہ زور و شور کی ایک طوفانی بارش ہو گئی اور قریبی تالاب پانی سے بھر گیا، حتیٰ کہ دارالحدیث کی بنیادیں تک پانی سے لبریز ہو گئیں، یہ قطعۂ زمین تالاب ہی کا ایک حصہ تھا، جو ۱۳۲۰ھ میں اٹوایا گیا تھا، مٹی چونکہ ابھی پختہ نہ ہوئی تھی اس لئے گر گئی، اور بنیاد کا حال دلدل کا سا ہو گیا، اس کے علاوہ درسگاہوں تک پانی کے پہنچ جانے سے عمارتوں کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا، ادھر تو یہ حالت تھی اور ادھر مزدور بالکل نہیں ملتے تھے، بارش کے تواتر سے یہ احتمال بھی نہ تھا کہ پانی دو چار روز میں خشک ہو جائے گا، ڈال لگوا کر پانی نکلوانا شروع کیا، مگر سارے دن میں بہت تھوڑا سا پانی نکل سکا، بالآخر نمازِ عصر کے بعد طلباء نے کمرِ ہمت باندھی، بالٹیاں لے کر کھڑے ہو گئے اور ایک گھنٹے میں تمام پانی نکال کر تالاب میں ڈال دیا، پانی نکل جانے پر معلوم ہوا کہ ابھی ایک سخت مرحلہ باقی ہے، بنیاد میں نصف قدِ آدم دلدل ہو گئی تھی، اس موقع پر مدرسین و طلباء کی محنت و جانفشانی کا منظر قابلِ دید تھا، کئی سو طلباء لگے ہوئے تھے اور قطاریں بنا کر آناً فاناً میں گارے کی بالٹیاں بھر بھر کر تالاب میں پہنچا رہے تھے، رجزیہ اشعار پڑھتے جاتے تھے، اور ہر ایک، دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی سعی میں لگا ہوا تھا، اس مقابلے اور مسابقت میں اور بھی لطف تھا، طلباء نے دو جماعتیں بنا کر کام کو

نصف نصف تقسیم کرلیا تھا، جو کام مہینے بھر میں مزدوروں سے ہونا مشکل تھا وہ طلباء نے دو دن میں کردیا، کنکریٹ کی کٹائی میں بھی طلباء نے حصّہ لیا، یہ کام بھی تنہا معماروں اور مزدوروں سے شاید ایک ماہ میں بھی ختم نہ ہوتا، لیکن طلباء نے اس جدوجہد سے کنکریٹ، اینٹ اور چونا موقع پر پہنچایا کہ ایک ہفتے میں بنیادیں اوپر آگئیں، الغرض جیسی مقدس اور متبرک تعمیر تھی ویسے ہی مخلص ہاتھوں سے بنیاد تعمیر ہوئی اور طلباء کی یہ آرزو کہ "دارالحدیث کی بنیاد ہم کھودیں گے" اب مع شئے زائد پوری ہوگئی "۔

عالم اسلام میں ماضی میں جو دارالحدیث بنائے گئے اُن کے بنانے والے سلاطین اور فرماں روا تھے، اس دارالحدیث کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تعمیر میں غریب عوام کا ہاتھ کارفرما رہا ہے، اور اُنھیں کی معمولی معمولی امدادوں سے یہ عظیم الشان عمارت عالم وجود میں آئی ہے۔

بارگاہِ نبوّت میں دارالحدیث کی مقبولیت

دارالحدیث کی تعمیر سے قبل مختلف حضرات نے عالم خواب میں دیکھا کہ موقع تعمیرِ دارالحدیث پر دارالعلوم کے اکابر مرحومین جمع ہیں اور خود اپنے ہاتھوں سے سامان تعمیر اٹھا اٹھا کر لارہے ہیں اور تعمیر میں مصروف ہیں، اسی زمانے میں ریاست ٹونک میں سرونج کے رہنے والے ایک صاحب سید یوسف علی ٹونک میں دارالحدیث کے لئے چندہ جمع کررہے تھے، انھوں نے ایک نہایت مبارک خواب دیکھا، جو اُنہی کے الفاظ میں درج ذیل ہے، موصوف لکھتے ہیں:-

"گذشتہ نصف شب کے بعد میں نے بعالم خواب دیکھا کہ میں بسواری ریل ٹونک جارہا ہوں، ایک کفِ دست ریگستانی مقام میں یکایک ریل ٹھہر گئی، ایک شخص میرے پاس آئے اور کہا اترو! حضور اقدس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہاں تشریف فرما ہیں، میں بکمالِ شوق اُن کے ہمراہ ہوگیا، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک جگہ چند مکان سرکی کے اور دو تین خیمے ایستادہ ہیں۔ میں پہلے سرکی والے مکان میں گیا، وہاں چند

حضرات تشریف فرما تھے، اُن میں سے ایک صاحب نے جو کسی قدر فربہ اندام اور کچھ سیاہ فام تھے، پیشانی پر سجدہ کا نشان تھا، کرتہ کی گھنڈی کھُلی ہوئی تھی اور چند مجلد چرمی کتابیں اُن کے پاس رکھی ہوئی تھیں[1]، مجھ سے فرمایا کہ "اول حضور اقدس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں جاؤ!" میں نے عرض کیا کہ کیا حضور مجھ کو خیمے کے اندر بلوائیں گے؟ فرمایا "ہاں!" میں سلام کرکے خیمۂ مبارک پر پہنچا، دروازہ پر یاد نہیں کہ پردہ تھا یا نہیں، مجھ کو باریابی نصیب ہوئی، حضور نے مسکرا کر میری جانب دستِ مبارک بڑھائے۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر دستِ مبارک کو بوسہ دیا اور روتا رہا، بیٹھنے کا حکم صادر ہوا، میں بیٹھ گیا، ہنس کر فرمایا تم نے کس قدر چندہ وصول کیا ہے؟ میں نے عرض کیا ۶۲ روپیہ، ارشاد ہوا، سرونج کا اہتمام زکریا کے ذمے ہے! میں نے عرض کیا وہ میرا بھائی ہے، فرمایا کہ اس اہتمام کا بار زکریا کو لینا چاہیئے، پھر ارشاد ہوا کچھ پڑھو! میں نے سورۂ فاتحہ سُنائی، فرمایا کہ قرآن شریف صحیح پڑھا کرو۔!

حضور کے قریب دو صاحب اور تھے، ایک پورے قد آور جوان، خوبصورت چہرہ، سرخ و سپید رنگ، داڑھی سینہ تک، بال سیاہ و سفید، دوسرے صاحب لانبے، لاغر جسم، ان کا پورا حلیہ یاد نہیں رہا۔"

اس خواب کو نقل کرکے موصوف لکھتے ہیں کہ:-

"قبل ازیں مجھ کو دو مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی لیکن خاص صورت مبارک میں اس مرتبہ کی زیارت چندہ دارالحدیث کے ساتھ جس کی بابت میں کوشاں ہوں خاص ہے[2]

---

[1] یہ حلیہ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کی تصریح کے مطابق، حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ پر منطبق ہے ملاحظہ ہو رسالہ القاسم ص ۲ بابتہ ذی قعدہ ۱۳۲۹ھ — [2] ایضاً

علامہ سید رشید رضا کا ورودِ دار العلوم

علامہ سید رشید رضا مرحوم دنیائے اسلام کے منتخب و متبحر عالم، نامور اہلِ قلم، مصر کے مشہور علمی رسالہ "المنار" کے ایڈیٹر اور یگانۂ روزگار مصنف تھے، ان کو مصر کے مشہور رہنما مفتی محمد عبدہ سے شرفِ تلمذ حاصل تھا، اور جو فکرِ اجتہاد، دقیقہ رسی اور بالغ نظری مفتی محمد عبدہ کی خصوصیت تھی اس کا بڑا حصہ سید رشید رضا کے حصے میں آیا تھا، موصوف جب ۱۳۳۰ھ میں ہندوستان آئے تو دار العلوم کی جانب سے اُنھیں دار العلوم میں آنے کی دعوت دی گئی، علامہ مرحوم نے دار العلوم میں تشریف لا کر اس کی علمی خدمات، درس کی مابہ الامتیاز خصوصیات، اس کے مذہبی مسلک اور علم و فکر کی مضبوط بنیادوں کو دیکھ کر انتہائی حیرت اور مسرت کا اظہار کیا، اس موقع پر حضرت علامہ محمد انور شاہ صاحبؒ نے عربی زبان میں ایک طویل تقریر فرمائی تھی، جس میں علمائے دیوبند کے علمی مسلک اور اُن کی علمی خدمات کی وضاحت کی گئی تھی۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ نے عربی سپاس نامہ پیش کیا جس میں دار العلوم کی تاریخ اور جماعتِ دار العلوم کے فقہی مسلک کا تعارف کرایا گیا تھا، سید صاحبؒ نے اپنی جوابی تقریر میں فرمایا کہ "جو عظیم الشان اور گراں بہا خدمات آپ علم اور دین کی انجام دے رہے ہیں اُن کے لحاظ سے آپ میرے اور تمام مسلمانوں کے شکریے کے مستحق ہیں، مجھے اس دار العلوم کو دیکھ کر بڑی مسرت حاصل ہوئی، میں آپ حضرات کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر میں دار العلوم دیوبند کو نہ دیکھتا تو میں ہندوستان سے نہایت غمگین واپس جاتا، سید صاحب کے خاص الفاظ یہ تھے، لَوْلَمْ أَرَهَا لَرَجَعْتُ مِنَ الْهِنْدِ حَزِيْنًا!

اس مدرسہ کی نسبت میں نے اب تک جو کچھ سُنا تھا اس سے بہت زیادہ پایا، استاذِ جلیل مولانا انور شاہ صاحب نے جو اصول بیان کئے ہیں اور اپنے مشائخ کا جو مسلک مجھے بتلایا ہے، میں اسے پسند کرتا ہوں اور اس سے متفق ہوں، فقہ حنفی بلاشبہ کافی

روانی ہے۔"

علمائے دارالعلوم کی سادہ زندگی اور اُن کی علمی خدمات سے سید صاحب بہت متاثر ہوئے، اس کا اندازہ اُن کی اُس رائے سے ہوتا ہے جو انھوں نے مفتاح کنوزالسنۃ کے دیباچہ میں ظاہر کی ہے، فرماتے ہیں :۔

"اگر ہمارے بھائی ہندوستانی علماء کی توجہ اس زمانے میں علم الحدیث کی طرف مبذول نہ ہوتی تو مشرقی ممالک سے یہ علم ختم ہو چکا ہوتا، کیوں کہ مصر، شام، عراق اور حجاز میں دسویں صدی ہجری سے چودھویں صدی کے اوائل تک یہ علم ضعف کی آخری منزل پر پہنچ گیا تھا۔"[1]

انجمن ہلال احمر کی امداد میں دارالعلوم کی مساعیٔ حسنہ

خلافتِ عثمانیہ کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کو جو تعلق اور اخلاص رہا ہے، اس کے بیان کی یہاں چنداں ضرورت نہیں ہے، خلافت کے وجود سے اسلام کی عزت اور قبلتین کی حفاظت و خدمت گذاری کا انتظام وابستہ تھا، سلطنتِ عثمانیہ کا کسی ایسے سخت نرغے میں پھنس جانا جس سے اس کی عظمت و شوکت میں فرق آجانے کا اندیشہ ہو، یا حرمین شریفین کی حُرمت معرضِ خطر میں پڑ جائے، عالم اسلامی کو جس قدر بے چین اور مضطرب بنا سکتا تھا وہ ظاہر ہے، مسلمانوں کے دلوں سے طرابلس کے حوادث کے زخم ابھی مندمل نہ ہونے پائے تھے کہ بلقان کی خوں چکاں جنگ نے دنیا کے سامنے دوسرا قیامت خیز منظر پیش کر دیا، اخبارات کے ذریعے سے جب ترکی کے مظلومین و مجروحین اور مہاجرین کے ناقابلِ برداشت اور اندوہناک حوادث و مصائب کا علم ہوا کہ کیوں کر ہزارہا مسلمان مرد و عورت، بچے اور بوڑھے، سردی اور فاقے اور دوسرے گوناگوں مظالم و مصائب

---

[1] مقدمہ مفتاح کنوزالسنۃ صفحہ "ق"

کا شکار ہو رہے ہیں تو عالمِ اسلامی میں بالعموم سخت اضطراب اور بے چینی پھیل گئی، مسلمان جہاں جہاں اور جس ملک میں تھے اُن میں بے کس و مظلوم مسلمانوں کی اس حالت سے ہمدردی اور حمیتِ اسلامی کا جوش پیدا ہو گیا، اُنھوں نے اپنی امکانی کوشش سے مجروح و جلا وطن اور فاقہ کش و آفت رسیدہ مسلمانوں کی امداد و اعانت کا بیڑا اٹھایا، ہندوستان کے مسلمان اس میں پیش پیش تھے، یہاں اس خدمت کو دارالعلوم نے اپنی مخصوص روایت کے مطابق انجام دیا لاکھوں کی تعداد میں فتاویٰ اور اشتہار چھپوا کر ملک کے گوشے گوشے میں پہنچائے، اساتذہ اور طلبا نے ملک کے اطراف و جوانب میں دورے کر کے عام جلسوں میں اس کی اہمیت بیان کی اور امدادی تحریک کو پورے ہندوستان میں پھیلا دیا، جگہ جگہ "انجمن ہلالِ احمر" کی امداد و اعانت کے لئے انجمنیں قائم ہو گئیں، جن کے ذریعے سے لاکھوں روپیہ چندہ کر کے بھیجا گیا، اس کے علاوہ خود طلبا نے اپنی حمیتِ ملّی اور جوشِ عمل کا یہ ثبوت دیا کہ ۱۲۹۳ھ و ۱۲۹۴ھ کی طرح سالانہ انعام میں ملنے والی کتابوں کی پوری رقم ہلالِ احمر کو نذر کر دی اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کیا کہ ضروری استعمال کی اشیا تک چندہ میں دے ڈالیں، اس روپیہ کے علاوہ جوان حضرات کی کوششوں سے ملک کے مختلف مقامات سے چندہ کر کے بھیجا گیا، خود اُن کے ذاتی چندوں اور دوسرے عطیوں سے ۶۵ ہزار کی گراں قدر رقم دارالعلوم کے ذریعے سے روانہ کی گئی۔

۱۳۳۱ھ، مجلّہ القاسم

علمائے دیوبند کے علوم و معارف اور مضامین عام مسلمانوں تک پہنچانے اور عوام الناس کو دین کے صحیح عقائد و مسائل سے باخبر کرنے کے لئے ۱۳۲۸ھ میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ اور دیگر اکابر علما کی زیرِ نگرانی بانیٔ دارالعلوم کے نام پر "القاسم" کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا گیا، "القاسم" علمی اور تاریخی مضامین کی اشاعت کے علاوہ دارالعلوم کے مقاصد اور اس کی دینی و علمی خدمات سے بھی عام مسلمانوں کو روشناس کرانے کا ایک بڑا ذریعہ تھا، اس لئے اس کا اجرا، دارالعلوم ہی کی جانب سے ہونا چاہئے تھا، مگر ابتدائی مصارف سے دارالعلوم کو

بچانے کے لئے حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اس کو اپنے ذاتی مصارف پر اس وقت تک چلاتے رہے جب تک اس کی مالی حالت قابلِ اطمینان نہیں ہو گئی، "القاسم" جس وقت جاری ہوا اُس وقت دیوبند میں طباعت کا کوئی انتظام نہ تھا، چنانچہ ابتدائی پرچہ احمدی پریس علی گڈھ میں چھپوایا گیا[1]، لیکن جب رفتہ رفتہ ان مشکلات پر قابو حاصل ہو گیا اور "القاسم" خود اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا تو اس کا تعلق دارالعلوم سے کر دیا گیا۔

یوں تو "القاسم" میں شائع ہونے والا ہر مضمون بجائے خود نہایت مفید، پُراز معلومات اور اہم ہوتا تھا مگر حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحبؒ کا ایک مخصوص عنوان "دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا؟" "القاسم" کے مضامین میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے، اس عنوان کے تحت مضامین کا ایک طویل سلسلہ برسہا برس تک "القاسم" میں جاری رہا جو حضرت ممدوح کی وفات کے بعد "اشاعتِ اسلامؒ" کے نام سے کتابی شکل میں چھپ گیا ہے، اس کی افادیت اور قبول عام کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ناتمام ہونے کے باوجود اب تک متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

ہلالِ احمر کے چندے کا اثر دارالعلوم پر

سال گذشتہ میں دارالعلوم نے اپنے آپ کو نظر انداز کر کے ترکی کے مظلوم مسلمانوں کے لئے چندہ بھجوانے میں جو جد و جہد کی تھی اس کا اثر دارالعلوم کی مالیات پر پڑنا لازمی تھا، چنانچہ سال رواں میں سات آٹھ مہینے سخت مشکلات اور ابتلاو آزمائش میں گذرے مگر الحمد للہ اس کے بعد حالت بدل گئی اور ختم سال پر گو آمدنی مصارف کے مقابلے میں کم رہی مگر تاہم دارالعلوم کے کسی کام میں رکاوٹ پیش نہیں آئی، دولتِ آصفیہ سے اب تک ڈھائی

---

[1] یہ مطبع مولانا رشید احمد انبہٹوی کا تھا، جو حضرت مولانا خلیل احمد انبہٹویؒ محدث سہارنپوری کے حقیقی بھائی تھے۔

سو روپے ماہانہ آتے تھے، مگر اس سال کے رمضان المبارک سے یہ مقدار دو نی کر کے پانچ سو کر دی گئی۔

۱۳۳۲ھ، اجمالی حالات

حسب سابق دارالعلوم کے تمام شعبہ جات تعلیم، انتظام جلسہ، کتب خانہ، مطبخ، تعمیر وغیرہ کا نظام حُسن اسلوبی کے ساتھ قدیم طریقے پر جاری رہا، ہر چند معمولی موانع رفتار ترقی میں سدِّ راہ ہوئے، مگر بحمد اللہ دارالعلوم کی فطری قوت اور طبعی سلامتی سب پر غالب رہی، باعتبار آمد و صرف اور بلحاظ نتائج امتحان وغیرہ یہ سال بہ نسبت سالہائے گذشتہ بہت اچھا رہا۔

۱۳۲۸ھ میں بہت ہی مختصر پیمانہ پر مطبخ کا اجراء عمل میں آیا تھا، مگر طلباء کی روز افزوں کثرت نے اس میں اس قدر وسعت اختیار کی کہ اس سال میں مطبخ کے لئے ایک مستقل وسیع عملہ رکھنا پڑا۔

الرشید کا اجراء

سال گذشتہ "القاسم" کا تعلق براہ راست دارالعلوم سے کر دیا گیا تھا، اس سال میں حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی یادگار کے طور پر ایک دوسرے رسالہ کا اجراء "الرشید" کے نام سے عمل میں آیا، چونکہ "القاسم" کے معاونین کا حلقہ وسیع ہو چکا تھا، اس لئے "الرشید" کو شروع ہی سے دارالعلوم کے تحت نکالا گیا، اس سال کی روداد میں "القاسم" اور "الرشید" کی افادیت اور مضامین کے معیار کا تذکرہ مندرجہ ذیل، الفاظ میں کیا گیا ہے، جس سے فی الجملہ ان رسالوں کی علمی اور دینی حیثیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"القاسم" اور "الرشید" نے مسلمانوں کی جس قدر علمی خدمات انجام دی ہیں اور جس طرح صاف معلومات کے ذخائر بہم پہنچائے ہیں اور ہر ایک مسئلہ میں خواہ کسی علم کا ہو صحیح و بے لوث لکھا ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لئے مجلدات سنین سابقہ موجود ہیں، جس کا دل چاہے بنظر غور دیکھے اور اس کے ساتھ ان موقت الشیوع رسالوں کو بھی دیکھے جو علمی ہیں یا تاریخی و ادبی، انشاء اللہ روز روشن کی طرح وہ فرق جو ان دونوں رسالوں اور اُن رسائل میں ہے واضح ہو جائے گا،

ان دونوں رسالوں میں جس مضمون کے اوپر قلم اٹھایا گیا ہے خواہ کسی فن میں ہو محققانہ طرز کے ساتھ سلف کے ادب و شان اور ان کو واجب التعظیم، قابلِ اقتدار و تقلید سمجھنے کے ساتھ اٹھایا گیا ہے، ارتقاء زمانہ کی طرح یہ نہیں ہوا کہ مجتہدین کرجس کی نسبت جو چاہا لکھ دیا، یا جس مسئلہ میں جو چاہے رائے قائم کرلی، ادبیات و تاریخیات میں یہ التزام رکھا گیا ہے کہ ہر واقعہ معیار تاریخ پر جنچا تلا ہوا ہے، اسی کے ساتھ وہ نتائج و ثمرات دکھلائے گئے جن کو دیکھ کر قوم بڑے بڑے فوائد اپنی معاشرت و تمدن اور تدین و مذہب میں حاصل کرسکتی ہے۔

پھر یہ بھی کچھ کم تعجب انگیز امر نہیں کہ باوجود ہر قسم کے مسائل کے تحریر مضامین میں نہایت سلامت و اعتدال کا طریقہ قائم رکھا گیا ہے، بحمد اللہ کسی معترض کو اس کی گنجائش نہیں دی گئی کہ اس پر بے جا طور سے نکتہ چینی کرسکے اور یہ بھی نوبت شاید نہ آئی اور آئی بھی ہو تو بہت ہی شاذ کہ کسی کو خواہ مخواہ ہی الجھنے کا موقع ملا ہو"

جبۂ نبوی کا غلاف قسطنطنیہ میں دولت عثمانیہ کے زمانے سے شاہی خزانے میں بعض آثار نبویہ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار، جھنڈا اور جبۂ مبارک محفوظ ہیں، یہ آثار دسویں صدی ہجری کے اوائل میں آخری عباسی خلیفہ المتوکل علی اللہ نے سلطان سلیم اول کو تفویضِ خلافت کے وقت سپرد کئے تھے، سلاطین عثمانیہ ان آثار نبویہ کو بطور سندِ استحقاقِ خلافت اپنے پاس محفوظ رکھتے تھے، جبۂ مبارک پر حفاظت کی غرض سے مہین کپڑے کا غلاف رکھ دیا جاتا ہے، جس میں سے جبۂ مبارک صاف نظر آتا ہے، دولت عثمانیہ کے سفیر کا بیان ہے کہ زیارت کے وقت جبۂ مبارک کی عظمت کا بڑا لحاظ رکھا جاتا ہے، اور کوئی شخص خواہ وہ کسی درجے کا ہو یہ جرأت نہیں کرسکتا تھا کہ خاص جبۂ مبارک کو ہاتھ لگائے یا بوسہ دے، جو لوگ زیارت کرتے اور بوسہ دیتے ہیں اُن کا عمل اسی باریک غلاف تک محدود رہتا ہے، عثمانی سلاطین کا سقوطِ خلافت تک یہ معمول تھا کہ وہ اعیان و ارکان دولت کے ساتھ سال بھر میں ایک دفعہ ۱۵ رمضان المبارک کو آثارِ نبویہ کی زیارت کیا کرتے تھے،

جبۂ مبارک پر جو غلاف رکھا جاتا تھا وہ کبھی کبھی خاص خاص لوگوں کو سلطان المعظم کی جانب سے تبرک کا ہدیہ کر دیا جاتا تھا، یہ غلاف اس وجہ سے کہ جبۂ مبارک کو مس کئے ہوئے رہا ہے جس قدر متبرک اور موجب خیر و برکت ہے وہ ظاہر ہے۔

اب یہ جبۂ مبارک استنبول کے ایک شاہی قصر "توپ کاپی" میں رکھا ہوا ہے، اس قصر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد یادگاریں محفوظ ہیں، اس قصر کو سلطان محمد فاتح نے ۸۶۳ھ ۱۴۵۸ء میں تعمیر کرایا تھا، ایک عرصے تک یہ محل ترک سلاطین کا قصر خلافت رہا، بعد میں اسے میوزیم کی شکل دے دی گئی، توپ کاپی (TOP KAPI) ترکی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنی ہیں "توپ کا دروازہ"۔

توپ کاپی کے میوزیم میں متعدد ہال ہیں، ایک ہال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو تلواریں چاندی کے ایک صندوق میں رکھی ہوئی ہیں، یہیں سونے کے دو صندوق ہیں، ایک میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک اور مہر ہے جو عقیق کو تراش کر بنائی گئی ہے مہر گلابی رنگ کے عقیق کی ہے اور بیضوی شکل میں ہے، اور دوسرے میں آپؐ کا ایک جھنڈا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جبۂ مبارک اور مکتوب گرامی سونے کے فریم میں لگا ہوا ہے، یہ وہ نامۂ مبارک ہے جسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مصر کے حاکم مُقَوقس کے نام ارسال فرمایا تھا[ل]، یہ نامۂ مبارک آثار قدیمہ کے ایک فرانسیسی ماہر بارتھلمی (BORTHLAMY) کو مصر میں ۱۸۵۰ء میں دستیاب ہوا تھا، فرانسیسی عالم نے اس مکتوب گرامی کو سلطان عبد المجید خاں (۱۲۵۵ھ ۱۸۳۹ء، ۱۲۷۷ھ ۱۸۶۱ء) کی خدمت میں پیش کیا، سلطان معظم نے لے طلائی صندوق میں محفوظ کرا کر توپ کاپی میں رکھوا دیا تھا۔

توپ کاپی کے اس حصے میں جہاں یہ تبرکات رکھے ہوئے ہیں دروازے پر چار

ل اس مکتوب نبوی کی تفصیل کے لئے راقم سطور کی کتاب مکتوبات نبوی (اردو) سے مراجعت کی جائے۔

زبانوں ترکی، جرمنی، انگریزی اور فرانسیسی میں مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہوئی ہے:-

"گذشتہ سینکڑوں برسوں سے مسلمانوں کے نزدیک اس مقام کی مذہبی اہمیت اور بڑی قدر ہے، اس میں جتنے آثار رکھے ہوئے ہیں سب مقدس اور قابلِ احترام ہیں۔

آپ سے امید ہے کہ آپ اس مقدس جگہ پر خاموشی، متانت اور سنجیدگی کو ملحوظ رکھیں گے اور اس بابرکت جگہ پر کوئی نامناسب بات نہ کریں گے"[۱]

دارالعلوم نے جنگِ بلقان کے زمانے میں ترک مجروحین و مہاجرین کی انجمن ہلالِ احمر کے ذریعے ہندوستان میں قابلِ قدر امدادی خدمات انجام دی تھیں (جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے) اُن سے سلطان محمد پنجم (۱۳۲۴ھ / ۱۹۰۸ء، ۱۳۳۶ھ / ۱۹۱۸ء) بہت متأثر ہوئے تھے، چنانچہ سلطان المعظم نے اپنے اس تأثر کا اظہار اس طرح فرمایا کہ دولتِ عثمانیہ کا سب سے بڑا متبرک ہدیہ یعنی جبۂ مبارک کا غلاف دارالعلوم کو عطا فرمایا، خالد خلیل بک دولتِ عثمانیہ کے سفیر مقیم بمبئی ۱۶ ربیع الاول ۱۳۳۲ھ کو دیوبند تشریف لائے اور سلطان المعظم کی جانب سے یہ متبرک ہدیہ پیش کیا۔[۲]

---

[۱] مجلۃ العربی الکویت بابت جنوری ۱۹۶۸ء

[۲] یہ ہدیۂ خیر و برکت دارالعلوم کے موجودہ کتب خانہ کی عمارت میں خلیل خالد بک نے میرے والد ماجدؒ کے سامنے بہت ادب کے ساتھ پیش کیا، یہ احقر بھی وہاں موجود تھا، اور اس کی وہی تفصیل بیان کی جو متن کتاب میں آپ پڑھ چکے ہیں، اس وقت کلکتہ کے ایک بڑے تاجر حاجی محمد یعقوب صاحب مرحوم بھی سفیر ترکی کے ساتھ معائنہ دارالعلوم میں موجود تھے، انھوں نے والد ماجدؒ سے فرمایا کہ اس مقدس ہدیہ کے لئے ایک قیمتی بکس بنوا کر بھیجنے کی مجھے اجازت مرحمت فرمائی جاوے، جو بہت خوشی سے دے دی گئی، چنانچہ اُسی بکس میں جس کا ڈھکن بلّوری شیشہ کا ہے یہ ہدیۂ مبارک رکھا ہوا ہے اور وقتاً فوقتاً اہم واردین و صادرین کو اس کی زیارت کرائی جاتی ہے۔ محمد طیب غفرلہٗ

یہ غلاف رومال کی شکل میں ہے، کپڑا سفید، نہایت نفیس اور خوش وضع ہے، وسط میں جلی قلم سے سیاہ حروف میں یہ شعر لکھا ہوا ہے ؎

نُورُالْهُدٰی بِلَنَا بِہٖ تَکْرِیْمًا　　　صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا

کناروں پر ترکی زبان کے شعر لکھے ہوئے ہیں۔

یہ ذخیرۂ خیر و برکت دارالعلوم کے خزانے میں ایک نہایت خوبصورت چوبی بکس میں رکھا ہوا ہے، اور جس روز سے دارالعلوم میں آیا ہے اکثر و بیشتر اس کے یُمن و برکات کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے[1]

ڈھاکہ کے لئے وفد کی روانگی

ڈھاکہ کے رئیس نواب سلیم اللہ خاں صاحب کو قومی اور اسلامی کاموں سے بڑا شغف تھا، موصوف دارالعلوم کی امداد و اعانت میں بڑی بڑی رقموں سے بیش از بیش حصہ لیتے تھے، ۱۳۲۲ھ میں جب دارالحدیث کی تعمیر و تکمیل کے لئے چندے کی اپیل کی گئی تو موصوف نے بڑی گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم کیا اور اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ اس سلسلے میں دارالعلوم کا ایک وفد ڈھاکہ آنا چاہیے، دارالعلوم کی پچاس سالہ تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ملک کے ایک بڑے رئیس کی جانب سے اس قسم کی دعوت دی گئی، دارالعلوم میں اب تک وفود کے بھیجنے کا کوئی خاص اہتمام نہ تھا اور بالخصوص امراء و رؤسا کی بارگاہوں سے تو مصلحتاً اجتناب ہی برتا جاتا تھا، مگر نواب صاحب کے دینی کاموں میں خلوص کے ساتھ حصہ لینے، قومی ہمدردی اور اسلامی کاموں سے شغف اور دل سوزی کے باعث اُن کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے وفد کی روانگی کا فیصلہ کیا گیا۔

۷ ر جمادی الاولیٰ کو دارالعلوم کے اراکین و اساتذہ کا ایک وفد مہتمم صاحب کی زیر سرکردگی

---

[1] روداد ۱۳۲۲ھ ص ۲۹، ۳۰

ڈھاکہ روانہ ہوگیا، نواب صاحب نے اراکینِ ریاست اور اپنے اعزّہ کے ساتھ اسٹیشن پر استقبال کیا، اور وفد کی شایانِ شان اس کی مدارات و تواضع میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا کئی روز تک ڈھاکہ میں جلسے ہوتے رہے، حضرت شاہ صاحبؒ، حضرت مولانا مدنیؒ، علامہ عثمانیؒ اور مولانا مرتضیٰ حسنؒ نے وعظ و تقریریں فرمائیں، نواب صاحب نے افتتاحی تقریر میں بتلایا کہ:۔

"میں زمانۂ دراز سے دارالعلوم دیوبند کا دلی خادم ہوں اور ہر وقت یہی خیال رہتا ہے کہ اس کی ترقی کی کوشش کروں اور دارالعلوم کی بہبودی کے ذرائع نکالوں، چنانچہ اس وقت بھی کہ یہ خیر مقدم کا موقع ہے میں چاہتا ہوں کہ کچھ ہدیہ پیش کروں اور امید کرتا ہوں کہ دارالعلوم کے واسطے آپ اس ناچیز ہدیہ کو قبول فرمائیں گے، ہر چند یہ محقّر نذر اس لائق نہیں کہ اس عظیم الشان کام کے لئے جس کا آپ حضرات نے ذمّہ لیا ہے کچھ بھی کفایت کرسکے، تاہم امید کرتا ہوں کہ اس قلیل مقدار کو قبول فرماکر سرفرازی بخشیں گے۔"

نواب صاحب نے اپنی اور اپنے خاندان کی جانب سے تیرہ ہزار روپے کی رقم دارالحدیث کی تعمیر کے لئے عطا فرمائی اور مزید رقم آئندہ باقساط بھیجنے کا وعدہ کیا، ساتھ ہی دارالحدیث کی تکمیل کے لئے جس کی لاگت کا اندازہ ایک لاکھ روپے تھا نواب صاحب نے ایک کمیٹی بنائی، اور وفد کو یقین دلایا کہ تعمیر کا کام شروع کردیا جائے، کمیٹی حسب ضرورت چندے کے ذریعے روپیہ بہم پہنچاتی رہے گی[1]

۱۳۳۳ھ، تنخواہوں میں اضافہ

تنخواہوں کے بارے میں دارالعلوم کا طرز ابتدائے تاسیس سے نہایت سادہ رہا ہے

---

[1] وفد ڈھاکہ کے حالات روداد ۱۳۳۲ھ اور القاسم بابت ماہ جمادی الآخر و رجب ۱۳۳۲ھ میں بتفصیل مذکور ہیں۔

شان ونمود کے لئے گراں قدر مشاہرے مقرر کرنا کبھی پسند نہیں کیا گیا، اسی کے ساتھ خود دارالعلوم کے اساتذہ اور کارکنوں نے بھی تنخواہ کی نسبت ہمیشہ یہ بات ملحوظ رکھی ہے کہ وہ دارالعلوم پر صرف اسی قدر تنخواہ کا بار ڈالیں جس میں سادہ معاشرت اور قناعت وکفایت کے ساتھ گذر بسر کیا جاسکے، چنانچہ سب سے پہلے صدر المدرسین حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا مشاہرہ صرف چالیس ۴۰ روپیہ ماہانہ تھا، چنانچہ روداد میں مذکور ہے کہ :۔

"دارالعلوم میں مشاہروں کی مقدار اُس کی عظمت وشان اور مدرسین کے کمال وشہرت نیز اُن کی کفایت مایحتاج، ہر ایک کے لحاظ سے ہمیشہ کم رہی ہے، مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کو بایں عظمت وکمال صرف چالیس روپیہ ملتے تھے مولانا سیّد احمد صاحب کو ۳۵ روپیہ، دارالعلوم کی شان اور ان حضرات کی وقعت وعظمت کو خیال کرکے ان مشاہروں کو خیال کرلیا جائے، جس تنگی اور عسرت کے ساتھ یہ بزرگوار ان مشاہروں میں گزر اوقات کرتے تھے اس کا حال سب پر واضح ہے اور ہم نے خود مشاہدہ کیا ہے، یہ بزرگوار دیوبند سے باہر جانا گوارہ فرماتے تو کس منصب پر اور کتنے مشاہرے پر تشریف لے جاتے اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ مولانا محمد یعقوب صاحب کو بھوپال بلایا گیا تھا، آپ نے انکار فرمادیا، لیکن مولانا سید احمد صاحب بھوپال تشریف لے گئے تو تقریباً ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار مقرر ہوئے۔"

(روداد ۱۳۳۴ھ ص ۳۸)

لیکن اسی کے ساتھ دارالعلوم نے بھی کبھی یہ پسند نہیں کیا کہ اس کے کارکن معاشی پریشانیوں میں سرگرداں رہیں اور اُن کا فراغ خاطر مفقود ہوجائے، چنانچہ جب کبھی ایسی صورت پیش آئی تو دارالعلوم نے اس پر فوری توجہ کی اور بروقت مشاہروں میں حالاتِ زمانہ کے لحاظ سے

اضافہ کرکے اپنے کارکنوں کے لئے سکونِ خاطر اور اطمینانِ قلب کے ساتھ کام کرنے کا موقع بہم پہنچایا، چنانچہ سالِ رواں میں صدر المدرسین کا مشاہرہ پچاس روپے کے بجائے پچھتّر کیا گیا اور اسی نسبت سے دوسرے کارکنوں کی تنخواہوں میں اضافہ عمل میں آیا۔

ریلوے اسٹیشن پر مسجد کی تعمیر دیوبند میں دارالعلوم کی مرکزیت کی وجہ سے مسلمانوں اور اہلِ علم کی بکثرت آمد و رفت رہتی ہے، جس کا ذریعہ اُس وقت صرف ریلوے تھی، پختہ سڑک بہت بعد میں تعمیر ہوئی ہے، اسٹیشن پر مسجد نہ ہونے کے سبب سے سخت دقت پیش آتی تھی، دیوبند کے بعض حضرات نے متعدد مرتبہ مسجد کی تعمیر کا ارادہ کیا، یہاں تک کہ تعمیر کے ابتدائی مراحل بھی طے ہوگئے، مگر ہر مرتبہ کچھ ایسے مواقع پیش آتے رہے کہ تعمیر شروع نہ ہو سکی، قدرت کی جانب سے یہ سعادت دہلی کے تین صاحب خیر اور حقیقی بھائی شیخ محمد ابراہیم، شیخ محمد یعقوب اور شیخ محمد یٰسین صاحبان کے لئے مقدر ہو چکی تھی، ان حضرات کی توجہ اور سرمایہ سے اسٹیشن پر ایک خوشنما مسجد تعمیر ہوگئی، مسجد کا احاطہ کافی وسیع ہے، گرد اگرد پختہ چہار دیواری ہے، جس میں پُر فضا باغیچہ لگا ہوا ہے، امام و مؤذن کے لئے کمرہ ہے، احاطہ کے باہر مسجد کے مصارف کے لئے چند دکانیں بھی بنائی گئی ہیں، پانچ ہزار روپے مسجد کی تعمیر پر صرف ہوئے[1] یہ مسجد دارالعلوم کے زیرِ انتظام ہے۔

گورنر یوپی کا ورود دارالعلوم کی تاریخ میں اس سال دوسری مرتبہ صوبۂ متحدہ کے گورنر نے اس کا معائنہ کیا، پہلا موقع دس سال قبل حضرت گنگوہیؒ کی حیات میں ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء میں پیش آیا تھا، اس مرتبہ دعوت دینے کا ایک خاص سبب یہ تھا کہ جس جگہ دارالحدیث

---

[1] شیخ محمد یعقوب مرحوم "ماہنامہ شمع" دہلی کے مالک حافظ محمد یوسف صاحب کے والد ماجد تھے، شیخ محمد ابراہیم حافظ صاحب کے تائے اور شیخ محمد یٰسین چچا تھے، ان حضرات نے اپنی مرحومہ والدہ ماجدہ (اہلیہ حاجی عبدالرحمٰن) کے ایصالِ ثواب کے لئے یہ مسجد تعمیر کرائی ہے۔

کی تعمیر ہونے والی تھی، وہاں سے ایک برساتی نالہ گذرتا تھا، اس کے ہٹائے جانے کی کوشش تو مدت سے جاری تھی مگر قرب وجوار کی زمین کے نشیب وفراز کے سبب سے اس سلسلے میں کچھ ایسی دشواریاں حائل تھیں کہ سرکاری منظوری کے باوجود نالہ ہٹایا نہیں جا سکا تھا، اس کام کی تکمیل کے لئے صوبائی حکومت کی اجازت کے ساتھ اُس کی اعانت کی بھی ضرورت تھی، اسی بنا پر حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ مہتمم دارالعلوم کا عرصے سے خیال تھا کہ صوبہ کے گورنر کو دعوت دی جائے، سر جیمس مسٹن اس وقت صوبہ متحدہ کے گورنر تھے، یکم مارچ ۱۳۳۳ھ ۱۹۱۵ء کو دیوبند آئے، جلسہ خیر مقدم میں ہز آنر کو جو سپاس نامہ دیا گیا اس میں دارالعلوم کے نصب العین اصول تعلیم، طرزِ عمل، طلباء کی ضروریات کی تکمیل اور نمود ونمائش سے احتراز، اساتذہ وطلباء کی سادہ زندگی اور دارالعلوم کی تدریجی ترقی اور مستقبل کے عزائم کو وضاحت سے بیان کیا گیا تھا۔

دارالعلوم کو دیکھ کر سر جیمس مسٹن کے قلب میں اس کی عظمت کا جو گہرا نقش قائم ہوا اس کا اظہار انھوں نے اپنی مندرجہ ذیل اردو تقریر میں اس طرح کیا:۔

"عرصے سے میری تمنا یہ تھی کہ یہاں آکر بچشم خود اس مشہور مدرسہ کو دیکھوں اور اس کے ذی علم مدرسوں سے تعارف وملاقات کا مجھ کو موقع ملے، میری اس آرزو کی متعدد وجوہ ہیں، اولاً ایسے علمائے متبحر کی جو بلا امیدِ نفع دنیوی تعلیم و تدریس میں مصروف رہتے ہیں، تعظیم وتکریم جو فطرتاً ہر تعلیم یافتہ شخص کے دل میں جاگزیں ہونی چاہئے، دوم وہ فخر ومباہات جو ان صوبوں کے ہر باشندے کو اس مدرسہ کی وجہ سے کرنا چاہئے، جس کی شہرت تمام ممالک ایشیا اور اسلامی یورپ میں پھیلی ہوئی ہے، اور ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ میں تہہ دل سے اس کی قدر ومنزلت کرتا ہوں کہ آپ نہایت ثابت قدمی سے محض مذہبی درس و تدریس میں مشغول رہتے ہیں، میں تہ دل سے آپ کا ممنون ہوں کہ آپنے

اپنا مشہور و معروف مدرسہ مجھ کو دکھلایا اور اپنے کام اور مقاصد اصلی کے کچھ کچھ حالات معلوم کرنے کا مجھ کو موقع دیا۔

آج کل دنیا کے لوگوں کا میلان تین امور ناقص کی طرف ہے، اول یہ کہ لوگ بلا لحاظ عقبیٰ کی راحتِ دائمی کے رات دن دولتِ دنیا کے حصول کی سعی کرتے رہتے ہیں اور اسی ادنیٰ کام میں اپنی عقل و شعور کو جو ہمارے خالقِ اکبر نے بہتر مقاصد کے لئے ہم کو عطا فرمایا ہے صرف کر دیتے ہیں، دوسرا امر یہ ہے کہ لوگ ظاہری زیب و زینت اور نام و نمود کی طرف مائل رہتے ہیں اور روحانی و باطنی برکات و ترقیات حاصل کرنے کے لئے جو سچی اور واقعی نعمتیں ہیں کوئی حصہ اپنے وقت کا باقی نہیں رکھتے، تیسرا امر یہ ہے کہ لوگ مذہب کے پردے میں تعصب کا برتاؤ کرتے ہیں اور باہمی نزاع و نفاق پھیلاتے ہیں، بجائے اس کے کہ مذہبی پند و تعلیم سے یہ بات ذہن نشین کریں کہ خداوندِ عالم کی نظر میں اس کے سب بندے یکساں ہیں، اور سب کو باہم دگر انکسار و درگزر کا سلوک اور اس قول پر عمل کرنا چاہیئے ؎

شناسند بیگانہ را ہمچو خویش — رہِ آشتی راگیرند پیش

آپ نے ایڈریس کے اس فقرے میں جو سب سے زیادہ مؤثر ہے، یہ تحریر کیا ہے کہ آپ ان تینوں ناقص امور سے اجتناب کُلّی رکھتے ہیں اور مجھ کو یقین کامل ہے کہ اس طرح آپ اپنے طلبار کی ایسی تعلیم و تربیت کر رہے ہیں جو دنیا و عقبیٰ دونوں جگہ اُن کی راحت و خوشی کا باعث ہوگی۔

اگرچہ آپ کی قوم پر تکلیف و مایوسی کا زمانہ گذر رہا ہے مگر آپ اس کو ہمیشہ عاقلانہ وعظ و پند کی روشنی دکھلاتے رہتے ہیں، اور سچے مذہب کی تعلیم سے اس حالت افسردگی میں تسکین و تسلی دیتے رہتے ہیں، اس طرح اُن کی

تکلیفیں جاتی رہیں گی" اس موقع پر میں خود تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں کسی دنیوی طریقے سے آپ کی امداد و اعانت کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ یہ شاید آپ کو ناگوار گذرے لیکن آپ خوب جانتے ہیں کہ اگر آپ کی طرف سے کبھی امداد کی خواہش کی جائے گی تو میں کامل طور پر اور بکشادہ دلی اُس کے پورا کرنے کی سعی کروں گا، اور اس کو اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا، آج تو میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں آپ کی مہمان نوازی کا بہت شکر گذار ہوں، اور میرے دل میں آپ کے کام کی نہایت عظمت و توقیر ہے، اور میں خدا سے یہ دعا کرتا ہوں کہ آپ کو ہر قسم کے امور دینی و دنیوی میں ترقی حاصل ہو۔"

۱۳۴۴ھ، حیدر آباد کے عطیہ میں اضافہ اس سال پھر حیدر آباد کے ماہانہ عطیے میں مزید اضافہ ہوا، اب تک حیدر آباد سے دارالعلوم کے لئے پانچ سو روپیہ ماہانہ آتے تھے، اس سال میں بسعی حضرت مہتمم صاحب ان پر تین سو روپے کا اضافہ ہو کر آٹھ سو روپے ماہانہ ہو گئے، اور پھر چند ہی سال بعد ۱۳۴۵ھ میں ایک ہزار کر دیئے گئے، جو ریاست حیدر آباد کے سقوط تک جاری رہے، ان اضافوں کی کامیاب سعی سے جب بھی حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ مہتمم دارالعلوم حیدر آباد سے دیوبند پہنچتے تھے تو دارالعلوم کی طرف سے اُن کا شاندار خیر مقدم کیا جاتا، تہنیتی جلسے ہوتے اور اس میں تبریکی نظمیں پڑھی جاتی تھیں، چنانچہ آخر کے اضافہ پر حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ، حضرت مولانا عبد السمیع صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم نے (جو اُس وقت طالب علمی کے دور میں تھے) اپنے اپنے بلیغ قصائد سُنائے۔

اُس زمانے میں سلطنتِ آصفیہ کے جود و کرم سے ہندوستان کی تمام اسلامی درسگاہیں علی العموم سیرابی حاصل کرتی رہی ہیں، حکومتِ آصفیہ جس طرح دارالعلوم دیوبند، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور دوسرے بہت سے مسلم اداروں کی نہایت فیاضی کے ساتھ مدد کرتی تھی، اسی طرح

بنارس ہندو یونیورسٹی اور شانتی نکیتن وغیرہ ہندو ادارے بھی ماضی میں اس کی علمی فیاضیوں سے مستفید ہوتے رہے ہیں۔

دار العلوم کی غیر معمولی ترقی

دار العلوم نے روز اول سے ترقی کی جانب جو قدم بڑھایا تھا اس میں سال بسال اضافہ ہوتا رہا، اس سال کے حالات میں لکھا ہے :-

"آخری دس سال کے اندر مدرسہ عالیہ دیوبند کا طول وعرض ہر حیثیت سے سہ چند و چہار چند ہو گیا، اگر اس کے ہر ہر شعبہ پر نظر ڈالی جائے اور موجودہ حالت کا آج سے دس سال قبل کی حالت سے موازنہ کیا جائے تو وضاحتاً معلوم ہوتا ہے کہ بعض امور میں سہ چند ترقی کر گیا ہے اور بعض میں چہار چند، مثلاً رجوع طلبار، تعداد مدرسین، تعمیرات، کتب خانہ، مجموعی آمد وصرف چنانچہ آخر کے چند سالوں کی نسبت کو دیکھنے سے اُن کے رجوع کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے، ۱۳۲۶ھ کے آخر میں درجۂ عربی کے طلبار کی تعداد ۱۶۹ تھی، اور اب سات برس کے بعد چار سو سے زائد ہے، طلبار کے رجوع و ہجوم سے مدرسہ کے ہر شعبہ کو وسعت دینا لازم ہو گیا تعمیرات کے لحاظ سے، اس لئے کہ بہت سی جماعتوں میں ۵۰ - ۶۰ - ۸۰ تک طلبار ہوتے ہیں، اسی طرح کتب خانہ کی توسیع لازمی ہو گئی، چنانچہ بحمد اللہ ہر چیز میں اسی نسبت سے وسعت ہوتی گئی، کتب خانہ وسیع بنایا گیا جو با وجود وسعت کے اب پھر تنگ ہو رہا ہے، درس گاہیں بنائی گئیں اور اسی سلسلے میں دار الحدیث کی عمارت تجویز ہوئی"

۱۳۳۶,۳۵ھ، تعلیمی کیفیت

روداد میں ہے کہ ۱۳۳۵ھ کا تعلیمی سال شروع ہونے پر غیر معمولی طور سے طلبار کا رجوع و ہجوم ہوا، اتنی کثرت طلبار کی گذشتہ کسی سال میں نہیں ہوئی، بالخصوص اوپر کے درجوں میں مستعد اور شائق طلبار کی بہت زیادہ کثرت ہوئی، دورۂ حدیث کی جماعت میں اس قدر طلبا کسی زمانے میں نہیں ہوئے تھے، ترمذی شریف، اور مسلم شریف میں طلبار کی تعداد ۹۰ تک پہنچ گئی تعلیم نہایت اطمینان وسکون

اور پابندی و التزام سے جاری ہے، ہر ایک انتظام اپنے اپنے موقع پر مکمل نظر آتا تھا، دارالعلوم کی یہ حالت دیکھ کر بے اختیار خداوند عالم کا شکر ادا ہوتا ہے کہ اس نے علوم دین کی اس بے قدری کے زمانے میں دارالعلوم کو ایسی مقبولیت و شہرت نصیب فرمائی اور مسلمانوں میں علوم دین کی تحصیل کا ایسا ذوق و شوق پیدا فرما دیا کہ دنیا کی دولت و عزت کو پس پشت ڈال کر اسلام کی ترقی، مسلمانوں کی رہنمائی اور تعلیم کی اشاعت میں اپنی عمریں بسر کرنا چاہتے ہیں اور کسی سے صلہ و ستائش کے طالب نہیں بلکہ اس کے برعکس ہدفِ ملامت بن کر ہمہ تن اس کی طرف متوجہ ہیں۔

لیکن عین اس وقت جب کہ تعلیم پورے شباب پر ہو رہی تھی دیوبند میں وبائی امراض نمودار ہوئے اور چند طلباء مرض کا شکار ہو گئے، اگرچہ طلباء میں تشویش اور پریشانی ضرور پیدا ہو گئی مگر تعلیم کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ لیکن جب مرض کی شدت بہت بڑھ گئی تو دارالعلوم میں مجبوراً تعطیل کرنی پڑی، مدرسین میں سے اکثر موسمی امراض میں مبتلا ہوئے، کئی مہینے تک دارالعلوم بالکل بند رہا، یہ ناگہانی افتاد ایسی تھی جس سے باوجود انتظامِ تعلیم کے مکمل ہو جانے اور کارِ تعلیم کے اعلیٰ پیمانے پر جاری ہونے کے حرج واقع ہوا، لیکن بحمداللہ بالآخر سابقہ حالت عود کر آئی، مدرسین و طلباء ہمت کے ساتھ کام میں مصروف رہے اور پوری جدوجہد سے تیاری کرتے رہے خداوندِ عالم کے فضل و کرم اور مدرسین و طلباء کی مستعدی سے یقین کامل تھا کہ جو حرج باسبابِ خاص ظہور ہوا ہے اس کی تلافی باحسن وجوہ ہو جائے گی، چنانچہ جب تعلیمی سال کے ختم پر سالانہ امتحان ہوا تو ۷۷۵ طلباء میں ۱۵۵ حاضر اور شریکِ امتحان ہوئے، ۲۶ غیر حاضر اور بیمار تھے، حاضرین میں باوجود حرج شدید کے صرف چھ طلباء ناکام رہے اور ۵۴۵ نے کامیابی کے نمبر حاصل کئے، یعنی کامیابی کا اوسط فی صدی تقریباً ۹۹ ½ رہا جو کامیابی کا اعلیٰ ترین درجہ شمار ہوتا ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری

گذشتہ سال کے آخر میں حضرت شیخ الہندؒ حج کے لئے تشریف لے گئے تھے، فراغت حج کے بعد کچھ مدت حرمین شریفین میں قیام کا ارادہ تھا، قیام میں ایک خاص مصلحت بھی پیش نظر تھی جس کی تفصیل آگے آتی ہے، چنانچہ آپ نے ۱۳۳۴ھ کا پورا سال حرمین شریفین کے قیام میں گذارا، اوائل ۱۳۳۵ھ میں واپسی متوقع تھی کہ اچانک معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہندؒ کو برطانوی گورنمنٹ نے شریف حسین کے ذریعے سے گرفتار کرا کر اولاً قاہرہ اور پھر مالٹا بھیجدیا ہے، اس افسوسناک حادثے سے ہندوستان کے مسلمانوں کو اور دارالعلوم اور حضرت کے متوسلین کو خصوصاً قلق و اضطراب کا ہونا لازمی تھا، دارالعلوم اور عام مسلمانوں کی جانب سے حضرت کی رہائی کے لئے ہر ممکن سعی کی گئی اور کوئی مؤثر طریقہ اٹھا نہیں رکھا گیا مگر بے نتیجہ رہا۔ ۶ر نومبر ۱۹۱۷ء کو علمائے دارالعلوم کا ایک مقتدر وفد بسرکردگی حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم، صوبہ متحدہ کے گورنر سے ملا، تحریری عرضداشت پیش کی مگر سوائے زبانی ہمدردی کے اظہار کے آخر تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا، اور حضرتؒ کو تقریباً سوا تین سال مالٹا میں جنگی قیدیوں کے ساتھ نظر بند رکھا گیا۔

حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری کا سبب اُن کا وہ جنگی منصوبہ تھا جو انھوں نے ہندوستان سے برطانوی حکومت کو ختم کرنے کے لئے بنایا تھا، یہ ایک منظم منصوبہ تھا جس کی شاخیں ہندوستان سے باہر تک پھیلی ہوئی تھیں، منصوبہ یہ تھا کہ جرمنی، ترکی اور افغانستان سے مدد لے کر ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر آزاد قبائل کے ذریعے سے انگریزوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی جائے، اور اسی کے ساتھ ہندوستان میں عام بغاوت برپا کرادی جائے، اس وقت چونکہ برطانیہ کی ساری فوجی طاقت جرمنی اور ترکی کے مقابلے میں مصروف جنگ تھی اس لئے بیرونی حملے اور اندرونی بغاوت پر انگریزوں کے لئے قابو پانا مشکل ہو جائے گا، اور انھیں ہندوستان چھوڑ دینے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ اس منصوبے کی تفصیلات باب پنجم میں پیش کی جائیں گی۔

رسالہ سیر دار العلوم

دہلی کے مشہور مخیر رئیس حاجی بخش الٰہی صاحب اور ان کا خاندان دار العلوم کے خصوصی اعانت فرمانے والوں میں تھے، موصوف ہمیشہ بڑی بڑی رقموں سے دار العلوم کی اعانت میں حصہ لیتے تھے، ۱۳۳۵ھ میں ممدوح نے اپنے فرزند حاجی محمد رفیع صاحب کو دار العلوم دیکھنے کے لئے دیوبند بھیجا، موصوف نے دار العلوم میں قیام فرما کر نہایت دیدہ وری کے ساتھ ایک ایک چیز کا معائنہ کیا۔ اور دہلی پہنچکر اپنے مشاہدات کو "دار العلوم دیوبند کی سیر" کے عنوان سے قلم بند کر کے خود شائع کیا، یہ رسالہ بڑی تقطیع کے ۴۲ صفحات پر مشتمل ہے، دار العلوم کے ہر ایک شعبے، اس کے نظام، کارکنان و مدرسین اور ارکانِ انتظامیہ کا ذکر نہایت جامعیت اور مؤثر طریقے سے بیان کیا ہے، طلبار کی نسبت لکھا ہے کہ:-

"شعبان کا مہینہ تھا، میں نے دیکھا کہ سالانہ امتحان ہو رہا ہے، وہاں کی نگرانی اور انتظام اور امتحان کا منظر دیکھ کر میرے دل میں بڑے بڑے شاہان اسلام کا فوٹو کھنچ گیا، حقیقت میں ان ہی حضرات کی ہمت اور برکت ہے کہ ایسی بڑی جماعت کا اتنا باقاعدہ انتظام اور اہتمام کر رکھا ہے، طلبار کے شوق و رغبت کا یہ حال تھا کہ آدھی آدھی اور ساری رات اُن کو کتاب دیکھنے اور تکرار و مطالعہ کرتے ہوئے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، یہ اساتذہ کی محنت اور خوبیٔ تعلیم کا اثر ہے، جب میں طلبہ کی محنت کا یہ حال دیکھتا تھا تو مجھ کو ان بیچارے غریب و مسکین لوگوں پر بڑا رحم آتا تھا، جنھوں نے اپنے گھربار کو چھوڑا اپنے عزیز و اقارب کی مفارقت کو گوارا کیا، اور دور دراز سے سفر کی زحمتیں اٹھائیں اور اس ناداری کی حالت میں ایسی ایسی سخت محنتیں کرتے ہیں، اور اپنے عیش و آرام کو خاک میں ملا دیتے ہیں۔

طلبار کی جماعت میں ایک طالب علم مولوی عبدالغفور صاحب کو دیکھا جو شریف الطبع شہر مُوصَل (عراق) کے رہنے والے دیوبند میں محض تحصیل علوم کی غرض سے تشریف فرما

ہیں، میں نے یہ بھی سُنا کہ آپ پہلے شافعی المذہب تھے، مگر اپنی خوشی اور دلی رغبت سے باوجود یکہ اساتذہ دارالعلوم نے منع کیا، لیکن انھوں نے بطیبِ خاطر حنفیت اختیار کر لی۔

غرض کہ وہاں روس، چین، بلخ و بخارا، کابل، روم، شام اور عرب و عجم، ہر ملک اور ہر شہر کا طالب موجود ہے، اس وقت تک ایک ہزار سے زائد عالم دارالعلوم سے بالکل فارغ التحصیل ہو کر اطرافِ ملک میں پھیل چکے ہیں، اور نہیں معلوم کہ ابھی کس قدر اور وہاں سے نکل کر اُمّت کے لئے باعثِ ہدایت بنیں گے، کیوں کہ میں دیکھتا ہوں کہ ہندوستان کے اکثر حصّوں میں جس درس گاہ اور انجمن یا مدرسہ اور مکتب میں کسی ذی استعداد عالم کی ضرورت ہوتی ہے تو دارالعلوم ہی سے بلایا جاتا ہے اور وہیں کے تعلیم یافتہ عالم اور مدرس یہ قابلیت رکھتے ہیں کہ ہر قسم کی کتابیں بخوبی پڑھا سکیں، چنانچہ مجھ کو بھی جب اپنے بچے کی تعلیم و تربیت کا خیال ہوا تو دارالعلوم ہی سے ایک سعید و صالح نوجوان عالم مولوی قاری محمد یوسف صاحب کو بلایا، اور میں کہیں بھی یہاں کیا، جس بڑے شہر مثلاً کلکتہ، بمبئی، کانپور، الہ آباد، بنارس، دہلی، آگرہ، میرٹھ، بریلی جس جگہ بھی آپ دیکھیں گے آپ کو دارالعلوم ہی کے اکثر فیض یافتہ مسندِ درس پر بیٹھے ہوئے انشاء اللہ تعالیٰ ملیں گے۔

حسابات کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"مجھ کو وہاں کی بعض باتوں پر نہایت حیرت اور تعجب ہوتا ہے اور عقل دنگ رہجاتی ہے، مثلاً دارالعلوم جیسے بڑے علمی مرکز کہ جکی نظیر ہندوستان کے سوا دور، دور نہیں ہے، اس کا مدار زیادہ تر عام چندہ پر ہے، اور چون برس سے نہایت خوبی کے ساتھ اسلام کی نمایاں خدمت کر رہا ہے، وہاں کا حساب، کتاب اس قدر صاف اور سچا ہے کہ جس کی نظیر بہت کم ملے گی، جس کا جی چاہے وہاں سے روداد طلب کر کے اپنا اطمینان کلی کر سکتا ہے ہر رجسٹر وہاں کا اتنا باقاعدہ ہے کہ ابتدائی مدرسے سے آج تک جس تاریخ

کا حساب آپ دیکھنا چاہیں برابر دیکھ سکتے ہیں، میری نظر سے بہت سی انجمنوں، مدرسوں اور دفتروں کے حساب کتاب گذرے لیکن اتنا صاف اور سچا حساب میرے دیکھنے میں نہیں آیا، اور حق یہ ہے کہ یہ ان حضرات کے خلوص اور دیانت داری کا نتیجہ ہے، جن کو یقین نہ ہو وہ انصاف پسندی سے وہاں جاکر اس کے نمایاں اثر کو دیکھ سکتے ہیں، اور کیا عجب ہے کہ ان حضرات کا خلوص اور دیانت ہی دارالعلوم کی ترقی کا سبب بنا رہا ہو۔

(دارالعلوم دیوبند کی سیر ص ۴۔ ۶)

اُس دور کی علمی خصوصیات اور روحانی و عرفانی کیفیات کے بارے میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رح دیوبندی ثم کراچوی رقم طراز ہیں کہ:۔

"اُس وقت دارالعلوم دیوبند ائمہ فن علماء اور اولیاء و اتقیاء کا ایک بے مثال گہوارہ تھا، ایک طرف نمونۂ سلف قدوۃ المشائخ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری صدر مدرس دارالعلوم کا حلقۂ درس حافظ ابن حجر اور شیخ الاسلام نووی کے حلقۂ درس کی مثال تھی تو دوسری طرف شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کا حلقۂ درس امام غزالی اور رازی کی یاد تازہ کرتا تھا، ایک طرف شیخ المشائخ مفتی اعظم حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب کا حلقۂ فتویٰ و درس حدیث و تفسیر اور اس کے ساتھ حلقۂ اصلاح و ارشاد اور سالکان طریقت کی تربیت کا بے نظیر سلسلہ جاری تھا تو دوسری طرف یادگار سلف عالم ربانی حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب کا درس حدیث و فقہ اور نہایت مفید عام تصانیف کا سلسلہ جاری تھا۔ اسی کے ساتھ عام اصلاح خلق کے لئے ارشاد و تربیت کا ایک بڑا حلقہ تھا جس سے ہزارہا بندگان خدا کی اصلاح ہوتی تھی اور ان میں دینی انقلاب نمایاں نظر آتا تھا۔

شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب اور شیخ المعقول والمنقول حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی اور حضرت مولانا رسول خان صاحب ہزاروی رحمۃ اللہ علیہم

اس زمانے کے متوسط مدرسین میں شمار ہوتے تھے۔ رئیس المناظرین حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب اس وقت ناظم تعلیمات تھے، حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب دارالعلوم کے صدر مہتمم تھے اور اس کے ساتھ ہمیشہ ایک سبق پڑھانے کا معمول تھا، نائب مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب تھے جن کے عربی قصائد اور عظیم الشان تصنیف "دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا" ہر طبقے کے علماء میں قبول عام حاصل کر چکے ہیں۔ غرض ہر طرف بزرگانِ سلف کے نمونے پیکرِ علم و عمل ستاروں کی طرح درخشاں نظر آتے تھے، جن کے چہرے دیکھ کر خدا یاد آتا تھا، ان کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ع

ایک محفل تھی فرشتوں کی جو برخواست ہوئی[1]

۱۳۳۷ھ وفیات

اس سال کے حالات میں اہم واقعہ حضرت مولانا عبدالرحیم رائپوری رحمۃ اللہ علیہ رکنِ اعلیٰ دارالعلوم کی وفات کا حادثہ ہے، آپ نے ۲۵ ربیع الثانی ۱۳۳۷ھ کو اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کو رحلت فرمائی، دارالعلوم میں حسبِ معمول جلسہ منعقد کیا گیا اور ایصالِ ثواب کے لئے کلمۂ طیبہ کا ختم کرایا گیا، حضرت شیخ الہند نے مالٹا سے ایک طویل اردو مسدس بطور مرثیہ کے لکھ کر بھیجا۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ علم ظاہری و باطنی کے جامع، زہد و توکل، صبر و قناعت اور وسعتِ اخلاق میں اپنے زمانے میں بے نظیر تھے، حضرت گنگوہی قدس سرہٗ سے خلافت حاصل تھی، فیوض و برکات کا دائرہ بہت وسیع تھا، قرآن مجید کی تعلیم کی جانب خاص توجہ تھی، سہارنپور کے مضافات اور پنجاب کے اکثر مشرقی اضلاع میں تعلیم قرآن کے بہت سے مدارس آپ کی سعی و توجہ سے جاری تھے، استفاضۂ باطنی کرنے والے حضرات کا ہر وقت ہجوم رہتا تھا، غرض کہ ظاہر و باطن کے دونوں سلسلے آپ کی ذات گرامی سے قائم تھے، استفاضہ

---

[1] مجلہ دارالعلوم دیوبند بابت ماہ دسمبر ۱۹۷۲ء ص ۳۰۔

باطنی کا طریقہ حضرت گنگوہی قدس سرہ سے بہت اشبہ تھا، دارالعلوم کے ساتھ نہایت خصوصیت سے تعلق تھا، اس کے ہر چھوٹے بڑے معاملے میں غایت دلچسپی سے حصّہ لیتے تھے۔

اسی عنوان کا دوسرا واقعہ دارالعلوم کے قدیم مدرس مولانا غلام رسول صاحب کا انتقال ہے، مولانا بفہ ضلع ہزارہ کے رہنے والے تھے، متوسطات تک اپنے وطن میں پڑھی تھیں، ۱۲۹۶ھ میں دارالعلوم میں تشریف لائے اور یہیں علوم کی تکمیل فرمائی، فراغت کے بعد ۱۳۰۷ھ میں دارالعلوم کے مدرس مقرر ہوئے، اور تیس سال تک دارالعلوم کی تعلیمی خدمت انجام دی ر دیوبند میں اس سال انفلوئنزا کی بڑی شدت تھی، ایک مہینہ سے زیادہ دارالعلوم بند رہا، آٹھ دس طالب علم انفلوئنزا کی نذر ہو گئے، اسی مرض میں مولانا مرحوم نے ۱۰ محرم ۱۳۳۷ھ کو انتقال فرمایا، مولانا غلام رسول صاحب علوم عقلیہ ونقلیہ کے نہایت جامع اور حافظ علوم تھے، علوم عقلیہ میں علماء کے طبقے میں انھیں نمایاں مقام حاصل تھا، طلبہ آپ سے استفادہ علوم میں فخر محسوس کرتے تھے مولانا کو ان کی جامعیت ومقبولیت کے سبب سے متعدد مرتبہ مختلف مقامات سے گراں قدر مشاہرے پر طلب کیا گیا مگر آپ نے دارالعلوم سے جدا ہونا گوارہ نہ کیا، دارالعلوم کے قلیل مشاہرے پر دوسری جگہ کے بیش قرار مشاہرے کو ترجیح دینا پسند نہیں کیا، زندگی نہایت سادہ تحمل سے یکسر بے نیاز تھی۔

دارالعلوم کا اثر جنوبی اور مشرقی افریقہ میں

گذشتہ اوراق سے آپ کو بخوبی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ دارالعلوم کو شروع ہی سے دنیائے اسلام کی علمی مرکزیت حاصل ہو گئی تھی، اور اس کی شہرت کا آوازہ ایشیا کو گذر کر یورپ اور افریقہ تک پہنچ گیا تھا، اسی طرح اس کی فیض رسانی کا دائرہ بھی صرف ہندوستان کی سرزمین تک محدود نہیں تھا۔ رودادوں کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ دارالعلوم میں جس طرح ہندوستان کے مختلف صوبوں اور مقامات کے طلباء موجود تھے، اسی طرح

کابل وایران، بلخ وبخارا، چین اور روس اور شام وحجاز کے لوگ قرآن وحدیث کے علم کی تحصیل کے لئے دیوبند کا سفر اختیار کرتے تھے، اگر ایک طرف امام بخاریؒ کے ہم وطن اپنے قدیم ترکے کو حاصل کرکے بخارا لے جانے میں سرگرم تھے تو دوسری طرف موصل وحجاز اور خاص مدینہ طیبہ تک دارالعلوم کے فیض یافتہ پہنچ کر اپنے اصلی سرچشمہ سے علاقہ پیدا کر رہے تھے۔

لیکن جس طرح دارالعلوم کا فیض وسیع ہوتا گیا اور اس کے مصارف بڑھتے گئے اسی طرح اس کے حامیوں اور مددگاروں کا حلقہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا، اور وقتاً فوقتاً ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک کے اہل خیر مسلمان اس کی امداد واعانت میں حصہ لیتے رہے چنانچہ ۱۳۳۰ھ کے عظیم الشان جلسہ دستاربندی کے موقع پر جنوبی افریقہ کے اہل خیر مسلمانوں نے معقول رقم ارسال فرمائی تھی، اس وقت سے یہ سلسلہ برابر بڑھتا گیا، جنوبی افریقہ کے مقامات ڈربن، ناٹال، ٹرانسوال، اسٹینگر وغیرہ میں دارالعلوم کے بہت سے ہمدرد اور معاون پیدا ہوگئے، اور یہ سلسلہ جو جنوبی افریقہ سے شروع ہوا تھا مشرقی افریقہ تک پہنچ گیا۔

۱۳۳۸ھ حضرت شیخ الہندؒ کی رہائی اور مالٹا سے واپسی

۱۳۳۵ھ کے حالات سنویہ میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی گرفتاری کا ذکر گذر چکا ہے، اس کے بعد حجاز کے قیام اور مالٹا کی سوا تین سالہ نظر بندی کے زمانے کے حالات اپنے مناسب مقام پر پیش کئے جائیں گے، یہاں مختصراً نظر بندی سے رہائی کے حالات درج کئے جاتے ہیں:-

۲۲ جمادی الآخر ۱۳۳۸ھ کو حضرت شیخ الہندؒ اپنے رفقاء کے ساتھ فوجی نگرانی میں مالٹا سے روانہ کئے گئے، تقریباً سوا دو مہینے سیدی بشر اور سوئز میں رکھا گیا، ۵ رمضان المبارک کو سوئز سے بمبئی کے لئے روانگی ہوئی، ۲۰ رمضان کو جہاز بمبئی پہنچا، بمبئی پہنچنے پر بتلایا گیا کہ آپ مع رفقاء کے آزاد ہیں اور اب کوئی پابندی نہیں ہے، بمبئی کی خلافت کمیٹی نے نہایت عظیم الشان استقبال کیا، ۲۳ رمضان تک بمبئی میں قیام فرماکر ۲۵ رمضان کو دہلی تشریف

لائے۔ ۲۶ رمضان کی صبح کو دیوبند کے لئے روانگی ہوئی اور ۹ بجے اسٹیشن دیوبند پر ورود فرمایا، راستے میں عام طور پر اسٹیشنوں پر مشتاقانِ زیارت کا بے پناہ ہجوم تھا، دیوبند کے اسٹیشن پر پہونچے تو ہجوم کی کوئی انتہا نہ تھی، بے شمار لوگ زیارت کے لئے موجود تھے، دیوبند میں سوئز سے روانگی کی اطلاع خطوط سے اُسی وقت مل چکی تھی اور یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ ۲۰ رمضان المبارک کو بمبئی پہونچیں گے، مگر جیسا کہ اوپر عرض کیا جاچکا ہے یہ علم بالکل نہ تھا کہ رہائی ہوچکی ہے اور نہ یہ معلوم ہوسکا تھا کہ بمبئی میں ملاقات ہوسکے گی یا نہیں، مگر اس کے باوجود حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ مع صاحبزادگان، اور حضرت شیخ الہندؒ کے بعض اعزہ اور بعض دوسرے مخلصین بمبئی پہونچ گئے تھے، دارالعلوم میں حضرت شیخ الہندؒ کی تشریف آوری کی نسبت روداد میں درج ہے:۔

"اس سال کے سب سے مبارک اور روشن حالات میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب کا قریب پانچ سال کی غیبت کے بعد مصر و قاہرہ اور اس کے بعد جزیرہ مالٹا میں نظربندی کا زمانہ گذار کر آزادی کے ساتھ مراجعت فرمائے ہندوستان اور اپنے وطنِ خاص دیوبند میں رونق افروز ہونا ہے، تاریخ دارالعلوم میں یہ ایک نہایت ہی اہم واقعہ ہے، ۲۶ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ کی یہ ایک مبارک تاریخ تھی کہ تقریباً پانچ سال کے بعد دیوبند کے مشتاق قلوب کو یہ خوش منظر دن دیکھنا نصیب ہوا، دیوبند میں جس خلوص و جوش و مسرت کے ساتھ شاندار استقبال ہوا اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کی آنکھوں نے وہ مبارک نقشہ دیکھا ہے، اسٹیشن سے حضرت مولانا اولاً مدرسہ میں تشریف لائے، دارالحدیث کے سب سے بڑے اور غیر مسقف کمرہ میں تخت پر تشریف فرما ہوئے، اور ہر طرف مشتاقانِ زیارت حلقہ باندھ کر بیٹھ گئے، اور جو دور تھے وہ کھڑے ہوکر یا مدرسہ کی چھت پر سے زیارت سے مشرف ہوئے، حضرت مولانا نے اور تمام مجمع نے دیر تک دعا مانگی، اس کے بعد مولانا مدرسہ کے دارالمشورہ میں تشریف فرما ہوئے، یہاں پر تھوڑی سی دیر قیام فرمایا، اور یہاں سے مکان تشریف

بے گئے۔

جدید دارالاقامہ کی بنیاد

:- پچھلے آٹھ دس سال سے دارالعلوم میں مسلسل ہر سال طلبہ کا بکثرت اضافہ ہوتا جا رہا تھا، چنانچہ ۱۳۳۶ھ میں طلبار کی تعداد ۱۶۳۰ تھی مگر اس سال میں یہ تعداد ۱۰۶۰ تک پہونچ گئی تھی، دارالاقامہ کے کمرے اس تعداد کے لئے بالکل ناکافی تھے، اس لئے نصف سے زائد طلبار شہر کی مختلف مساجد اور منفرق مکانات میں رہتے تھے، اس صورت میں نہ تو طلبار کو یکسوئی اور اطمینان حاصل تھا اور نہ اُن کی نگرانی اور تربیت خاطر خواہ طریق پر ہوسکتی تھی، علاوہ ازیں جو طلبار دارالاقامہ میں رہتے تھے ان کی تعداد بھی دارالاقامہ کی وسعت کے لحاظ سے زیادہ تھی، لہٰذا جگہ کی تنگی کے باعث اکثر پریشانی لاحق رہتی تھی، اس لئے مزید کمروں کی تعمیر کی ضرورت بشدت محسوس کیجارہی تھی، دارالحدیث کے شمالی، غربی اور جنوبی اطراف میں ایک وسیع دارالاقامہ بنائے جانے کی تجویز زیر غور تھی، خدا کا شکر ہے کہ اس سال میں امرتسر کے بعض ارباب خیر کی توجہ اس طرف مبذول ہوئی، اور ان کے عطیات سے اس مجوزہ وسیع دارالاقامہ کی بنیاد رکھی گئی، یہ کمرے جو بعد میں وقتاً فوقتاً بنائے گئے ہیں ہندوستان کے مسلمانوں کی دینداری علوم دین سے اعتنار اور دینی کاموں میں فیاضانہ امداد کی قابل قدر یادگار ہیں، یہ کمرے اسقدر وسیع اور کشادہ ہیں کہ ہر ایک میں آٹھ تک طلبار بآسائش رہ سکتے ہیں، کمروں کے سامنے برآمدے ہیں اور آگے نہایت وسیع اور پُر فضا صحن ہے، جس کے تین سمتوں میں دارالاقامہ اور مشرقی جانب دارالحدیث کی نہایت عظیم الشان اور سربفلک وہ عمارت ہے جو ہندوستان کی سرزمین میں اپنی نوعیت کی پہلی تعمیر ہے، صحن وسیع اور کشادہ ہے جس میں قسم قسم کے چھوٹے بڑے پھول دار درختوں کی چمن بندی کی گئی ہے اور روشش بنا کر ایک خوش نما پائین باغ کی شکل دے دی گئی ہے، دارالحدیث کے بالمقابل بعد میں مغربی جانب باب الظاہر تعمیر کیا گیا ہے، جو افغانستان کے بادشاہ محمد ظاہر شاہ کی دارالعلوم سے وابستگی کی ایک ایسی یادگار ہے جو تاریخ

کے دامن میں ہمیشہ محفوظ رہے گی۔

۱۳۳۹ھ وفات حضرت شیخ الہندؒ

ابھی گذشتہ سال ۱۳۳۸ھ میں حضرت شیخ الہندؒ کی مالٹا سے رہائی اور تشریف آوری ہوئی تھی، ۱۳۳۹ھ شروع ہی ہوا تھا کہ حضرت ممدوح کی وفات کا قیامت خیز سانحہ پیش آگیا، روداد میں ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کی تشریف آوری کی تقریب نے دیوبند کی رونق کو اس درجے پر پہنچا دیا تھا کہ اس سے زیادہ زمانۂ مابعد کے لیے اذہان عامہ میں متصور نہیں، اضیاف و زوار کی کثرت نے رشیدی و قاسمی مجالس کے نمونے پیش کر دیئے تھے، حضرت شیخ الہندؒ کے حیرت انگیز اخلاق کا منظر قابل دید تھا، طویل سفر کی صعوبات کے علاوہ صوم نہار اور قیام لیل کے باوجود بھی یہ پسند خاطر نہ ہوتا تھا کہ مشتاقانِ زیارت اور بالخصوص اسفار بعیدہ کی مشقتوں کو گوارہ کر کے حاضر دربار عالی ہونے والوں سے جدا ہو کر تھوڑی دیر کے لئے استراحت فرمادیں، بعض مرتبہ سمجھدار مہمان خود ہی ان مجالس کو ختم کر دیتے تھے اور بعض مرتبہ حضرت کے خدام باصرار تمام کچھ دیر کے لئے تخلیہ کر دیتے تھے۔

حضرت کا ارادہ تھا کہ حسب معمول درسِ حدیث جاری فرمائیں لیکن لوگوں کا ہجوم مہلت ہی نہیں لینے دیتا تھا کہ کوئی علمی یا تعلیمی شغل جاری ہوسکے، تاہم دارالعلوم کا تعلیمی سال چونکہ شوال سے شروع ہوتا ہے جس میں تعلیم جاری ہو جاتی ہے اور امتحانات داخلہ لئے جاتے ہیں۔ سب لوگوں کی تمنا یہ تھی کہ حضرت ہی سے امتحانات داخلہ کا آغاز کیا جائے اور حضرت ہی درس حدیث کا افتتاح فرمائیں۔ مگر زائرین و مشتاقان قدمبوسی نے اس کی مہلت نہ دی کہ معمول کے مطابق ترمذی شریف کو شروع کرائیں، اسی دوران میں آپ کو بعض ضروری سفر پیش آگئے اسفار سے واپسی پر عیدالاضحیٰ کے بعد سے علالت کا سلسلہ شروع ہوگیا، دیوبند کے اطباء کا علاج ہوتا رہا، جن میں آپ کے برادر خورد حکیم محمد حسن صاحب طبیب مدرسہ عالیہ دیوبند بھی شامل تھے، اسی دوران میں علی گڈھ کا ایک وفد آپ کی خدمت میں اس غرض سے

حاضر ہوا کہ "جامعہ ملیہ" کا افتتاح آپ کے ہاتھوں سے کرائے جانے کی درخواست کرے، خدام و متعلقین آپ کے مرض کی شدت کے سبب سے سفر کے لئے مانع تھے، لیکن آپ نے گوارہ نہ فرمایا کہ مسلمانان علی گڈھ کی عرضداشت کو رد فرمادیں، اسی حالت میں کہ کروٹ تک خود نہ لے سکتے تھے عازم سفر ہو گئے، متعدد خدام ساتھ ہوئے جن میں حضرت علامہ عثمانی مرحوم اور مہتمم حال مولانا محمد طیب صاحب بھی تھے، علی گڈھ کے سفر میں اضمحلال بڑھ گیا اور دیوبند واپس ہونے کے بعد حالت زیادہ تشویشناک ہو گئی، بالآخر دہلی لے جایا گیا، مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب اور ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری نے علاج شروع کیا، یوم وفات سے ایک دن پہلے اطلاع ملی کہ طبیعت زیادہ علیل ہے، حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مددگار مہتمم اور مولانا سید انور شاہ صاحب اور دوسرے حضرات دہلی روانہ ہو گئے، جس وقت یہ حضرات دیوبند سے روانہ ہو رہے تھے، ٹھیک اسی وقت حضرت شیخ الہند نے ربیع الاول کی ۱۸ تاریخ یوم سہ شنبہ کو ڈاکٹر انصاری مرحوم کی کوٹھی واقع دریا گنج میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

جنازہ دیوبند لایا گیا، راستے میں متعدد مقامات کے اسٹیشنوں پر بڑی بڑی جماعتوں نے نماز جنازہ پڑھی، جنازہ دیوبند کے اسٹیشن پر پہونچا تو تقریباً وہی سماں تھا جو تشریف آوری کے وقت تھا، فرق صرف اس قدر تھا کہ اُس وقت شدت مسرت سنبھلنے نہ دیتی تھی اور اِس وقت شدتِ غم چین نہیں لینے دیتی تھی ازدحام کی وجہ سے جنازہ کافی دیر کے بعد مکان تک پہونچایا جا سکا اگلے دن صبح کو احاطہ دارالعلوم میں نماز جنازہ ادا کر کے بہزار حسرت و افسوس و بہزاران غم و الم اس گنجینۂ علم و عمل کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ نور اللہ مرقدہٗ!!

حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ کی وفات پر آپ کے متوسلین کے متعدد قصائد و مرثیے عربی، فارسی اور اُردو کے روداد میں درج ہیں، یہاں مولانا سراج احمد صاحب مدرس دارالعلوم کا لکھا ہوا قطعہ تاریخ وفات درج ذیل ہے ؎

کیا کبھی مرتے ہیں اللہ پہ مرنے والے | لوحِ محفوظ پہ ہے ثبت دوامِ محمود
اس کی آواز پہ لبیک کہا عالم نے | آن کی آن میں سب ہوگئے رامِ محمود
آپ مامور من اللہ تھے بہرِ تبلیغ | شاہدِ عدل ہے تاثیرِ پیامِ محمود
پئے دنیائے دنی ایک قدم بھی نہ اٹھا | راہِ حق میں ہی اٹھا جب اٹھا گامِ محمود
دور تھا ساغرِ تحدیث کا ہر شام و پگاہ | واہ وا! صلِّ علیٰ شُربِ مُدامِ محمود
اُن کے شاگرد ہیں پھیلے ہوئے دنیا بھر میں | واقعی زندۂ جاوید ہے نامِ محمود
بولتے کچھ نہیں اور لب پہ تبسم ہے عیاں | موت ہے؟ نیند ہے؟ یا ہے یہ منامِ محمود
سالِ رحلت پہ ہوا غیب سے دل میں القا | خلدِ اعلیٰ طرب افزا ہے مقامِ محمود

۱۳ ۳۹ ھ

فرانس اور جنوبی افریقہ کی گرانقدر امداد

۱۳۳۹ھ میں ہندوستان سے دارالعلوم کے چندے اور آمدنی میں کمی رہی، مگر فرانس جنوبی افریقہ اور رنگون وغیرہ بیرونی ممالک کے گراں قدر چندے نے اس کمی کو پورا کردیا۔ اس میں فرانس کا چندہ پہلا اور آخری چندہ تھا۔

۱۳۴۰ھ، حضرت مہتمم صاحب کا حیدرآباد کے عہدہ افتاء کے لئے انتخاب

۱۳۴۰ھ کے اوائل میں نظام دکن کے چیف سکریٹری کا تار موصول ہوا کہ "اعلیٰ حضرت نے حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم کو حیدرآباد کی عدالت عالیہ (ہائی کورٹ) کے عہدۂ افتاء پر تین سال کے لئے بمشاہرہ ایک ہزار روپیہ تجویز فرمایا ہے"۔

حضرت مہتمم صاحب کو دارالعلوم سے جس درجے کا تعلق اور اس کے کاموں میں جس قدر انہماک تھا اس کے ہوتے ہوئے کسی دوسری جانب متوجہ ہونے کا کوئی موقع ہی نہ تھا، مگر دارالعلوم اور حیدرآباد کے مابین جو دیرینہ تعلق قائم تھا اس کو نظرانداز کرنا بھی آسان نہ تھا،

بالآخر جماعتی فیصلہ یہی قرار پایا کہ امتثالِ امر سے انکار نہ کیا جائے، ۹ ربیع الآخر کو حضرت مہتمم صاحبؒ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کو ہمراہ لے کر روانہ ہو گئے، ۱۴ ربیع الآخر کو نظام دکن سے ملاقات ہوئی، حضرت مہتمم صاحب نے دار العلوم کی خدمت اور اپنے شغف و انہماک کا ذکر فرمایا تو ارشاد ہوا کہ "میں جانتا ہوں کہ وہ کام جس کو آپ سر انجام دیتے ہیں بہت بڑا ہے، اور اگر آپ اس بنا پر یہاں آنے سے انکار کر دیتے تو مجھے کچھ ملال نہ ہوتا، لیکن میرا خیال یہ تھا کہ میرے منشار کا اتباع کر کے ضرور آئیں گے، آپ یہاں رہ کر بھی دار العلوم کی خدمات انجام دے سکتے ہیں"۔

اس تقرر میں عہدۂ افتار کے علاوہ نظام کے سامنے مدرسہ نظامیہ کی تعلیمی و انتظامی اصلاح کی بھی ضرورت پیش نظر تھی چنانچہ اس کی صدارت بھی تفویض کی گئی، اور فرمانِ خاص صادر ہوا کہ مدرسہ نظامیہ کے سابقہ حالات کو دیکھکر اصلاح و ترقی کے لئے تجاویز پیش کی جائیں، چنانچہ حضرت مہتمم صاحب نے اس سلسلے میں جو تجاویز پیش کیں ان کو فوراً نظام کی منظوری حاصل ہو گئی۔

قیام حیدر آباد کے زمانے میں بھی حضرت مہتمم صاحب کا تعلق دار العلوم کے ساتھ بدستور قائم رہا، صدارت اہتمام کا ایک عہدہ قائم کر کے آپ کو بحیثیت صدر مہتمم دار العلوم دکن

لے ریاست حیدر آباد کے سابقہ نظام میں اسلامی طرز پر دار القضار کا محکمہ قائم تھا جس میں ممالک محروسہ کے شرعی معاملات پیش ہو کر طے ہوتے تھے، افتار کا منصب بھی سرکاری طور پر قائم تھا، عدالت عالیہ میں صدر مفتی کا عہدہ تھا، جس کا کام قتل و قصاص کے مقدمات میں شریعت کے مطابق فتویٰ دینا تھا، عدالت عالیہ کے فیصلے اور سزائے موت کا انحصار مفتی کے فتویٰ پر ہوتا تھا۔ اگرچہ یہ عہدہ عدالت عالیہ کے چیف جج کے مماثل تھا مگر اس لحاظ سے کہ یہ ایک خالص مذہبی و شرعی منصب ہے زیادہ ممتاز اور باعظمت سمجھا جاتا تھا۔

بھیجا گیا اور حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب نائب مہتمم دار العلوم کو مہتمم بنایا گیا اس صورت سے تمام بنیادی اور اہم امور کے فیصلے آپ دکن ہی میں کرتے تھے۔ اور برابر اہم معاملات میں تحریر و مشورے کے ذریعے سے دار العلوم کی خدمات میں حصہ لیتے رہے۔

اضافۂ مشاہرات اور بعض تغیرات

دار العلوم میں ہمیشہ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے تنخواہوں کا معیار بہت ہی کم اور معمولی رہا ہے اور ہمیشہ یہاں کے کارکنون اور اساتذہ نے اپنی خدمات کے معاوضے میں حق تعالیٰ کی خوشنودی اور ایثار کو ترجیح دی ہے مگر انسانی ضرورتوں سے بھی کلیۃً قطع نظر نہیں کیا جا سکتا، اس لئے جب جنگِ عمومی کے سبب شدید گرانی پیدا ہو گئی اور مابعد جنگ بھی اسکے اثرات بدستور باقی رہے تو تنخواہوں میں اضافہ کا مسئلہ ناگزیر ہو گیا، چنانچہ اس تناسب سے اضافہ عمل میں آیا کہ صدر مہتمم صاحب کے سابقہ مشاہرے ۸۵ روپے میں ۴۰ روپے کا اور صدر مدرس صاحب کی تنخواہ ۷۰ روپے میں ۳۰ روپے کا اضافہ کیا گیا، اور اسی طرح علی قدر مراتب تمام مدرسین اور ملازمین کی تنخواہیں بڑھائی گئیں۔

اس موقع پر مجلس شوریٰ نے تنخواہوں میں اضافہ کی ضرورت کی تجویز پاس کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "جناب مہتمم صاحب نے دربارہ مشاہرات حضرات مدرسین و ملازمین دار العلوم جو تجویز تحریر فرمائی ہے وہ بالکل مناسب ہے، تجویز مذکور میں جو وجوہ تحریر کی گئی ہیں ان کی بابت موجودہ حالاتِ زمانہ پر نظر کرنے سے کوئی وجہ عدم تسلیم نہیں ہو سکتی، تمام دنیا کے ہر ایک طبقے و گروہ میں معاوضۂ خدمت کی قیمت بہت زیادہ ہو گئی ہے، لہٰذا حضرات مدرسین اور دیگر ملازمین دار العلوم بھی اضافہ کا استحقاق رکھتے ہیں۔

مجلس شوریٰ حضرات مدرسین کا شکریہ ادا کر کے نہایت امتنان کے ساتھ ان حضرات

کے ایثار کا اعتراف کرتی ہے، حضرات مدرسین نے محض لوجہ اللہ تعالےٰ خدمتِ تدریس دارالعلوم کو اپنا دینی و قومی فریضہ جان کر دوسری جگہ باوصف اضعافاً مضاعف تنخواہ پر بلائے جانے کے باوجود دارالعلوم کو نہیں چھوڑا، بالخصوص حضرت مولانا انور شاہ صاحب صدر مدرس کا ایثار خاص شکریے کے قابل ہے کہ حضرت موصوف نے دارالعلوم کی قلیل رقم پیش کردہ کو قبول فرما کر دوسری جگہ اضعافاً مضاعفاً مشاہرہ پر جانے سے بالکل انکار فرمادیا ہے، حضرت موصوف کا شکریہ بالخصوص ارکان مجلس شوریٰ پر اور بالعموم عام ہمدردانِ دارالعلوم بلکہ تمام اہلِ اسلام پر واجب ہے۔

جناب مہتمم صاحب نے اپنی یادداشت کے ساتھ جملہ ملازمین متعلقہ دارالعلوم کی فہرست مرتب فرمائی ہے لیکن اس میں کسی جگہ خود مہتمم اور نائب مہتمم کے نام کا اندراج نہیں ہے، یہ بھی ایک طرح کا ایثار ہے جو حضرات موصوفین کا ہمیشہ سے شعار چلا آرہا ہے لیکن جہانتک نظر دوڑائی جائے یہی نظر آئے گا کہ دارالعلوم میں ترقیات مالی و انتظامی جس قدر ہوئی ہیں وہ حضرات موصوفین کی جد وجہد اور کوشش بلیغ کا نتیجہ ہے، لہٰذا ان حضرات کی خدمات کا دراصل کوئی معاوضہ نہیں ہوسکتا اور مجلس شوریٰ معاوضہ تجویز کرنے سے بالکل قاصر ہے مگر تاہم اس موقع پر دونوں حضرات کا اضافہ تجویز نہ کرنا مجلسِ شوریٰ کی ایک سخت کوتاہی اور نہایت ناسپاسی اور ناقدری خیال کی جائے گی، نظر براں اس فہرست میں ہر دو حضرات کے لئے بھی اضافہ درج کیا جاتا ہے۔[۱]

سنہ ۱۳۴۱، ۱۳۴۲ھ، شدھی اور سنگٹھن کے زمانے میں دارالعلوم کی تبلیغی خدمات

سنہ ۱۳۴۱ و ۱۳۴۲ھ کے حالات میں سب سے زیادہ اہم واقعہ شدھی اور سنگٹھن کا وہ افسوسناک واقعہ ہے جس نے دارالعلوم کی تمام تر توجہ داخلی حالات

---

[۱] روداد مجلس شوریٰ منعقدہ ربیع الاول سنہ ۱۳۴۱ھ۔

سے ہٹا کر اپنی جانب مبذول کرالی ۔ تاریخ ہند کا یہ ناگوار سانحہ آریہ سماج کی ایک منظم تحریک تھی ، جس کا مقصد اسلام سے ناواقف اور سادہ لوح مسلمانوں کو آریہ بنانا تھا ۔ اُس زمانے کی سیاست اور ہندو مسلم اتحاد کے پیش نظر یہ تحریک بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے ، اس کے سمجھنے کیلئے تحریک کا پس منظر جاننا نہایت ضروری ہے ۔

سن ۲۰ ، ۲۱ اور ۱۹۲۲ عیسوی میں تحریک خلافت اور کانگریس کے باہم دگر تعاون اور اشتراک عمل سے ہندو مسلمانوں میں یک جہتی اور اتحاد و اتفاق کے تعلقات اس قدر مستحکم ہو گئے تھے کہ دونوں قومیں شیر و شکر بن گئی تھیں ، ہندوؤں میں مسلمانوں کے ساتھ چھوت چھات برتنے میں یہ بڑا تغیر رونما ہو گیا تھا کہ ہندو مسلمان کے ہاتھ سے شربت اور پان بے تکلف کھانے پینے لگے تھے ، یہ ایسے حالات تھے جنھوں نے ہندوستان کے مستقبل میں برطانوی حکومت کے قیام کو دشوار بنا دیا تھا ، انگریز نے حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے منافرت و تفریق کا اپنا پرانا نسخہ استعمال کیا جو ہندوستان کی بدقسمتی سے نتیجتہً تیر بہدف ثابت ہوا ، اس کی تفصیل یہ ہے کہ سنہ ۱۹۲۳ء میں وائسرائے نے ترک موالات کے ایک بڑے لیڈر سوامی شردھانند کو جو اس وقت جیل میں تھے بلا کر گفتگو کی اس گفتگو کے بعد جو صیغۂ راز میں رہی اُن کو رہا کر دیا گیا ، جیل سے نکلتے ہی سوامی شردھانند نے مسلمانوں کی شدھی کا کام شروع کر دیا ، دوسری طرف ڈاکٹر مونجے نے سنگٹھن قائم کی جو خالص ہندوؤں کی جماعت تھی ۔[1] لاہور کے اخبار "کیسری" نے آگرے کے ساڑھے چار لاکھ ملکانہ نو مسلم راجپوتوں کو شدھی کر لینے کی طرف توجہ دلائی ، آگرہ ، متھرا ، اٹہ ، اٹاوہ ، کانپور ، فرخ آباد ، گوڑگانوہ اور مین پوری وغیرہ کے اضلاع اس تحریک کے خاص مرکز تھے ۔

اس نازک ترین موقع پر دارالعلوم نے وہی کیا جو ایک دینی اور مذہبی ادارے کے

---

[1] روشن مستقبل طبع چہارم ص ۳۷۹ ۔

شایانِ شان تھا، اس نے اس سلسلے میں مدافعانہ اور جوابی کاروائی سے قبل آل انڈیا نیشنل کانگریس سے اخلاقی طور پر اپیل کی کہ وہ ان جارحانہ سرگرمیوں کو جو مسلمانوں اور ہندوؤں میں منافرت اور عداوت کے جذبات پرورش کر رہی ہیں اپنے ہمہ گیر اثرات سے فی الفور بند کرادے، تجویز کے متن کا حاصل یہ تھا کہ:۔

" دار العلوم کی یہ مجلس آل انڈیا کانگریس کمیٹی سے پُر زور درخواست کرتی ہے کہ وہ ملک کے پُر آشوب حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان تمام کارروائیوں کو جو ایک باقاعدہ معرکہ آرائی کی صورت میں ظاہر ہو کر مسلمان اور ہندو قوم کے جذباتِ منافرت و عداوت کے بھڑکانے اور مطلع آزادی ہند کو تاریک بنانے کی موجب ہو رہی ہیں عام ملکی مفاد کی خاطر موقوف کرادے اور ملک کی سیاسی فضا کو جو بد قسمتی سے روز بروز مکدر ہوتی چلی جا رہی ہے صاف اور پُر امن بنانے کے لئے ان مبلّغین کو جو ایک طرح کی مذہبی جنگ آزمائی میں منہمک ہیں واپس کرادے البتہ ایسی مذہبی تبلیغ جو بین الاقوامی رواداری کے ساتھ معقول اور ملائم طرز پر ہو اس سے کوئی جماعت دوسری جماعت کو روکنے کا اختیار نہیں رکھتی"۔

سنگٹھن کی نسبت یہ تجویز پیش کی گئی تھی:۔

"چونکہ ہندو سنگٹھن کی تحریک کے بعض حلقوں میں صحیح یا غلط طور پر یہ معنیٰ سمجھ لئے گئے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے مقابلے پر ایک طاقتور نظام عمل بنایا گیا ہے جس کی غرض ہندوؤں کو مسلمانوں سے ٹکرانا ہے، اس خیال نے ملک کے امن و امان کو سخت مجروح و مخدوش بنا دیا ہے، اس لئے یہ مجلس تجویز کرتی ہے کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی ہندو مہاسبھا سے بہت زور کے ساتھ درخواست کرے کہ وہ ان نازک اور پُر خطر حالات کا اندازہ کرتے ہوئے جن سے ہمارا ملک گذر رہا ہے ہندو سنگٹھن کی موجودہ صورت کو ملتوی کر دے، جن سے مضر خطرات کے پیدا ہونے کا ہر وقت اندیشہ لگا رہتا ہے، البتہ جس وقت ملک کی فضا درست اور حالات معتدل ہو جائیں، تب آل انڈیا کمیٹی سے درخواست کی جائے کہ وہ ہندو مسلمان

دونوں کی جسمانی قوت کو ترقی دینے کے لئے ایسی تدابیر کی تلقین کرے جن سے دونوں قومیں انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنے جسمانی قوی کو عام کمزوری سے محفوظ رکھ سکیں جو اس زمانے میں دونوں قوموں کے اکثر افراد میں کم وبیش مشاہدہ کی جا رہی ہیں. تاکہ ملک ایسے فرزندوں کی خدمات بیش از بیش مقدار میں حاصل کر سکے، اور شریف لوگ شریروں کے مقابلے میں اپنی جان ومال آبرو اور مذہب کو محفوظ رکھنے کے قابل ہو سکیں"

اسے ملک کی بدقسمتی ہی کہا جا سکتا ہے کہ دارالعلوم کی جانب سے یکجہتی کی یہ مصالحانہ اپیل اس وقت صدا بصحرا ہو کر رہ گئی، ادھر دارالعلوم میں جب خطوط اور اخبارات کے ذریعے پے در پے آریہ سماج کی ناگوار فرقہ وارانہ سرگرمیوں اور مسلمانوں کے ارتداد کی خبریں موصول ہوئیں تو ۱۲ جمادی الاخریٰ کو دارالعلوم سے مبلّغین کا ایک وفد روانہ کیا گیا، وفد کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ آریہ سماج کی تحریک نہایت منظم اور وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی ہے، جس کے ازالے کے لئے مزید اور کافی مبلّغین کی سخت ضرورت ہے اس پر دارالعلوم کے اساتذہ اور طلبہ کے پے در پے متعدد وفد روانہ کئے گئے، آگرہ کو تبلیغی کاموں کا مرکز قرار دے کر علمائے دیوبند کا دفتر کھولا گیا، مولانا میرک شاہ صاحب مدرس دارالعلوم دفتر کے نگراں بنائے گئے، موصوف جہاں ضرورت ہوتی مبلّغین کو بھیجتے. بحمداللہ مبلّغین کی ان تھک مساعی کا نتیجہ یہ نکلا کہ بے شمار مرتدین تائب ہو کر اسلام میں واپس ہو گئے،

جن مقامات پر آریہ سماج کی تحریک جاری تھی وہاں کے مسلمان عموماً دین سے ناواقف اور سادہ لوح تھے، اس لئے آسانی سے مخالفین کا شکار ہو جاتے تھے، مبلّغین نے وعظ و تبلیغ کے ذریعے ملکانہ راجپوتوں کو اسلام سے روشناس کرایا ان کے لئے دینی تعلیم کا انتظام کیا اور جگہ جگہ مدارس کھولے گئے، اکثر مقامات پر آریہ مبلّغین سے مناظرے ہوئے، جن میں بالعموم دارالعلوم کے مبلّغ کامیاب رہے۔

مبلّغین نے وقتاً فوقتاً جو اطلاعیں بھیجیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع شروع

میں اُنھیں جاہل اور اکھڑ ملکانوں کی کج اخلاقیوں اور سختیوں سے بڑی بڑی اذیتیں اٹھانا پڑیں، ریاست الور کے ایک گاؤں تسئی میں جب ابتداءً مبلغین پہنچے تو ملکانوں نے ٹھہرانے سے انکار کر دیا، وہ مبلغین کے وضو کا مذاق اڑاتے تھے، پانی مانگتے تو اینٹوں سے جواب دیتے، مبلغین نہایت ہمت اور پامردی کے ساتھ مسجد میں ٹھہر کر ان کی ایذا رسانیوں کو مدت تک برداشت کرتے رہے، جب صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور کامیابی کی کوئی شکل نظر نہ آئی تو بادل ناخواستہ واپسی کا ارادہ کیا، رات کو خواب میں دیکھا کہ آن حضرت صلے اللہ علیہ وسلم متبسمانہ انداز میں فتنۂ ارتداد کے انسداد میں معروف ہیں، اس بشارتِ کبریٰ سے ہمتیں از سرِ نو بندھ گئیں، ادھر ملکانوں کی حالت بھی تقدیرِ الٰہی سے اچانک بدل گئی اور ان کی ایذا رسانی، مبدل براحت رسانی ہوگئی!

اس میں کلام نہیں کہ اس نازک دور میں دارالعلوم کے علاوہ اور بھی اکثر اداروں اور انجمنوں نے تبلیغی مساعی میں بیش از بیش حصہ لیا، جمعیۃ العلمار ہند کی سرگرمیاں بھی اس میدان میں کچھ کم اہم نہیں تھیں، یہاں تک کہ جب جمعیۃ العلمار نے بھی آگرہ میں اپنا تبلیغی دفتر کھول دیا تو دارالعلوم نے اجتماعی حیثیت کو برقرار رکھنے کی خاطر مناسب سمجھا کہ اپنے شعبۂ تبلیغ کو جمعیۃ کے دفتر کے ساتھ ملحق کر دیا جائے، چنانچہ ربیع الاول ۱۳۴۲ھ سے اس پر عمل درآمد شروع کر دیا گیا، مگر عام مسلمانوں اور اخبارات نے دارالعلوم کی خدمات کا جس انداز میں اعتراف کیا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ دارالعلوم کی مساعی سب سے زیادہ وسیع منظم اور وقیع تھیں، اخبار "سیاست" لاہور نے اپنی ۲۷ جون ۱۹۲۳ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ "جہاں تک تحفظِ دین، تردیدِ مخالفین اور اصلاح المسلمین کا تعلق ہے، دارالعلوم دیوبند کے مدرسین، مبلغین اور منتظمین کا حصہ سارے ہندوستان سے بڑھ چڑھ کر ہے، مثال کے طور پر اگر ان غیر محدود کوششوں کو ملاحظہ کر لیا جائے جو آریہ سماج نے اسلام کے خلاف کیں، تو آپ کو روز روشن کی طرح نظر آجائے گا کہ ان مساعی کے مقابلے میں

سب سے زیادہ نمایاں طریق پر جو سینہ سپر ہوا وہ مدرسہ عالیہ دیوبند ہی ہے، اور دعویٰ سے کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں دینِ حنیف، علوم عربیہ، تفسیر و حدیث اور فقہ کے چرچے بعونہ تعالیٰ بہت حد تک دیوبند کے وجود مسعود کی وجہ سے قائم ہیں۔"

روزنامہ "زمیندار" لاہور نے لکھا تھا کہ: "یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ دارالعلوم انسدادِ فتنۂ ارتداد میں بھی کس قدر قیمتی خدمات انجام دے رہا ہے، اس کے اساتذہ وطلبہ غایت انہماک کے ساتھ اس مقصد کی تکمیل میں سرگرم ہیں، اور یہ کھلی حقیقت ہے کہ حقیقی درسگاہ وہی ہے جو وقت پر میدانِ عمل میں اُترے۔" (زمیندار ۲۴ر جون ۱۹۲۳ء)

تبلیغی تعلیم کا انتظام

آریہ سماج کا یہ حملہ اس قدر شدید تھا کہ اس کی مدافعت کیلئے صرف "دفاعی انداز" کافی نہ تھا، اس لئے اقدامی طریق کار کے طور پر مبلغین کو آریہ مذہب سے براہ راست واقفیت پیدا کرانے کے لئے سنسکرت کا انتظام کیا گیا، مولوی ابو رحمت صاحب میرٹھی جو سنسکرت میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے، اُن کو بلاکر مبلغین کی تعلیم کا کام سپرد کیا گیا، اس زمانے میں اتفاق سے ڈاکٹر غلام محمد صاحب نے بھی اپنی خدمات پیش کیں، موصوف آریہ سماج کے تبلیغی مشن کے زبردست رکن اور سنسکرت کے نامور فاضل تھے، اور اسی زمانے میں اسلامی محاسن سے متاثر ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے، ڈاکٹر صاحب کی توجہ اور محنت سے بہت تھوڑے عرصے میں دارالعلوم کے طلبہ میں ایسے مبلغین کی جماعت تیار ہو گئی جو فنِ مناظرہ کے ساتھ سنسکرت میں بھی کافی دخل رکھتی تھی، اور مخالفین کے اعتراضات کا دندان شکن جواب دینے کے علاوہ انکے مذہب پر براہ راست حملہ آور ہو کر خود اُن کو ہی مدافعت پر مجبور کر دیتی تھی، اس کا یہ اثر ہوا کہ زیادہ عرصہ نہ گذرنے پایا تھا کہ مخالفین کی سرگرمیاں سرد پڑ گئیں اور آریہ سماج کے مشن نے ملک میں جو ناگوار فرقہ وارانہ مذہبی فضا پیدا کر دی تھی وہ ختم ہو کر حالات سابقہ معمول پر لوٹ آئے۔

۱۳۴۴ھ چار سالہ مالیات کا مدّوجزر

۱۳۴۱ھ میں شدھی سنگٹھن کا ہنگامہ جس شدّ و مدّ اور زور شور کے ساتھ اٹھا تھا اس کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ مسلمان ہمہ تن اس طرف متوجہ ہو گئے، وقت کا یہ تقاضہ بھی بجائے خود بڑی اہمیت رکھتا تھا مگر ان حالات کا دارالعلوم کے مالیہ پر اثر پڑنا بھی ناگزیر تھا، ۱۳۴۰ھ میں آمدنی کا اوسط ۸۲ ہزار اور صرف ۶۸ ہزار تھا، ۱۳۴۱ھ میں آمدنی ایک دم گھٹ کر ۵۹ ہزار ہو گئی مگر صرف ۶۲ ہزار ہوا، البتہ ۱۳۴۲ھ میں سابقہ کمی کی بہت حد تک تلافی ہو گئی، اس سال آمدنی ۹۴ ہزار اور صرف ۹۷ ہزار رہا، مگر چوں کہ سابقہ قضیے کے اثرات ابھی تک باقی تھے اس لئے ۱۳۴۳ھ میں پھر کم ہو کر آمدنی تو ۷۳ ہزار پر آگئی مگر مصارف ۹۹ ہزار پر پہنچ گئے۔ مگر اس چار سالہ آمد و صرف کے عدم توازن اور مدّ و جزر کے باوجود آخری نتائج کی یکسانیت حیرت انگیز رہی، کہ دارالعلوم کا تمام کاروبار بلا ادنیٰ تغیر کے بدستور جاری رہا، اس چیز کو دارالعلوم کے اعجاز سے تعبیر کرنا بے جا نہیں ہے! والحمد للہ علیٰ ذالک۔

۱۳۴۴ھ حضرت مہتمم صاحب کی حیدرآباد سے واپسی

۱۳۴۰ھ کے حالات میں گذر چکا ہے کہ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کو نظام دکن نے عدالت عالیہ کے عہدۂ صدر مفتی کیلئے تین سال کے واسطے طلب فرمایا تھا، مجلس شوریٰ نے آپ کی تین سال کی رخصت منظور کرتے ہوئے یہ طے کر دیا تھا کہ زمانۂ قیام حیدرآباد میں آپ کا تعلق دارالعلوم سے بدستور باقی رہے گا، چنانچہ اس فیصلے کے مطابق دارالعلوم کے تمام اہم امور آپکی رائے اور مشورہ سے انجام پاتے رہے جیسا کہ سابقہ سطور میں گذر چکا ہے اس کے علاوہ آپ ہر سال دو تین ماہ کے لئے دیوبند تشریف لاکر دارالعلوم کی خدمت اصالۃً بھی انجام دیتے تھے، تین سالہ مدت کے اختتام پر شاہی فرمان کے ذریعے اس مدت میں

ایک سال کی مزید توسیع کی گئی، لیکن زمانۂ توسیع میں صحت خراب ہوگئی، جب علالت کا سلسلہ زیادہ بڑھا تو آپ قبل از وقت مستعفی ہوکر اوائل ربیع الآخر میں دیوبند تشریف لے آئے، حیدرآباد سے رخصت کی تقریب باغِ عامہ میں نظام دکن نے بنفس نفیس شرکت فرماکر حضرتِ ممدوح کی خدماتِ جلیلہ کی نہایت شاندار الفاظ میں تعریف و تحسین فرمائی، اور حُسنِ خدمات کے صلے میں پانسو روپیہ ماہانہ وظیفہ کے اجرار کا فرمان صادر ہوا۔ غرض کہ حضرت ممدوح کا تعلق جس غیر معمولی اعزاز و احترام کے ساتھ شروع ہوا تھا، اسی طرح نہایت عزّت و وقار کے ساتھ انجام پذیر رہا۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب بجائے حضرت مہتمم صاحب

حضرت ممدوح کے استعفار کو منظور کرتے ہوئے نظام دکن نے فرمایا تھا، کہ ہم آپ کی جگہ پر مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی کا تقرر کرنا چاہتے ہیں، آپ ان سے دریافت کرکے جواب دیں" حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے امتثالِ امر کے طور پر یہ تعلق منظور فرمالیا اور ۲۲ جمادی الاولیٰ کو حیدرآباد تشریف لے گئے، لیکن دو تین ماہ کے بعد جب حضرت مہتمم صاحب کی علالت نے طول کھینچا تو مجلس شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا کہ حضرت مولانا کو واپس بلا لیا جائے، چنانچہ اس مقصد کے لئے نظام کی بارگاہ میں مجلس کی جانب سے ایک معروضہ ارسال کیا گیا جس میں دارالعلوم کی اہمیت اور اس کی ضرورت کے پیش نظر استدعا کی گئی تھی کہ حضرت مولانا کو مراجعتِ دیوبند کی اجازت مرحمت فرمائی جائے، چنانچہ حضرت ممدوح حیدرآباد سے رخصت ہوکر ۱۲ ربیع الاوّل ۱۳۴۷ھ کو دیوبند تشریف لے آئے

حضرت تھانویؒ کی سرپرستی

حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ کی وفات کے بعد سے اب تک سرپرستی کے لئے کسی مقدس اور باا ثر شخصیت کا انتخاب نہ ہوسکا تھا۔ اس اہم منصب کو پُر کرنے کے لئے مجلس شوریٰ

نے مولانا سعیدالدین صاحب رکن مجلس کی تحریک پر متفقہ طور پر حضرت تھانوی قدس سرہٗ کو سرپرستی کے لئے تجویز کیا، حضرت ممدوح ابتداءً اپنی کثیر مصروفیتوں کے سبب سے آمادہ نہ تھے، مگر جب مجلس اور اہتمام کی جانب سے زیادہ اصرار ہوا تو بالآخر آپ نے قبول فرمالیا۔

ایک اہم حادثہ

یوں تو دارالعلوم اپنے آغاز ہی سے خلافتِ راشدہ کی طرح گوناگوں حوادثات کا شکار رہا ہے، مگر اس سال کے اواخر میں جو اہم حادثہ پیش آیا وہ دارالعلوم کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا حادثہ تھا، اب تک جو حوادث پیش آئے تھے وہ باہر سے اٹھے ہوئے عوارض تھے، مگر یہ حادثہ اندرونی طور پر رونما ہوا تھا، اولاً بعض شعبوں کے منتظمین کے خلاف طلبار کی ہنگامی شکائتوں سے اس کا آغاز ہوا، عام طور پر ہر جگہ ایسی شکائتیں منتظمین کے خلاف اکثر پیدا ہوجایا کرتی ہیں، مولوی گل محمد خاں مرحوم سے مطبخ وغیرہ مختلف شعبوں کا کام متعلق تھا، طلبار کو ان سے زیادہ شکایات تھیں، ان معمولی باتوں نے شعبان میں سالانہ امتحان کے موقع پر عین دارالامتحان میں اچانک ایک ایسے حادثے کی شکل اختیار کرلی جو آگے چل کر دارالعلوم کی تاریخ میں ایک بڑا اور اہم ہنگامہ بن گیا، مولوی گل محمد خاں مرحوم کے ساتھ زدوکوب کا افسوسناک اور توہین آمیز معاملہ کرنے کے جرم میں پانچ طلبار کا اخراج عمل میں آیا اسی کے ساتھ جن منتظمین سے طلبار کو شکایات تھیں انھیں بھی مؤثر فہمائش کردی گئی مگر مذکورہ طلبار کے اخراج سے طلبار کی ایک بڑی جماعت میں ہیجان پیدا ہوگیا، انھوں نے اپنے مطالبات میں قوت پیدا کرنے کے لئے "لجنۃ الاتحاد" کے نام سے ایک جماعت قائم کی، دارالعلوم کی جانب سے اس جماعت کو مخلِ انتظام سمجھ کر خلافِ قانون قرار دیا گیا، اس دوران میں سالانہ امتحان کے بعد عام تعطیل ہوگئی، طلبار کے اپنے اپنے وطن چلے جانے سے اس وقت یہ ہنگامہ فرو ہوگیا۔

۱۳۴۵ھ، گذشتہ ہنگامے کی تجدید

گذشتہ سال طلبار کے جس ہنگامے کا آغاز ہوا تھا وہ اگرچہ اُس وقت بالکل وقتی حالات کا نتیجہ معلوم ہوتا تھا، طلبار کو بعض منتظمین سے جو شکایات تھیں اُن کا بروقت تدارک کر دیا گیا تھا مگر بعد میں بتدریج شکایتوں میں اضافہ ہوتا گیا، اور رفتار کے ہر موڑ پر اچانک ایسی تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں جنھوں نے حالات کو شدید سے شدید تر بنا دیا، طلبہ کی انجمن "لجنۃ الاتحاد" جس کی بنیاد گذشتہ سال پڑ چکی تھی، نہ صرف یہ کہ وہ باقی تھی بلکہ اُس کی طاقت میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا، لیکن اب تک جو کچھ ہوا وہ صرف طلبہ ہی کی حد تک محدود تھا، طلبہ کو اساتذہ کی اعانت حاصل نہ تھی کہ دفعتہ شعبان کے پہلے ہفتے میں حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب نے طلبار کے مطالبات کی تائید میں یکے بعد دیگرے دو مرتبہ مسجد دار العلوم میں تقریر فرمائی، حضرت شاہ صاحبؒ کے ساتھ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا سراج احمد صاحبؒ اور چند دوسرے اساتذہ بھی شریک ہو گئے، امتحان سالانہ کے موقع پر منتظم مطبخ کو مطبخ سے علیحدہ کئے جانے کا مطالبہ طلبار کی جانب سے کیا گیا، یہ مطالبہ منتظم اور طلبہ کی ایک معمولی آویزش پر مبنی تھا، ادھر تو اہتمام کو اس مطالبے کے جائز ہونے میں کلام تھا اور اُدھر طلبہ کو منتظم مطبخ کی علیحدگی پر شد و مد سے اصرار تھا، یہ احتجاج یہاں تک بڑھا کہ اس کو مخل نظم قرار دے کر ایسے طلبار کا اخراج کر دیا گیا جو ایجی ٹیشن کی رہ نمائی میں سرگرمی سے حصہ لے رہے تھے، مذکورہ طلبہ کے اخراج پر ہیجان اور بڑھ گیا، اب "لجنۃ الاتحاد" نے اپنے مطالبات اخبارات کے ذریعے ملک کے سامنے پیش کئے، اس پر تائیدی اور تردیدی مضامین کا ایک طویل سلسلہ عرصے تک اخبارات میں چلتا رہا۔

دستورِ اساسی میں ترمیم

گذشتہ سال سے دار العلوم کے اندرونی نظام

میں اختلافات کے سبب سے جو حالات پیش آرہے تھے اُن پر قابو حاصل کرنے کے لئے یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ اہتمام کے اختیارات کو نسبتہً وسیع کردیا جائے، اس کے لئے قدیم دستور اساسی میں تغیر و تبدل کیا گیا، حضرت سرپرست صاحب کی سہولت کی غرض سے مجلس شوریٰ کا اجلاس دیوبند کے بجائے تھانہ بھون میں منعقد ہوا، دستور اساسی کے قواعد و ضوابط کی تفصیل نظم و نسق کے عنوان سے آئندہ اوراق میں پیش ہوگی۔

مجلس انتظامیہ کا قیام

دستور اساسی میں ترمیم و تنسیخ کے ساتھ مجلس شوریٰ نے اپنے کاموں میں امداد و اعانت اور تخفیف کار کے پیش نظر "مجلسِ انتظامیہ" (مجلسِ عاملہ) کے نام سے ایک ذیلی مجلس قائم کی، جس کے ارکان کی تعداد پانچ مقرر کی گئی، مجلس انتظامیہ کے اراکین کے انتخاب میں اس بات کو ملحوظ رکھا گیا کہ یہ ایسے اراکین پر مشتمل ہو جو دیوبند کے قرب و جوار میں مقیم ہوں تاکہ ماہانہ اجلاسوں میں بسہولت شرکت کر سکنے کے علاوہ وقتاً فوقتاً دارالعلوم کا معائنہ بھی کرتے رہیں۔

۱۳۴۶ھ حضرت شاہ صاحبؒ کے ہم خیال حضرات کا استعفار

گذشتہ دو سال سے اختلافات کا جو خلفشار چل رہا تھا ہر چند اس میں بعض اوقات کمی تو ہو جاتی تھی مگر اس کا بالکلیہ ازالہ نہیں ہوتا تھا اس لئے وہ دب دب کر بھی بار بار نمایاں ہو جاتا تھا، ذیقعدہ ۱۳۴۵ھ میں حضرت شاہ صاحبؒ رخصت پر اپنے وطن کشمیر تشریف لے گئے، ماہ صفر ۱۳۴۶ھ کے وسط میں آپ نے وہیں سے استعفار بھیجدیا، ۲ ربیع الاول کو حضرت شاہ صاحبؒ واپس دیوبند تشریف لائے اور چونکہ مستعفی ہو چکے تھے اس لئے درس شروع نہیں فرمایا، دارالعلوم میں صدر المدرسین کی شخصیت کو ہمیشہ خاص اہمیت حاصل رہی ہے، اس لئے حضرت شاہ صاحبؒ کی علیحدگی سے طلبہ کا متاثر ہونا لازمی تھا، چنانچہ ۳ ربیع الاول یعنی حضرت شاہ صاحبؒ کی واپسی کے

دوسرے دن سے "لجنۃ الاتحاد" کی جانب سے تعلیمی اسٹرائک کر دی گئی، جو مسلسل دس دن تک جاری رہی۔ دارالعلوم میں تعلیمی معاملے کا یہ پہلا موقع تھا، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ اور مولانا احمد سعید صاحب دہلویؒ کی سعی و کوشش سے چند دنوں کے لئے بظاہر مفاہمت ہوگئی جس کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت اسٹرائک ختم کر دی گئی۔[1]

---

[1] اختلاف کا یہ سلسلہ جو ۱۳۴۳ھ سے شروع ہوا تھا تقریباً ۱۳۴۶ھ تک باقی رہا، دارالعلوم کے ریکارڈ سالانہ رودادوں اور نیز اس سلسلے میں شائع ہونے والے اخبار "الانصار" اور "مہاجر" کے فائلوں میں تفصیلی حالات مذکور ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ یہ باتیں وقتی تھیں، اب نہ وہ حالات باقی ہیں اور نہ اُن واقعات کی تفصیلات اپنے اندر کوئی مفید پہلو رکھتی ہیں، راقم سطور نے جزئیات و تفصیلات کو ترک کر کے واقعات کے ایسے نقاط کا بیان کر دینا کافی سمجھا ہے جن سے واقعات کے اہم پہلو سامنے آجائیں۔

دونوں جماعتوں کے اکابر اور اُن کے علم و فضل دیانت و صداقت اور ورع و تقویٰ کے پیش نظر اختلافات کی نوعیت کو دیانتدارانہ اختلاف رائے پر مبنی سمجھنا چاہیئے جیسے بہت سے ائمہ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے اختلاف و مشاجرات تاریخ کے صفحات میں مذکور ہیں، رائے کا اختلاف انسانی طبیعت کا فطری خاصہ ہے! نیک نیتی پر مبنی اختلاف رائے کو زبانِ نبوت میں "اختلاف اُمتی رحمۃ" سے تعبیر کیا گیا ہے، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی جب ۱۳۵۴ھ میں دارالعلوم کے صدر مہتمم کی حیثیت سے تشریف لائے تو ایک عام اجتماع میں اس اختلاف و خلفشار کے اسباب بیان کرتے ہوئے نہایت بلیغ انداز میں فرمایا تھا کہ "جس طرح ایک خاص موسم میں سمندر میں جوش و خروش اور ہیجان و تلاطم پیدا ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سمندر کے بخارات بادل کی شکل اختیار کر کے اُسی وقت زمین کی شادابی اور سرسبزی کا سبب بنتے ہیں جبکہ زمین اپنی خشکی اور تشنگی کے سبب پانی کی سخت محتاج ہوتی ہے لیکن جب سمندر میں گرمی پیدا ہو کر تموج اور تلاطم پیدا ہوتا ہے (باقی صفحہ ۲۷۳ پر ملاحظہ ہو)

اوائل رجب میں مجلس شوریٰ کا اجلاس منعقد ہوا، جس میں بربنائے اختلاف حضرت مفتی صاحب اور مولانا سراج احمد صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہوجانے کی درخواست کی گئی، ان حضرات کے استعفار پر چند دوسرے اساتذہ نے بھی احتجاج کے طور پر اپنے اپنے استعفار پیش کر دیئے، اس پر طلبار نے احتجاجاً دوسری مرتبہ پھر اسٹرائک کی، یہاں یہ بتلادینا بھی ضروری ہے کہ اس اختلاف کے پورے زمانے میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) تو کچھ جزوی نقصانات بھی ہوجایا کرتے ہیں، جس سے بسااوقات سمندر میں چلنے والے جہاز تک خطرے میں پڑ جاتے ہیں، مگر جن لوگوں کی نظر حق تعالٰی کی حکمت بالغہ پر ہوتی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ اس نقصان میں بھی کوئی نفع کلی ضرور ہے، گو سمندر کا یہ تلاطم اور جوش کچھ لوگوں کو اضطراب و ہلاکت میں ڈالدینے والا ہوتا ہے مگر اسی سے مخلوق کے لئے زندگی کا کوئی عظیم الشان فائدہ اور سامان بھی مشیتِ الٰہی کے پیش نظر ہوتا ہے۔

بالکل اسی طرح دارالعلوم کے علمی سمندر میں بھی ایک طوفان جوش اور تلاطم اٹھا اور اس کی موجیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں، اس تموج و تلاطم سے کچھ نقصانات بھی پہنچے، مگر یہاں سے بخارات کے جو بادل اٹھے وہ ابر رحمت بن کر گجرات کی اُس دور افتادہ سرزمین پر جاکر برسے جو علم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے بالکل محروم اور بے بہرہ تھی، علمار دیوبند کے وہاں پہنچ جانے سے ڈابھیل میں جو عظیم الشان مدرسہ عالم وجود میں آیا اس کے علمی فیضان سے آج گجرات کا چپہ چپہ سیراب ہو رہا ہے، اور گجرات کا بدعت کدہ بحمداللہ آج قرآن و سنت کی روشنی سے منور ہے"

علامہ عثمانی کے الفاظ میں یہ ہے انجام دارالعلوم کے علمی سمندر کے اس جوش و تموج کا جس نے دارالعلوم کی فضار میں تین چار سال تک مسلسل طوفان اور تلاطم برپا رکھا، کسی نے سچ کہا ہے:-

خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد

سید محبوب رضوی

اساتذہ وطلبہ کی دو جماعتیں ہوگئیں تھیں، ایک جماعت اہتمام کے ساتھ تھی، اس جماعت کے طلبار "جمعیۃ الطلبار" کے ساتھ منسلک تھے، دوسری جماعت حضرت شاہ صاحبؒ سے وابستہ تھی، "لجنۃ الاتحاد" طلبار کی اسی مؤخر الذکر جماعت کا نام تھا، اسٹرائک اور مطالبات بھی اسی جماعت کی جانب سے تھے، اول الذکر جماعت نے نہ صرف یہ کیا کہ اسٹرائک میں کوئی حصہ نہیں لیا بلکہ اس نے پوری شدت کے ساتھ "لجنۃ الاتحاد" کا مقابلہ بھی کیا، تعلیمی سال کا یہ آخری مہینہ تھا، حالات پر قابو پانے کے لئے سالانہ امتحان کی تاریخیں کچھ مقدم کر دی گئیں، دو ثلث کے قریب طلبار شریک امتحان ہوئے اور ایک ثلث نے بدستور اپنا مقاطعہ جاری رکھا۔

دوسری اسٹرائک کے بعد سے حضرت شاہ صاحبؒ اور ان کے ہم خیال اساتذہ و طلبار کا رسمی تعلق دارالعلوم سے بالکل منقطع ہوگیا، نیز ان تمام طلبار کو دارالعلوم سے خارج کر دیا گیا جو "لجنۃ الاتحاد" سے دلچسپی رکھتے تھے۔

۱۳۴۷ھ، حیدرآباد کا تحقیقاتی وفد

گذشتہ دو تین سال سے اخبارات میں دارالعلوم کے نظم و نسق اور حسابات کی نسبت جس بے اطمینانی کا اظہار کیا جارہا تھا اس سے متاثر ہوکر متعدد مقامات سے مختلف اوقات میں متقدر حضرات دارالعلوم میں تشریف لائے حالات کا معائنہ کیا اور حسابات کی جانچ پڑتال کی، اس سلسلے میں نظام دکن نے حیدرآباد کے محکمۂ تعلیمات کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر سید محی الدین صاحب کو دارالعلوم کے حسابات کی جانچ و تنقیح کے لئے مامور فرمایا، سید صاحب اوائل محرم میں دیوبند تشریف لائے، محکمۂ تعلیمات کے "محاسب" ساتھ تھے، کئی روز قیام فرما کر حسابات کی جانچ کی، اساتذہ کے طرزِ تعلیم اور طریقِ درس کو دیکھا اور مختلف شعبوں کے کاموں کی تحقیقات کی۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ مہتمم دارالعلوم نے سید صاحب کے سامنے

اس موقع پر جو تحریر پیش کی اس میں نظام کی توجہ فرمائی کا خیر مقدم کرتے ہوئے دارالعلوم کے طریق کار پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی گئی تھی :-

"دارالعلوم کے موجودہ حالات چار حصوں پر منقسم ہوتے ہیں، حصہ اول، حساباتِ دارالعلوم، حصہ دوم، انتظاماتِ دارالعلوم، حصہ سوم، اصولِ دارالعلوم، حصہ چہارم اختلافاتِ دارالعلوم، حساباتِ دارالعلوم کے متعلق میں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ اگر ان میں کوئی خیانت ثابت ہوجائے تو بلاشبہ موجودہ مہتمم کا علیحدہ کیا جانا ضروری ہے، انتظاماتِ دارالعلوم کے متعلق ہمیشہ یہ اصول مرعی رکھا گیا ہے کہ عمل میں سہولت رہے، دارالعلوم کو کبھی یہ دعویٰ نہیں ہوا اور نہ ہوسکتا ہے کہ اس کے انتظامات نقائص سے مبرا و پاک ہیں، ایسا کوئی بھی نہیں کہہ سکتا، خدام دارالعلوم ہمیشہ اصلاح نقائص کے متلاشی و ساعی رہتے ہیں اور معقول مشورہ و اصلاح سے انحراف نہیں کرتے۔"

دارالعلوم کے تعلیمی اور حسابی امور کی عمدگی اور صحت و صفائی نے سید صاحبؒ کو بہت متاثر کیا آپ نے دارالعلوم کے متعلق جو رپورٹ پیش کی اس نے نظام کو دارالعلوم کی جانب سے بالکل مطمئن کردیا۔

حضرت حافظ صاحب کا سانحۂ وفات

نظام دکن نے حضرت حافظ صاحبؒ سے اس وقت جب آپ حیدرآباد میں افتاء کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے ایک مرتبہ دارالعلوم کے دیکھنے کا شوق ظاہر فرمایا تھا، اس سال کے اوائل میں ارباب حل و عقد کی رائے ہوئی کہ حافظ صاحب خود حیدرآباد تشریف لے جاکر نظام کو ان کا وعدہ یاد دلائیں اور دارالعلوم کی طرف سے یہاں قدم رنجہ فرمانے کی دعوت دیں، حضرت ممدوح نے باوجود پیرانہ سالی اور غیر معمولی ضعف و نقاہت کے جماعت کی خواہش کو منظور فرمایا، اور دکن کے طول طویل سفر کے لئے تیار ہوگئے، ۲۸ ربیع الثانی کو روانگی عمل میں آئی، حیدرآباد پہونچنے پر نظام سے ٹیلی فون پر گفتگو کے بعد ملاقات کا وقت مقرر ہوگیا، لیکن تقدیر الٰہی کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

ملاقات کے دن اچانک بواسیر کا (جس کا مدت سے عارضہ تھا) ایسا شدید دورہ ہوا کہ قوائے جسمانی نے جواب دینا شروع کر دیا، مرض کی شدت مایوس کن حالت تک پہنچ گئی، جب ملاقات کئے جانے کا کوئی امکان باقی نہ رہا تو یہ رائے قرار پائی کہ آپ کو بعجلت ممکنہ دیوبند لیجایا جائے، سکنڈ کلاس کا ایک پورا کمرہ ریزرو کرایا گیا اور آپ اپنے رفقائے سفر کی معیت میں ۳ر جمادی الاولیٰ کی صبح کو حیدرآباد سے دیوبند کے لئے روانہ ہو گئے، جب ٹرین نظام آباد کے اسٹیشن کے قریب پہنچی تو زبان پر ذکر اللہ جاری تھا ۹۰ کے عدد پر عقد انامل تھا کہ اللہ کے لفظ کے ساتھ روح پرواز کر گئی رحمۃ اللہ رحمۃً واسعۃً!

نظام آباد اسٹیشن پر نعش اتاری گئی شہر میں خبر پہونچتے ہی لوگوں کا ہجوم ہو گیا اور جنازہ تیار کیا گیا، متعلقین اور نظام کو تار کے ذریعے اطلاع دی گئی، نظام کا جواب آیا کہ حافظ صاحب کا جنازہ حیدرآباد لایا جائے، چنانچہ جنازہ حیدرآباد لے جایا گیا، نظام آباد اور حیدرآباد میں متعدد جگہ نماز جنازہ پڑھی گئی، اگلے روز ۴ر جمادی الاولیٰ کو قبیلِ عصر نظام کی تجویز کے مطابق حیدرآباد کے مخصوص قبرستان میں جو خطۂ صالحین کے نام سے خود نظام نے اکابر و متعلقین کے لئے بنایا تھا موتِ عزت کے اس شہید کو شاہانہ اعزاز کیساتھ سپردِ زمین کر دیا گیا، نظام نے باغِ عامہ کی مسجد میں تعزیتی تقریر کرتے ہوئے نہایت تاسف کے ساتھ یہ پُر اثر جملہ فرمایا کہ " افسوس وہ مجھے لینے آئے تھے مگر خود یہیں رہ گئے "۔

حافظ صاحبؒ کا عہدِ اہتمام درحقیقت دارالعلوم کی تاریخ کا ایک زرّین اور تابناک باب ہے، انھوں نے دارالعلوم کی جو عظیم خدمات انجام دیں اور دارالعلوم نے اُن کے عہدِ اہتمام میں جو عظیم الشان اور ہمہ جہت ترقی حاصل کی اس کی وجہ سے پورے ملک میں اُن کی وفات کو ملت کا زبردست صدمہ تصور کیا گیا، ہندوستان کے طول و عرض میں ان کی وفات پر جا بجا تعزیتی اجتماعات منعقد کئے گئے جن میں ان کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا اور ایصالِ ثواب کرایا گیا، یہ سب تفصیلات حافظ صاحبؒ کے حالات میں پیش کی جائیں گی۔

۴۸۔۱۳۴۹ھ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی کا حادثۂ وفات

گذشتہ سال حضرت حافظ صاحبؒ کی وفات سے دار العلوم کو کیا بلکہ پوری جماعت کو جو شدید زخم پہنچا تھا ابھی وہ مندمل نہ ہونے پایا تھا کہ امسال حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کی وفات کا حادثہ عظیم پیش آگیا۔

۱۳۴۸ھ کی روداد میں لکھا ہے کہ "یہ سال مقاصد دار العلوم کی کامیابی کے لحاظ سے ایک کامیاب سال تھا، شعبوں کی ترقیات نے دار العلوم کو سنین گذشتہ کی نسبت اوج ترقی پر پہنچا دیا تھا، طلبہ کی تعداد آمد و صرف کی وسعت، سامان کی افزائش، رجوعِ عام کی بہتات وغیرہ سب ہی ترقی پذیر تھے۔

لیکن ان ہی ترقیات کے وفور میں تقدیرِ الٰہی سے ایک ایسا الم ناک حادثہ بھی دار العلوم کے لئے مقدر تھا جو تاریخ دار العلوم کے لحاظ سے ہمیشہ اس کے احاطہ میں الم انگیز نگاہوں سے دیکھا جائے گا، اور گو ہم آسے دار العلوم کے لئے تنزل سے تعبیر نہ کرسکیں لیکن طبعی جذبات کی رُو سے یہ ضرور کہیں گے کہ اس واقعے نے تمام ترقیات کو تاریک بنا دیا، اور ماضی کی مسرتیں حال کے اندوہ پر غالب نہ رہ سکیں، یہ حادثہ فخر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی کی وفات حسرتِ آیات کا تھا، جس نے اس حریم علم و عمل کو ۱۳۴۷ھ کے بعد پھر ایک دفعہ مجسمۂ غم و حسرت بنا دیا، ابھی گذشتہ سال کا سانحہ جانگداز یعنی ۱۳۴۷ھ میں حضرت صدر مہتمم صاحب کی دائمی مفارقت کا داغ سینوں سے محو نہ ہونے پایا تھا کہ ۱۳۴۸ھ میں اس سانحہ روح فرسا نے اس زخم کو اور گہرا کر دیا۔"

۳ رجب ۱۳۴۸ھ کی تاریخ دار العلوم کے لئے ایک قیامت خیز تاریخ تھی، جبکہ شب کو ۸ بجے دار العلوم اس مبارک ہستی کے فیوض و برکات سے محروم ہو رہا تھا اور ہر شخص تصویرِ غم بن گیا تھا، ۱۳۴۷ھ میں جو یتیمی دار العلوم پر آئی تھی ۱۳۴۸ھ کی اس

تاریخ میں اس کی پوری تکمیل ہو گئی، ۳؍ رجب کی درمیانی شب میں نعشِ مبارک دارالاہتمام میں محفوظ رکھی گئی، جس چارپائی کو حضرت مرحوم کی شخصیت سے ۳۰ برس تک زینت رہی تھی آج کی شب وہ چارپائی بصورت جنازہ سب خدام کے لئے حسرت و یاس کا باعث بنی ہوئی تھی، ۴؍ رجب کو جمعہ تھا، علی الصباح تجہیز و تکفین کے فرائض عمل میں آئے تقریباً ۱۰ بجے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ نے نماز جنازہ پڑھائی، مجمع کی انتہا نہ تھی، صحن دارالعلوم ہجوم سے پُر تھا، طلبا اور اہل شہر ٹوٹے پڑتے تھے ۱۱ بجے کے عمل میں جنازہ قاسمی قبرستان میں پہنچایا گیا اور ۱۲ بجے تک اس گنجینۂ علم و عمل اور فہم و فراست کے خزانے کو سپردِ خاک کر کے سب لوگ خالی ہاتھ واپس چلے آئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مرحوم کے عزم و استقلال، ہمت و جرأت دانش و تدبر، فکر و نظر، علم و تبحر اور اسی کے ساتھ غیر معمولی انتظامی قابلیت، غرض کہ ہر حیثیت سے آپ کی وفات ملک میں غیر معمولی اور منفرد تسلیم کی گئی تھی، ادب و تاریخ کی وسیع النظری مشہور زمانہ تھی، تاریخی حیثیت سے آپ کی معرکۃ الآرا اور مقبولِ زمانہ تصنیف اشاعتِ اسلام ایک زبردست شاہکار اور ایک عظیم یادگار ہے، نیز متعدد ادبی تصانیف مثل لامیۃ المعجزات اور قصیدہ مناجاتیہ وغیرہ عربی قصائد حضرت مرحوم کی ادبیت کے شاہدِ عدل ہیں۔

اہتمام کے لئے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کا انتخاب

اواخر ۱۳۳۹ھ میں مجلس شوریٰ کے رکن مولانا سعید الدین صاحب رام پوری نے مجلس میں یہ تحریک پیش کی تھی کہ حضرت مہتمم صاحب اپنی کبر سنی کے سبب سے ضعیف ہو گئے ہیں، ہر چند ان حضرات نے اب تک خدماتِ دارالعلوم میں کوئی فرق نہیں آنے دیا، تاہم مجلس شوریٰ کا یہ فرض ہے کہ وہ اس امر کا احساس کرتے ہوئے ایسے وسائل اختیار کرے جس سے ان حضرات کو فی الجملہ اپنے

کاموں میں امداد مل سکے، تجویز کا متن یہ تھا۔

"حضرت مہتمم صاحب اور نائب مہتمم صاحب سلمہا اللہ تعالٰے کی جو کچھ خدمات ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔ اب یہ دونوں حضرات بوجہ تقاضائے عمر و نیز بسبب امراض گوناگوں ضعیف ہو گئے ہیں، اگرچہ خدمات دارالعلوم میں کسی قسم کا فرق نہیں آنے دیتے ہیں لیکن مجلس شوریٰ کا فرض ہے کہ وہ اس بات کا احساس کر کے ایسے وسائل پیدا کرے جس میں ہر دو حضرات کو خاص طور سے اپنے کاموں میں امداد ملے، لہذا ایک عہدہ نائب دوم کا تجویز کرنا ضروری ہے، اور اس خدمت پر ایسا شخص تجویز کرنا ضروری ہوگا جو صاحب علم، عالی خاندان اور با اثر ہو، دارالعلوم کے ساتھ سچی اور دلی ہمدردی مثل ان ہر دو حضرات کے رکھتا ہو، لہس میں اپنی رائے میں اس عہدہ کے لئے مولانا قاری محمد طیب صاحب سلمہ اللہ تعالٰے کو تجویز کرتا ہوں، مولانا موصوف نوجوان، صالح، صاحب علم اور عالی خاندان اور دارالعلوم کے ساتھ آبائی نسلاً بعد نسلٍ سچی و دلی ہمدردی رکھنے والے ہیں۔

حضرت مہتمم صاحب، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند اکبر ہیں، مولانا محمد طیب صاحب پوتے، حضرت مہتمم صاحب کے زمانے میں دارالعلوم کو جس قدر ترقیات آمدنی میں ہوئیں اور جس قدر درجاتِ تعلیم المضاعف ہوئے، جس قدر طلباء کی تعداد بڑھی، اور جس قدر ہندوستان سے باہر دور دراز اقالیم و ممالک میں اس دارالعلوم کی قدر و منزلت قلوب میں عامۃ روز افزوں پیدا ہوئی اس کے ثبوت میں خود دارالعلوم ایک مجسم شہادت موجود ہے، لہذا تمام مسلمانان بہی خواہان دارالعلوم پر عموماً اور مجلس شوریٰ پر خصوصاً روحانی طور سے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اس خاندان کے کسی فرد کے ہاتھ میں بشرط قابلیت وصلاحیت نظام دارالعلوم

تجویز کر دیا جائے تاکہ وہ روحانی نبض جو ترقیات دارالعلوم میں باطنی طور پر مُمد و معاون ہے برابر جاری رہے[1]۔

مجلس کی اس تجویز کی رُو سے ۱۳۴۱ھ میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کو نائب مہتمم بنایا گیا مگر یہ عہدہ آپ کے طبعی رجحان کے خلاف تھا، آپ انتظامی اُمور سے علیحدہ رہ کر یکسوئی کے ساتھ علمی اور تدریسی مشاغل کو پسند فرماتے تھے، چنانچہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد اپنی خواہش و اصرار سے اپنے آپ کو شعبۂ تعلیم میں منتقل کرالیا، مگر بالآخر اکابر کے اصرار نے مجبور کیا اور پھر آپ کو نیابت اہتمام کا عہدہ سنبھالنا پڑا، جس پر اوائل رجب ۱۳۴۸ھ تک فائز رہے۔ حضرت مولانا عثمانی کی وفات کے بعد مجلس شوریٰ نے پہلے تجربے کے طور پر قائم مقام مہتمم بنایا اور جب اس امر کا یقین ہو گیا کہ اس اہم منصب کے سنبھالنے کی آپ میں بدرجۂ اتم صلاحیت موجود ہے تو مندرجہ ذیل فیصلے کے ساتھ آپ کو مستقل طور پر مہتمم مقرر کر دیا گیا، مجلس کی تجویز یہ ہے:۔

"ہم سب ممبران مجلس شوریٰ دارالعلوم دیو بند نے ۸ شوال ۱۳۴۸ھ سے ۱۲ شوال ۱۳۴۸ھ تک دارالعلوم میں رہ کر دارالعلوم کے تمام شعبوں کا غور سے معائنہ کیا، جو امور بحث طلب مہتمم صاحب نے مجلس شوریٰ میں پیش کئے ان کا بلا رو رعایت تصفیہ کیا، ہم ممبران اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ جب سے مولوی قاری محمد طیب صاحب نے زمام اہتمام اپنے ہاتھ میں لی ہے ان کے ہر طریق عمل سے صدق و اخلاص نیت، حُب و بغض فی اللہ اور ادائے حقوق و فرض شناسی میں عزم قوی اور ثبات و استقلال بوجہ احسن ثابت ہوتا ہے، وللہ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ، ہم سب حق تعالیٰ کے فضل و کرم سے قوی اُمید

---

[1] رجسٹر تجاویز مجلس شوریٰ ۱۳۴۰ھ۔

رکھتے ہیں کہ اس تھوڑی سی مدت میں جن خوبیوں کا مہتمم صاحب سے ظہور ہوا ہے انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ اس سے اضعافاً مضاعفۃً ظاہر ہوگا، وما ذلک علی اللہ بعزیز، یہ الفاظ بے اختیار قلب سے نکلے ہیں اس میں نہ تصنع کو دخل ہے اور نہ مہتمم صاحب کی خدمات کی داد ہے"[1]۔

مسجد میں اضافہ اور دارالحدیث کی تکمیل

طلباء کی روز افزوں کثرت کے سبب سے مسجد دارالعلوم تنگ ہوگئی تھی، بالخصوص دھوپ اور بارش میں سخت تکلیف پیش آتی تھی اس لئے حضرت مولانا محمد طیب صاحب نے سب سے پہلے جو اقدامی تجویز اپنے قلم سے لکھی وہ مسجد کی بالائی منزل کی تعمیر سے متعلق تھی، نیز صحنِ مسجد کو بھی مشرق کیجانب بڑھایا گیا، اور حوض جو پہلے صحن کے آخر میں تھا توسیع کے بعد تقریباً وسط میں ہوگیا، اس تعمیر کے تمام مصارف سید زین العابدین صاحب حیدرآبادی نے ادا فرمائے۔ دارالحدیث کی پُرشکوہ عمارت جو عرصے سے زیرِ تعمیر تھی بحمداللہ ۱۳۴۹ھ میں بہمہ وجوہ مکمل ہوگئی۔

۱۳۵۰ھ، دورۂ تفسیر کا اجراء

دارالعلوم میں عرصے سے یہ تجویز زیرِ غور تھی کہ جس طرح حدیث کی اعلیٰ تعلیم دورۂ حدیث کے ذریعے دی جاتی ہے، اسی طرح تفسیر میں بصیرت پیدا کرانے کے لئے نصابِ تعلیم میں دورۂ تفسیر کا اجراء کیا جانا ضروری ہے، اب تک علم تفسیر میں جلالین اور تفسیر بیضاوی کی صرف سورہ بقرہ داخل نصاب تھی، ان کتابوں کی تعلیم سے قرآن فہمی میں اس قدر مناسبت اور استعداد تو ضرور پیدا ہو جاتی تھی کہ طالب علم فراغتِ تحصیل کے بعد ذاتی مطالعے سے مزید بصیرت حاصل کر سکتا تھا نیز ضرورت کے وقت آیاتِ قرآنیہ سے فی الجملہ استفادہ بھی

---

[1] روداد ۱۳۴۸و۱۳۴۹ھ ص ۵"۔

کرسکتا تھا مگر چونکہ سب لوگوں کو بالعموم ایسے حالات میسر نہیں آتے کہ وہ زمانۂ تحصیل علم کے بعد علوم سے مزاولت باقی رکھکر اپنے علم و معلومات میں مزید اضافہ کرسکیں، اس لئے ضرورت سمجھی گئی کہ زمانۂ تعلیم ہی میں تفسیر کے متعلق تفصیلی معلومات کا ذخیرہ طالب علم کیلئے مہیا کردیا جائے تاکہ بعد میں اگر مطالعۂ کتب کا موقع میسر نہ آئے تو محفوظ شدہ معلومات سے اسکی کچھ تلافی ہو سکے۔

ہندوستان کے اسلامی مدارس میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ سے پہلے علم حدیث کی بھی یہی حالت تھی، مشکوٰۃ المصابیح یا مشارق الانوار کا پڑھ لینا اس علم میں کافی سمجھا جاتا تھا، شاہ صاحب پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس قدیم روش میں تبدیلی کرکے حدیث کی تعلیم کے معیار کو بلند کیا، شاہ صاحبؒ کے اس معیار کی دارالعلوم نے کما حقہٗ اشاعت کی، اس لئے یہاں دورۂ حدیث کو تعلیم حدیث کے لئے ہمیشہ سے ممتاز حیثیت حاصل رہی ہے۔

دورۂ تفسیر کے اجراء کے ساتھ مزید دو کتابیں داخلِ نصاب کی گئیں، ایک تفسیر بیضاوی (مکمل) اور دوسری تفسیر ابن کثیر، یہ دونوں کتابیں فہم قرآن کے لئے علم تفسیر میں نہایت اہم سمجھی جاتی ہیں، دورۂ تفسیر سے پہلے جلالین اور اصول تفسیر میں الفوز الکبیر پڑھنا لازمی ہے، دورۂ تفسیر کے اجراء سے دارالعلوم میں علم حدیث کی طرح علم تفسیر کا معیار بھی بہت بلند ہوگیا ہے۔

تجوید کا لزوم تجوید کی تعلیم تو ۱۳۲۱ھ سے شروع ہوچکی تھی مگر اب تک اسکی مشق و تعلیم طلباء کے لئے اختیاری تھی، لازمی نہ تھی، اس سال سے تجوید کی مشق لازمی کردی گئی، اور یہ ضابطہ بنادیا گیا کہ جب تک طالب علم کم از کم پارۂ عم کی مشق نہ کرے سندِ فراغت نہ دی جائے۔

۱۳۵۲ھ، تعمیر دارالحدیث فوقانی ابتداءً جب دارالحدیث کا مسئلہ زیرِ غور

تھا تو تجویز یہ تھی کہ دارالحدیث کی عمارت "نودرے" کے اوپر تعمیر کی جائے، چنانچہ ۱۳۲۹ھ میں اس کا سنگِ بنیاد بھی رکھ دیا گیا لیکن اس کے بعد دوسری تجاویز کے مطابق ۱۳۳۱ھ میں دارالحدیث کی تعمیر کا آغاز بالائے نودرہ کے بجائے عقبِ نودرہ سے کیا گیا اور چند سالوں میں اہلِ خیر مسلمانوں کی توجہ اور بذلِ ہمت سے نہایت عظیم الشان عمارت عالمِ وجود میں آگئی جس میں ایک وسیع ہال کے علاوہ متعدد بڑے بڑے کمرے بنے ہوئے ہیں، اپنی نوعیت کی ہندوستان کے اسلامی مدارس میں یہ پہلی عمارت ہے مگر آغازِ تعمیر سے ٹھیک بیس سال بعد دارالعلوم کی روزافزوں ترقی کے باعث ضرورت محسوس ہوئی کہ ۱۳۲۹ھ کے مجوزہ نقشے کے مطابق ایک اور ہال درسِ حدیث کے لئے "نودرے" پر تعمیر کیا جائے، چنانچہ ۱۳۵۲ھ میں اس کی تعمیر کا آغاز کر دیا گیا اور چند سالوں میں بحمداللہ یہ عظیم الشان ہال تعمیر ہو گیا۔

قواعد داخلہ میں اصلاح

طلبار کے داخلے کا اب تک جو طریقہ رائج تھا وہ نہایت دقت طلب تھا، طلبار دستی درخواست کے ذریعے داخلہ کراتے تھے، اس میں عدم نظم وضبط کے سبب سے تقدیم وتاخیر طلبا کے لئے اکثر وبیشتر تکلیف اور پریشانی کی موجب ہوتی تھی، اس کو دور کرنے کے لئے اس سال داخلے کے فارم طبع کرائے گئے جو قدیم وجدید طلبار کے لئے علیحدہ علیحدہ ہیں، اس فارم کے ذریعے سے ایسا انتظام قائم کیا گیا ہے کہ ہفتہ بھر کے اندر اندر فارم تمام متعلقہ شعبہ جات سے گذر جائے اور داخلے کی جملہ ضروریات، اسباقِ متعلقہ، تعینِ اوقات، تقسیم کتب، اجرار امداد اور رہائش کا انتظام بر وقت ہوتا رہے۔

کھانے کے ٹکٹ

قواعد داخلہ کی طرح تقسیم طعام میں بھی مناسب اصلاح عمل میں لائی گئی، اب تک یہ طریقہ رائج تھا کہ طلبار مقررہ وقت پر مطبخ میں پہونچ جاتے تھے اور کیف ماتفق اپنا اپنا کھانا لے آتے تھے، اس میں

ازدہام کے علاوہ ایک بڑا نقص یہ بھی تھا کہ یہ پتہ چلنا دشوار رہتا تھا کہ کس طالب علم نے کھانا نہیں لیا یا کسی نے دو مرتبہ تو نہیں لے لیا، یہ بات محض مقسّمِ طعام کی قوتِ یادداشت پر منحصر تھی، اس طریقے کو منضبط بنانے کے لئے ایلمونیم کے مدوّر ٹکٹ بنواتے گئے یہ ٹکٹ صبح وشام کے لئے علیحدہ علیحدہ ہیں، ٹکٹوں پر صبح یا شام کے الفاظ کی صراحت کے علاوہ اختلاف رنگ کے ذریعے بھی ان کو ممتاز کردیا گیا ہے، ٹکٹوں پر نمبر کندہ ہیں، اور ہر نمبر کے دو ٹکٹ ہوتے ہیں، مطبخ کے رجسٹر میں طلبار کے نام درج ہوتے ہیں اور رجسٹر میں جس نمبر پر نام لکھا ہوتا ہے، وہی نمبر اس طالب علم کے ٹکٹ کا ہوتا ہے ٹکٹ داخل کرنے پر اگلے وقت کے لئے اُسی نمبر کا دوسرا ٹکٹ دے دیا جاتا ہے، مقسّم ٹکٹ ٹکٹ کو دیکھ کر کھانا حوالے کر دیتا ہے۔ اس طریقے سے جہاں طلبار کے لئے راحت و سہولت پیدا ہو گئی ہے، وہیں تقسیم میں بھی ضبط و نظم قائم ہوجانے کے سبب سے دوبارہ کھانا لے سکنے کا اندیشہ باقی نہیں رہا، اس کے علاوہ تقسیم طعام میں اگر کوئی طالب علم غیر حاضر ہو تو بسہولت اس کا پتہ چل جاتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ ایک ہزار طلبار کو گھنٹے بھر میں بآسانی کھانا تقسیم ہوجاتا ہے۔

۱۳۵۳ھ، ایک مبارک چندہ

شوال ۱۳۵۳ھ میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے۔ مکہ مکرمہ میں حضرت شاہ نیاز احمد صاحب نے جو شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہٗ کے خلیفہ تھے، چھ ہزار روپیہ دارالعلوم کے لئے عطا فرمائے، اس گراں قدر رقم کو دارالعلوم کے لئے ایک صاحبِ نسبت بزرگ کا متبرک عطیہ ہونے کے علاوہ سرزمینِ بیت اللہ کی موہبتِ عظیم سے اگر تعبیر کیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا، ارضِ بیت اللہ سے کسی بعید ترین ادارے کی امداد کا غالباً یہ پہلا موقع ہے۔

پنشن کا اجراء

دارالعلوم میں سرانجامی خدمت کی بلحاظ عمر کوئی تحدید نہیں ہے، جب تک کوئی کارکن باعتبار صحت قوی متعلقہ فرائض کو انجام دے سکتا ہے اس کے علم کی پختگی اور کارکردگی کے تجربے سے محروم ہونے کو پسند نہیں کیا جاتا، لیکن جب قوی کام کرنے سے جواب دے دیں اور سبکدوشی ناگزیر ہو جائے تو دیرینہ خدمت گذار کی خدمات کا از بس تقاضا ہے کہ اس کے ساتھ مروت و اخلاق اور دستگیری کا معاملہ برتا جائے، اب تک اس کے لئے کوئی ضابطہ مقرر نہ تھا، مولانا محمد یٰسین صاحب، منشی منظور احمد صاحب کو جو تقریباً ۴۰ سال سے درجۂ فارسی میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے سبکدوش کیا گیا تو مجلس شوریٰ نے یہ طے کیا کہ ان حضرات کی طویل خدمات کے پیشِ نظر ان کو پنشن دی جائے۔

۱۳۵۴ھ، صدارت اہتمام

گذشتہ سال حضرت مہتمم صاحب کے زمانہ سفر حج میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی عارضی طور پر قائم مقام مہتمم مقرر کئے گئے تھے، ۱۳۵۴ھ میں مجلس شوریٰ نے ممدوح کو اُن کی عظیم شخصیت اور علم و فضل کے پیشِ نظر صدارت اہتمام کے لئے منتخب کیا، اُس زمانے میں ممدوح کا مستقل قیام گجرات کے مشہور مدرسہ ڈابھیل میں تھا، مولانا عثمانیؒ وہاں سے بالکلیہ قطع تعلق کے لئے آمادہ نہ تھے، چنانچہ ابتداءً کچھ مدت تک یہ صورت رہی کہ کچھ عرصہ ڈابھیل میں قیام فرماتے تھے اور کچھ عرصہ دیوبند میں، مگر بالآخر دارالعلوم کی مرکزیت نے اُن کو یہاں کھینچ لیا۔

سرپرستی کا مسئلہ

اس سال کے اہم واقعات میں ایک واقعہ سرپرستی کا مسئلہ ہے، زمانۂ قدیم سے دارالعلوم کی سرپرستی کی یہ شکل تھی کہ جماعت میں جو شخصیت اپنے علم و فضل، ورع و تقوٰی، بزرگی اور اصابت رائے کے لحاظ سے زیادہ ممتاز ہوتی تھی اس کو دارالعلوم کے انتظامی امور کا مرجع الامر تصور کر کے

مجلس شوریٰ اپنی تجاویز کے فیصلوں میں سرپرست سے رجوع کرتی تھی، البتہ اس کیلئے کوئی ضابطہ مقرر نہ تھا اور واقعہ بھی یہ ہے کہ دارالعلوم میں نمود و نمائش کی ضابطہ بندیوں کے بجائے درحقیقت دیانت و اخلاق اور خلوص وللہیت پر زیادہ تر کاموں کی سرانجامی کا مدار رہتا آیا ہے، سرپرست کے اختیارات کا حاصل یہ تھا کہ ممبران میں اختلاف رائے کی صورت میں سرپرست کی رائے کے مطابق فیصلہ ہوتا تھا، اس میں خواہ سرپرست کی رائے قلت ہی کی جانب کیوں نہ ہو، البتہ اگر ممبران متفقہ طور پر کسی چیز کو پاس کرتے اور سرپرست کو اس سے اختلاف ہوتا تو وہ وجوہِ اختلاف کو مدلل تحریر کرکے مجلس میں دوبارہ غور و خوض کے لئے بھیج دیتے تھے، اس صورت میں اگر مجلس اپنی سابقہ رائے سے رجوع نہ کرتی تو البتہ مجلس ہی کی رائے برقرار رہتی تھی اور بغیر استرضائے سرپرست اس کا نفاذ ہو جاتا تھا۔

۱۳۴۵ھ میں جب انتظامی امور کے لئے قوانین مدون ہوئے تو مندرجہ بالا طریقِ عمل کو باضابطہ بنا دیا گیا، مگر ۱۳۴۸ھ میں کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ اس بارے میں مجلس شوریٰ کے اندر اختلاف رائے پیدا ہو گیا، ایک جماعت کی رائے تو اس طریقِ عمل کی حمایت میں تھی اور دوسری جماعت اس کو مجلس شوریٰ کی بے کسی اور عدم ضرورت سے تعبیر کرتی تھی اور فیصلہ کا مدار کثرت رائے پر رکھنا چاہتی تھی، چنانچہ مجلس شوریٰ کے متعدد اجلاسوں میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جو ۱۳۴۴ھ سے دارالعلوم کے سرپرست تھے از خود مصلحتاً سرپرستی سے مستعفی ہو گئے، رجب ۱۳۵۴ھ میں مجلس شوریٰ نے حسب ذیل الفاظ میں یہ استعفار منظور کر لیا:۔

مجلس شوریٰ کا یہ اجلاس پورے غور و فکر اور احترام و تقدیس اور عظمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے حضرت مولانا تھانوی مدظلہٗ کے استعفار کو نہایت افسوس کے ساتھ منظور کرتا ہے، اور حضرت ممدوح سے درخواست

کرتا کہ آپ اپنی دعوتِ صالحہ اور توجہاتِ عالیہ سے دارالعلوم پر ہمیشہ ظل گستر رہیں گے۔[1]

۱۳۵۵ھ، تین شعبوں کا قیام

دارالعلوم کے فضلاء اور بہی خواہان کی تنظیم، آمدنی کی توفیر، کاغذات و امسلہ کے تحفظ، طلباء کی جسمانی ورزش کے سلسلے میں حسبِ ذیل تین شعبے قائم کئے گئے۔

شعبہ تنظیم و ترقی

اس شعبہ کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ لٹریچر اور عملی کارروائی کے ذریعے ملک میں دارالعلوم کے فضلاء اور بہی خواہوں کے نام سے ایک ایسی جماعت قائم کی جائے جو دارالعلوم کے اثرات کو ہمہ گیر بنانے والی ہو اور جس کا ہر فرد خود بھی کم از کم ایک روپیہ سالانہ چندہ گذار ہو، اس سلسلے میں توفیر آمدنی کے لئے حسب ضرورت سفیر رکھے جاتے ہیں، جن پر ملک کے مختلف حصوں کو تقسیم کر دیا جاتا ہے، یہ سفراء اپنے اپنے علاقوں میں کام کرتے ہیں، شعبہ تنظیم و ترقی کی کارگذاری کی تفصیل آئندہ اوراق میں پیش کی جائے گی۔

محافظ خانہ

اب تک دارالعلوم کے شعبے جات و دفاتر کے کاغذات و امسلہ رجسٹر وغیرہ دفاتر ہی میں رکھے جاتے تھے، ان کی کوئی باقاعدہ ترتیب و تہذیب اور مرتب یادداشت نہ تھی، جس کے سبب سے اکثر و بیشتر بر وقتِ ضرورت مطلوبہ کاغذات کی دستیابی میں سخت مشکلات پیش آتی تھیں، دارالعلوم کی طویل عمر اور وسیع کاروبار نے ان مشکلات میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا، کاغذات مختلف شعبہ جات میں منتشر رہتے تھے، نیز اکثر کاغذات میں دفتری طریقِ کار کے لحاظ سے سُقم بھی باقی رہ جاتا تھا جو آئندہ کے لئے مضرت رساں بن جاتا تھا، اس کوتاہی اور دقت کو رفع کرنے کے لئے محافظ خانہ کے نام سے ایک شعبہ کا قیام عمل میں لایا

---

[1] رودادِ مجلس شوریٰ ۳۰ رجب ۱۳۵۴ھ۔

گیا، اور جملہ شعبوں کے تمام سابقہ اسلہ کاغذات اور دستاویزات کو محافظ خانہ میں منتقل کر کے ترتیب و انضباط کے ساتھ رکھا گیا تاکہ بوقت ضرورت کاغذات بسہولت حاصل ہوسکیں۔ اور ہر کاغذ کی دفتری ضابطے کے مطابق بروقت تکمیل ہوتی ہے اس وقت محافظ خانہ میں دارالعلوم کا ایک سو چودہ سال کا تاریخی سرمایہ محفوظ ہے۔

شعبہ ورزش

بقائے صحت کے لئے تفریح اور ورزش جس قدر ضروری ہے اس کے بیان کی ضرورت نہیں ہے، بالخصوص طلبار کے لئے جو دن رات دماغی محنت میں منہمک رہتے ہیں اس کا ہونا ازبس ضروری ہے، ہرچند طلبار اب تک بطور خود فرصت کے اوقات میں مختلف کھیل کھیل لیتے تھے مگر اس کا کوئی مقررہ نظام نہ تھا۔ اس اہم ضرورت کے پیش نظر باقاعدہ اس کا انتظام کیا گیا اور ایک شعبہ ورزش جسمانی کے نام سے کھول دیا گیا تاکہ دماغی محنت کے ساتھ جسمانی ورزش کے ذریعے اعضائے بدن کی نشوونما اور طاقت و توانائی کے حصول میں خاطرخواہ مدد پہنچائی جاسکے، نیز ایسے ذرائع کا شروع ہی سے انسداد کر دیا جائے جو طلبار کو لہو ولعب کی طرف لے جانے والے ہوں۔ اس شعبہ میں مختلف جسمانی ورزشوں کے علاوہ لاٹھی، گدکا اور بنوٹ وغیرہ کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔

علمائے مصر کا وفد

اس زمانے میں جامعہ ازہر کے علمار کا ایک مقتدر وفد جو وہاں کے مخصوص اساتذہ پر مشتمل تھا ہندوستان آیا ہوا تھا، دارالعلوم کی دعوت پر ۲ ذیقعدہ ۱۳۵۵ھ کی شام کو وفد کے اراکین دارالعلوم میں تشریف لائے، اگلے روز وفد نے دارالعلوم کا معائنہ کیا، اساتذہ کی محنت و تندہی، کثرت اسباق اور مختلف علوم و فنون کی تعلیم و تدریس کی جامعیت کو دیکھ کر وفد کو حیرت ہوتی تھی، چنانچہ امیر وفد شیخ ابراھیم الجبالی نے اس پر بار بار اپنے تعجب کا اظہار کیا، اُن کو یقین نہ آتا تھا کہ ایک ہی استاد ۵۔۶ گھنٹے کس طرح مختلف علوم کی متعدد بلند پایہ کتابیں پڑھا

سکتا ہے اور مختلف علوم میں کیوں کر جامعیت پیدا کر سکتا ہے۔

معائنے کے بعد خیر مقدم کے جلسے میں سپاس نامہ پیش کیا گیا جس کے جواب میں امیر وفد نے دار العلوم کا شکریہ اور اس کی علمی خدمات کی تعریف و تحسین کرتے ہوئے دار العلوم اور جامعہ ازہر کے مابین ارتباطِ باہمی کے رشتے کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کئے جانے کی خواہش کا پر زور الفاظ میں اظہار فرمایا۔

۱۳۵۶ھ، چند جدید عمارتیں

سال زیر بحث کی تاریخ میں روزمرہ کے معمولی واقعات و سوانح کے علاوہ سات مستقل عمارتیں تعمیر ہوئیں، پہلی عمارت درجۂ فارسی کی وہ درسگاہ ہے جو اس درجے کی قدیم درسگاہوں کے قریب شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کی یادگار کے طور پر "یادگارِ سعدی" کے نام سے موسوم ہے، "یادگارِ سعدی" حیدر آباد دکن کے سرور خان صاحب گنۃ دار کے عطیئے سے تعمیر ہوئی ہے، دوسری محافظ خانے کی وہ دو منزلہ عمارت ہے جو دار الاہتمام کی جنوبی سمت میں واقع ہے۔

تیسرا سلسلہ جدید دار الطلباء کی تکمیل سے متعلق ہے جس کی تفصیل جو حضرت مہتمم صاحب کی یادداشت سے ماخوذ ہے) یہ ہے کہ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمہما اللہ کے دور میں دارِ جدید کے صرف پانچ کمرے شمال مغربی سمت میں تعمیر ہو سکے تھے جبکہ اس عظیم دار الاقامہ میں ۵۲ کمرے تجویز شدہ تھے، روزمرہ کے معمولی چندوں سے یہ عظیم عمارت خدا جانے کتنے طویل عرصہ میں پایۂ تکمیل کو پہونچتی۔ اس لئے حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند نے حیدر آباد دکن کا سفر اختیار فرمایا۔ تاکہ ریاست دکن سے کوئی یکمشت بڑی امداد حاصل کی جا سکے، یہ سر اکبر حیدری کی صدارت عظمیٰ کا زمانہ تھا، حضرت ممدوح نے بتوسط نواب عبد الباسط خان صاحب مرحوم صدرِ اعظم موصوف سے ملاقات کا وقت لیا ملاقات کے دوران مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے

فرمایا کہ دارجدید کے ، ہم کئے تعمیر طلب پڑے ہوئے ہیں جو شاہی قسم کا کام ہے اس لئے فیاض اور دین پسند شاہیت ہی اُسے پورا کر سکتی ہے جو بلاشبہ آج کے دور میں ہمارے لئے مملکتِ آصفیہ دکن ہے آپ اس وقت اس کے عملی سربراہ ہیں اگر آپ نے اس میں فیاضی سے کام لیا تو آپ کا دور یادگار دور رہے گا اور علمی حلقوں میں ہمیشہ آپ کا نام احترام سے لیا جاتا رہے گا۔ سراکبر حیدری نے اس تقریر سے متاثر ہو کر فرمایا کہ میں اس میں ہمدردانہ سعی کروں گا تدبیر یہ ہے کہ سرکار نظام کی والدہ کا انتقال ہو گیا ہے ان کے ایصالِ ثواب کے نام سے آپ ایک معروضہ سرکار عالی کی خدمت میں پیش فرما دیں جس میں عام تعلیمی اداروں کے ضمن میں دارالعلوم کا ذکر بھی فرما دیں وہ جتنی رقم کی منظوری مرحمت فرمائیں گے اس میں نصف دارالعلوم کی ہو گی اور نصف ہم یہاں کے تعلیمی امور کے لئے رکھ لیں گے ، چنانچہ حضرت ممدوح نے اس مضمون کا مراسلہ سرکار عالی کو پیش کرنے کے لئے سراکبر حیدری کے پاس بھجوا دیا ، جس پر انھوں نے ایک لاکھ روپے کی سفارش لکھی ، یہ مراسلہ اسی دن سرکار عالی کے سامنے پیش ہو گیا انھوں نے نہ صرف اُسے منظور ہی فرمایا بلکہ ایک کے ہندسہ کو دو بنا کر دو لاکھ کی منظوری دیدی جو حضرت مہتمم صاحب کے لئے غیر معمولی خوشی کا سبب ہوئی کہ وہ تخمیناً پچاس ساٹھ ہزار کا اندازہ لیکر گئے تھے اس زمانے میں ایک کمرہ کا تخمینہ قریباً ایک ہزار ہوتا تھا مولانا حکیم مقصود علی خاں صاحب حیدآبادی رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم نے فون پر مبارک باد دی اور فرمایا کہ اس ملک کا یہ پہلا واقعہ ہے کہ بغیر دفتری چکروں کے ہمروزہ کسی معروضہ کی منظوری اور وہ بھی طلب سے زیادہ دوگنی رقم کی مل گئی ، سراکبر حیدری نے اس رقم کے لئے ایک کمیٹی بنا دی اور اس پر پہلے ہی سے اپنی رائے بھی لکھ دی کہ اس رقم کو بینک میں داخل کر کے اس کے سود سے طلبائے دکن کے وظیفے جاری کئے جائیں ۔ حضرت مہتمم صاحب نے بکمال جرأت سراکبر حیدری سے پھر ملاقات کا وقت لیا اور صاف گوئی کے ساتھ ناگواری کے لہجے میں اس وعدہ خلافی کو

ان کے سامنے جتا کر متأسفانہ انداز سے اُٹھکر چلے آئے جس پر سر اکبر حیدری سوائے سکوت ندامت کے اور کچھ نہ کہہ سکے۔

یہ افسوس ہے کہ حضرت ممدوح دیوبند لوٹے، اور اس مقصد کے لئے اس دوران مدراس کا سفر کیا مربیٔ حاجی اسماعیل صاحب مرحوم کے یہاں قیام ہوا جو حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ سے بیعت تھے حضرت ممدوح نے دکن کا پورا واقعہ سنا کر فرمایا کہ اب میرے اس غم والم کی تلافی آپ حضرات کو کرنی ہے، جس پر مربیٔ حاجی صاحب بہت متأثر ہوئے اور فرمایا کہ آپ صرف ایک اپیل ہمیں لکھ کر دے دیں کام ہم کریں گے آپ کو کہیں آنا جانا نہیں پڑے گا اس طرح اس رمضان کے ایک ہی عشرہ میں، ۴۰ ہزار روپے جمع کر کے انھوں نے ممدوح کی خدمت میں پیش کر دیا اور کہا کہ اگر آپ بقیہ حصہ رمضان بھی ہمیں دیدیں تو یہ رقم ایک لاکھ تک پہونچ سکتی ہے مگر حضرت ممدوح نے فرمایا کہ جب ضرورت کی بقدر رقم ہمیں حق تعالےٰ نے عطا فرمادی ہے تو ہوس کی ہمیں ضرورت نہیں، چناں چہ اس رقم سے دارِ جدید کے تمام کمرے سوائے صدر دروازہ کے (جو باب الظاہر کے نام سے موسوم ہے) مکمل ہو گئے[1]۔

۱۳۵۷ھ، حافظ محمد ابراہیم صاحب وزیر رسل ورسائل کا ورود

دار العلوم کو ریلوے اسٹیشن سے ملانے کے لئے عرصے سے ایک مستقل سڑک کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی ۱۹۳۷ء میں جبکہ ہندوستان کے سات صوبوں میں قومی حکومت قائم ہو گئی تھی یو پی کی صوبائی حکومت کو اس طرف توجہ دلائی گئی، اس سلسلے میں وزیر رسل ورسائل حافظ محمد ابراہیم صاحب کو دعوت دی گئی تاکہ وہ بچشم خود دار العلوم کی اس اہم ضرورت کا معائنہ فرمالیں،

---

[1] ماخوذ از یادداشت حضرت مہتمم صاحب مدظلہ۔

چناں چہ ۱۳ مئی ۱۹۳۰ء کو موصوف دیوبند تشریف لائے، اسٹیشن پر اکابر دارالعلوم اور طلبا کے علاوہ عمائدینِ شہر و ضلع سہارن پور، حکام محکمۂ نہر اور ممبران میونسپل بورڈ معزز مہمان کے استقبال کے لئے موجود تھے، حافظ صاحب کا شاندار جلوس اسٹیشن سے روانہ ہو کر شہر کے آراستہ بازاروں سے گذرتا ہوا ۹ بجے دارالعلوم میں پہنچا۔

دارالعلوم کی تاریخ میں ارکانِ دارالعلوم کے لئے ایسے مسرت انگیز شاندار استقبال کا یہ پہلا موقع تھا، یہاں یہ بتلانا ضروری نہیں کہ یہ جوش و خروش اور مسرت دارالعلوم کی دیرینہ حریت طلبی کا نتیجہ تھا، اس کی عمر میں ارکینِ حکومت کے قومی ہونے کا یہ پہلا اتفاق تھا، دارالعلوم نے عرصہ ہوا جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر کا سماں دارالعلوم کی آنکھوں کے سامنے تھا اس لئے جس قدر بھی جوش و مسرت کا اظہار ہوتا وہ کم تھا، خیر مقدم کے جلسے میں سپاسنامہ اور جذباتِ تشکر سے لبریز قصائد پڑھے گئے، اکابرِ دارالعلوم نے معزز مہمان کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا، سپاس نامہ میں تحریک حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کے نام سے ایک سڑک تعمیر کیے جانے پر توجہ دلائی گئی تھی، جو اسٹیشن دیوبند سے سیدھی دارالعلوم تک پہونچتی ہو، آخر میں حافظ صاحب نے جوابی تقریر فرمائی جس کے ایک ایک لفظ سے والہانہ خلوص و عقیدت اور محبت مترشح ہوتی تھی، موصوف نے فرمایا کہ :-

"میں جب سے وزارت پر مامور ہوا ہوں بہت سے مقامات پر جانے کا اتفاق ہوا اور بہت سی بستیوں میں سپاس نامے بھی پیش کئے گئے، ان میں اگر کوئی سپاس نامہ میرے لئے باعثِ فخر ہو سکتا ہے تو میں کہوں گا کہ وہ آج کا سپاس نامہ ہے جو دارالعلوم میں دیا گیا، یہ سپاس نامہ ایسی قابل قدر یادگار ہوگا جس کا بھول جانا مشکل ہے، میرے پاس وہ

الفاظ نہیں جن سے میں عزت افزائی کے احساس کو بیان کرسکوں ۔ علمائے کرام کی بدولت ہندوستان میں اسلام کا نام باقی ہے اور اسکی صحیح تعلیم باقی ہے، وہ جماعت جس نے ہندوستان میں مسلمانوں کو الحاد و دہریت کے حملوں سے بچایا، مسلمانوں میں ان ہی علماء کی بدولت برطانیہ کی حکومت پر اتنا طویل عرصہ گذر جانے کے باوجود کوئی تغیر پیدا نہیں ہوا، ایسے علماء کی جماعت کسی کو اپنی طرف سے عزت دے تو میں سمجھتا ہوں کہ ایک مسلمان کے لئے اس سے زیادہ خوش نصیبی نہیں ہوسکتی، یہ آپ کی عزت افزائی ایسی چیز ہے کہ میرے نزدیک اس پر ایک وزارت کیا ہزاروں وزارتیں قربان کی جاسکتی ہیں، میں باوجود اس صوبہ کا وزیر ہوجانے کے اور باوجود آپ کے اس احترام کے آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جو طالب علم آپ کے مدرسہ میں چھوٹے سے چھوٹا ہے میں اُس سے بھی اپنے آپ کو چھوٹا سمجھتا ہوں اور اس کی خدمت کرنا میری سعادت ہے، مجھ سے جو کچھ بھی اس دارالعلوم کے لئے ہوسکتا ہے چاہے میں گورنمنٹ میں ہوں یا نہ ہوں اس کے انجام دینے کے لئے میں ہر وقت تیار ہوں ۔

سڑک کے متعلق سپاس نامے میں ذکر کیا گیا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی ایسی خدمت نہیں جس کے انجام دینے کو کوئی خدمت سمجھا جائے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ یہ سڑک بنجانی چاہیئے، موجودہ حکومت اپنے حدود کے اندر رہ کر جو خدمت انجام دے سکتی ہے اس کے لئے ہر وقت تیار ہے، یہاں کے مدرسین اور طلباء کی خدمت کے لئے میں موجودہ حکومت کی طرف سے یقین دلاتا ہوں "

۱۳۵۸ھ مولانا سندھی کی واپسی حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ جو حضرت

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تحریکِ انقلاب آزادی ہند کے سرگرم رکن اور حضرت شیخ الہندؒ کے شاگردِ رشید اور دستِ راست تھے، ۱۳۳۳ھ میں حضرت شیخ الہندؒ کے حکم سے تحریک کے سلسلہ میں افغانستان چلے گئے تھے، برطانوی حکومت کو جب ان کے مقصدِ سفر کا پتہ چلا تو حکومت نے جلاوطنی کا حکم جاری کردیا، سات سال کابل میں مقیم رہکر مولانا ماسکو اور پھر وہاں سے ترکی تشریف لے گئے، ۱۳۴۴ھ میں مکہ مکرمہ پہنچے جہاں اواخر ۱۳۵۷ھ تک قیام رہا، غرض کہ ۲۵ سال کی ہندوستان سے طویل مفارقت کے بعد ۱۹۳۷ء میں یو پی کی پہلی کانگریس حکومت نے ان پر لگی ہوئی پابندی واپس لے لی، پابندی اٹھ جانے کے بعد اچانک ۶ صفر ۱۳۵۸ھ کو بغیر اطلاع کے مولانا سندھیؒ دیوبند تشریف لائے، مولاناؒ نے سب سے پہلے مسجد دارالعلوم میں پہونچ کر دوگانہ ادا کیا اطلاع ہوتے ہی سب سے پہلے حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم اُن سے ملنے کے لئے مسجد میں پہنچے حضرت مہتمم صاحب کا سامنا ہوا تو لپک کر آگے بڑھے اور حضرت مہتمم صاحب کے قدموں پر ہاتھ رکھ کر جھک گئے اور رونے لگے، آمد کی خبر پھیلتے ہی دارالعلوم میں خوشی اور مسرت کی لہر دوڑ گئی، اساتذہ وطلباء اور منتظمین مسجد میں جمع ہوگئے، خیر مقدم کو ایک شاندار جلسہ منعقد ہوا جس میں مولانا نے حضرت شیخ الہندؒ کی سیاسی تحریک کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی اور اپنی طویل سیاحت کے تجربات بیان فرمائے۔

سلطان ابن سعود کا علمی ہدیہ

اواخر سال میں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے زمانۂ حج میں مرحوم سلطان ابنِ سعود نے حضرتِ ممدوح سے ملاقات فرماکر خلعتِ شاہی سے نوازا، اور کتب خانہ دارالعلوم کے لئے حکومت حجاز کی جانب سے طبع شدہ کتابیں عنایت فرمائیں، سلطان کا یہ علمی ہدیہ کتب خانہ میں "عطیۂ سعودیہ" کے عنوان سے

ایک ممتاز جگہ رکھا ہوا ہے۔

حضرت مہتمم صاحب کا سفر افغانستان

ہندوستان اور افغانستان کا تعلق تاریخی حیثیت رکھتا ہے، دارالعلوم میں شروع ہی سے افغانستانی طلبہ زیر تعلیم رہے ہیں چنانچہ ۱۲۸۳ھ جو دارالعلوم کا پہلا سال ہے اس میں بھی ہندوستان کے مختلف اطراف کے طلباء کے دوش بدوش افغانی طلباء نظر آتے ہیں، اس تعلق کی وجہ سے ہمیشہ دارالعلوم میں افغانستان کے ساتھ ہمدردانہ وابستگی کا اظہار کیا گیا ہے، نادر شاہ شہید کی تخت نشینی پر جلسۂ تہنیت منعقد کیا گیا، اور ان کی شہادت کے موقع پر تعزیت کا جلسہ منعقد ہوا، اسی طرح محمد ظاہر شاہ کی تخت نشینی پر بھی تبریک و تہنیت کا جلسہ منعقد ہوا، اس موقع پر مجلسِ عاملہ نے طے کیا کہ دارالعلوم اور افغانستان کے قدیم علمی اور تعلیمی روابط کی تجدید اور ان کو مستحکم بنانے اور تبریک و تہنیت کے پیغام کو حکومتِ افغانستان تک پہنچانے کے لئے مہتمم صاحب، دارالعلوم کے نمائندے کی حیثیت سے کابل تشریف لے جائیں، مولانا حامد الانصاری صاحب غازی رفیقِ سفر تھے، اطلاع پہلے سے دیدی گئی تھی اور اخبارات میں بھی یہ خبر شائع ہو گئی تھی درمیانی اسٹیشنوں اور بالخصوص لاہور اسٹیشن پر ایک کثیر مجمع ملاقات کے لئے موجود تھا جس میں حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ مفسرِ قرآن اور حضرت مولانا عبیداللہ سندھی بھی شامل تھے، ان سب حضرات سے رخصت ہو کر پشاور پہنچے تو مولانا غلام صمدانی اور کثیر التعداد فضلائے دیوبند نے خیر مقدم کیا یہاں سے بذریعہ موٹر کار افغانی سرحد میں داخل ہوئے تو شاہی مدارات شروع ہو گئی، غایت تعظیم و احترام سے نہایت شان دار استقبال کیا گیا، کابل پہنچنے پر اولاً وزیرِ امورِ خارجہ سردار علی محمد خان صاحب سے ملاقات ہوئی، حضرت مہتمم صاحب نے ایک طویل فارسی تقریر کے ذریعے دارالعلوم کا تعارف کرایا، اس کے بعد صدرِ اعظم سردار

محمد ہاشم خاں صاحب سے ملاقات ہوئی جنھوں نے انتہائی مدارات اور شفقت آمیز انداز سے حضرت مہتمم صاحب کا خیر مقدم کیا، اور پھر خود ہی فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ اعلیٰ حضرت امیر افغانستان سے بھی ملاقات فرمائیں۔ وقت مقرر ہونے پر قصر شاہی میں اعلیٰ حضرت سے شرف نیاز حاصل ہوا جو افغانی طرز مدارات کے مطابق اپنی کرسی سے اٹھ کر اور دروازہ تک آکر بغلگیر ہوئے۔ حضرت مہتمم صاحب نے ایک مختصر فارسی تقریر کے بعد چند سطور بنام ہدیۂ اخلاص باجازت پڑھ کر سنائیں جس کو اعلیٰ حضرت نے کھڑے ہو کر سنا اُس میں ظاہر کر دیا گیا تھا کہ ہماری حاضری کا مقصد کسی بھی مالی اعانت کا سوال نہیں ہے صرف قدیمی روابط کا استحکام ہے۔

بہرحال اس ملاقات سے پہلے صدر اعظم سے ملاقات میں حضرت مہتمم صاحب نے انکے سامنے دارالعلوم کی علمی اور دینی خدمات، تعلیمی عظمت و شہرت کے اسباب اسکی حریت کارانہ مساعی اور اسلام کی بے لوث خدمات پر ایک مفصل تحریری یادداشت پیش کی۔ یہ مکمل تحریر "روداد سفرِ افغانستان" میں درج ہے، یہاں اس کے چند اقتباس پیش کئے جاتے ہیں:۔

"آج جبکہ دارالعلوم کے روابط کا سلسلہ مشرق و مغرب تک پھیل چکا ہے ممالک اسلامیہ میں اس کے تلامیذ منتشر ہو چکے ہیں، اور ساتھ ہی حالات کے اچانک کروٹ بدل لینے سے پوری دنیائے اسلام کو ارتباطِ باہمی کا شدید احساس ہو رہا ہے۔ دارالعلوم کو بھی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اپنی علمی رَو کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے اور اپنے علمی و تعلیمی اثرات کو عالم اسلام میں بیش از بیش طریق پر عام کرنے کے لئے دولِ اسلامیہ کی طرف اپنے خصوصی روابط کا ہاتھ بڑھائے اور ایسے وسائل پر غور کرے جس سے وہ بجائے خود دنیائے اسلام کی علمی ضرورتوں کو پورا کر سکے،

تمام دُولِ اسلامیہ میں چونکہ دولتِ علیہ افغانستان ہندوستان کی ہم جوار اور قابلِ فخر اسلامی دولت ہے نیز خاندانِ شاہی کے سربرآوردہ بزرگوں کو دارالعلوم کے مؤسسین اور اکابر سے براہِ راست مخصوص ربط وتعلق رہا ہے چنانچہ والاحضرت کو سب سے زیادہ علم ہے کہ اس مبارک خاندان کو علاوہ اپنی مادّی اور ظاہری قوتوں اور اپنے خاندانی جاذبِ قلوب اخلاق وشرافت کے بزرگانِ دیوبند کی قوی روحانی توجہات اور مقبول ومستجاب دُعاؤں سے پوری پوری امداد ملی ہے جس کا ظہور آج لیل ونہار میں روزِ روشن کی طرح واضح ہے، اس لئے ہر واقفِ حال "آلِ قاسم" اپنے آپکو موجودہ شاہی خاندان سے مربوط تصور کیا کرتا ہے، اور یہ امر واقعہ ہے کہ خدام جامعۂ قاسمیہ اس قدیم خاندانی اتحاد کی وجہ سے دولتِ عالیہ اسلامیہ کے ساتھ پہلے سے زیادہ وابستہ ہوگئے ہیں اس لئے دارالعلوم کی مجلسِ عالیہ انتظامیہ نے مجھے اختیار دیا ہے کہ میں بطورِ خود والاحضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر تبادلۂ افکار کی سعادت حاصل کروں، میرا مخلصانہ نقطۂ نظر ذیل کی چار دفعات میں یہ ہے کہ:۔

(۱) اس قدیم اتحاد کو بے لوث اور بے غرضانہ طریقے اور عرفانی اساس پر ترقی پذیر صورت میں باقی رکھا جائے۔

(۲) والاحضرت معظم اور دولتِ علیہ کے عرفان مآب اولیاءِ امور کے لئے ایسا موقع فراہم کیا جائے کہ وہ دارالعلوم جیسے مرکزی اور علمی ادارہ سے براہِ راست تعارف حاصل کرسکیں۔

(۳) دارالعلوم افغانستان اور دارالعلوم دیوبند کے عرفانی روابط کو محض تعلیمی مقاصد کے لئے اس طرح ترقی دی جائے جس سے دارالعلوم کے اولیاءِ امور افغانستان اور دنیائے اسلام کی تازہ ترین علمی ضروریات کا براہِ راست اندازہ کرسکیں اور اس اندازے کی روشنی میں آج کے تبدیل شدہ حالات میں ایسے علماء تیار کرسکیں جو وقت کی مقتضیات

کو پیدا کرنے میں دنیائے اسلام کی آزاد حکومتوں کے مقصد و منشا کے ساتھ پورا پورا تعاون کر سکیں اور سلطنت کے مخلص رجالِ کار ثابت ہوں ۔

(۴) اس سلسلے میں ضروری ہے کہ والاحضرت کی رسمی رہنمائی اور توجہات کے زیر اثر مجھے افغانستان کی جدید علمی ترقیات، متوقعہ ضروریات اور مکاتبِ عرفانی کے معائنہ اور اکتسابِ نظر و فکر کا موقع دیا جائے تاکہ ملتِ افغانیہ کے عرفانی تصورات کا اصلی خاکہ میرے سامنے آجائے اور دار العلوم دیوبند کے آئندہ پروگرام اور بالخصوص افغانی طلبار کی تربیت میں مشعلِ راہ بن سکے ۔

مجھے یہ عرض کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ ایک طرف دنیائے اسلام کی آزاد اور مستقل حکومتوں میں افغانستان ہی وہ دولت ہے جس نے اپنے پورے حلقۂ اثر میں اسلامی شوکت اور اثر و نفوذ کو باقی رکھا ہے اور دوسری طرف دار العلوم دیوبند ہی وہ مہم ادارہ ہے جس نے اسلامی روح کی حفاظت کرنے میں پوری تنظیم اور جرأت سے کام لیا ہے اس لئے ان دونوں اسلامی مرکزوں میں باہمی روابط کا استحکام جس درجے ضروری ہے اسی درجے میں تمام عالم اسلام کے لئے بہر نہج مفید اور نتیجہ خیز بھی ہے اور جس کا نفع مآلِ کار افغانستان کے اذکیارِ امت اور روشن ضمیر علمار کی صورت میں خود افغانستان ہی کی طرف لوٹ آئے گا۔

اس جدید ارتباط کے ماتحت جہاں دار العلوم دولتِ علیہ کے مشورے کی روشنی میں ملتِ افغانیہ کے لئے خدمات پیش کرے گا وہیں دولتِ علیہ کی طرف سے اس کے مناسب شان اگر دار العلوم پر ایسی خصوصی اور اخلاقی توجہات مبذول ہوں جو ان عرفانی روابط کے اظہار و بیان اور اس قسم کے روابطِ حسنہ کے دوامی تحفظ کی پُرشرف اساس ہو سکیں تو دار العلوم نہ صرف انہیں قبول ہی کرے گا بلکہ اپنے لئے باعثِ شرف و اعزاز اور اُن روابط کے بقار و استحکام کے لئے ضروری اور موزوں سمجھے گا ۔"

حضرت مہتمم صاحب کو دورانِ قیام میں کابل کی متعدد موقر علمی و ادبی جماعتوں سے سرکاری طور پر تبادلہ خیالات کا موقع ملا، اخبار "انیس" کے فاضل مدیر کے بقول "مہتمم صاحب کے افکار و نظریات سے علماء اور نوجوان تعلیم یافتہ طبقے نے یکساں اثر قبول کیا وزارتِ تعلیم نے کابل یونیورسٹی اور کالجوں کے معائنہ کی خواہش کا اظہار کیا، مہتمم صاحب نے یونیورسٹی کے تعلیمی نظام پر تفصیلی تبصرہ لکھ کر پیش فرمایا، جس میں یونیورسٹی کی واقعی تعلیمی خوبیوں کا اعتراف و اظہار کرتے ہوئے بعض تجاویز اور مشورے پیش کئے گئے تھے اس تبصرے میں بحث کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ غیر زبانوں اور علوم جدیدہ کی تعلیم کسی ایسے متوازی عنوان سے نہ دی جائے جو دینیات کے ساتھ ٹکرا جائے اور قوم میں مختلف المزاق طبقے پیدا ہو کر قومی تشتت کا باعث بن جائیں، بلکہ دینی اور دنیوی تعلیم مشترک طریق پر ہونی چاہیئے تاکہ پیدا شدہ تفریق ختم ہو جائے۔

اس سفر کے نتائج میں جو چیز سب سے اہم ہے وہ اسلامی مرکزوں میں تعلیمی ربط و تعلق کا قیام و استحکام ہے، اگر اس سے دانشمندانہ طریق پر کام لیا جائے تو تعلیمی ترقی کے سلسلے میں عالمِ اسلام کے لئے مستقبل میں اہم مفید نتائج پیدا ہو سکتے ہیں، کابل سے واپسی پر صدرِ اعظم نے وداعی ملاقات کرتے ہوئے اپنی حکومت کی جانب سے دارالعلوم کے لئے پچاس ہزار روپے افغانی کے عطیے سے مطلع فرمایا، صدرِ اعظم کے خاص الفاظ یہ تھے کہ "آپ الحمدللہ مستغنی ہیں اور دارالعلوم کا مدار توکل پر ہے، اسے خدا کے سوا کسی کی حاجت نہیں، لیکن بہر حال حکومت کا فریضہ تھا کہ وہ کم از کم دارالعلوم کے معاملے میں اپنے فرائض کو پہچانے اعلیٰ حضرت نے جو کچھ کمک دارالعلوم کے لئے منظور فرمائی ہے وہ دارالعلوم کی شان سے کم ہے، مگر دنیا کے موجودہ حالات میں افغانستان کی ذمہ داریاں جو اہمیت رکھتی ہیں ان کا آپ کو بھی علم ہے۔[۱]

---

[۱] اس سفر کے تفصیلی حالات کے لئے حضرت مہتمم صاحب کا سفرنامہ افغانستان ملاحظہ فرمایئے۔

شاہانہ عطیے کے وصول ہونے پر دار العلوم میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا، جس میں حضرت مہتمم صاحب نے حکومتِ افغانستان کی مہمان نوازی، بارگاہِ خسروی میں باریابی، صدرِ اعظم اور وزرائے حکومت کی پرتپاک ملاقاتوں، علمی مرکزوں، تعلیمی اور صنعتی اداروں، انجمن ادبی، جمعیۃ علماء کابل، یونیورسٹی اور مختلف علوم والسنہ کے کالجوں کے حالات اور افغان قوم کے دینی اور مذہبی احساسات پر نہایت بلیغ الفاظ میں تبصرہ فرمایا۔

ہندوستان کے مختلف اداروں، انجمنوں، مدارس اور معزز شخصیتوں نے بھی شاہ افغانستان کی اس علم دوستی کے شکریے اور سپاس گذاری میں پرجوش حصہ لیا، اخبارات نے بالعموم اپنے کالموں میں اس خبر کو نہایت نمایاں طور پر شائع کیا، اور اس مخلصانہ تعلق کی تجدید و استحکام پر پورے ملک میں نہایت مسرت و شادمانی کا اظہار کیا گیا۔

دار التفسیر

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ دورۂ حدیث کی طرح ۱۳۵۰ھ سے دورۂ تفسیر بھی جاری کر دیا گیا تھا، اس وقت دورۂ تفسیر کیلئے کوئی مستقل درس گاہ موجود نہ تھی، ۱۳۵۸ھ میں دار الحدیث کی بالائی منزل پر ۳۰×۳۰ فٹ مربع ہال کی درس گاہ دار التفسیر کے نام سے تعمیر کی گئی، دار التفسیر کے اوپر ایک پرشکوہ گنبد بنایا گیا ہے، جو اپنی رفعت و عظمت کے لحاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا دار العلوم کے سر پر تاج رکھا ہوا ہے، دار الحدیث و تفسیر کی یہ عظیم الشان عمارت بہیئت مجموعی بڑی پرشوکت ہے جسے دیکھنے والا محوِ حیرت ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

۱۳۵۹ھ باب الظاہر کی تعمیر

افغانی عطیے کے مصرف کی نسبت مجلس شوریٰ نے یہ طے کیا کہ چونکہ دار العلوم

کی مخصوص سڑک تیار ہو گئی ہے اور دارالتفسیر کا گنبد بھی مکمل ہو چکا ہے اس لئے دارالحدیث کے بالمقابل دارالطلباء کے صدر دروازے کا بنوایا جانا ضروری ہو گیا ہے، لہٰذا اس روپے سے صدر دروازہ تعمیر کرا کر اس کا نام شاہ افغانستان کے نام پر باب الظاہر رکھا جائے تاکہ دارالعلوم اور افغانستان کے مخلصانہ تعلق کی ایک دیرپا یادگار قائم ہو جائے۔" باب الظاہر" کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانیؒ کا انتخاب کیا گیا جنھیں دعوت دینے کے لئے حسب منشا حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مہتمم صاحب خود حبیب گنج ضلع علیگڈھ تشریف لے گئے، مولانا حسب وعدہ مقررہ تاریخ پر دیوبند پہونچے، علماء، طلباء اور عام مسلمانوں کے ایک بہت بڑے مجمع میں صدر یار جنگ مرحوم کے مبارک ہاتھ سے باب الظاہر کی بنیاد رکھی گئی، دارالعلوم میں باب الظاہر ایک عظیم الشان اور پر شوکت سہ منزلہ عمارت ہے، جس میں متعدد کمرے اور بڑی بڑی درس گاہیں ہیں جن میں شعبۂ خوشنویسی کے اساتذہ طلبہ کو فنِ کتابت سکھلاتے ہیں۔

ایک مفید تعلیمی اسکیم کی تدوین

فرماں روائے ریاست قلات کی طلب و دعوت پر حضرت مہتمم صاحب قلات تشریف لے گئے، خانِ قلات کا مقصد یہ تھا کہ ریاست قلات کے نوخیز طلباء کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک ایسا نصابِ تعلیم تجویز کیا جائے جس میں علوم دینیہ کے ساتھ ساتھ عصری علوم اور معاشرتی ضرورتوں کا بھی پورا لحاظ رکھا جائے، نیز دینی اور دنیوی تعلیم کے اختلاف سے جو بُعد پیدا ہو کر قوم میں دو علمی طبقے پیدا ہو گئے ہیں جس سے ان کے مابین منافرت کی زبردست خلیج حائل ہو گئی ہے اس کو دور کرنے کے ذرائع اختیار کئے جائیں، اور ایک ایسا جامع نصاب تعلیم وضع کیا جائے جس کے ذریعے سے دونوں تعلیموں کو بقدر ممکن جمع کر کے "تعلیمی ثنویت" کی اس خلیج کو درمیان سے ہٹا دیا جائے، تاکہ قدیم و جدید تعلیمی رجحانات

کو ایک نقطۂ اتحاد پر جمع کر کے قوم میں علم و فکر کی وحدت پیدا کرنے کی سعی کی جا سکے۔

اس نقطۂ نظر سے تعلیمی اسکیم کو مرتب کرنے کے لئے حضرت مہتمم صاحب نے دار العلوم سے اپنے ساتھ حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی کو لے لیا تھا وہاں پہونچکر مقامی قدیم و جدید ماہرینِ تعلیم کے مشورے سے ایک نہایت جامع اور مفید نصاب مرتب کر کے پیش کیا گیا، فرماں روائے قلات کی خواہش کے مطابق اس نصاب کو عملی جامہ پہنانے کے لئے دار العلوم سے مولانا شمس الحق صاحب افغانی، مولانا حامد الانصاری غازی اور چند دوسرے حضرات کو قلات بھیجا گیا لیکن اس میں دار العلوم کا نقصان یہ ہوا کہ اول الذکر کو وزارتِ تعلیم کا منصب تفویض ہوا، اور مؤخر الذکر نشر و اشاعت کے ڈائرکٹر بنائے گئے، اور یہ دونوں حضرات قلات کے ہو گئے، لیکن ابھی یہ اسکیم اپنی ابتدائی منزل ہی میں تھی کہ دوسری جنگِ عظیم کے موقع پر برطانوی حکومت نے اپنے دفاعی مصالح کی بنا پر ریاست کے انتظام کو اپنے کنٹرول میں لے لیا، افسوس ہے کہ اس غایت مفید اسکیم کے ذریعے سے قدیم و جدید رجحانات میں وحدت و اتحاد پیدا کرنے کے لئے جو ذرائع تجویز کئے گئے تھے وہ بروئے کار نہ آ سکے۔

دار العلوم اور مُسلم یونیورسٹی کا تعلق

دار العلوم دیوبند اور مُسلم یونیورسٹی علی گڈھ ہندوستان میں مسلمانوں کے سب سے بڑے تعلیمی ادارے ہیں، جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد یکے بعد دیگرے عالم وجود میں آئے۔ دار العلوم نے اسلامی علوم کی راہ سے مُسلمانوں کے دین کو سنبھالا، اور مُسلم یونیورسٹی نے عصری اور معاشی علوم کی تعلیم کے ذریعے سے مُسلمانوں کو دنیوی تباہی سے بچایا، باوجودیکہ دونوں مُسلمانوں ہی کے لئے قائم ہوئے اور مُسلمانوں کے لئے کام کرتے رہے ہیں، مگر دونوں کے درمیان براہِ راست تعلق قائم نہ تھا، تحریک خلافت کے زمانے میں جب حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ

مُسلم یونیورسٹی میں تشریف لے گئے اور جامعہ مِلّیہ کی بنیاد ڈالی گئی تو اس موقع پر حضرت شیخ الہند ؒ نے وہ معرکۃ الآراء صدارتی خطبہ دیا تھا جو جامعہ مِلّیہ کا تاسیسی خطبہ سمجھا جاتا ہے اس کے بعد پھر وہی بے تعلقی کا دور عود کر آیا تھا۔

گذشتہ سالوں میں یونیورسٹی کی انجمن "اسلامی تاریخ و تمدن" کی جانب سے محامد الانصاری صاحب نے دارالعلوم کے اکابر کو "اسلامی ہفتہ" کی تقریب میں دعوت دی، اس سلسلے کی ابتداء حضرت مہتمم صاحب سے ہوئی، حضرت ممدوح نے "اسلام اور سائنس" کے عنوان پر ایک معرکۃ الآراء عالمانہ و فلسفیانہ تقریر فرمائی جو بقول ڈاکٹر امیر حسن صاحب صدر انجمن مُسلم یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ کے حلقوں میں بیحد مقبول ہوئی۔ [1]

---

[1] حضرت مہتمم صاحب نے اس پُر مغز تقریر میں سائنس اور اسلام کی حقیقت، اسلام اور سائنس کا تعلق اور اس کے مقتضیات پر عالمانہ انداز میں ایک تشفی بخش تبصرہ کیا ہے، آپ نے سائنس کا موضوع اور اس کے حدود، بحث متعین فرمانے کے بعد عناصر اربعہ اُن کے متضاد خواص، اُن کی مختلف خصوصیات و آثار کا تفاوت اور اس کے اسباب پر استقرائی تبصرہ فرمایا ہے، قوت کا منشار اور معیارِ تفاوت متعین کرنے کے ساتھ ہی آپ نے ایک صحیح "اثر" کی روشنی میں انسانی قوت و استعداد اور مادی قوتوں پر اسکے تصرف و تسلّط پر دلچسپ بحث فرمائی ہے، یہ واضح کرنے کے بعد کہ انسانی قوتوں کا سرچشمہ روح ہے، آپ نے روحانیت، الٰہیات، ذاتِ الٰہی اور صفاتِ باری تعالےٰ پر نہایت لطیف پیرایہ میں استدلال کیا ہے، اسی کے ساتھ فلسفیانہ انداز میں یہ بتلایا ہے کہ روحانی قوتوں کے کمال کا معیار کیا ہے؟ فضائل نفس کے اصول اور روحانی اخلاق و اوصاف کے مظاہر کیا ہیں؟ روحانی و مادی اخلاق کے کیا امتیازات ہیں؟ اسلام اور مادی حکمت میں کیا نسبت ہے؟ مادیتِ محضہ کی مفرتیں کیا ہیں؟ اسلام کس حقیقت کی طرف دعوت دیتا ہے اور مادیتِ محضہ کو اپنا واحد نصب العین بنا کر انسان روحانی اور الٰہی حقیقتوں سے کیونکر دور جا پڑتا ہے بلاشبہ (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

دوسری تقریر بر سال رواں میں "اسلامی تہذیب وتمدن کے عناصر ترکیبی" پر ہوئی اس تقریر کو بھی بے انتہا پسند کیا گیا، اول الذکر تقریر انجمن کی جانب سے کتابی شکل میں چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

ان تقریروں کا یہ اثر ہوا کہ یونیورسٹی میں علمار کے خلاف جو علمی استخفاف اور بدظنی پھیلی ہوئی تھی وہ دور ہو گئی، اس وقت سے اب تک دارالعلوم اور یونیورسٹی کے تعلق میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور ان دونوں علمی اداروں کے مابین جو بُعد واقع تھا وہ اب بحمداللہ بہت کم ہو چکا ہے۔

۱۳۶۰ھ، دارالاقامہ کی تکمیل

سنہ ۱۳۶۰ھ (سنہ ۱۹۴۱ء) کا زمانہ وہ ہے جس میں دنیا تباہ کن اور ہولناک عالمگیر جنگ میں مبتلا تھی، ملک کے عام اقتصادی حالات نہایت نازک اور پیچیدہ ہو رہے تھے، مگر حق تعالےٰ کا فضل وکرم دارالعلوم کو آگے بڑھانے میں مصروف تھا، رمضان المبارک میں جیساکہ اوپر ذکر آچکا ہے حضرت مہتمم صاحب مدراس تشریف لے گئے، اس سفر سے چند ماہ قبل مدراس کے تاجروں کا ایک وفد حاجی اسمٰعیل صاحب مرینؔ کی قیادت میں یہاں پہنچ کر دارالعلوم کا تفصیلی معائنہ کر چکا تھا اور دارالعلوم کے نظم ونسق کی خوبی اساتذہ اور کارکنوں کے اخلاص وللہیت، طلبار کے تعلیمی انہماک اور دارالعلوم کی ضرورتوں اور اس کے خالص دینی ماحول سے متأثر ہو کر دارالعلوم کی امداد واعانت پر متوجہ تھا ان حضرات کا یہ معائنہ حضرت مہتمم صاحب کے سفر کے لئے زبردست محرک ثابت ہوا، اور آپ مدراس تشریف لے گئے، رفیقِ سفر حضرت مولانا مبارک علی صاحب رح

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) — انداز بیان اور دلچسپ تمثیلات نے ان دقیق مباحث کو جتنا عام اور دلچسپ بنا دیا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ سید محبوب رضوی

نائب مہتمم دارالعلوم تھے، دارالعلوم کے بے شمار عقیدت مندوں اور بہی خواہوں کے حلقۂ اثر کی توسیع کے ساتھ اہل مدراس نے ۴۷ ہزار روپے دارالاقامہ کے کمروں کی تکمیل کے لئے پیش کئے اس میں ۲۰ ہزار روپے تنہا حاجی محمد اسماعیل صاحب کی جانب سے تھے۔

حضرت مہتمم صاحب کی مدراس سے واپسی کلکتہ کے راستے سے ہوئی، اور چند روز کلکتہ میں قیام رہا، بحمداللہ یہ سفر بھی کافی نتیجہ خیز ثابت ہوا اور اس سفر کا ثمرہ ۲۴ ہزار روپے کی شکل میں برآمد ہوا اس میں ۲۰ ہزار روپے تنہا حاجی محمد دین صاحب تاجر چرم نے عنایت فرمائے، حق تعالےٰ ان سب حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے، اور جو گذر چکے ہیں انھیں اعلیٰ علیین میں مقام بلند نصیب فرمائے اُن کی توجہ اور عنایت سے دارالاقامہ کی تکمیل ہوگئی، جو برسہا برس سے نامکمل پڑا ہوا تھا، اور طلبار جگہ کی قلت کے سبب سے سخت تکالیف اٹھا رہے تھے، دارالاقامہ کی تکمیل سے دارالعلوم کا احاطہ جو اَب تک بالکل غیر محفوظ تھا وہ محفوظ ہوگیا، جزاہم اللہ عنّا فی الدنیا والآخرۃ۔

ماہنامہ "دارالعلوم"

عام مسلمانوں کے عقائد وعمل کی دینی اصلاح و تربیت کے لئے ۳۲ سال قبل (۱۳۲۸ھ میں) دارالعلوم کی سرپرستی اور نگرانی میں ماہنامہ "القاسم" جاری ہوا تھا، جو عرصے تک نہایت کامیابی کے ساتھ اسلام اور مُسلمانوں کی مفید خدمات انجام دیتا رہا، "القاسم" نے علمار دیوبند کے جو محققانہ اور بلندپایہ علمی مقالات شائع کئے اور جس صاف اور سادہ انداز میں صحیح دینی معلومات کا بہترین ذخیرہ مُسلمانوں کے سامنے پیش کیا، اُس کی یاد آج تک اہل علم کے دلوں میں تازہ ہے، "القاسم" ۱۱ سال کی طویل مدت تک جاری رہنے کے بعد بند کر دیا گیا تھا، اس کے بعد سے اب تک پیہم کچھ ایسے حالات پیش آتے رہے کہ دارالعلوم کی جانب سے کوئی رسالہ جاری نہ ہو سکا، حالانکہ ۲۰ سال کی مدت میں دارالعلوم کے مخلصین ومتوسلین

کی جانب سے مسلسل ایک ماہنامہ کے اجراء پر اصرار کیا جاتا رہا، نیز خود اکابرِ دارالعلوم بھی اس اہم ضرورت کو محسوس فرماتے رہے، لیکن اس کے باوجود اس بارے میں کوئی عملی قدم نہ اٹھ سکا۔ بالآخر جمادی الاول ۱۳۶۰ھ سے "دارالعلوم" کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ کا اجراء عمل میں آیا، ماہنامہ "دارالعلوم" کے مقاصد جن کے تحت اس کا اجراء ہوا ہے مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) دارالعلوم کے حالات وکوائف سے معاونین ومتوسلین دارالعلوم کو باخبر رکھنا۔

(۲) اسلام کی تعلیمات کو سہل ودلنشین پیرایے میں پیش کر کے مسلمانوں میں صحیح مذہبی ذہنیت پیدا کرنا۔

(۳) علمی مسائل کے متعلق علمائے دیوبند کے محققانہ مقالات اور حالاتِ حاضرہ پر دارالعلوم کا موقف پیش کرنا۔

(۴) مخالفینِ اسلام کے حملوں کی سنجیدگی کے ساتھ مدافعت کرنا۔

۱۳۶۱ھ، حضرت مولانا مدنیؒ کی گرفتاری

۹-۱۰ جمادی الاخریٰ ۱۳۶۱ھ کی درمیانی شب میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ صدر مدرسین دارالعلوم دیوبند، جھنگ (مغربی پنجاب) کی ہندو مسلم اتحاد کانفرنس کی صدارت کرنے کے لئے دیوبند سے روانہ ہوئے، سہارنپور کے قریب ٹپری کا اسٹیشن پر پولس انسپکٹر نے وارنٹ گرفتاری پیش کیا اور سہارنپور اسٹیشن پر حضرت مدنیؒ کو گاڑی سے اتار کر سہارنپور جیل پہنچادیا گیا، وہاں سے اگلے دن مرادآباد لے جایا گیا، یہ گرفتاری ایک سیاسی تقریر کی بناء پر عمل میں آئی تھی جو حضرت مولانا مدنیؒ نے جمعیۃ العلماء ضلع مرادآباد کی کانفرنس منعقدہ بچھراؤں میں فرمائی تھی (یہاں ایک لطیفہ سنیئے اس جلسے کی صدارت حضرت مولانا محمد طیبؒ صاحب نے فرمائی تھی، حضرت مہتمم صاحب جب حضرت مدنی سے مرادآباد جیل میں ملنے کے لئے تشریف

لے گئے تو حضرت مدنیؒ نے جیلر سے فرمایا کہ اس قابلِ اعتراض جلسہ کے یہ صدر صاحب تو دندناتے پھر رہے ہیں اور مجھ بڈھے آدمی کو آپ نے جیل میں ڈال رکھا ہے حضرت مہتمم صاحب نے فرمایا کہ حضرت میں بھی تو اس وقت آپ کے ساتھ جیل ہی میں ہوں)

۱۰ اِر کی صبح کو حضرت کی گرفتاری کی اطلاع دارالعلوم میں پہنچی، اس خبر کے سنتے ہی اساتذہ طلبار اور ذمہ داروں اور کارکنوں میں سخت ہیجان اور اضطراب اور غم و غصے کی لہر دوڑ گئی شہر میں ہڑتال کردی گئی اور تمام بازار بند ہو گئے، حضرت صدر مہتمم صاحب کی صدارت میں احتجاجی جلسہ منعقد کیا گیا جس میں صدر جلسہ نے فرمایا کہ اگر حکومت حضرت مولانا مدظلہٗ کو گرفتار کر کے دارالعلوم اور جماعت دارالعلوم کو چیلنج کرنا چاہتی ہے تو میں پوری جماعت کی طرف سے اس چیلنج کو قبول کرنے کے لئے تیار ہوں ۔

اس موقع پر نوجوان طلبار کے صبر و ضبط کا اعتراف نہ کرنا یقیناً ناانصافی ہو گی، حضرت مولانا مدنیؒ کے زمانۂ اسارت میں کئی مرتبہ احتجاجی جلوس نکالے گئے، مظاہرے اور جلسے کئے گئے، مگر باوجودیکہ نوجوان طلبہ میں حکومت کے خلاف سخت ہیجان اور انتہائی جوش و خروش پایا جاتا تھا، تاہم ہر موقع پر پُرمتانت جوش اور پُرامن مظاہروں کے ساتھ عالمانہ وقار ہی نمایاں رہتا تھا، حالانکہ بالعموم ایسے اشتعال انگیز مواقع پر یہ خصوصیت برقرار نہیں رہتی، مگر دارالعلوم کے طلبار نے ثابت کر دیا کہ وہ نوجوانی اور طالب علمانہ عمر میں بھی جذبات کے اظہار میں کس قدر محتاط اور قابو یافتہ ہیں اور سخت سے سخت موقع پر بھی عالمانہ وقار و متانت کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔

مراد آباد جیل میں ۱۰ رجب ۱۳۶۱ھ کو حضرت مولانا مدنی کے مقدمہ کا فیصلہ سنا دیا گیا، عدالت نے ۱۸ ماہ قیدِ محض، پانچ سو روپے جرمانہ اور عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں مزید ۶ ماہ کی سزا تجویز کی، اور اے کلاس میں رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔

سالانہ امتحان کا التوار اور تعطیل عام | حضرت مولانا مدنی رح کی گرفتاری

اواخر جون ۱۹۴۲ء کا واقعہ ہے، اس کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد اگست ۱۹۴۲ء میں کانگریس ہائی کمانڈ کی گرفتاری کے ساتھ ملک بھر میں کانگریس کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا جس پر ہندوستان بھر میں اضطراب اور بےچینی پیدا ہو گئی، لیڈر گرفتار کئے جا چکے تھے، عوام نے کم و بیش ہر جگہ تشدد اختیار کر لیا، حکومت کے اداروں اور ریلوے لائینوں پر بالعموم حملے کئے جانے لگے، یہ زمانہ شعبان کا مہینہ تھا، جس میں دارالعلوم میں سالانہ امتحان ہوتا ہے اور پھر عام سالانہ تعطیل ہو جاتی ہے، ملک کے تشویشناک حالات سے اندیشہ تھا کہ طلباء اپنے وطن پہنچنے سے محروم نہ رہ جائیں اس لئے دار الاہتمام میں تخفیف امتحان کی تجویز زیر غور ہی تھی کہ اسی اثناء میں خود طلباء نے بھی متفقہ طور پر یہ استدعا کی کہ ملک کے موجودہ تشویشناک حالات میں امتحان کے ختم ہونے تک اگر ہم لوگ ٹھیرے رہے تو اندیشہ ہے کہ ہم اپنے اپنے وطنوں تک نہ پہنچ سکیں گے، کیونکہ ریلوے لائن خطرے میں پڑ جانے کے باعث وطن تک پہنچنے میں سخت دشواریاں حائل ہو جانے کا اندیشہ ہے، دوسرے یہ کہ ہمیں وقت کی پکار اور ضرورت پر لبیک کہنا اور اس میں شریک ہونا بھی ہے، لہٰذا طلبہ کو جلد سے جلد چلے جانے کی اجازت دی جائے، چنانچہ وقتی ہنگامہ خیز حالات کے پیش نظر اس فیصلے کے ساتھ کہ سالانہ امتحان ۲۵ ذی الحجہ تک دے دینا لازمی ہوگا، طلبہ کی مذکورہ درخواست منظور کر لی گئی اور دارالعلوم میں التوائے امتحان کے ساتھ عام تعطیل کا اعلان کر دیا گیا۔

چینی نمائندہ عثمان وو کی آمد

چینی اسلامی قومی سالویشن فیڈریشن نے ہندوستان کے مسلم اداروں کے حالات معلوم کرنے کے لئے عثمان وو کو اپنا نمائندہ بنا کر ہندوستان بھیجا تھا، موصوف اپنے اس دورے کے سلسلہ میں ۲۵ شعبان کو دارالعلوم میں تشریف لائے، اور

یہاں کے نظم ونسق اور طریقِ تعلیم وغیرہ امور کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا، بحیثیتِ مجموعی دارالعلوم کو دیکھ کر بہت مسرور ہوئے اور حسبِ ذیل الفاظ میں اظہارِ خیال فرمایا۔

"میرے لئے یہ ایک اعزاز ہے کہ مجھے دارالعلوم کے دیکھنے کا موقع ملا، مولانا محمد طیب صاحب نے مجھے دارالعلوم کی سیر کرائی جس کے لئے میں اُن کا ممنون ہوں، یہ ادارہ خالص مذہبی ادارہ ہے جس کو مشرق کا الازہر کہہ سکتے ہیں، ہند اور بیرونِ ہند کے ہر مُسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس مشرقی "الازہر" کی نگہبانی کرے اور اس کی امداد میں کوشاں رہے تاکہ مشرق میں "اسلامی کلچر" بہتر حالت میں جاری رہ سکے۔"

۱۳۶۲ھ، ملکی حالات کا اثر دارالعلوم پر

۱۳۶۲ھ میں سنینِ ماضیہ کے اعتبار سے طلبار کی تعداد نسبتہً بہت کم رہی، ملک میں اگست ۱۹۴۲ء کی تحریک کے اثرات کم وبیش ہر جگہ پائے جاتے تھے، ریلوے لائنوں کے خطرے میں پڑ جانے سے سفر کرنا خطرناک ہوگیا تھا، بالخصوص بنگال اور بہار میں سخت ابتری پھیلی ہوئی تھی، گرانی حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی، سیاسی بے چینی اور شورش عام تھی، بنگال قحط اور فاقہ زدگی سے دم توڑ رہا تھا، اس لئے بنگال اور دوسرے دور دراز کے طلبار کے لئے گھر سے قدم نکالنا بھی مشکل تھا بنگال کے طلبار جن کی بڑی تعداد ہر سال دارالعلوم میں مقیم رہتی ہے اس مرتبہ بہت کم آسکے۔

ایک طرف تو ملک میں یہ ہنگامہ برپا تھا اور دوسری طرف خود دارالعلوم کے اربابِ حل وعقد میں سیاسی مسلک کے اختلاف کی بنار پر کشیدگی اور مخالفت کا شدید خلفشار رونما ہوگیا جو بالآخر صدر مہتمم اور پانچ اساتذہ کے استعفار اور علیحدگی پر مُنتج ہوا، اس کی تفصیل آگے آتی ہے، مستعفی جماعت کے ساتھ تقریباً ۶۰ طلبار بھی دارالعلوم سے علیحدہ

ہو گئے، مگر بحمد اللہ اس کے باوجود اساتذہ کی خالی شدہ آسامیوں کے فی الفور پُر ہو جانے کے باعث نظام میں کوئی غیر معمولی اور نمایاں فرق رونما نہیں ہوا۔

علامہ عثمانیؒ کی یکسوئی

۱۳۵۴ھ میں جب حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی صدر مہتمم مقرر ہوئے تھے، تو دار العلوم کے مسلک کے تحفظ کے سلسلے میں حضرت مہتمم صاحب کے اختیارات بھی حضرت صدر مہتمم صاحب کی جانب منتقل کر دیئے گئے تھے لیکن عملاً دار العلوم کا نظام حضرت مہتمم صاحب ہی کے ہاتھ میں تھا، صدر مہتمم صاحب کا قیام چونکہ دیوبند میں کم رہتا تھا، اور وہ ڈابھیل کے مدرسہ کی صدر مدرسی پر فائز ہونے کی وجہ سے سال کا زیادہ حصہ وہیں گذارتے تھے، اس لئے ہر قسم کی ذمہ داری اور جواب دہی مہتمم صاحب ہی پر عائد ہوتی تھی، اور گذشتہ طویل مدت کے تجربے نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ عملاً جبکہ پورے ادارے کو مہتمم صاحب ہی چلا رہے ہیں تو اُن ہی کو اختیارات بھی حاصل ہونے چاہئیں، یہ سوالات اس بنا پر محل بحث و نظر بنے ہوئے تھے کہ مہتمم صاحب کو عملاً فرائض ذمہ داری نبھانے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا کیونکہ وہ شعبہ جات و دفاتر کے امور کی تکمیل کے لئے مجلس شوریٰ و انتظامیہ کے سامنے جواب دہ تھے، دستور اساسی کی رو سے کلیۃً عملی اور انتظامی ذمہ داریاں مہتمم صاحب سے متعلق تھیں، اس لئے ذی الحجہ ۱۳۶۱ھ میں مجلس نے وقتی حالات کے قدرتی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے تمام اختیارات مہتمم صاحب کی جانب منتقل کر دیئے، اس تجویز کی رو سے صدر مہتمم کی حیثیت صرف ایک آئینی نگراں کی قرار پائی، اور انتظامی امور سے صدر مہتمم کا تعلق ختم ہو گیا، اس وقت عام ملکی حالات کے پیش نظر طلباء، اساتذہ اور کارکنوں کی ایک بڑی اکثریت ملکی سیاسیات میں شریک ہو کر عملی جد و جہد کرنا ضروری اور وقت کا اہم تقاضا سمجھتی تھی، اور علامہ عثمانیؒ دار العلوم کے تعلیمی ادارہ ہونے اور بعض دیگر وجوہ کے نقطۂ نظر

سے اس کے وابستگان کی عملی جدوجہد کو مضر سمجھتے تھے، اُن کی رائے یہ تھی کہ دارالعلوم من حیث الجماعت عملی سیاسیات سے دامن کشاں رہے، یہ کشمکش یہاں تک بڑھ گئی کہ فریقین کے مابین عدم تعاون کی خلیج حائل ہو گئی۔

ایسے مواقع پر آئینی اداروں میں عموماً یہ طریقِ عمل جاری ہے کہ جب ذمہ دارِ اعلیٰ کسی حکمتِ عملی کو چلانے میں دشواریاں اور ناکامی محسوس کرتا ہے تو وہ مستعفی ہو کر علیحدگی اختیار کر لیتا ہے، تاکہ عدم تعاون سے دو عملی کے مضر نتائج بروئے کار نہ آئیں، چنانچہ حضرت علامہ عثمانیؒ نے بھی اس موقع پر اسی عاقلانہ تدبّر کا ثبوت دیا، اور وہ مستعفی ہو کر کنارہ کش ہو گئے، علامہ عثمانیؒ کے ساتھ اساتذہ میں حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحبؒ مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ، مولانا ظہور احمد صاحبؒ اور دو استاد اور تقریباً ۶۰ طلبا ر بھی جو ممدوح کے ہم خیال تھے، اُن کی یکسوئی کے بعد مستعفی ہو کر دارالعلوم سے علیحدہ ہو گئے، البتہ کچھ مدت کے بعد حضرت مہتمم صاحب کی سعی و کوشش سے حضرت مولانا محمد ابراھیم صاحبؒ اور مولانا ظہور احمد صاحبؒ دارالعلوم میں واپس تشریف لے آئے۔

۱۳۶۳ھ حضرت مولانا مدنیؒ کی رہائی

۱۳۶۱ھ ۱۹۴۲ء ہندوستان کی سیاسیات میں نہایت ہنگامہ خیز سال تھا، ملک کے تمام بڑے چھوٹے لیڈر جیل کی چہار دیواری میں محبوس کر دیئے گئے تھے، اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت مولانا مدنیؒ کو جمادی الاخریٰ ۱۳۶۱ھ کے عشرۂ اول میں دیوبند اور سہارن پور کے درمیان سفر کرتے ہوئے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ رمضان المبارک ۱۳۶۳ھ میں آپ کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا گیا، حضرت مولانا مدنیؒ ۱۴ رمضان المبارک کو دیوبند تشریف لائے، اسٹیشن پر ہزارہا عقیدت مندوں کا اجتماع تھا، ہجوم کا یہ عالم تھا کہ مدت سے ایسا نظارہ دیکھنے میں نہیں آیا تھا، بعد نماز تراویح جامع مسجد میں

خیر مقدم کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا حضرت مولانا نے تہنیتی قصائد کے بعد جن میں ایک اہم قصیدہ حضرت مہتمم صاحب نے بھی فارسی زبان میں لکھ کر سنایا تھا، انگریزوں کے مظالم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ "ہندوستان اور دنیائے اسلام کی آزادی ہی ہمارے قلوب کو مطمئن کر سکتی ہے، جب تک یہ حاصل نہ ہو ہمارا فرض باقی رہے گا، اور آزادی کی جنگ جاری رہے گی۔"

۱۳۶۴ھ، شعبۂ خوشخطی کا اجرار

پڑھنے کے ساتھ لکھنے کا جو تعلق ہے وہ کسی تشریح کا محتاج نہیں ہے، تحریر و کتابت کا علم سے گہرا تعلق ہے اسی بنار پر خط کو "نصف علم" سے تعبیر کیا گیا ہے، مدارس عربیہ میں حُسنِ تحریر کو اب تک مناسب جگہ نہیں دی گئی ہے، البتہ دارالعلوم میں خط کی عمدگی کا اس قدر لحاظ ضرور رکھا جاتا تھا کہ امتحانات کے پرچوں میں جن طلبار کا خط عمدہ ہوتا ان کو حُسنِ تحریر پر امتیازی نمبر دئے جاتے تھے، مگر خط کی اصلاح و درستگی کا دارالعلوم کی جانب سے بطورِ خاص کوئی انتظام نہ تھا اور صرف طلبار کے لئے اپنے ذوق پر اس کا انحصار تھا، بالعموم طلبار کے خط نہایت بھدّے ہوتے تھے، امسال اس خامی کی اصلاح کے لئے خوشخطی کے شعبے کا اجرار عمل میں لایا گیا، اور طلبار کے لئے خط کی درستگی اور حُسنِ تحریر کو ضروری قرار دیا گیا، شعبۂ خوشخطی کے ذریعہ نسخ اور نستعلیق دونوں خطوں کی مشق کرائی جاتی ہے، حُسنِ تحریر کے علاوہ جو طلبار خوش نویسی (کتابت) کی تعلیم بحیثیت فن حاصل کرنا چاہتے ہیں، ان کو فنی لحاظ سے اس کی مشق کرائی جاتی ہے اس طرح پر خط کی اصلاح کے علاوہ یہ شعبہ طلبائے دارالعلوم کے لئے حصولِ معاش کا بھی ایک باعزت اور عمدہ ذریعہ ہے۔

۱۳۶۵ھ، دارالصنائع کا قیام

یہ تو ظاہر ہے کہ موجودہ زمانے میں دارالعلوم کے طلبار پر تعلیم و تدریس اور تبلیغ و دینی قیادت کے

علاوہ عام معاشی راہیں کشادہ نہیں ہیں، دارالعلوم میں اس امر کا احساس کرتے ہوئے ضروری سمجھا گیا کہ طلبا رکے مستقبل کے لئے معاش کے ذرائع مہیا کئے جائیں تاکہ وہ دارالعلوم سے نکلنے پر فراغت واطمینان سے مستغنیانہ زندگی بسر کرسکیں، شعبۂ خوشخطی کے قیام میں اصلاحِ خط کے ساتھ ایک یہ مقصد بھی پیشِ نظر تھا، حق تعالےٰ جزائے خیر عطا فرمائے مولانا عبدالغفور صاحب بخاری کو جو اس وقت دارالعلوم کی مسجد کے امام تھے اور بعد میں مدینہ منورہ ہجرت کر کے چلے گئے اور وہیں وفات پائی اُن کی مخلصانہ سعی وامداد سے اس شعبے کا قیام عمل میں آیا، اور جلد سازی کے کام سے شعبے کا آغاز ہوا، موصوف بخارا کے رہنے والے تھے، بمبئی میں ان کا اچھے پیمانے پر جلد سازی کا کارخانہ تھا، ان کو خود بھی اس کام میں اچھی دستگاہ حاصل تھی، بمبئی کے قیام کے زمانے میں ان کو دینی علوم کے حصول کا شوق دامن گیر ہوا، اور دارالعلوم کو اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے منتخب کیا، جلد سازی کی مشین، آلات اور اس سلسلے کا دوسرا سامان جو کچھ ان کے پاس تھا وہ دارالعلوم کو وقف کردیا، چنانچہ انہی کے وقف کردہ سامان سے رجب ۱۳۶۵ھ میں شعبۂ تجلید سے دارالصنائع کا افتتاح عمل میں آیا، موصوف نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ خود اپنی خدمات بھی بغیر کسی معاوضے کے دارالصنائع کے لئے پیش کر کے ایسے لوگ تیار کر دیئے جو طلبا رکو تجلید کی تعلیم دے سکیں۔

اس کے بعد دارالصنائع میں مختلف اوقات میں دوسری صنعتوں کی تعلیم کا اضافہ ہوتا رہا ہے۔

۱۳۶۶ھ، بہار اور گڈھ مکٹیشر کے فساد زدہ مُسلمانوں کی امداد واعانت

ابھی ہندوستان میں آزادی کے آسمان پر آفتاب طلوع بھی نہ ہونے پایا تھا کہ بہار اور گڈھ مکٹیشر (ضلع میرٹھ) میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی اکثریت کے لوگوں نے اقلیت پر قیامت برپا کردی، جو لوگ فسادات میں زندہ بچ گئے تھے وہ اس قدر خوف زدہ تھے

کہ آئندہ اپنے گھروں میں مقیم رہنے پر بھی آمادہ نہ تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اس سلسلے میں گاندھی جی کی خدمات تاریخ کے صفحات سے بھلائی نہیں جا سکتیں، بہار کے فساد زدہ علاقے میں اُن کے دورے نے تریاق کا کام کیا، تاہم ضرورت تھی کہ مسلمانوں کو خود مسلمانوں ہی کیجانب سے ڈھارس اور اطمینان دلا کر ان میں خود اعتمادی اور صبر و استقلال کی تبلیغ و تلقین کرنے کے علاوہ اخلاقی طور پر آئندہ کے لئے ایسے رخنوں کو بند کرنے کی جد و جہد بھی کی جائے، چنانچہ اس کے لئے دار العلوم سے وفود بھیجے گئے، جن کا نتیجہ خاطر خواہ بر آمد ہوا، اور بہت سے مسلمان جو ترکِ وطن کا ارادہ کر چکے تھے وہ رک گئے اور جو ترکِ وطن کر چکے تھے وہ حالات کے معمول پر آجانے کے بعد اپنے گھروں میں واپس آ گئے۔

تقریباً یہی صورت گڑھ مکتیشر میں پیش آئی اور دار العلوم کے وفد نے وہاں پہنچ کر حکومت کی امداد سے مساجد اور مکانوں کی صفائی، درستگی، مرمت اور شہیدوں کی تدفین اور امن و امان بحال کرنے میں نہایت تندہی، جانفشانی اور دل سوزی سے کام لیا، مسلمانوں کا خوف و ہراس دور کر کے مسلمانوں کو اپنے گھروں میں بسنے پر آمادہ کر دیا۔

پراویڈنٹ فنڈ کا اجراء

دار العلوم کے اساتذہ اور کارکنوں کے مشاہرے اُن کی خدمات کے عوض میں ہمیشہ بہت کم رہے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کے مشاہرے بدقت ان کی اور ان کے اہل و عیال کی ضرورت کے لئے کفایت کر سکتے ہیں، اس میں پس انداز ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں ہوتا، مگر انسانی ضرور تیں ایثار و قربانی کے ماتحت نہیں ہیں، اس لئے جب کوئی وقتی اور ہنگامی حادثہ پیش آتا تو انھیں بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا، اسی طرح جو لوگ بڑھاپے یا دوسرے اسباب کی بنا پر سبکدوش ہوتے اُن کے لئے مستقبل میں کوئی معمولی سا مالی سہارا بھی نہیں ہوتا تھا، خود راقم سطور نے اپنی

آنکھوں سے ایسے متعدد غم ناک واقعے دیکھے ہیں کہ دارالعلوم میں آخر عمر تک ملازمت کرنے کے بعد جب انتقال ہوا تو پسماندگان میں اتنی مالی مقدرت بھی نہ تھی کہ وہ مرحوم کے کفن دفن کا انتظام کر سکیں، خود ملازم بھی اگر کبھی کسی مزمن مرض میں مبتلا ہو جاتا تو اپنا علاج نہ کر سکتا تھا، پیہم تجربات اور ملازمین دارالعلوم کی درخواست پر ناگزیر انسانی احوال وضروریات کے پیش نظر دارالعلوم میں پراویڈنٹ فنڈ کا سلسلہ جاری کیا گیا تاکہ شدید ضرورتوں یا سبکدوش ہونے کے مواقع پر بسہولت امداد میسر آسکے، اس موقع پر مجلس شوریٰ نے ملازمین کی عرض داشت پر توجہ کے ساتھ اپنی ہمدردی کا ثبوت دیا، پراویڈنٹ فنڈ میں ہر مستقل ملازم کی تنخواہ سے ۶ پیسے فی روپیہ کے حساب سے وضع کیا جاتا ہے، اور اسی قدر اس میں دارالعلوم کی جانب سے شامل کر دیا جاتا ہے، سبکدوش ہونے پر پراویڈنٹ فنڈ کی جمع شدہ رقم اس کے حوالے کر دی جاتی ہے نیز دورانِ ملازمت میں ضرورت کے موقعوں پر پراویڈنٹ فنڈ کا دو تہائی حصہ بطور قرض بھی لیا جاسکتا ہے، جو پانچ فیصد کے حساب سے ماہ بماہ وضع ہوتا رہتا ہے۔

۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں علماء کرام کو جو مقام حاصل رہا ہے اس میں کوئی جماعت ان کی حریف فخر نہیں کہی جاسکتی، ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ خیز انقلاب کے بعد صرف یہی ایک جماعت تھی جس نے آزادی کے تصور کو ملک میں زندہ رکھا، انکی مسلسل جدوجہد نے بالآخر پورے ملک میں آزادی کی روح پھونک دی، حضرت نانوتوی قدس سرہٗ اس تصور کے سب سے بڑے داعی اور اس تحریک کے سب سے بڑے مبلّغ تھے، انھوں نے جس سرگرمی کے ساتھ اس تصور کو پروان چڑھایا، افسوس ہے کہ جنگ آزادی کی تاریخ لکھنے والوں نے اس بارے میں انصاف سے کام نہیں لیا، ہندوستان کی آزادی کے موقع پر حضرت نانوتویؒ کی تیار کی ہوئی جماعت کو جس قدر

مسرت ہونی چاہیئے تھی اس کا اندازہ حضرت مہتمم صاحب کی اس تقریر سے ہو سکتا ہے جو حضرت ممدوح نے جشنِ آزادی کے موقع پر ۱۵، ۱۶ اگست کی درمیانی شب میں طلبائے دارالعلوم اور اہلِ شہر کے مجمع میں فرمائی تھی، چونکہ اس تقریر سے آزادی کی جدوجہد میں علماء کی خدمات کی تاریخ پر فی الجملہ روشنی پڑتی ہے اس لئے تقریر کا بجنسہ پیش کر دینا مناسب ہوگا۔

حضرت ممدوح نے فرمایا:۔

بزرگانِ ملت علمائے کرام اور عزیز طلبائے دارالعلوم آج کا مبارک دن ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا، ایک عظیم الشان سلطنت جس کے متعلق مسلّم تھا کہ اس میں کسی وقت آفتاب غروب نہیں ہوتا اور جس کے بارے میں خود اس سلطنت کے ایک مغرور اور متکبر نمائندے گلیڈ اسٹون نے پارلیمنٹ میں کہا تھا کہ ہماری سلطنت آج اس قدر طاقتور ہے کہ اگر آسمان بھی اس پر گرنا چاہے تو ہم اسے بھی اپنی سنگینوں کی نوک پر روک لیں گے اور وہ ہماری سلطنت کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا، وہی سلطنت آسمان کے گرنے سے نہیں محض زمین کے چند ذرّوں کے اڑنے سے اس سہولت سے ختم ہو رہی ہے کہ تاریخ اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی! ہم اس انقلاب پر پورے ملک کو مبارک باد دیتے ہیں پورا ملک عموماً اور خصوصیت سے وہ جوان اور بوڑھے اس مبارک باد کے مستحق ہیں جنکی قربانیوں اور مساعی نے یہ شیریں ثمر ہندوستان کے سامنے لا رکھا۔

ناسپاسی ہوگی اگر اس موقع پر ہم ان اکابرِ ملت کی مساعی کا تذکرہ نہ کریں جنھوں نے حقیقتاً اس آزادی کا سنگِ بنیاد رکھا اور اس وقت رکھا جب آزادی کے تصور سے بھی اس ملک کے دل و دماغ خالی تھے، یہ شاہ ولی اللہؒ کے جاں باز شاگردوں کی مجاہد جماعت ہے جو دو سو برس سے اس سعی میں نہ صرف قلم اور روشنائی سے بلکہ شمشیر اور خون سے اس کی راہ نوردی کر رہی تھی، ۱۸۵۷ء کے بعد جب انگریزی اقتدار مکمل ہو کر پوری طرح اس ملک پر چھا گیا تو صرف یہی ایک جماعت تھی جس نے آزادی

کے تصوّر کو اس ملک میں زندہ رکھا اور بالآخر اس تصوّر کا سب کو دیوانہ بنا کر چھوڑا، ۱۸۵۷ء میں بانیٔ دارالعلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ بقول حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اس تصور کے سب سے بڑے حامل اور اس جوش کے سب سے بڑے امین تھے، انھوں نے اپنے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ کی قیادت میں تلوار اٹھائی اور آزادی کی راہ میں سرفروشی کے ساتھ میدان میں اُترے لیکن راہ کی مشکلات کے باعث فتح کا سلسلہ شاملی کی تحصیل تک رہ گیا اور دہلی کے تخت تک نہ پہنچ سکا اور ملک آزادی سے محروم رہ گیا لیکن یہ جماعت اپنے تصور سے غافل نہ ہوئی حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ اس دنیا سے گئے تو اُن کے صحیح اور سچے جانشین حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ نے جو اُن کے علم اور نظریات کے جائز وارث تھے، اس پوری جماعت کے ساتھ تحریک آزادی کو جاری رکھا ۔

مدینہ کے گورنر جمال پاشا کے قول کے مطابق شیخ الہندؒ کی مٹھی بھر ہڈیوں اور مختصر سے جثے میں کیا کرامت رکھی ہوئی تھی کہ اس نے پوری دنیائے اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، بہر حال ان بزرگوں کا جذبہ انگریزوں کے اقتدار کے خلاف نہ جاہ و منصب کے لئے تھا نہ وزارت کی کرسیوں کے لئے تھا نہ کسی ایک پارٹی کے اقتدار کے لئے تھا بلکہ صرف اس لئے تھا کہ جابر قوم کی گرفت سے مظلوم ملک کو نکالا جائے، اور حق بحقدار کے طور پر جس کی امانت ہو اسے سپرد کیا جائے، جس سے حق کا کلمہ بلند ہو۔

ان بزرگوں کا سب سے بڑا مشغلہ یہی ذکر و فکر ہر وقت رہتا تھا کہ انگریزوں کا جوا کس طرح کندھوں سے اُتارا جائے اسی کے بارے میں پیشینگوئیاں اور مکاشفات تھے اور اسی کے بارے میں تمام نظم اور انتظام، ایک دن چھتے کی مسجد میں سب بزرگ جمع تھے، انگریزوں کے تسلط اور غیر معمولی طاقت کو دیکھ کر حضرت حاجی سید محمد عابد صاحبؒ نے فرمایا کہ "انگریزوں نے گھیر پنجے جمائے ہیں دیکھئے کس طرح اکھڑینگے۔؟"

اس پر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب ؒ نے جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے شیخ الحدیث تھے فرمایا "حاجی صاحب! آپ کس خیال میں ہیں وہ وقت دور نہیں جب کہ ہندوستان صف کی طرح لوٹ جائے گا، کوئی جنگ نہ ہوگی بلکہ بحالتِ امن وسکون یہ ملک صف کی طرح پلٹ جائے گا، رات کو سوئیں گے ان کی عملداری اور صبح کریں گے دوسری عملداری ہیں"

میں آج کے جاں بازوں کی ناقدری نہیں کرتا لیکن اس سے کسی حالت میں بھی نہیں ہٹ سکتا کہ آج آزادی کی تمام مساعی ایک عمارت ہے جس کی بنیاد یہ بزرگ رکھ گئے تھے اور اس لئے میں بہانگِ دُہل کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کی آزادی کی یہ جدوجہد صرف مُسلمانوں نے شروع کی انھوں نے اسے پروان چڑھایا حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے انگریزوں کے خلاف فتویٰ دیا، ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا، حضرت حاجی امداداللہ صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے اس فتویٰ کو استعمال کیا، اور اس نسخۂ شفا کو خاص ترکیب سے بیا اور پلایا، حضرت شیخ الہندؒ نے اسی نسخے کو معجونِ مرکب کی صورت میں محفوظ کیا اور اس قابل کردیا کہ ہرکس وناکس اسے استعمال کرسکے، چنانچہ وہ استعمال شروع ہوکر عام ہوگیا، تحریکِ خلافت میں یہی نسخہ گو تلخ تھا مگر سب نے استعمال کیا اور بہرحال عام استعمال شروع ہوکر آزادی کا جذبہ مُسلمانوں سے گذر کر ابنائے وطن تک پہنچا وہ بھی سرگرم ہوگئے اور ہندومُسلمانوں کی انتھک مساعی اور قربانیوں کا ثمرۂ شیریں آج ملک کی آزادی کی شکل میں ہمارے سامنے ہے جس پر ہم ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ہیں اور ان بزرگانِ مرحومین کے لئے دعاءِ خیر کرتے ہیں جن کی تخم ریزی سے یہ درخت تناور ہوا اور آج اس کا پھل سب کھا رہے ہیں،

ہندوستان کی آزادی تمام دنیائے اسلام کی آزادی ہے، اس لئے ہماری مُبارکباد کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہے، ہماری مبارک باد کی مستحق ہندوستان وپاکستان

دونوں سلطنتیں ہیں، ہم پاکستان کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے اور ہندوستان کو وطن کی حیثیت سے مبارک باد دیتے ہیں، میں اس تصور کو بھی ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہندوستان میں اب مسلمان ایک معمولی اقلیت کی صورت میں رہ گئے ہیں، اور آج کی آزادی میں جہاں ان کے لئے یہ انتہائی خوشی کا مقام ہے کہ انگریز کا دوسو سالہ اقتدار ختم ہوگیا جس کے لئے وہ بے چین تھے وہیں اس فکر کا موقع بھی ہے کہ ان کی حیات اجتماعی کی اس ملک میں اب کیا صورت ہوگی؟ اس کے لئے انھیں ابھی سے قدم اٹھانا چاہئے، شریعتِ مقدسہ کی روشنی میں صرف ایک ہی صورت ہے کہ وہ اپنے شرعی نظام کو قائم کرنے کے لئے اپنے میں سے کسی امام اور مستند امیر کا انتخاب کریں، ہندوستان کی مسلم جماعتیں منتشر رہنے کے بجائے متحد ہوں، ایک ہوجائیں اور اسلام کے کلمے پر ایک ہوں، ایک امیر کے ماتحت شرعی زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کریں، اسی ایک جملے میں ان کی حیاتِ اجتماعی کی لمبی چوڑی تفسیر پنہاں ہے، ان کے لئے سب سے مقدم یہ ہے کہ ماضی کے واقعات فراموش کردیئے جائیں، ہم طعن وطنز کا سلسلہ ترک کریں، ایک دوسرے پر الزام رکھنے کی فکر نہ کریں، بلکہ صرف مستقبل کو سامنے رکھ کر اس پر غور کریں کہ متحد ہونے کے لئے اُخوّت ومساوات کی کیا تدابیر ہوسکتی ہیں جن کو وہ آج عمل میں لاسکتے ہیں میرے خیال میں پہلے سے زیادہ اب سکے امکانات ہیں کہ ہم متحد ہوسکیں وہ پارٹیاں جن پر آویزشوں کی بنیادیں ہیں اس انقلاب سے منقلب ہوچکی ہیں اور حقیقتاً ہندوستان کے بدلنے سے وہ بھی بدل گئی ہیں، اس لئے اب بجائے اسکے کہ ہم نئی پارٹیوں کی بنیادیں رکھ کر اختلافات کی تخم ریزی کریں یہ مناسب بلکہ ضروری ہے کہ وحدتِ جماعت کا سنگِ بنیاد رکھ کر ان تمام مسائل کو حل کریں جو نئے ہندوستان میں پیدا ہوگئے ہیں[1]۔

---

[1] رسالہ دارالعلوم بابتہ ماہ ذیقعدہ ۱۳۶۶ھ (اکتوبر ۱۹۴۷ء)

اس موقع پر دارالعلوم کی جانب سے حسبِ ذیل اعلان شائع کیا گیا:۔

دارالعلوم دیوبند مسلمانوں کی ایک مذہبی درس گاہ اور ایک عظیم الشان علمی ادارہ ہے، جس نے ملکی سیاسیات کے ہنگاموں میں بھی اپنی تعلیم اور تعلیمی کاموں کی ہمیشہ حفاظت کی ہے، اور تعلیمی سلسلوں میں کسی وقتی تحریک سے مغلوب ہو کر کبھی خلل نہیں پڑنے دیا، لیکن اس کے باوجود اس نے برطانوی غلبہ و اقتدار کی مخالفت کی حد تک کبھی بھی اپنی قوم اور قومی تحریکات سے بیگانگی نہیں برتی بلکہ ذمہ دارانہ طریق پر اس قسم کے قومی معاملات میں مناسب حصّہ لیا۔

ہندوستان کی وطنی آزادی کا واقعہ اور برطانوی سامراج کے استیلاء و تسلّط سے اس کی نجات کا پہلا قدم کوئی ایسی چیز نہیں کہ دارالعلوم اس سے الگ رہ سکے دارالعلوم وطن کی آزادی پر نہ صرف مسرور ہی ہے بلکہ اسے مستقبل کی حقیقی آزادی کیلئے فالِ نیک تصور کر رہا ہے اور آئندہ کی بہت سی مسرّتوں کا پیش خیمہ سمجھ رہا ہے۔

اس نے ہندوستان کے اس ابتدائی آزادی کے واقعے اور انتہائی آزادی کی پوری توقع پر اظہارِ مسرّت کرنے کے لئے طے کیا ہے کہ ۱۵؍ اگست کو عام تعطیل منائی جائے، چنانچہ تعطیل کے ذریعے ملک کی اس عام مسرّت میں دارالعلوم شریک ہے

ہندوستان دو سو سال کی غلامی کے بعد آج آزادی کی پہلی قسط حاصل کر رہا ہے،

ہم ان تمام دوست افراد کو جنھوں نے ملک کی آزادی کی خاطر قربانیاں دی ہیں مبارکباد دیتے ہیں کہ حق تعالےٰ نے اُن کی مساعی کو قبول فرما کر آزادی کی دولت سے بہرہ ور فرمایا، ہمیں اُمید ہے کہ ملک کے یہ جانباز اس وقت تک برابر جد و جہد کو جاری رکھیں گے جب تک کہ ہندوستان مکمل آزادی حاصل نہ کرلے، اور انھیں آزادی کے ساتھ اپنے تمام شعائرِ ملی و مذہبی کو بلند کرنے کا موقع حاصل نہ ہو جائے[1]

---

[1] رسالہ دارالعلوم دیوبند بابت ماہ شوال ۱۳۶۶ھ (ستمبر ۱۹۴۷ء)۔

۱۳۶۷ھ، دارالافتار کی جدید عمارت

دارالعلوم کے دارالافتار کو ملک میں جو اہمیت اور عظمت حاصل ہے اس کا اندازہ ان بے شمار سوالات سے کیا جا سکتا ہے جو ہمیشہ شرعی مسائل میں رہنمائی حاصل کرنے کے لئے دارالافتار سے کئے جاتے ہیں برِ صغیر کا کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جہاں دارالعلوم سے طلبِ فتاویٰ کے خواہشمند موجود نہ ہوں، دارالافتار کی قدیم عمارت بہت مختصر تھی، دارالافتار میں کارکنوں کے اضافے کے بعد جگہ بہت تنگ ہوگئی تھی، اس لئے مسجد دارالعلوم کی مشرقی جانب کی عمارت کی بالائی منزل پر ایسی وسیع اور کشادہ عمارت تیار کرائی گئی جو دارالافتار کی ضرورتوں کو پورا کر سکے، دارالافتار کی یہ عمارت متعدد کمروں پر مشتمل ہے، ان میں ایک کمرہ دارالافتار کے کتب خانہ کے لئے مخصوص ہے، ۱۹ ربیع الاخر ۱۳۶۷ھ سے دارالافتار کو جدید عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔

انسدادِ ارتداد مسلمانانِ دہرہ دون

دہرہ دون کے نواحی علاقے میں فساد کے بعد مسلمانوں کے ارتداد کا فتنہ زور پکڑ گیا تھا، دارالعلوم سے اس فتنے کے انسداد کے لئے مبلّغ بھیجا گیا، دارالعلوم کے مبلّغ نے دہرہ دون کو مرکز قرار دے کر دیہات میں گشت کیا، مبلّغ کے بروقت پہنچنے سے وہاں کے مسلمانوں کو بڑی تقویت حاصل ہوئی، مبلّغ صاحب نے مسلمانوں کو دوبارہ بسانے اور آباد کرنے میں بڑی تن دہی کا ثبوت دیا، ان کی جدوجہد سے بہت سے مرتدین اسلام میں واپس آ گئے، دیہاتی مسلمانوں میں ہمت و استقلال اور خوداعتمادی سے فسادات کا مقابلہ کرنے کا جذبہ پیدا ہوگیا، جو لوگ خوف و ہراس کے باعث ترکِ وطن کر چکے تھے وہ دوبارہ اپنے گھروں میں لوٹ آئے۔

۱۳۶۸ھ، مسلم یونیورسٹی کورٹ کیلئے علمائے دیوبند کا انتخاب

دیوبند اور علی گڈھ کے

مابین عرصے سے جو بُعد چلا آرہا تھا ۱۳۵۹ھ میں حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہٗ کی یونیورسٹی میں تقریروں سے اُس میں بڑی کمی آگئی تھی، چنانچہ یہ پہلا موقع تھا کہ مُسلم یونیورسٹی کی کورٹ کے لئے علمائے دیوبند کو منتخب کیا گیا۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰنؒ، مولانا محفوظ الرحمٰن نامی مرحوم اور مولانا محمد طیب صاحب کا کورٹ کی رکنیت کے لئے انتخاب عمل میں آیا، اور اس طرح ان دونوں عظیم علمی اداروں میں تعاون کی راہیں کُھل گئیں۔

دارالعلوم کی تلاشی اور احکام عیدالاضحیٰ کی ضبطی

گذشتہ سال بھی عیدالاضحیٰ کے موقع پر حکام کی مداخلت سے دارالعلوم کے ساتھ اہانت آمیز واقعہ پیش آیا تھا، اس سال پھر عیدالاضحیٰ سے چند روز قبل ۵ ذی الحجہ کو دارالعلوم کی تلاشی کا افسوسناک حادثہ پیش آیا، ایک مقامی پولیس افسر تین پینتیس مسلح کانسٹبلوں کے ساتھ دارالعلوم کے دروازے پر پہنچا اور ادارہ اہتمام کے کسی رکن سے اجازت اور اُن اخلاقی تقاضوں سے کام لئے بغیر جو اس قسم کے مواقع پر ضروری سمجھے جاتے ہیں اس نے دفتر اہتمام کی تلاشی لے کر عیدالاضحیٰ کے ان مطبوعہ احکام و مسائل پر قبضہ کر لیا جن میں قربانی کے احکام درج تھے، قربانی کے احکام چندے کی اپیل کے ساتھ سالہا سال سے شائع ہوتے رہے ہیں اور اس سے پہلے کبھی اس پر اعتراض نہیں کیا گیا، اس مرتبہ حکام کے نزدیک اشتہار کے مضمون کا وہ حصّہ خاص طور سے قابلِ اعتراض تھا جس میں قربانی کے جانوروں کی تفصیل کے ساتھ گائے کا ذکر تھا، اُن کے نزدیک گائے کے ذکر کے یہ معنیٰ تھے کہ دارالعلوم کی جانب سے حکومت کے احکام کے خلاف قربانی کی ترغیب دی گئی ہے، حکام کو بتلایا گیا کہ گائے کا ذکر بطور مسئلہ کے کیا گیا ہے، چنانچہ اس میں اونٹ کی قربانی کا ذکر موجود ہے، حالانکہ ہندوستان بھر میں اونٹ کی قربانی نہیں ہوتی، نیز اس کے ساتھ یہ نوٹ بھی موجود ہے کہ بحالاتِ موجودہ مُسلمان وقت کے مصالح کے پیشِ نظر گردوپیش کے ملکی حالات کی رعایت

ملحوظ رکھیں اور ایسے طریقے اختیار نہ کئے جائیں جن سے امن وامان میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہو' دارالعلوم دنیائے اسلام کے مسلمانوں کا مرکزی دینی ادارہ ہے، یہ شرعی احکام ہیں جن کا بیان کرنا دارالعلوم کا فریضہ ہے، یہ احکام ہندوستان سے باہر بھی بڑی تعداد میں بھیجے جاتے ہیں جہاں گائے کی قربانی پر پابندی نہیں ہے، علاوہ ازیں خود ہندوستان میں بھی بہت سے ایسے مقامات ہیں جہاں گائے کا ذبیحہ ممنوع نہیں ہے، مگر حکام کا اصرار بدستور باقی رہا، چنانچہ ان کے اصرار پر ایک مزید اعلان شائع کیا گیا، جس میں حکام کے مزعومہ شبہ کا ازالہ کرتے ہوئے بتلایا گیا کہ "جن مقامات پر حکومت کی جانب سے گائے کی قربانی پر پابندی عائد ہے وہاں ملک کے موجودہ حالات اور آپس کے میل ملاپ کے لئے گائے بیل اور بچھڑے کی قربانی سے احتراز کیا جائے، نیز حکومت کے احکام کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے۔"

ملک میں حکام کے اس توہین آمیز اقدام پر جا بجا احتجاجی جلسے کئے گئے اور اخبارات کے ذریعے اس فعل کی مذمت کی گئی۔

۱۳۶۹ھ، پاکستانی طلباء کے داخلے میں حکومت ہند کا تعاون

ہندوستان کی تقسیم کے بعد پرمٹ سسٹم[1] کی وجہ سے پاکستانی علاقے کے طلباء کی آمد و رفت بالکل بند ہوگئی تھی، بالخصوص مغربی پاکستان کے طلباء کے لئے دارالعلوم میں حصول علم کا کوئی ذریعہ باقی نہیں رہا تھا، دارالعلوم کی شہرہ آفاق مرکزیت کے پیش نظر طالبانِ علم دارالعلوم میں آنے کے لئے بے چین تھے، اور اس امر کے لئے درخواستوں

---

[1] اس وقت دونوں ملکوں کے درمیان پاسپورٹ اور ویزا نہ تھا پرمٹ لے کر ایک دوسرے ملک میں سفر کیا جا سکتا تھا۔

درخواستیں چلی آرہی تھیں کہ پاکستانی طلبار کے لئے ایسے ذرائع مہیا کئے جائیں جو انھیں انکے گوہرِ مقصود (علم) سے ہم کنار کرسکیں، اس صورتِ حال کو حکومتِ ہند کے سامنے پیش کیا گیا وزارتِ تعلیم نے دارالعلوم کی اس درخواست کو منظور کر کے یہ اجازت دیدی کہ جو طلبار پاکستان سے دارالعلوم میں آنا چاہیں اُن کو درخواست پیش کرنے پر ایک سال کا پرمٹ دے دیا جایا کرے گا جس کی بعد میں حسبِ ضرورت صوبائی حکومت سے توسیع کرائی جاسکتی ہے، مگر اس اجازت کے باوجود دفتری ضوابط کی وجہ سے زیادہ عرصے تک یہ سلسلہ چل نہ سکا۔

حکومتِ ہند کی جانب سے بیرونِ ہند میں دارالعلوم کا تعارف

اس سال میں وزارتِ خارجہ اور آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن نے اپنی نشریات کے سلسلے میں اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ دارالعلوم کی تاریخ اور موجودہ حالات کا بیرونی دنیا اور بالخصوص مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں تعارف کرایا جائے، چنانچہ اس مقصد سے دارالعلوم کے حالات اور عمارتوں کی تصاویر حاصل کرنے کے لئے یکے بعد دیگرے وزارتِ خارجہ اور آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن کے اراکین دیوبند آئے، موخرالذکر اراکین میں ڈپٹی ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو برائے مشرقِ وسطیٰ اور مصر و ایران کے نمائندے نشریات شامل تھے، دارالعلوم کی بڑی بڑی عمارتوں، اسکے مختلف شعبہ جات اور نادر مخطوطات کے فوٹو لئے گئے، دارالعلوم کے معائنے کے بعد ان حضرات نے اپنے تاثرات کا جن الفاظ میں اظہار فرمایا مناسب ہوگا کہ اس کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا جائے۔

ایم۔ اے۔ ایس ڈپٹی ڈائرکٹر برائے مشرقِ وسطیٰ کے الفاظ یہ تھے:۔

"یہاں پر سادہ زندگی اور بلند عزائم کی روح اپنے حقیقی معنیٰ میں ملتی ہے، میں نے بعض لکچروں کو سُنا اور دیکھا، اور یہ بھی دیکھا کہ طلبار کو کس ضبط و نظم

کے ساتھ کھانا تقسیم کیا جاتا ہے، مطبخ بہت صاف ستھرا تھا، مالیات کا حساب بہت باضابطہ رکھا جاتا ہے، دارالعلوم میں ایک بہت بڑا کتب خانہ ہے، جس میں مختلف موضوعات پر قیمتی کتابیں ہیں، حقیقت میں یہ ادارہ ایک یونیورسٹی ہے۔"

عبدالفتاح عودہ ناظم نشریات عربی نے کہا کہ :۔

"یہ امر واقعہ ہے کہ میں نے دیوبند میں اسلام کا ایک قلعہ اور ایمان و سُننِ نبوی کی ایک پناہ گاہ پائی، یہاں آکر میں نے معلوم کیا کہ دین و دنیا اور آخرت دونوں کے لئے کس طرح کی صلاحیت دارالعلوم اپنے اندر رکھتا ہے، یہ بڑی قیمتی میراث ہے جس کے ساتھ تمسک کرنا ہمارے لئے ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ ہم مستقبل کی تعمیر کے لئے اسے عماد اور ستون بنائیں۔"

علی امیر معز ناظم نشریات فارسی نے بیان کیا کہ :۔

"یہ وہ جگہ ہے جہاں میں نے اسلام کی حقیقی عظمت اور قدرت کا احساس کیا، میں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی صفیں نماز میں خالی نہیں اور ہر ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے، آخر کار ایک دن آئے گا کہ اسلام کے اتحاد و سادگی کے سائے اور مسلمانوں کی بے ریائی اور بے لوثی کے نتیجے میں اسلام تمام جہان پر چھا جائے گا۔

اسلام کے بتلائے ہوئے طریقے کے مطابق خدا کی عبادت جس سے ہم مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں دور ہو گئے تھے اور دنیوی مال و دولت اور جاہ و جلال نے ہماری آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا اُس کو ہم نے اس مقدس مقام میں پایا۔ اور اس طرح پایا کہ اسلام کی عظمت

سے ہم دوبارہ آگاہ ہوئے۔"

سفیرِ افغانستان کی دارالعلوم میں تشریف آوری

جس طرح دارالعلوم کا علمی فیضان عام ہے اسی طرح اس کے ہمدردوں کا حلقہ بھی وسیع ہے، آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ مسلمانانِ ہند کے علاوہ دوسرے ممالک کے مسلمان بھی اس کی تعمیر و ترقی میں کم و بیش شریک رہے ہیں، خصوصاً افغانستان نے دارالعلوم کی دینی خدمات کو ہمیشہ اہمیت کی نظر سے دیکھا ہے، چنانچہ ان ہی قدیم روابط کے پیشِ نظر سفیرِ افغانستان مقیم دہلی سردار نجیب اللہ خاں، ۸ رجب کو دارالعلوم میں سرکاری حیثیت سے تشریف لائے، اور کئی گھنٹے تک اکابرِ دارالعلوم سے علمی مسائل پر تبادلۂ خیالات فرمایا۔ دارالعلوم کے شعبہ جات اور درسگاہوں کا معائنہ کیا، سفیر موصوف "باب الظاہر" کی بالائی منزل میں قیام پذیر ہوئے، "باب الظاہر" افغانستان کے بادشاہ محمد ظاہر شاہ کی علم دوستی کی شاندار یادگار ہے، ممدوح کے اعزاز میں دارالحدیث کے بڑے ہال میں جلسہ منعقد کیا گیا، تہنیتی نظم کے بعد حضرت مہتمم صاحب نے خیر مقدم کی تقریر میں دارالعلوم اور افغانستان کے تاریخی تعلقات پر تفصیلی روشنی ڈالی اور دارالعلوم کے بین الاسلامی مسلک کی وضاحت فرمائی، آخر میں سردار نجیب اللہ خاں نے اپنی جوابی تقریر میں ملتِ افغان کے دارالعلوم سے شغف و تعلق اور دارالعلوم کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا:۔

"دارالعلوم دیوبند افغانستان کے عوام کی نظر میں ایک عوامی علمی درسگاہ ہے، مگر میں اپنے مشاہدے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ صرف ایک علمی درسگاہ ہی نہیں ہے، بلکہ اسلامی ثقافت کا مرکز بھی ہے، دارالعلوم نے اس زمانے میں جبکہ ہندوستان میں اسلامی حکومت باقی نہیں رہی تھی دین اور اسلامی علوم کی حفاظت کی، اور مجھے اُمید ہے کہ وہ آئندہ بھی اسی طرح

علوم وفنون کی خدمت میں معروف رہے گا، افغانستان کے عوام اور علماء اور علم دوست اس کے قدردان ہی نہیں بلکہ علماء کے مددگار اور بہی خواہ بھی ہیں۔

ثقافت اسلامی کی بنیاد سچائی، محبت، مساوات اور حقیقت شناسی پر مبنی ہے اور یہ دارالعلوم ان اجزاء پر مشتمل ہے۔

دارالعلوم کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اس نے ہمیشہ راست کردار اور راست گفتار فرزند پیدا کئے ہیں جن پر دارالعلوم صحیح طور پر فخر کرسکتا ہے، دارالعلوم تنہا ہندوستان کا ورثہ نہیں ہے بلکہ تمام عالم اسلامی کی میراث ہے، اسلئے خدا تعالےٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ اس دارالعلوم کو ترقیوں کے ساتھ باقی رکھے اور عالم اسلامی کے لئے مفید بنائے۔"

۱۳۷۰ھ مولانا آزادؒ کی تشریف آوری

حکومت ہند کے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد ۲۹ ربیع الآخر ۱۳۷۰ھ کی صبح کو دیوبند تشریف لائے، تشریف آوری سے قبل آپ کا تار حضرت مدنیؒ کے پاس اس مضمون کا پہونچا کہ میں ۸ جنوری کو آرہا ہوں اور کھانا مولانا محمد طیب کے ساتھ کھاؤں گا اس تشریف آوری کے موقع پر ان کا پُرجوش استقبال کیا گیا۔

سب سے پہلے آپ دارالعلوم میں تشریف لائے، مسندِ اہتمام کا اس درجے احترام ملحوظ رکھا کہ صدر مقام سے کسی قدر ہٹ کر بیٹھے، دیر تک تعلیمی امور پر گفتگو ہوتی رہی، نشست کے بعد مولانا نے دارالعلوم کے شعبہ جات اور درسگاہوں کا معائنہ فرمایا، دورانِ معائنہ میں ہر ہر شعبہ کی اہمیت اور اس کی کارکردگی کا اپنے مخصوص انداز میں اظہار فرماتے رہے بعد ظہر جلسۂ خیر مقدم ہوا، تہنیتی قصائد اور سپاس نامے پیش کئے گئے، حضرت مہتمم صاحب نے تفصیل کے ساتھ دارالعلوم کا تعارف کرایا، آخر میں مولانا آزاد نے نہایت

فصیح و بلیغ اور بصیرت افروز تقریر فرمائی، جس میں بانیٔ دار العلوم کی مثالی زندگی کی خصوصیات دار العلوم کی علمی اہمیت و عظمت اور اس سے اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کرنے کے بعد آخر میں طلبا سے خطاب کرتے ہوئے اُن کو زریں نصائح کی تلقین فرمائی، تقریر کا یہ حصہ اس قدر اہم ہے کہ اگر طالبانِ علم اس کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنالیں تو علم کی دنیا میں حیات آفریں انقلاب پیدا ہو سکتا ہے، مولانا آزاد نے فرمایا:۔

"طلبائے عزیز! کیا تم نے اس پر کبھی غور کیا ہے کہ تم جو تعلیم حاصل کر رہے ہو اس کا مقصد کیا ہے؟ یہ علم مقصود ہے یا وسیلہ؟ دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو وسیلہ ہیں، اصل مطلوب نہیں، البتہ جو مطلوب ہیں وہ ان کے بغیر نہیں مل سکتیں، اس لئے وسیلہ بھی مطلوب ہو جائے گا، مثلاً سکہ چاندی سونے کا چلتا ہے، دولت کمانے کا یہی ذریعہ ہے مگر ہماری زندگی کی ضرورتوں میں یہ سونا چاندی کس کام آتا ہے، اگر پیاس لگی ہو تو کیا چاندی سے بجھ جائے گی؟ بھوک میں کیا سونا بھوک بجھا دے گا؟ مگر جب تک یہ سامان نہ ہو کھانے پینے کی چیزیں نہیں مل سکتیں، اس لئے چاندی سونا بھی ضروری ہو گیا ہے، گورنمنٹ نے کرنسی نوٹ چلائے ہیں، کاغذ کا پرچہ ایک چھدام کا بھی نہیں ہے، مگر گورنمنٹ نے اس پر چھاپ دیا ہے ایک ہزار روپے، اب یہ وسیلہ ہے اسی کاغذ کے ذریعہ سے روپیہ اور اشرفیاں مل جاتی ہیں، یہ کاغذ وسیلہ ہو گیا ہے ایک ہزار روپے وصول کرنے کا، اب لوگ ہزار روپے کی اشرفیاں یا چاندی کے سکے نہیں رکھتے بلکہ کاغذ کا یہ پرزہ رکھ لیتے ہیں، جو چیزیں وسائل کا حکم رکھتی ہیں اُنہیں استقرار ضروری نہیں ہے، لیکن جو چیزیں مقاصد میں داخل ہیں اُن میں تبدیلی نہیں ہو سکتی بھوک میں غذا مقصد ہے، وسیلہ اس کو بدل نہیں سکتا!

تم نے اپنے گھروں اور عزیز واقارب کو چھوڑا اور یہاں آئے، ملک میں تعلیم کے دوسرے طریقے بھی رائج ہیں، لوگ ان کی طرف دوڑتے ہیں، مگر تم نے اسکولوں

اور کالجوں سے آنکھیں بند کیں تاکہ دینی علوم میں مہارت حاصل کرو، بڑا مبارک ارادہ ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ جس علم کو تم سیکھ رہے ہو وہ علم وسیلہ ہے یا مقصد؟ تمہارے ذہن نے اگر اس کو نہ سمجھا تو میں متنبہ کروں گا کہ تم صحیح کام نہیں کر رہے ہو، اور قوموں نے ہمیشہ علم کو وسیلہ سمجھا ہے مگر مسلمانوں کی یہ خصوصیت ہے کہ انھوں نے علم کو وسیلہ نہیں مقصد سمجھا ذریعۂ معاش نہیں سمجھا! ہندوستان میں ۲۴ یونیورسٹیاں ہیں، کالج ہیں اور لاکھوں اسکول ہیں، جن کا دامن دیہات تک پھیلا ہوا ہے، اُن میں جو تعلیم ہوتی ہے اس کو وسیلہ سمجھا جاتا ہے، مقصد نہیں سمجھا جاتا، ان میں صرف اس لئے تعلیم حاصل کی جاتی ہے کہ سرکاری ملازمتیں مل سکیں، اور اونچے عہدے حاصل کئے جا سکیں، جو شخص وہاں جاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ جب تک یہاں کی ڈگری موجود نہ ہو وہ معاش حاصل نہیں کر سکتا، مگر میں تمہیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ جس علم کی خاطر تم زانوئے ادب طے کر رہے ہو وہ علم مقصد ہے! وسیلہ نہیں ہے! اس کو کسی وسیلے کے طور پر حاصل نہیں کیا جاتا بلکہ اس لئے حاصل کیا جاتا ہے کہ اس کا حصول فرض ہے! مسلمانوں نے ہمیشہ علم کو علم کے لئے سیکھا ہے، وسیلے کے طور پر نہیں، انھوں نے کبھی علم کو اس لئے حاصل نہیں کیا کہ اس کے ذریعے سے معیشت حاصل کریں، مسلمانوں نے ذریعۂ معیشت کسی اور چیز کو بنایا، جنھوں نے علمار کے افسانے سُنے ہیں وہ جانتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ جنھوں نے علم فقہ مدوّن کیا جس پر کروڑوں مسلمان عمل کرتے ہیں وہ بزاز تھے، انھوں نے اپنے وسیع علم کو ذریعۂ معیشت نہیں بنایا، معروف کرخی موچی تھے، آج تم اس پیشے کو بھی سننے کے لئے تیار نہیں ہو، وہ کرخ[1] میں نکل جاتے، بازار میں بیٹھتے، راہ چلتے آدمیوں کے جوتے سینتے، اور اُس کی اُجرت سے گذر بسر کرتے، شمس الائمہ کا نام ہی حلوائی پڑ گیا تھا، اور اتنا بڑا عالم اپنا ذریعۂ معیشت حلوہ فروشی بنائے ہوئے تھا!

اسی طرح اسلام کے مشہور علمار نے علم دین کے چشمے بہائے مگر کبھی علم دین کو

---

[1] کرخ بغداد کے ایک محلّے کا نام ہے۔

ذریعۂ معیشت نہیں بنایا، وہ علم کو علم کے لئے حاصل کرتے تھے، زخارفِ دنیوی کے لئے نہیں، ان کے نزدیک یہ گناہ تھا کہ علم کو دنیا کے لئے حاصل کیا جائے، وہ تشنگانِ علم کو علم کی روشنی سے سیراب کرنا اپنا دینی فریضہ سمجھتے تھے! یہ ہمارے علمار کا خاص شیوہ رہا ہے کہ دین کی خدمت اور علوم دینیہ کی اشاعت کو انھوں نے اپنا فریضہ سمجھا ہے، انھوں نے اس کے لئے خرید و فروخت کا بازار گرم نہیں کیا، اس حقیقت کو اگر تم نے سمجھ لیا تو اپنی پوری زندگی کی تاریخ ڈھال لی!

اللہ نے تمہیں علم دین کی توفیق دی ہے تو تمہارا فرض ہے کہ اس کی صدا ہر شخص کے کانوں تک پہنچا دو، کچھ دنوں کے بعد تم تعلیم کے مرحلوں کو طے کر کے فراغت حاصل کرو گے، اور ایک عالم دین کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش ہو گے، اس وقت تمہارے سامنے یہی فریضہ ہونا چاہیئے، اگر تم نے یہ کر لیا تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ جو علم تم حاصل کر رہے ہو اس آسمان کے نیچے اس سے اونچا عزت کا کوئی اور مقام نہیں ہوگا۔

میری دعا رہے گی کہ اللہ تعالےٰ آپ سب کو اس کی توفیق بخشے، میں اُمید کرتا ہوں کہ مجھے انشار اللہ بار بار اس قسم کی تقریبات میں شرکت کا موقع ملے گا۔[1]

ملک کی تقسیم کا آمدنی اور طلبار کی تعداد پر اثر

۱۳۶۶ھ ۱۹۴۷ء یعنی ملک کی تقسیم کا سال

دارالعلوم کی آمدنی کے لئے بڑا پریشان کن سال تھا، طلبار کی تعداد بھی غیر معمولی طور پر کم ہوگئی، متحدہ ہندوستان کے جو علاقے پاکستان کے حصے میں آئے تھے

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "روداد خیر مقدم مولانا آزاد" شائع کردہ دفتر اہتمام دارالعلوم دیوبند۔ مرتبہ: سید محبوب رضوی

وہی دار العلوم کی آمدنی کے علاقے تھے، مغربی پاکستان کے علاقے سے آمدنی زیادہ ہوتی تھی اور مشرقی پاکستان سے طلبار زیادہ تعداد میں آتے تھے، پھر دہلی، کلکتہ، حیدرآباد کے فسادات اور ان مقامات کی مسلمان تاجر پیشہ آبادی کی اکثریت کا پاکستان منتقل ہوجانا مزید پریشانی کا باعث ہوا، دار العلوم کے لئے یہ زمانہ بڑی آزمائش و ابتلا کا تھا، مگر رفتہ رفتہ یہ حالت تبدیل ہوتی رہی، طلبہ کی تعداد جو سولہ سو سے گھٹ کر ایک ہزار پر آگئی تھی اس سال میں ترقی کر کے بارہ سو سے اوپر پہنچ گئی، آمدنی میں بھی بتدریج اضافہ ہوتا رہا، حالات پُرسکون ہوجانے پر پاکستان کے اہلِ خیر نے بڑی فیاضی سے امداد و اعانت میں حصہ لیا، چنانچہ دار العلوم کی جانب سے پاکستان کے مرکزی مقامات میں تحصیل چندے کے دفاتر کھول دیئے گئے، چند سالوں تک پاکستان سے سب سے بڑی امداد غلّے کی ہوتی رہی، یا پانچ ہزار من گیہوں جو طلبار و اساتذہ اور عملے کی سال بھر کی ضروریات کے لئے درکار ہوتا تھا بہت ہی معمولی نرخ پر بھاولپور (پاکستان) سے ہر سال آتا رہا، اس بحرانی زمانے میں دار العلوم کے سنبھالے رکھنے میں بھاولپور کے اس غلّے کا بڑا حصہ ہے، خصوصاً ملکی تقسیم کے بعد چار سال تک اگر یہ امداد میسّر نہ آتی تو دار العلوم کو بڑی دشواریاں پیش آتیں، حق تعالےٰ اُن لوگوں کو جزائے خیر اور اجرِ عظیم عطا فرمائے، جن کی توجہ اور سعی و کوشش ایسے حالات میں دار العلوم کے لئے مددگار ثابت ہوئی۔

۱۳۷۱ھ، اچاریہ ونوبا بھاوے کے تأثرات

اچاریہ ونوبا بھاوے اپنی بھومی دان کی تحریک کے سلسلے میں ۲ ربیع الاول ۱۳۷۱ھ (۲ دسمبر ۱۹۵۱ء) کو وارِدِ دیوبند ہوئے اتفاق سے اس تاریخ میں دار العلوم کی مجلسِ شوریٰ کا اجلاس ہو رہا تھا، حضرت مہتمم صاحب، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اچاریہ جی سے ملاقات کے لئے اُن کی قیام گاہ پر تشریف

لے گئے۔ وقت کی تنگی کے باعث اچاریہ جی کو دن میں دارالعلوم کو دیکھنے کا موقع نہ مل سکا
شب میں سات بجے کے قریب اچاریہ جی آئے اور دارالعلوم کو دیکھ کر اس مسرت کا
اظہار کیا کہ ان کو ایشیا کی اس عجیب و غریب تعلیم گاہ کے دیکھنے کا موقع ملا۔ آپ نے
طلبار اور ذمہ داران دارالعلوم کو مبارک باد دی کہ خدمتِ ملک و ملت کے اعلیٰ مقصد
کو سامنے رکھتے ہوئے انگریزی اقتدار کے دورِ غلامی میں انھوں نے عظیم الشان خدمات
انجام دی ہیں۔

طلبار کی درخواست پر انھوں نے ایک مختصر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "یہ یونیورسٹی
ہمارے ملک کا بہترین سرمایہ ہے، جس میں پورے ایشیا کے نوجوان جمع ہیں جن کے
ذریعے سے ہم ایشیا کے اتحاد کے نقشے میں رنگ بھر سکتے ہیں، غلامی کے دور میں اس
یونیورسٹی نے جو خدمت انجام دی ہے، مجھے اُمید ہے کہ اس سے بہت زیادہ عظیم الشان
خدمت آزادی کے دور میں انجام دے گی، ہم اس یونیورسٹی کے ذریعے سے مشرقی
ایشیا میں اپنا پیغام پہنچا سکیں گے، ہندوستان ہمیشہ سے پریم اور اتحاد کا حامل رہا
ہے، یہاں بہت سی قومیں آئیں اور پریم و اتحاد کی گنگا جمنا سے سیراب ہوئیں، ہندوستان
اپنا یہ پیغام پورے ایشیا بلکہ تمام دنیا تک پہنچانا چاہتا ہے، اس کے پیغام سے دنیا کی
موجودہ گتھی سلجھ سکتی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ یہ یونیورسٹی ہمارے اس پیغام کو پہنچانے
میں بہت زیادہ مددگار ثابت ہوگی۔"[1]

دارالعلوم کو دیکھنے کے بعد اچاریہ جی نے شہر میں جو تقریر کی اس میں بھی بطور
خاص انھوں نے دارالعلوم کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

"میں اس ادارے میں جا کر بہت خوش ہوا، یہ سادہ زندگی، کم سے کم ضروریات

---

[1] روزنامہ "الجمعیۃ" مورخہ ۸ر دسمبر ۱۹۵۱ء۔

زندگی اور ایک بامقصد زندگی کی طرف رہنمائی کرنے والا ادارہ ہے، جس نے ہزاروں لاکھوں انسانوں کو مذہب کی برکتوں سے مالا مال کیا ہے، یہ علم کا بڑا مرکز ہے، یہاں سے علم کی جو ہوائیں چلتی ہیں وہ دُور دُور تک پھیل جاتی ہیں۔

مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ اس مشینی دور میں اس ادارے کے لوگ مشینی زندگی کی اہمیت سے واقف ہوتے ہوئے بھی بڑی سادہ زندگی گذارتے ہیں۔

آخر میں انھوں نے کہا "یہی ایک ادارہ ہے جس نے پہلے دن سے برٹش سامراج کی مخالفت کی، اور اس مخالفت میں ہر محاذ پر سب سے پہلے قربانیاں پیش کی ہیں۔"

دارالعلوم کا ایک نازک مالیاتی دَور

مابعد جنگ جو اقتصادی زبوں حالی پیش آئی اُس سے کوئی ادارہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا، دارالعلوم پر بھی اس کا اثر پڑنا ناگزیر تھا، ادھر ملکی تقسیم کے بعد آمدنی کے بڑے علاقے پاکستان میں شامل ہو چکے تھے، مُسلمانانِ عالم کی اس مشترک امانت کی اعانت کے لئے ایک عالمی اپیل شائع کی گئی، اور الحمد للہ اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا، خصوصاً پاکستان اور جنوبی افریقہ نے اس میں بڑا حصہ لیا، حتیٰ کہ ساؤتھ روڈیشیا جس کا نام بھی کبھی دارالعلوم کے اعانتی حلقے میں سننے میں نہیں آیا تھا وہ بھی چندہ دہندگان کی صف میں شریک ہوگیا، اور اس طرح بفضلہ تعالےٰ دارالعلوم کی کشتی گرداب سے نکل کر ساحلِ مراد کی جانب رواں دواں ہوگئی۔

قرب وجوار کے مُسلمانوں کی فیاضی

اسی کے ساتھ ساتھ دارالعلوم میں ایک نئی اسکیم کا آغاز کیا گیا یعنی دارالعلوم

کی جانب سے فصلِ ربیع کے موقع پر قرب وجوار کے مسلمان زمینداروں اور کاشتکاروں کا ایک نمائندہ اجتماع بلایا گیا، جس نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ دارالعلوم کی امداد و اعانت میں وہ کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ اس کی یہ صورت تجویز کی گئی کہ دارالعلوم کی سال بھر کی ضرورت کے لئے پانچ ہزار من غلّے کی فراہمی کا شتکاروں اور زمینداروں کی جانب سے ہونی چاہیے، چنانچہ اس پر عمل شروع کر دیا گیا اور باوجودیکہ پہلے سے کام کا تجربہ نہ تھا اور ادھر فصل کٹنے کا زمانہ ٹھیک رمضان المبارک کا مہینہ تھا مگر اس کے باوجود ساڑھے تین ہزار من غلّہ فراہم ہوگیا۔ اگرچہ غلّے کی یہ مقدار مطلوبہ ضرورت سے کم تھی تاہم اس سے دارالعلوم کو اس نازک اور ہوش رُبا گرانی کے زمانے میں بڑی تقویت پہنچی۔ اللہ تعالے اس نیک کام کرنے والوں کے اموال میں خیر و برکت عطا فرمائے۔ غلّے کی فراہمی کا یہ سلسلہ تا حال جاری ہے اور اب اس میں میرٹھ ڈویزون کے اضلاع کے علاوہ بجنور اور ہریانہ کا علاقہ بھی شامل ہوگیا ہے۔

ایک مصری فاضل کا ورود

عرب لیگ جو ممالکِ عربیہ کی ایک سیاسی جماعت ہے اپنی سیاسی سرگرمیوں کے علاوہ علمی کاموں سے بھی دلچسپی رکھتی ہے، اس سلسلے میں عرب لیگ کا ثقافتی شعبہ اپنی لائبریری میں نوادر اور کمیاب کتابیں جمع کرنے کے لئے مختلف ممالک میں اپنے نمائندوں کو بھیجتا رہتا ہے، تاکہ ان ممالک کے کتب خانوں سے نوادر مخطوطات حاصل کرکے اپنے یہاں ایک ایسا علمی ذخیرہ فراہم کرے جو بے مثال ہو، چنانچہ اس مقصد کے لئے اُس نے اپنے نمائندے شیخ محمد رشاد ابن عبدالمطلب کو ہندوستان بھیجا، شیخ موصوف دیوبند تشریف لائے اور نصف درجن مخطوطات کا انتخاب کرکے اُن کے فوٹو لے گئے۔

شیخ محمد رشاد ابن عبدالمطلب عربی اور انگریزی زبانوں کے نہ صرف ایک نوجوان فاضل تھے، بلکہ ان تمام علمی اور تحقیقاتی تقاضوں سے بھی واقف تھے جو یورپ

کی تہذیب اور اس دور کی سائنسی تحقیقات نے اہل علم طبقے کے لئے پیدا کر دیئے ہیں مختلف ممالک کے علمی دورے نے شیخ موصوف کو نہایت وسیع النظر بنا دیا تھا، دارالعلوم کو دیکھ کر ان پر جو تاثر ہوا وہ اُن کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے جو انھوں نے کتاب معائنہ میں لکھے ہیں :-

"کوئی شبہ نہیں کہ فخر و مباہات کے زبردست اسباب میں سے ایک بات یہ ہے کہ میں نے اس زبردست عمارت کو بالکل قدیم طرز اور مضبوط بنیادوں پر قائم پایا، اس کا ایک ہی سبب ہے، اور وہ ہے اس کے قائم کرنے والوں کا اللہ تعالےٰ کے ساتھ خلوص اور ان کے اعمالِ صالحہ" !

۱۳۴۲ھ شعبۂ طب میں اضافہ اور دارالشفاء کا قیام

جیسا کہ گذشتہ اوراق میں بیان کیا جا چکا ہے دارالعلوم میں فنِ طب کی تعلیم قیام دارالعلوم کے چند سال بعد ہی شروع کر دی گئی تھی، طبی کتابوں کی تعلیم کے ساتھ ہی طبیبِ دارالعلوم بیمار طلباء کے علاج و معالجے کی خدمات بھی انجام دیتا تھا، بیمار طلبہ طبیب سے اپنے اپنے مرض کی تشخیص اور نسخہ تجویز کرا کر ایسے عطار خانوں سے دوا لیتے تھے جو دارالعلوم کی جانب سے مقرر تھے، دواؤں کی قیمت دارالعلوم سے ادا کی جاتی تھی، معمولی مریضوں کے لئے تو یہ طریقہ کافی تھا مگر جو لوگ شدید بیماریوں میں مبتلا ہوں اُن کے لئے عرصے سے ایک ایسے دارالشفا کے قیام کی تجویز زیر غور تھی جس میں مریضوں کے لئے تمام ضروری چیزیں موجود ہوں، چنانچہ اس سال ایک دارالشفاء کا اجراء کیا گیا اور اسکے لئے ایک عمارت بنوا کر مخصوص کر دی گئی، اس میں مفرد، مرکب اور پیٹنٹ ادویہ کے ذخیرے کے ساتھ چارپائیوں، بستروں اور تیمارداری کا بھی ضروری سامان

مہیا کر دیا گیا ہے۔

اس شعبے کے قائم ہوتے ہی ہمدرد دواخانہ دہلی نے طلبار کے لئے ایک ہزار روپیہ سالانہ کی دواؤں کی پیش کش کی، جس کی مقدار اب تین ہزار روپے سالانہ تک پہنچ چکی ہے، نیز ملک کے دوسرے طبی دواخانے بھی بقدر ہمت اپنی اپنی دواؤں سے دارالشفا کی امداد میں حصہ لے رہے ہیں، خصوصاً کلکتہ کے مشہور انگریزی دواساز ایمن اینڈ اسمٰعیل اور ہندسی، سی ورکس مؤناتھ بھنجن (اعظم گڈھ) اپنی اپنی مخصوص اور پیٹنٹ ادویات دارالشفا کے لئے پابندی کے ساتھ بھیجتے رہے ہیں۔

دارالشفا میں، معالجوں کے علاوہ ۶ کارکن دوا کی تقسیم اور تیمارداری وغیرہ کی خدمات انجام دینے کے لئے مقرر ہیں۔

دارِ جدید میں پانی کی بہم رسانی

دارِ جدید کا وسیع صحن کئی ایکڑ زمین کے احاطے میں پھیلا ہوا ہے، اس کے کمروں میں چار پانچ سو طلبار کا ہر وقت قیام رہتا ہے، گو دارِ جدید کے احاطے میں بورنگ کے متعدد نل لگے ہوئے ہیں مگر اتنی بڑی آبادی اور دارِ جدید کے چمن کے لئے یہ نل بالکل ناکافی تھے، چنانچہ پانی کی قلت کو دور کرنے کے لئے دارِ جدید میں ٹیوب ویل لگایا گیا، اس سے چمن میں آب پاشی بھی کی جاتی ہے اور طلبا بھی اس کے وافر پانی سے بسہولت مستفید ہوتے ہیں۔

۱۳۷۴ھ، ملکِ حجاز کا پیغامِ تبریک

دنیائے اسلام کے اخبارات میں شاہ سعود کے اُس خواب کی خبریں شائع ہو رہی تھیں جس میں انھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے مسجدِ نبوی کے بارے میں توجہ دلائی گئی تھی، اور جس پر حکومت کی جانب سے مسجدِ نبوی میں توسیع کا نقشہ تیار کیا جا رہا تھا، اس موقع پر دارالعلوم کی جانب سے شاہ سعود کو مُبارک باد

پیش کی گئی تھی، جس میں لکھا گیا تھا کہ اخبارات میں وہ منامات صادقہ شائع ہوئی ہیں جنہیں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جلالۃ الملک کو خطاب فرمایا گیا ہے، اس سے ہماری عقیدت میں بدرجہا اضافہ ہوا ہے، ہم جلالۃ الملک کی بقا اور خدمت حرمین کی مزید توفیق کے آرزومند ہیں۔"

سفیر حجاز مقیم ہند کی معرفت جلالۃ الملک کی جانب سے جو برقیہ موصول ہوا اُس میں مرقوم تھا:۔

"مجھے جلالۃ الملک نے حکم دیا ہے کہ آنجناب نے اپنے تار میں جن جذبات کا اظہار فرمایا ہے اس کے لئے آنجناب کو اور دارالعلوم کے اسٹاف کو جلالۃ الملک کی خوشنودی کا پیغام پہنچا دوں، جلالۃ الملک اللہ تعالےٰ سے دعا کرتے ہیں کہ انھیں ان تمام چیزوں کی توفیق عنایت فرمائے، جو اسلام اور مسلمانوں کی بہبودی کے لئے مناسب ہوں[1]۔"

اتفاق سے جلالۃ الملک اس سال ہندوستان تشریف لائے اور دارالعلوم پر شاہانہ توجہ مبذول فرماتے ہوئے ۲۵ ہزار کا عطیہ دارالعلوم کو عطا فرمایا۔

انور السادات کی دارالعلوم میں آمد

عرب جمہوریہ کے موجودہ صدر انور السادات جو اُس وقت مؤتمر اسلامی کے جنرل سکریٹری تھے دارالعلوم میں تشریف لائے، موصوف نے حسب ذیل الفاظ میں اپنے تاثرات رقم فرمائے:۔

"اس عظیم دینی اور تاریخی درس گاہ کی زیارت نے مجھے مجبور کیا کہ میں بصمیم قلب اپنے بھائیوں کی خدمت میں مبارک باد پیش کروں جو اس ادارے کو چلا رہے ہیں، میں اللہ تعالےٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس ادارے کو

---

[1] ماہنامہ دارالعلوم جمادی الاولیٰ ۱۳۷۴ھ ص ۳

علم ومعرفت کا منارہ بنائے اور ہمیشہ ہمیشہ مسلمانوں کو اس سے مستفید ہونے کا موقع عطا فرمائے۔"

امریکہ اور یورپ میں دارالعلوم کا تعارف

کناڈا یونیورسٹی کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے ایک ریسرچ اسکالر کی طلب پر جن کی تحقیقات کا موضوع "عصرِ حاضر میں مسلمانوں کی دینی تعلیم" تھا، دارالعلوم کی علمی اور دینی تاریخ پر ایک مبسوط مقالہ لکھ کر بھیجا گیا جو امریکہ اور یورپ کے علمی حلقوں میں دارالعلوم کے تعارف کا اچھا ذریعہ ثابت ہوا، یہ مقالہ حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کے ارشاد پر راقم سطور نے لکھا تھا۔[1]

۱۳۷۵ھ میں مصر سے دارالعلوم کے روابط

موتمرِ اسلامی کے جنرل سکریٹری انور السادات کی آمد کے موقع پر حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے موصوف سے جامعہ ازہر اور دارالعلوم کے مابین روابط قائم کئے جانے کی خواہش ظاہر فرمائی تھی، موتمرِ اسلامی اور جامعہ ازہر میں حضرت مہتمم صاحب کی اس تجویز کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا اور وہاں سے دو جلیل القدر استاذ شیخ عبدالمنعم النمر شیخ اور عبدالعال العقباوی کو دو سال کے لئے دارالعلوم میں جدید عربی ادب وانشاء کی تعلیم کے لئے بھیجا گیا۔ ان حضرات کی دو سالہ مدت پوری ہو جانے پر شیخ عبدالوہاب محمود ان کی جگہ پر تشریف لائے، جامعہ ازہر سے رابطہ قائم ہو جانے کے بعد سے طلبائے دارالعلوم میں عربی ادب اور عربی زبان میں تقریر وتحریر کا ایک خاص ذوق پیدا ہو گیا ہے اور اب ایک مستقل شعبہ "صفِ عربی" کے نام سے قائم ہے جس سے عربی نطق واملاء میں

---

[1] ماہنامہ دارالعلوم بابت جولائی ۱۹۵۵ء ص ۴

طلبار مہارت پیدا کرتے ہیں اور سیکڑوں کی تعداد میں طلبار عربی بول چال اور عربی مضمون نگاری پر قادر ہو چکے ہیں۔

دارالعلوم کی مسجد میں توسیع

ہمارے یہاں کی مساجد کے عام دستور کے مطابق دارالعلوم کی مسجد کا حوض وسطِ صحن میں تھا، گرمی، سردی اور برسات میں اس پر بیٹھ کر وضو کرنا تکلیف دہ ہوتا تھا، اسی کے ساتھ طلبار کی تعداد میں اضافہ ہو جانے کی وجہ سے مسجد کا صحن بھی تنگ ہو گیا تھا، ۱۳۷۵ھ میں حوض کو وسطِ صحن سے ہٹا کر مشرق کی جانب دارالافتار کی عمارت کے نیچے بنایا گیا۔ اس تغیر سے مسجد کے صحن میں بھی کشادگی پیدا ہو گئی اور گرمی، سردی اور برسات میں کھلی ہوئی جگہ پر وضو کرنے کی تکلیف بھی ختم ہو گئی۔

اسی کے ساتھ سردی کے موسم میں گرم پانی کے لئے ایک بڑی ٹنکی تیار کرائی گئی اور حوض کے چاروں طرف پائپ لگا کر اس میں براس کا گ لگا دیئے گئے، اس سے وضو کرنے میں بڑی سہولت ہو گئی اور اب بیک وقت بہت سے آدمی حوض کے اطراف میں بیٹھ کر گرم پانی سے وضو کر سکتے ہیں۔

ایک مذہبی اجتماع

اس سال برادرانِ وطن کی جانب سے ملک میں دو اہم اجتماع منعقد کئے گئے ایک اجتماع "بین الملی آریہ سماج کانفرنس" کے نام سے شیر کوٹ (بجنور) میں اور دوسرا "بین الملی کانفرنس آریہ ورت راجپورہ (دہرہ دون) میں منعقد ہوا، دونوں اجتماعات میں دارالعلوم کی جانب سے مبلغِ دارالعلوم مولانا سیف اللہ صاحب ہاشمی نے نمائندگی کی، پہلے اجتماع میں "اسلام کی فطری تعلیمات اور محاسنِ اخلاق پر تقریر ہوئی" اس اجتماع میں صدرِ جلسہ نے دارالعلوم کو خراجِ تحسین ادا کرتے ہوئے اعلان کیا کہ:-

"اسلام کی خوبیاں تمام مذاہب سے زیادہ ہیں اور دارالعلوم کا مشن تمام مشنوں سے اونچا اور بلند رہا۔"

دہرہ دون کے اجتماع میں مولانا موصوف نے خدائے بزرگ و برتر کی توحید، انبیاء و رسل کی عام بعثت، اسلامی اخوت اور بھائی چارے کے موضوع پر تقریر کی، اس تقریر کے بارے میں دہرہ دون کے اخبار "اتحادِ دنیا" نے حسبِ ذیل الفاظ میں تبصرہ کیا ہے :-

"ہند دراجہ چرت سنگھ صاحب نے کہا کہ سب سے اچھی تقریر جناب سیف اللہ صاحب کی تھی، موصوف دیوبند سے آئے، اسلام پر بولے، اس مبلغِ اسلام نے اس طرح تبلیغ کی کہ ہر دین کا آدمی ذرا بھی خلاف نہیں کہہ سکتا تھا اور تعریف بہتوں نے کی"[1]

فتاویٰ دارالعلوم کی تدوین

طلب فتاویٰ کا سلسلہ قیام دارالعلوم کے زمانے ہی سے شروع ہو چکا تھا، ابتداً یہ کام حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ انجام دیتے رہے، حضرت مولانا کی وفات کے بعد مختلف اساتذہ سے یہ کام لیا جاتا رہا، لیکن جب طلبِ فتاویٰ کی تعداد زیادہ بڑھ گئی تو ۱۳۱۰ھ میں اس کے لئے ایک مستقل دارالافتاء قائم کیا گیا، حضرت مولانا مفتی عزیزالرحمٰن صاحبؒ دارالعلوم کے پہلے مفتی مقرر ہوئے، ابتداً فتاویٰ کی نقول رکھنے کا معمول نہیں تھا، اواخر ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ سے فتاویٰ کی نقول رکھنے کا قاعدہ مقرر ہوا، اس لئے دارالعلوم میں شروع کے ۱۹ سال کے فتاویٰ کی نقول موجود نہیں ہیں حضرت مفتی صاحبؒ کے زمانے کے فتاویٰ میں ذی قعدہ ۱۳۲۹ھ سے ۱۳۴۶ھ تک کے فتاویٰ کی تعداد ۳۷۵۶۱ ہے، بالعموم ایک مستفتی کئی کئی سوالات لکھ کر بھیجتا ہے، اگر اوسطاً تین سوالات ہر مستفتی کے مان لئے جائیں تو اس طرح فتاویٰ کے مسائل کی تعداد تین گنی ہو کر سوا لاکھ

---

[1] روداد ۱۳۷۵ھ ص ۱۶

کے لگ بھگ ہو جاتی ہے۔

حضرت مہتمم صاحب کی اس تحریک کو مجلسِ شوریٰ نے پسند کیا کہ فتاویٰ کو فقہی ترتیب پر ابواب وار مرتب کر کے شائع کیا جائے۔ ان فتاویٰ کے مدوّن و مرتب مولانا ظفیر الدین صاحب نے ترتیبِ فتاویٰ کے سلسلے میں ایسے فتاویٰ کو جو مکرر تھے اپنی ترتیب میں حذف کر دیا ہے۔ البتہ اگر کسی مسئلہ کی نوعیت میں نمایاں فرق ہوا تو اُسے دوبارہ بھی لے لیا گیا ہے۔ فاضل مرتب نے یہ التزام کیا ہے کہ فتاویٰ میں حوالے درج نہیں تھے، مرتب نے ایسے مسائل کے کتبِ فقہ سے حوالے دیدئے ہیں اسی کے ساتھ حوالوں میں کتاب اور باب کے ساتھ مسئلہ کی عبارت بھی نقل کر دی گئی ہے۔ اس التزام سے ہر ہر مسئلہ اپنی جگہ پر مُبرہَن ہو گیا ہے، اور اگر قاری اصل کتاب سے رجوع کرنا چاہے تو وہ بغیر کسی دشواری کے مراجعت کر سکتا ہے۔ اس التزام سے فتاویٰ دارالعلوم کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔ یہ فتاویٰ اپنی اصل شکل میں تاریخ دار تھے یعنی جس ترتیب سے مستفتیوں کی جانب سے بھیجے گئے تھے، اسی ترتیب سے ان کے جواب درج تھے، لیکن کتابی شکل میں لانے کے لئے ان کو فقہی انداز پر مسائل وار مرتب کیا گیا ہے جس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ کتاب الصلوٰۃ میں ۱۰ ابواب ہیں اور ہر باب میں چار چار فصلیں قائم کی گئی ہیں تاکہ تلاش مسائل میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

فتاویٰ دارالعلوم کی پہلی جلد ۱۳۸۲ھ میں شائع ہوئی تھی، اب تک ان کی نو ضخیم جلدیں زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں اور ابھی کئی جلدیں طبع ہونے سے باقی ہیں، فتاویٰ دارالعلوم کی مقبولیت کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ باوجودیکہ فتاویٰ کا سلسلہ ابھی مکمل نہیں ہوا ہے مگر جو جلدیں شائع ہو چکی ہیں ان کے کئی کئی ایڈیشن اب تک نکل چکے ہیں[1]۔ نویں جلد کتاب الطلاق کے مسائل و احکام پر مشتمل ہے اور تقریباً پانچسو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے فتاویٰ دارالعلوم مقدمہ جلد اوّل

مولانا ابوالکلام آزاد نے سنہ ۱۳۷۰ھ میں تشریف آوری کے موقع پر فتاویٰ کے اس ذخیرے کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ "اس سے ایک دوسرا تاتارخانیہ مرتب ہو سکتا ہے، یہ ایک بڑی دینی خدمت ہے اس سے لوگوں کی مشکلات حل ہوتی ہیں"[لہ]

سنہ ۱۳۷۶ھ صدر جمہوریۂ ہند دارالعلوم میں

اس سال کے اہم واقعات میں صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد کی دارالعلوم میں تشریف آوری ہے۔

صدر جمہوریہ ۱۴ر ذی الحجہ ۱۳۷۶ھ (۱۳ر جولائی ۱۹۵۷ء) کو دارالعلوم میں تشریف لائے، یہ کسی سربراہِ مملکت کے دارالعلوم میں آنے کا پہلا موقع تھا۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا حفظ الرحمٰنؒ، حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم اور حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کے علاوہ موتمر اسلامی کے نمائندے شیخ عبدالمنعم النمر اور شیخ عبدالعال العقبادی وغیرہ حضرات نے ریلوے اسٹیشن پر

لہ فتاویٰ تاتارخانیہ۔ فتاویٰ عالمگیری کی طرح فقہ کی ایک ضخیم کتاب ہے جو ہندوستان میں مدوّن ہوئی ہے، یہ کتاب ابوابِ ہدایہ کی ترتیب پر مرتب کی گئی ہے۔

آٹھویں صدی ہجری میں خاندانِ تغلق کے عہد میں خانِ اعظم تاتارخان کی فرمائش پر شیخ عالم بن علاء الحنفی نے فقہ حنفی کا یہ مجموعہ چار ضخیم جلدوں میں مرتب کیا ہے، فیروزشاہ تغلق کے عہد میں خانِ اعظم تاتارخاں وزارت کے منصب پر فائز تھے، ایک زمانے میں فتاویٰ تاتارخانیہ کی خاصی شہرت رہی ہے، حلب کے عالم ابراہیم بن محمد نے اس کتاب کی ایک تلخیص بھی تیار کی ہے، کشف الظنون میں لکھا ہے کہ اس کتاب کا کوئی نام تجویز نہیں کیا گیا تھا، اس لئے خانِ اعظم کی طرف منسوب ہو کر فتاویٰ تاتارخانیہ کے نام سے مشہور ہو گئی۔

(کشف الظنون مطبوعہ استنبول جلد اول ص ۲۱۱)

صدر جمہوریۂ ہند کا خیر مقدم کیا، صدرِ جمہوریہ کی کار جب دارالعلوم کے لئے روانہ ہوئی تو دیوبند اور قرب وجوار کے ہزاروں آدمی سڑک پر دو رویہ صدر کے استقبال کے لئے کھڑے ہوئے تھے، دارالعلوم کی تاریخ میں اس نوعیت کا استقبال اس سے قبل دیکھنے میں نہیں آیا، پورا راستہ رنگ برنگ جھنڈیوں سے آراستہ تھا، اسٹیشن کے قریب سب سے پہلے دروازے پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی:۔

دیدہ و دل فرشِ راہ

احاطہ دارالعلوم کے باہر طلبائے دارالعلوم کی دو رویہ قطاریں کھڑی ہوئی تھیں، اس موقع پر ہند و بیرون ہند کے طلبار کے علیحدہ علیحدہ گروپ تھے، طلبار دارالعلوم ہندوستان کی تقریباً سبھی ریاستوں کی نمائندگی کر رہے تھے۔

صدر جمہوریہ نے دارالعلوم کا تفصیلی معائنہ فرمایا، عمارتیں دیکھیں، کتب خانہ کے نوادر مخطوطات ملاحظہ فرمائے، آزادیٔ وطن کی راہ میں علمائے دیوبند کی قربانیوں کی داستان سنی، اساتذہ اور طلبار کا سادہ طرزِ معاشرت دیکھا، قرآن مجید کے ایک فارسی ترجمے کو بڑی توجہ سے ملاحظہ فرمایا اور اس میں راقم سطور سے چند آیتوں کا ترجمہ پڑھوا کر سنا، معائنہ دارالعلوم کے بعد خیر مقدم کے ایک عظیم الشان جلسہ میں حضرت مہتمم صاحب نے سپاس نامہ پیش کیا، صدر نے اُس کے جواب میں دارالعلوم کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ:۔

"دارالعلوم کے بزرگوں نے صرف اس ملک کے رہنے والوں ہی کی خدمت نہیں کی بلکہ آپ نے اپنی خدمات سے اتنی شہرت حاصل کر لی ہے کہ غیر ملک کے طالب علم بھی آپ کے یہاں آتے ہیں اور یہاں سے تعلیم پاکر اور جو کچھ یہاں انھوں نے سیکھا ہے اپنے ملکوں میں واپس جاکر اس کی اشاعت کرتے ہیں، یہ بات اس ملک کے سبھی باشندوں کے لئے قابلِ فخر

ہے، میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ جس خلوص، نیک نیتی اور جس عزم و ارادے کے ساتھ اس کام کو آج تک کرتے آئے ہیں آئندہ بھی اسے جاری رکھیں گے، مجھے اُمید ہے کہ یہ دارالعلوم دن بدن ترقی کرتا جائے گا، اور صرف اس ملک ہی کی نہیں بلکہ غیروں کی بھی خدمت کرتا رہے گا۔"

سہ پہر میں عصرانے کے موقع پر صدر جمہوریۂ ہند نے اراکینِ دارالعلوم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا:۔

"دارالعلوم کے بزرگ علم کو علم کے لئے پڑھتے پڑھاتے رہے ہیں، ایسے لوگ پہلے بھی ہوئے ہیں، مگر کم جنھوں نے علم کو محض علم کی خدمت کے لئے سیکھا اور سکھایا، ان لوگوں کی عزت بادشاہوں سے بھی زیادہ ہوتی تھی، آج دارالعلوم کے بزرگ اسی طرز پر چل رہے ہیں، اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ صرف دارالعلوم یا مُسلمانوں کی خدمت نہیں بلکہ پورے ملک اور دنیا کی خدمت ہے۔

آج دنیا میں مادّیت کے فروغ سے بے چینی پھیلی ہوئی ہے، دلوں کا اطمینان اور چین مفقود ہے، اس کا صحیح علاج روحانیت ہے، میں دیکھتا ہوں کہ سکون اور اطمینان کا وہ سامان یہاں کے بزرگ دنیا کے لئے مہیّا فرما رہے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ اگر خدا کو اس دنیا کو رکھنا منظور ہے تو دنیا کو بالآخر اسی لائن پر آنا ہے اس لئے دارالعلوم کے بزرگ جو اہم علمی خدمت انجام دے رہے ہیں وہ آگے بڑھے گی اور کام اسی طرح جاری رہے گا میں دارالعلوم میں آکر بہت زیادہ مسرور ہوا اور یہاں سے کچھ لیکر جارہا ہوں، میں تمام ذمّہ داران دارالعلوم کا شکریہ ادا کرتا ہوں[1]۔"

---

[1] صدر جمہوریۂ ہند دارالعلوم دیوبند میں ۲۵ و ۲۶ مرتبہ سید محبوب رضوی، شائع کردہ دارالعلوم دیوبند

حضرت مہتمم صاحب نے صدر جمہوریۂ ہند کی نسبت اپنے تاثرات کا حسب ذیل الفاظ میں اظہار فرمایا:۔

"صدر جمہوریۂ ہند کو میں نے نہ صرف ایک عظیم عہدے کا پر وقار مسند نشین دیکھا، بلکہ انھیں ایک نہایت ہی صوفی منش اور بزرگانہ انداز کا مشفق اور پابند مذہب واخلاق انسان بھی پایا۔"

دارالعلوم میں صدر جمہوریۂ ہند کی آمد کے موقع پر ہندوستان کے انگریزی پریس خصوصاً ہندوستان ٹائمز نے دارالعلوم کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے نامناسب نہ ہوگا اگر ان کو بجنسہ یہاں پیش کر دیا جائے، آج کل جدید تعلیم یافتہ طبقے میں جو ترقی پسند رجحانات پائے جاتے ہیں، "ہندوستان ٹائمز" نے اپنے مقالے میں ان کی ترجمانی کی ہے اس نے لکھا ہے:۔

"ہندوستان میں بہت کم لوگ ایسے اداروں کے متعلق زیادہ معلومات کا دعویٰ کر سکتے ہیں جن کی پبلسٹی بہت ہی کم ہوئی لیکن جو عرصے سے اپنے خاموش اور اصولی کام سے افراد اور واقعات پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں، ایک ایسا ادارہ دیوبند میں اسلامی درسگاہ "دارالعلوم" ہے جہاں صدر جمہوریۂ ہند گئے تھے، ایک مذہبی اکیڈیمی کے اعتبار سے دارالعلوم کا تمام دنیائے اسلام میں الازہر یونیورسٹی قاہرہ کے بعد دوسرا درجہ ہے، اس لئے یہ بات باعثِ تعجب نہیں کہ الازہر کے دو اساتذہ کا ایک ڈیلی گیشن گذشتہ دو سال سے دارالعلوم میں کام کر رہا ہے، جن لوگوں نے ۱۸۶۶ء میں دیوبند کی درسگاہ کی بنیاد رکھی ان میں وہ علماء تھے، جنھوں نے دس سال پہلے جنگِ آزادی میں حصہ لیا تھا، غالباً مدرسہ کی بنیاد رکھنا غیر ملکی حکومت کے قیام کا ایک ردِ عمل تھا کیونکہ اس کے بعد سے دیوبند کے رہنماؤں نے خود کو ان تمام تحریکوں کیساتھ سرگرمی کے ساتھ وابستہ رکھا جن کا مقصد ملک کے لئے آزادی حاصل کرنا تھا، جمعیۃ علماء ہند کے بیشتر رہنما قوم پرست علماء کی ایک طاقت ور جماعت ہیں، دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل

ہی رہے ہیں۔ نہ تو مسلم لیگ کی پر دبرٹش (برطانیہ نواز) پالیسیاں اور نہ ہی دو قوموں کی تھیوری کسی وقت بھی با حوصلہ علمار کو قومی کیریکٹر کی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے باز رکھ سکیں، وہ خلافت کے دور میں برطانیہ کے خلاف تھے اور ۱۹۴۰ء میں انھوں نے جنگِ عظیم دوم کے زمانے میں کانگریس کے رجحان کی تصدیق کی لیکن اس درسگاہ نے صرف ملک کی سیاسی زندگی ہی میں اہم حصہ ادا نہیں کیا ہے بلکہ اس کے مذہبی کام جن میں دیوبند کی کتابوں کی تیاری بھی شامل ہے دنیائے اسلام میں سراہے گئے ہیں، تعلیم کے میدان میں اس نے اسلامی مطالعے کی روایات کو قائم رکھا، عربی اور فارسی میں دلچسپی کو برقرار رکھا اور اردو کے کاز کو ترقی دی۔

دیوبند کی درسگاہ پر جو نکتہ چینی کی جاسکتی ہے وہ یہ کہ سماجی طور پر اور اکیڈیمک میدان میں یہ زیادہ ترقی پسند نہیں رہی ہے، کلاسیکل قسم کے جمود اور قدامت پرستی پر اس کا اصرار قابل تعریف ہوسکتا ہے لیکن اگر وہ اثر استعمال کرنے کی خواہش رکھتی ہے جو اس کو رکھنی چاہیے تو اس کو اپنے طریقِ کار میں موجودہ حالات کے مطابق اعتدال پیدا کرنا ہوگا نیشنلزم نے اب نئے معنی اختیار کر لئے ہیں اور مذہب کی بھی موجودہ حالات کے مطابق نئی تشریح ہونی چاہئے۔ مختلف مذہبی رہنماؤں کی طرف سے اپنے پیروؤں میں زیادہ مفاہمت اور یکسانیت پیدا کرنے کی تحریک خاص توجہ کی مستحق ہے۔ تاہم کوشش استدلالی بنیاد پر نہیں ہونی چاہیے، یہ اس درسگاہ جیسے باوقار اداروں کا کام ہے کہ وہ ایسے نظریات کو فروغ دینے کے سلسلے میں عملی اقدامات کرنے میں امداد دیں کہ جو تمام مذاہب کے اصولوں اور عبادت کے احترام کے حامل ہوں اور ساتھ ہی خالص اور صحت مند نیشنلزم کے جدید رجحان کو نظر میں رکھتے ہوئے حوصلہ افزائی کریں[1]۔

"ہندوستان ٹائمز" نے اپنے اداریہ کے آخر میں دار العلوم کو جو مخلصانہ مشورہ دیا ہے

---

[1] "ہندوستان ٹائمز" مورخہ ۱۶ر جولائی ۱۹۵۷ء

اس پر روزنامہ "الجمعیۃ" دہلی نے اُسی وقت تبصرہ کیا تھا، اس تبصرے کے بعد مزید کسی جواب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ "الجمعیۃ" کا تبصرہ حسبِ ذیل ہے:۔

صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد کو حال ہی میں دیوبند تشریف لے جانیکا اتفاق ہوا، تشریف بری کی غرض یہ تھی کہ ہندوستان کی سب سے بڑی اسلامی یونیورسٹی دارالعلوم دیوبند کا معائنہ فرمائیں اور اس مرکزِ علوم سے جو ایک صدی تک تحریکِ آزادی کا سرچشمہ رہا ہے رابطہ پیدا کریں، آپ نے وہاں پہنچکر دارالعلوم کے کُتب خانے پر نظر ڈالی، اس کے نادر و نایاب مخطوطات کو معائنہ کا شرف بخشا، اساتذۂ کرام سے تبادلۂ خیال فرمایا، اور اپنی تقریر میں دارالعلوم کی طویل خدمات کو سراہا، اور اس کی تاریخی اور مذہبی عظمت کا اعتراف کیا اور اس کی طرف سے بہترین جذبات لے کر واپس ہوئے۔

معاصر "ہندوستان ٹائمز" نے بھی صدرِ محترم کے اس مختصر دورے کو خاص اہمیت دی ہے، اور پوری سیر چشمی کے ساتھ دارالعلوم کے شاندار ماضی کو خراجِ تحسین ادا کیا ہے، اس نے بجا طور پر اعتراف کیا ہے کہ دارالعلوم دیوبند اُن اداروں میں سے ہے جس نے اپنی خاموش اور مُسلسل خدمات سے اشخاص اور واقعات کو ہمیشہ متاثر کیا ہے۔ اور ہندوستان میں صرف یہی ایک اسلامی یونیورسٹی ہے جو عالمِ اسلام میں ازہر یونیورسٹی قاہرہ کے بعد خاص لحاظ اہمیت رکھتی ہے، اس کے بانیوں میں وہ لوگ شامل ہیں جنھوں نے مدتوں پہلے جنگِ آزادی میں حصہ لیا اور آزادی کی ہر تحریک کو اپنایا، جمعیۃ عُلمار ہند جو قوم پرور علمار کا سب سے زیادہ طاقتور ادارہ ہے اس کی کارفرما شخصیتیں اسی دارالعلوم دیوبند کی پیداوار ہیں، ان علمار کو نہ تو مُسلم لیگ کی پرو برٹش پالیسی متاثر کرسکی اور نہ دو قومی نظریہ ان کے زاویۂ نگاہ کو بدل سکا، تحریکِ آزادی کے دَور میں بھی علمار کانگریس کے فیصلوں کی تصدیق میں پیش پیش رہے! معاصر نے اِن سطور میں دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علمار اور اُس کے سربراہوں کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس کی بنیاد صرف واقعات ہیں اور ہم خوش ہیں کہ واقعات کا اعتراف اس خوش دلی

کے ساتھ کیا گیا۔

معاصر نے ان اعتراضات کے ساتھ یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ دارالعلوم کو اپنی قدامت پسندی پر قائم رہتے ہوئے اتنی لچک پیدا کرنی چاہئے کہ وہ جدید مسائل تک رسائی حاصل کرسکے، اس نے لکھا ہے کہ دارالعلوم پر اگر کوئی اعتراض ہوسکتا ہے تو وہ یہی ہے کہ اس نے سماجی اور اکاڈمی میدان میں خاطر خواہ ترقی نہیں کی، لیکن ہمارے نزدیک اس میں اعتراض کی کوئی بات نہیں، ایک بھائی اپنے دوسرے بھائی کو مشورہ دینے اور اس کی بعض خامیوں پر انگلی رکھنے کا مجاز ہے، اور ہم بھی اسی بھائی چارہ کی اسپرٹ میں عرض کریں گے کہ ترقی اور قدامت پسندی کا مفہوم اضافی RELATWE بھی ہوسکتا ہے، ممکن ہے کہ معاصر کے نزدیک دارالعلوم کے کردار میں جمود ہو مگر فی الواقع ایسا نہ ہو، دارالعلوم جن مقاصد کے لئے قائم کیا گیا ہے وہ اُنکے لئے ہمیشہ کوشاں رہا ہے، اگر ملک کی تقسیم عمل میں نہ آتی اور حالات کی تبدیلی اس کی مالیات پر اثر انداز نہ ہوتی تو اس کے دائرۂ کار میں مزید وسعت پیدا ہوتی، اور اس کے قدم ترقی کے میدان میں اور آگے بڑھتے، مگر ایسا نہ ہوسکا جس کا ہمیں اپنے معاصر سے زیادہ احساس ہے۔

معاصر کے مشوروں میں یہ مشورہ بھی شامل ہے کہ آج نیشنلزم کو نئے معنے دیئے جارہے ہیں، اسی طرح مذہب کی تشریح اور تعبیر بھی ایسی ہونی چاہئے جو موجودہ حالات سے مطابقت پیدا کرسکے، شاید معاصر کو یہ سن کر خوشی ہو کہ اسلام کے اصول ہر زمانے سے مطابقت رکھتے ہیں، اور ہم کسی ایسی تعبیر پر مجبور نہیں ہیں جو اصولوں کو مسخ یا ان کی نفی کرنے کے مرادف ہو، تجربہ شاہد ہے کہ عالمگیر اصولوں میں مساوات، انسانی بھائی چارہ اور احترام آدمیت اور شخصی قوانین میں طلاق، وراثت اور عورت کے مالکانہ حقوق اسلام ہی کی رہنمائی کا نتیجہ ہیں، اور دوسروں نے اسلام کے ان ہی اصولوں اور قوانین کی پیروی کرکے اپنی تجدد پسندی کا ثبوت بہم پہنچایا ہے، جہاں تک مذہب کی نئی تعبیر کا تعلق ہے، دوسروں کو اس کی ضرورت ہمیشہ پیش آتی ہے، اسلام تو بذاتِ خود ایسی تعبیر ہے جو ہر زمانے کے مزاج پر حاوی ہے

اور سوسائٹی کی ہر ضرورت کو پورا کرتی ہے۔

معاصر کا یہ کہنا صحیح ہے کہ ہر مذہب کے لیڈروں کو مفاہمت کے لئے زیادہ سے زیادہ کوشش کرنی چاہیئے، نیز دارالعلوم دیوبند جیسے ادارے کے لئے ضروری ہے کہ وہ تمام مذہب کے اصول و اعمال کا احترام کرتے ہوئے ایسے خیالات کو نشوونما دے جو موجودہ رجحانات کے ساتھ حقیقی اور صحت مند نیشنلزم کو فروغ دے سکیں، بلاشبہ اس مشورے سے اختلاف کرنا مشکل ہے لیکن اگر نیشنلزم کے وہ معنے نہیں ہیں جو اپنی تنگ دامانی اور تعصب کے لئے مشہور ہے تو اس کے علَم بردار ہمیشہ علمار دیوبند ہی رہے ہیں، تحریکِ آزادی کے ابتدائی دور میں جب کہ نیشنلزم دودھ پیتے بچے سے زیادہ نہ تھا جب علمار دیوبند نے اپنی حکومت کا نقشہ بنایا تو اس کی صدارت کے لئے اُن کی نظرِ انتخاب راجہ مہندر پرتاپ پر پڑی، ہمیں کہنے دیجئے کہ اس سے بہتر اور صاف اور ستھرا نیشنلزم آج تک پیدا نہ ہو سکا، اور آئندہ بھی اس کی توقع پورے یقین کے ساتھ نہیں کی جا سکتی، ہم نے معاصر کے اشارات کے لئے اشارات ہی کی زبان اختیار کی ہے اور ہمیں اُمید ہے کہ اس زبان کو سمجھنے میں اسے دشواری پیش نہیں آئے گی۔[1]

حضرت مہتمم صاحب کا سفرِ برما

اس سال کے اہم حالات میں حضرت مہتمم صاحب کا سفرِ برما بھی شامل ہے، اس سفر کے محرک رنگون کے ایک اہلِ خیر جناب حاجی اسمٰعیل محمد باگیا صاحب تھے، موصوف سورت کے رہنے والے ہیں مگر مدت سے تجارت کے سلسلے میں رنگون میں قیام ہے، حضرت مہتمم صاحب کا یہ سفر ۱۵ جمادی الاولیٰ سے ۲۰ رجب تک جاری رہا، اور برما کے مختلف شہروں میں وہاں کے اہلِ خیر حضرات کی دعوت پر جانا ہوا، حضرت مہتمم کے اس طویل سفر سے برما میں دارالعلوم کا تعارف خواص سے گذر کر عوام تک ہو گیا اور دارالعلوم کے حلقۂ اثر میں غیر معمولی توسیع ہوئی، عوام اور حکومت دونوں حضرت مہتمم صاحب کی شخصیت سے متاثر ہوئے،

---

[1] روزنامہ الجمعیۃ دہلی ۱۹ جولائی ۱۹۵۶ء۔

برما کے وزیراعظم اونو کے علاوہ وزیر عدل وانصاف جناب عبداللطیف صاحب اور وزیر معدنیات جناب عبدالرشید صاحب نے مقصدِ سفر کو کامیاب بنانے میں بڑا حصہ لیا خصوصاً جناب عبداللطیف صاحب اکثر برما کے سفروں میں حضرت مہتمم صاحب کے ہمراہ رہے، عوام نے اپنے غیر معمولی تاثر کا اظہار دارالعلوم کے لئے دو لاکھ روپے سے زائد کی رقم فراہم کرکے کیا اور حکومت نے بڑی فیاضی کے ساتھ اس رقم کو ہندوستان منتقل کرنے کی اجازت دیدی، اس رقم سے کتب خانۂ دارالعلوم کے لئے ایک بڑا ہال تعمیر کرایا گیا ہے، جو مسلمانانِ برما کی دارالعلوم میں ایک عظیم یادگار ہے۔

اس چندے کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں دو ہزار روپے خود وزیراعظم اونو کی جانب سے تھے، موصوف نے غیر مسلم ہوتے ہوئے اپنی علمی فیاضی اور رواداری کی ایک ناقابل فراموش مثال قائم کی، مجلس شوریٰ نے مسلمانانِ برما کی اس علم دوستی پر دارالعلوم کی جانب سے شکریہ ادا کرتے ہوئے بطورِ خاص وزیراعظم کا شکریہ ادا کیا، یہاں پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اہلِ برما خصوصاً رنگون کے اہلِ خیر حضرات اگرچہ دارالعلوم کی امداد و اعانت میں حصہ لیتے رہے ہیں، مگر اتنی بڑی مقدار میں چندہ کی فراہمی کا یہ پہلا موقع تھا، اس سفر کی تفصیلات سفرنامہ برما کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔

۱۳۷۷ھ حضرت مولانا مدنیؒ کی وفات

اس سال کے عظیم ترین اور روح فرسا حوادث میں سب سے بڑا حادثہ جو دارالعلوم ہی کے لئے نہیں بلکہ پورے عالم اسلامی کے لئے حادثۂ کبریٰ تھا وہ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کی وفات حسرت آیات کا تھا، حضرت مولانا مدنیؒ نے طویل علالت کے بعد ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۷ھ (۵ دسمبر ۱۹۵۷ء) کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا، حضرت مولانا مدنیؒ کی شخصیت دارالعلوم کے لئے نہ صرف صدر المدرسین کی تھی بلکہ وہ دارالعلوم کے سرپرست اور مربی بھی تھے، ان کے ظاہری اور باطنی فیوض

سے دارالعلوم کے اساتذہ، کارکن اور طلبار سب ہی بہرہ ور ہوتے تھے، ۳۲ سال تک آپ نے دارالعلوم کے شیخ الحدیث کی حیثیت سے علم حدیث اور دارالعلوم کے نظامِ تعلیم کی بے نظیر خدمات انجام دیں اور ہزاروں تشنگانِ علوم آپ کے دریائے علم و معرفت سے سیراب ہوئے، ۴۸۳ طلبار نے آپ سے دورۂ حدیث کی تکمیل کی حضرت مولانا مدنیؒ اپنے علم و فضل، زہد و تقویٰ اخلاق و کمالات، علمی و دینی اور سیاسی و اجتماعی خدمات کے لحاظ سے ہندوستان کے علمی و دینی اور سیاسی طبقۂ علمار میں ایک بے نظیر شخصیت رکھتے تھے، اس لئے پورے عالم اسلامی میں اس حادثۂ کبریٰ کو محسوس کیا گیا، حضرت مولانا مدنی نور اللہ مرقدہٗ اپنے استاذِ جلیل حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کے برابر قبرستانِ قاسمی میں آسودۂ خواب ہیں۔

شاہِ افغانستان کا ورود

۱۳۷۶ھ کے اہم واقعات میں شاہِ افغانستان محمد ظاہر شاہ کا دارالعلوم میں ورودِ مسعود ہے، جو دارالعلوم کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا، یہ دارالعلوم کی تاریخ کا ایسا باب ہے جو نہ صرف دارالعلوم کے زرین ماضی پر مہرِ تصدیق ثبت کرتا ہے، بلکہ اس کے شاندار مستقبل کی بھی نشاندہی کرتا ہے، شاہ افغانستان نے ازراہِ علم نوازی دارالعلوم کی دعوت کو شرفِ قبول بخشا، اور پروگرام کے مطابق ۵ شعبان ۱۳۷۶ھ (۲۵ فروری ۱۹۵۶ء) کو بذریعۂ کار تشریف لائے، دارالعلوم کی جانب سے شاہ کا شاندار استقبال کیا گیا۔

دارالعلوم دیوبند اور افغانستان کے تعلقات

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ افغانستان سے ہمیشہ دارالعلوم کے مخلصانہ تعلقات رہے ہیں، جس میں دونوں طرف خیر سگالی کا جذبہ پایا جاتا ہے، احاطۂ دارالعلوم کا عظیم الشان دروازہ "باب الظاہر" دارالعلوم اور افغانستان کے

لہ تفصیل کیلئے دیکھئے شاہ افغانستان دارالعلوم دیوبند میں ص ۳۳ : مرتب سید محبوب رضوی شائع کردہ دارالعلوم دیوبند

گہرے باہمی ربط و تعلق کی ایک ایسی یادگار ہے جو ہر وارد و صادر کے ذہن کو بے ساختہ افغانستان کی "دولتِ خداداد" کی جانب منتقل کر دیتی ہے۔

ہندوستان و افغانستان کا تعلق جغرافی اور تاریخی اعتبار سے اُتنا ہی پُرانا ہے، جتنا دو ہمسایہ ملکوں کا قدرتی طور ہو سکتا ہے، دونوں ملک نہ صرف ثقافتی رشتے میں منسلک ہیں بلکہ زبان کے لحاظ سے بھی ہندوستان و افغانستان ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں، افغانستان کی زبان فارسی ہندوستان پر چھ سو سال کے قریب حکمراں رہی ہے، اور آج بھی ہندوستان کے بہت سے لوگ اس کو سمجھتے اور پڑھتے ہیں، ہندوستان کی مشکل ہی سے کوئی زبان ایسی ہو گی جس میں تھوڑے بہت فارسی کے الفاظ موجود نہ ہوں۔

۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۶ء میں جب دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا تو بیرونی ممالک میں افغانستان ہی وہ ملک ہے جس نے سب سے پہلے دارالعلوم کا خیر مقدم کیا، اور اپنے نونہالوں کو دارالعلوم کی آغوشِ تعلیم و تربیت کے سپرد کر دیا، یہ وہ زمانہ تھا جس میں سفر کی موجودہ سہولتیں میسر نہ تھیں، شمالی ہند کی نارتھ ویسٹرن ریلوے جو بعد میں افغانستان اور ہندوستان کے درمیان آمد و رفت کا سب سے بڑا ذریعہ رہی ہے اُس وقت تک جاری نہیں ہوئی تھی، اس چیز سے جہاں ملّتِ افغانستان کے غیر معمولی دینی جذبے اور علم دوستی کا ثبوت ملتا ہے، وہیں دارالعلوم کی روزِ اوّل سے مقبولیت کا پتہ بھی چلتا ہے، اُس وقت سے لے کر ۱۹۴۷ء تک دارالعلوم کی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں گذرا جس میں افغانستان کے طالبانِ علم کی تعلیمی سرگرمیاں دارالعلوم کی رونق کا باعث نہ رہی ہوں، اور اُدھر افغانستان میں بھی فضلائے دارالعلوم کے لئے ملک کے اہم کلیدی عہدوں کے دروازے ہمیشہ کھلے رہے ہیں۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن قدس اللہ سرہٗ نے جب بیسوی صدی کے دوسرے عشرے میں ہندوستان کے لئے ایک عارضی حکومت کا خاکہ تیار کیا تو اس کا مرکز افغانستان ہی کے دارالسلطنت کابل میں بنایا گیا تھا، حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور حضرت

مولانا محمد میاں انبٹھوی عرف مولانا منصور انصاری کو اس مقصد کے لئے بطورِ خاص افغانستان بھیجا گیا، یہ دونوں حضرات، حضرت شیخ الہندؒ کی انقلابی تحریک کے سرگرم کارکن تھے، کابل میں ان کی جدوجہد دارالعلوم اور افغانستان کے درمیان مخلصانہ روابط کے استحکام میں ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔

غرض کہ افغانستان کے ہندوستان اور بالخصوص دیوبند سے ہر زمانے میں گوناگوں تعلقات قائم رہے، چنانچہ ۱۳۵۸ھ ۱۹۳۹ء میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے سفر افغانستان کے موقع پر ان دیرینہ تعلقات کا خاص طور پر اظہار رہا، جس کی قدرے تفصیل گذر چکی ہے، دارالعلوم میں "باب الظاہر" کی تعمیر اسی سفر کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئی۔

جلسۂ خیر مقدم میں شرکت کے لئے اعلیٰ حضرت اور اُن کے رفقاء حضرت مہتمم صاحب اور حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی معیت میں احاطۂ مولسری کے شمالی زینے سے اوپر تشریف لے گئے، اور "رسالہ دارالعلوم" کے دفتر سے گذرتے ہوئے ادارہ اہتمام میں رونق افروز ہوئے، بعد از اں اعلیٰ حضرت نے محافظ خانۂ دارالعلوم کا معائنہ فرمایا اور "بسیار خوب است" کے الفاظ سے اپنی پسندیدگی کا اظہار فرما کر کتب خانے میں تشریف لے گئے، یہاں نادر و نایاب مخطوطات، مختلف عہد کے لکھے ہوئے قرآن شریف کے قلمی نسخے اور شاہی عطیات ہیں سعودی عرب، ترکی، مصر، ایران اور نظام دکن کی عطا کی ہوئی کتابیں نہایت قرینے کے ساتھ سجائی گئی تھیں، حکومتِ افغانستان کی عطا کی ہوئی کتابیں نمایاں طور پر رکھی ہوئی تھیں، ان میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن نور اللہ مرقدہٗ کا ترجمہ قرآنِ مجید بحواشی حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا وہ نسخہ بھی شامل تھا جس کو حکومتِ افغانستان نے سردار محمد ہاشم خاں مرحوم سابق وزیر اعظم کی نگرانی میں سرکاری طور پر اُردو سے فارسی میں منتقل کرایا ہے، اس کا اُردو ایڈیشن حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم نے شاہِ افغانستان کی خدمت

میں بطور ہدیہ پیش کیا تھا اور اسی وقت سے اس کے فارسی ترجمے کی داغ بیل پڑ گئی تھی، ہر کتاب پر خوشنما کارڈ لگا ہوا تھا جس میں کتاب کا تعارف درج تھا، شاہ نے غایت توجہ اور پسندیدگی سے ان سب چیزوں کو ملاحظہ فرمایا۔

شعبہ جات دارالعلوم اور کتب خانہ کے معائنہ کے بعد شاہ دارالحدیث کے مشرقی برآمدے سے گذرتے ہوئے اور دفتر تعلیمات کو ملاحظہ فرماتے ہوئے دارجدید کے شمالی صحن میں تشریف لائے یہاں انھوں نے سامنے سے "باب الظاہر" کو ملاحظہ فرمایا اور بعدازاں جلسہ گاہ میں تشریف لے گئے۔

دارجدید کے جنوبی صحن میں باب الظاہر کے نیچے ایک وسیع وعریض پنڈال تیار کیا گیا تھا، یہ عظیم الشان پنڈال جو حسن وسادگی اور شوکت کا ایک عجیب دل کش منظر پیش کر رہا تھا، مختلف قطعوں میں تقسیم تھا، ڈائس کی داہنی جانب دارالعلوم کے اساتذہ، شعبہ جات کے نظماء اور دوسرے کارکنوں، پریس اور آل انڈیا ریڈیو کے نمائندوں کی نشستیں تھیں، اور بائیں جانب اعلیٰ حضرت کے رفقاء، مقامی حکام اور معزز مہمان تشریف فرما تھے، سامنے کے حصے کو دو قطعوں میں تقسیم کیا گیا تھا، پہلا قطعہ طلبائے دارالعلوم اور دوسرا حصہ عوام کے لئے مخصوص تھا، یہ مجمع تقریباً بیس ہزار افراد پر مشتمل تھا۔

ڈائس کے سامنے دارالعلوم زندہ باد اور داہنے بائیں دولتِ خداداد افغانستان اور جمہوریۂ ہند زندہ باد کے خوشنما کتبے آویزاں تھے۔

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم نے فارسی میں افتتاحی تقریر فرمائی جس میں اعلیٰ حضرت کی تشریف آوری پر دارالعلوم کی جانب سے شکریہ ادا کرتے ہوئے دارالعلوم کی علمی وعرفانی حیثیت پر روشنی ڈالی گئی تھی، حضرت ممدوح نے فرمایا:۔

"اعلیٰ حضرت ہمایونی! دارالعلوم میں آپ کی تشریف آوری کا ہم پُرخلوص خیر مقدم کرتے ہوئے ہزارہا ہزار جذباتِ تشکر وامتنان پیش کرتے ہیں، اللہ تعالےٰ کے لُطف و

کرم سے آپ کا ورود مسعود ہمارے لئے فخر و مباہات کا موجب ہے۔

اعلیٰ حضرت! جس جگہ آپ اس وقت رونق افروز ہیں یہ مقام دینِ حنیف کا مرکز اور مسلکِ حق کا محور ہے، یہ صرف ایک مدرسہ اور جامعہ ہی نہیں ہے بلکہ دین وایمان کا ستون اور طریقت وشریعت کی اساس اور معرفتِ الٰہی کے خزانے بھی اپنی آغوش میں رکھتا ہے، اور مادیّت والحاد کی اس گرم بازاری کے زمانے میں حق وصداقت کا روشن مینار اور انجمنِ حق کی شمع فروزاں ہے۔

اعلیٰ حضرت! اس تشریف آوری کے موقع پر آپ ہندوستان میں بہت سی قدیم عمارتیں اور تاریخی مقامات ملاحظہ فرمائیں گے اور یہاں کی اونچی شخصیتوں سے مل کر یقیناً مسرور ہوں گے مگر یہ سب مادّی اور دنیوی ترقی کے مظاہر ہیں۔

لیکن یہ دارالعلوم تمام اسلامی دنیا میں اپنی روحانی اور اخلاقی عظمت کے لحاظ سے ایک بلند واعلیٰ مقام رکھتا ہے، اور بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ادارہ رُشد وہدایت کا آفتاب اور صراطِ مستقیم ودینِ قویم کا مظہر ہے، ذلك فضل الله يوتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم!

اعلیٰ حضرت! ہرچند یہ ادارہ دنیوی طمطراق اور تمدّنی شان وشکوہ سے تہی دامن ہے مگر اس کا ذرّہ ذرّہ حق وصداقت کی تابانی اور علم ومعرفت کی درخشانی کا مظہر ہے، اور اس ادارے کے ماضی وحال کی تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ یہاں کے اکابر وعلماء ہمیشہ علم ومعرفت کے عَلَم بردار رہے ہیں، اور سوائے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کے اسوۂ حسنہ کے کوئی چیز ان کے لئے نمونۂ عمل نہیں رہی۔

جلسۂ خیر مقدم میں حضرتِ مہتمم صاحب دارالعلوم نے اعلیٰ حضرت کو سپاس نامہ پیش کیا، آخر میں اعلیٰ حضرت پُرجوش نعرہ ہائے تکبیر کے درمیان تقریر کے لئے کھڑے ہوئے، اعلیٰ حضرت نے فارسی میں تقریر فرمائی جس میں دارالعلوم کی علمی وعرفانی خدمات

کا اعتراف اور دارالعلوم کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے اپنے شاندار استقبال پر اظہارِ مسرّت کیا۔ شاہ کی تقریر کا اُردو ترجمہ یہ ہے:-

"میں بہت مسرور ہوں کہ آج مجھے دارالعلوم کے دیکھنے کا موقع حاصل ہوا، یہ دارالعلوم افغانستان میں اور خاص طور پر وہاں کے مذہبی حلقوں میں بہت مشہور و معروف ہے، افغانستان کے علماء دارالعلوم دیوبند کے بانیوں اور یہاں کے اساتذہ کو ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھتے آئے ہیں، اور علم و روحانیت کے یقین میں جو فضیلت اور مرتبت انھیں حاصل ہے اسکے ہمیشہ قائل اور مدّاح رہے ہیں، افغانستان میں اس دارالعلوم کی شہرت محض اس سبب ہی سے نہیں ہے کہ یہ ایک مشہور ادارہ ہے، بلکہ دراصل یہ نتیجہ ہے اُن تعلقات کا جو افغان طلباء اور اس دارالعلوم کے درمیان عرصۂ دراز سے قائم رہے ہیں، بہت سے افغان علماء اس دارالعلوم سے فیضیاب ہوئے اور انھوں نے اپنے وطنِ عزیز واپس جاکر علم کی روشنی پھیلائی اور ملک کی خدمات انجام دی ہیں۔

میں آپ کے اس دوستانہ اور پُر مسرّت استقبال سے جو میں نے یہاں آکر مشاہدہ کیا ہے بہت ہی متاثر ہوا ہوں اور تہِ دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں، نیز اس علمی ادارے اور اس سے تعلق رکھنے والے تمام اشخاص کی مزید کامیابی کے لئے دعا کرتا ہوں[1]۔

۱۳۷۰ھ، شعبۂ تنظیم فضلائے دارالعلوم

مجمع عام میں فضلائے دارالعلوم کی دستار بندی کا طریقہ شروع

[1] شاہ افغانستان دارالعلوم دیوبند میں" مطبوعہ کوہ نور پریس دہلی، مرتبہ سید محبوب رضوی

ہی سے دارالعلوم میں جاری ہے، ابتداءً دستار بندی کے جلسے چند سالوں کے فاصلے سے جلد جلد ہوتے رہتے تھے، جیساکہ ابتدائی سالوں کے حالات میں اُن کی تفصیلات اوپر گذر چکی ہیں، پھر طویل وقفے کے بعد ۱۳۲۸ھ میں بڑے پیمانے پر دستار بندی کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا، جس کی یاد اب تک دیکھنے والوں کے دلوں میں باقی ہے، ۱۳۲۸ھ کے بعد سے اب تک بڑے پیمانے پر دستار بندی کا کوئی جلسہ منعقد نہیں ہو سکا، اس لئے مجلس شوریٰ نے ایک تجویز کے ذریعہ طے کیا کہ ۱۳۸۲ھ میں دارالعلوم کی عمر کے سو سال پورے ہونے پر فضلائے دارالعلوم کی دستار بندی کے لئے عظیم الشان پیمانے پر جلسہ دستار بندی منعقد کیا جائے، چنانچہ اخبارات میں اس کا اعلان کر دیا گیا تھا، اس مدت میں چونکہ طلبائے دارالعلوم کی ایک بڑی تعداد نے فراغت حاصل کی تھی اس لئے اس کام کیلئے عارضی طور پر ایک شعبہ "نظم جلسہ مجوزہ دستار بندی" کے نام سے قائم کیا، مگر حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے یہ ارادہ عملی جامہ نہ پہن سکا، اس بنا پر جو شعبہ اس مقصد کے لئے قائم کیا گیا تھا، ۱۳۸۷ھ میں اسے تنظیم فضلائے دارالعلوم کے نام سے موسوم کر کے مناسب سمجھا گیا کہ جلسہ دستار بندی سے قبل فضلائے دارالعلوم کی تنظیم کی جائے۔

تنظیم فضلائے دارالعلوم بھی اکابر کی ایک دیرینہ آرزو تھی اور عرصے سے یہ خواہش محسوس کی جا رہی تھی کہ فضلائے دارالعلوم ایک ایسے رسمی رشتے میں منسلک ہو جائیں جس کے ذریعے سے دارالعلوم اُن کے حلقۂ کار اور خدمات سے باخبر رہے اور وہ دارالعلوم کی ضروریات و حالات سے واقف رہیں، پہلے اخبارات اور کتابچوں کے ذریعے سے تنظیم فضلائے دارالعلوم کی غرض و غایت کی اشاعت کی گئی، اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ فضلائے دارالعلوم بھی اس کو ضروری سمجھتے ہیں اور اُنھوں نے اس بارے میں اپنی خدمات پیش کرنے کا یقین دلایا تو لائحہ عمل مرتب کر کے کام شروع کر دیا گیا، اور فضلائے دارالعلوم کی فہرستیں تیار کر کے ہر ضلع میں بھیجدی گئیں، چنانچہ مختلف صوبہ جات اور اضلاع میں فضلائے دارالعلوم نے مرکز

کی ہدایت کے مطابق اپنے اپنے ضلع میں اجتماعات بلاکر دارالعلوم کے ساتھ اپنے تعاون کا ثبوت دیا، مگر افسوس ہے کہ بہت سے مقامات کے فضلائے دارالعلوم کی سرد مہری یا لاعلمی کے باعث تنظیم فضلائے دارالعلوم میں کما حقہٗ پیش رفت نہ ہو سکی اور اب تک یہ کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا، اُمید ہے کہ ابتدائی مراحل طے ہونے پر یہ اجلاس منعقد کیا جا سکے گا۔

۱۳۷۹ھ، حضرت مہتمم صاحب کا سفرِ افریقہ

رے یونین (مشرقی افریقہ) کے ہمدردانِ دارالعلوم جناب حاجی احمد پٹیل و محمد پٹیل صاحبان کی دعوت پر حضرت مہتمم صاحب مدظلہٗ نے ۶ محرم ۱۳۷۹ھ کو رے یونین کا سفر فرمایا، اس سفر کے دوران زنجبار، دارالسلام، موریشس مڈغاسکر اور رے یونین کے مختلف شہروں میں تشریف لے جانا ہوا، وہاں کے باشندوں نے عقیدت مندانہ انداز سے خیر مقدم کیا جگہ جگہ جلسے ہوئے، حضرت مہتمم صاحب نے بطورِ خاص اس سفر میں اس کی تحریک فرمائی کہ دینی لحاظ سے ان مقامات کے پس ماندہ مُسلمان اپنے بچوں کو تعلیم کے لئے دارالعلوم میں بھیجیں تاکہ یہ بچے دینی تعلیم سے مزین ہو کر اپنے اپنے مقامات کے عوام تک اسلام کی تعلیمات پہنچانے کا ذریعہ بنیں، اس کے علاوہ خود مقامی طور پر ابتدائی تعلیم کے لئے تعلیم گاہوں کا انتظام کریں، حضرت مہتمم صاحب کے اس سفر سے دارالعلوم کو مادّی فائدہ بھی کافی پہنچا اور تقریباً سوا لاکھ روپے دارالعلوم کو بلا طلب و تحریک حاصل ہو گئے۔

دائرۃ المعارف حیدرآباد کی جوبلی میں دارالعلوم کی نمائندگی

دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد کا ایک مشہور اشاعتی ادارہ ہے یہ ادارہ نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیائے اسلام کے اہم اداروں میں شمار ہوتا ہے۔ دائرۃ المعارف عثمانیہ نے اپنی زندگی میں علمی نوادر اور مخطوطات کی طباعت

واشاعت کا بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اور مختلف اسلامی علوم و فنون کی کتابیں گرانقدر مصارف برداشت کرکے بڑے اہتمام سے شائع کی ہیں جو ہند و بیرون ہند کے علمی حلقوں میں بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں، دائرۃ المعارف نے جنوری ۱۹۶۰ء میں بڑے پیمانے پر جوبلی منانے کا انتظام کیا تھا، جس میں ایشیائی اور مغربی ملکوں کے فضلاء نے بھی شرکت کی تھی اس میں نمائندگانِ دارالعلوم کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی، دارالعلوم کی طرف سے مولانا محمد سالم صاحب استاد دارالعلوم اور راقم سطور (سید محبوب رضوی) کو حیدرآباد بھیجا گیا، دارالعلوم کی جانب سے حضرت مہتمم صاحب کا پیغام اور ایک علمی مقالہ بھی جوبلی کے اجتماع میں پیش کیا گیا، اس موقع پر کتب خانہ دارالعلوم کے نایاب مخطوطات بھی جوبلی کی نمائش میں پیش کئے گئے، دارالعلوم کی اس علمی شرکت سے ہندوستان کے ان دونوں علمی اداروں میں گہرے روابط قائم ہو گئے، دورانِ قیام حیدرآباد میں آندھرا پردیش کے گورنر جناب بھیم سین سچر نے دارالعلوم کے ارکانِ وفد کو چائے پر مدعو کیا جو دارالعلوم کی عظمت اور مرکزی حیثیت کا اعتراف تھا۔

صدر جمال عبدالناصر کے لئے علمی ہدایا

مارچ ۱۹۶۰ء میں صدر جمہوریہ مصر جمال عبدالناصر مرحوم ہندوستان کا دورہ کرنے والے تھے، اس زمانے میں حضرت مہتمم صاحب قاہرہ میں موجود تھے، حضرت ممدوح نے صدر ناصر کو دارالعلوم میں تشریف لانے کی دعوت دی تھی، صدر ناصر جب ہندوستان کے دورے پر آئے تو شوال کا پہلا ہفتہ تھا جو دارالعلوم میں تعطیل کا زمانہ ہوتا ہے، اس لئے حضرت مہتمم صاحب نے ایامِ تعطیل میں دارالعلوم میں صدر ناصر کی تشریف آوری کو اُن کے مناسب شان نہ سمجھتے ہوئے یہ مناسب سمجھا کہ خود دہلی پہنچ کر ملاقات فرمائیں، حضرت ممدوح نے اس موقع پر دارالعلوم میں سالانہ تعطیل کا عذر کرتے ہوئے دیوبند میں ملاقات نہ ہو سکنے پر اظہارِ افسوس فرمایا، اور اس کی تلافی کے طور پر دارالعلوم

کی جانب سے فیض الباری، فتح الملہم اور سوانح قاسمی کے نسخے علمی ہدیئے کے طور پر پیش فرمائے، صدر ناصر نے کھڑے ہو کر بڑی عقیدت سے اس ہدیہ کو قبول کیا، اور وقیع الفاظ میں دارالعلوم کا شکریہ ادا کیا، اس کے جواب میں صدر ناصر نے قاہرہ پہنچ کر قرآن شریف کا ایک حسین و خوبصورت نسخہ دارالعلوم کے لئے ارسال کیا، یہ قرآن مجید ایک خوبصورت چوبی فریم میں رکھا ہوا ہے، اس فریم کی یہ صفت قابلِ ذکر ہے کہ دیکھنے میں بجائے خود ایک مجلد کتاب معلوم ہوتا ہے، اور کھولا جائے تو وہی رحل کی صورت ہو جاتا ہے۔

حجّاجِ کرام

اس سال میں دارالعلوم کے متعدد حضرات حج بیت اللہ اور زیارت روضۂ نبوی سے مشرّف ہوئے، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم، استاذ الاساتذہ حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحبؒ مولانا معراج الحق صاحب، مولانا عبدالاحد صاحب، مولوی محمود احمد گل صاحب، مولانا احمد رضا صاحب، مولوی زاہد حسن صاحب اور حاجی اللہ رکھا ملازم تعمیرات حج کے لئے تشریف لے گئے۔

۱۳۸۰ھ، جامعۂ طبیہ کا اجراء

دارالعلوم میں تعلیم طب کا آغاز ۱۳۰۱ھ میں ہوا تھا، پہلے اس شعبہ میں مولانا حکیم محمد حسن صاحبؒ برادر خورد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ کا تقرر رہا، حکیم صاحب درسِ فقہ و حدیث اور طلبائے دارالعلوم کے علاج کے علاوہ فنِّ طب کی تعلیم بھی دیتے تھے، ۱۳۲۹ھ میں اسے مستقل شعبے کی شکل دی گئی، دارالعلوم کی طرح یہ شعبہ بھی سال بسال ترقی کی جانب گام زن رہا، مگر اب تک اس کے لئے کوئی مستقل عمارت نہ تھی، ۱۳۷۵ھ میں جامعۂ طبیہ کو وقف کرنال سے ایک معقول امداد اس شرط کے ساتھ پیش کی گئی کہ دارالعلوم کے شفاخانہ کا نام نواب عظمت علی خاں صاحب مرحوم کے نام پر عظمتیہ شفاخانہ رکھا جائے، اسی کے ساتھ جامعۂ طبیہ کی ایک مستقل

کمیٹی بنا کر (جو ملک کے مؤقر اور با اثر اطباء پر مشتمل ہے) حکومت سے کہا گیا کہ وہ ملک کے دوسرے طبیہ کالجوں کی طرح دارالعلوم کے جامعہ طبیہ کی سند کو تسلیم کر کے جامعۂ طبیہ کے فارغین کو مجازِ مطب قرار دے، جس کو حکومت نے منظور کر لیا ہے، جامعۂ طبیہ میں چار سالہ نصاب کے ذریعے فنِ طب کی علمی اور عملی تعلیم دی جا رہی ہے، اب جامعۂ طبیہ میں متعدد اساتذہ تعلیمِ طب اور طلبائے دارالعلوم کے معالجے پر مامور ہیں، احاطۂ دارالعلوم کے شمال میں جامعۂ طبیہ کی ایک وسیع اور شاندار عمارت تیار ہو چکی ہے جس میں درس گاہوں کے علاوہ مریضوں کے بستروں کا بندوبست بھی کیا گیا ہے نیز معالجہ طلباء کی حد تک محدود نہیں رکھا گیا، بلکہ بلا تخصیص مذہب و ملت سب کا علاج کیا جاتا ہے۔ دارالشفاء کے دو ہال تعمیر ہو چکے ہیں، اور مزید کچھ عمارتیں زیرِ تجویز ہیں۔

ڈاکٹر پی، ہارڈی کی آمد

لندن یونیورسٹی میں شعبۂ تعلیم اسلام کے لکچرار ڈاکٹر پی، ہارڈی اپنی تاریخی تحقیق کے سلسلے میں دیوبند آئے، تقریباً ایک ہفتہ دارالعلوم میں قیام کیا، حضرت مہتمم صاحب سے دارالعلوم کے پس منظر اور اس کے علمی مقاصد کے موضوع پر طویل گفتگو ہوئی، ڈاکٹر ہارڈی کا یہ تاثر قابلِ ذکر ہے کہ "جس اسلام کو ہم کتابوں میں پڑھتے تھے، اور جس اسلام کو پیغمبرِ اسلام نے دورِ اوّل میں پیش فرمایا تھا، سچ یہ ہے کہ وہ اسلام ہم نے دیوبند اور علمائے دیوبند میں موجود پایا۔"

ڈاکٹر ہارڈی نے تحریری شکل میں اپنے جو تاثرات چھوڑے ہیں وہ یہ ہیں:۔

"میں ہندوستان میں یہ توقع لے کر آیا تھا کہ یہاں مجھے اسلام کے سلسلے میں تعلیمی مواد فراہم ہو سکے گا، چنانچہ یہاں آنے کے بعد میں نے دارالعلوم دیوبند آنے کا ارادہ کیا تاکہ اپنا مقصد حاصل کر سکوں یہاں آنے کے بعد نہ صرف یہ کہ میری توقعات پوری ہوئیں بلکہ بہترین اخلاق اور مخلصانہ

تعاون نے مجھے بے حد متاثر کیا، یہاں کے فاضل علمار نے میری رہنمائی کی بالخصوص حضرت مولانا محمد طیب صاحب نے میرے مقاصد کے سلسلے میں میری رہبری فرمائی، میں نہ صرف یہاں کی بہترین یادیں ساتھ لے کر جاؤں گا بلکہ واقعتہً اس کی کوشش کروں گا کہ مجھے پھر یہاں آنے کی اجازت دی جائے۔

چناں چہ حضرت مہتمم صاحب کے سفرِ انگلستان کے موقع پر موصوف نے حضرت ممدوح سے عرض کیا کہ میں ایک سرکاری ضرورت سے جرمنی جارہا ہوں ورنہ آپ کے پاس کچھ وقت گزارتا۔

۱۳۸۱ھ مسٹر ہمایوں کبیر کی آمد

اس سال میں واردین وصادرین کی بڑی کثرت رہی، آنے والوں میں سب سے زیادہ نمایاں شخصیت مرکزی حکومت کے وزیر ثقافت وسائنسی تحقیقات پروفیسر ہمایوں کبیر کی تھی، موصوف جمادی الاولیٰ ۱۳۸۱ھ میں تشریف لائے، خیر مقدم کے جلسے میں پروفیسر ہمایوں کبیر نے دارالعلوم کی دینی اور ملکی خدمات پر خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ "دارالعلوم کے بزرگوں نے دینی اور علمی خدمات کے علاوہ وطن کی آزادی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے سلسلے میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ بہت روشن اور ناقابلِ تردید ہیں، دیوبند کی تاریخ بڑی اہم تاریخ ہے، آپ کا یہ دارالعلوم ایشیا میں اپنی قسم کا پہلا ادارہ ہے

دارالعلوم نے ہندوستان میں سب سے پہلے مُفت تعلیم کا انتظام کیا ہے، اس سے بھی بڑھ کر حیرت اور خوشی کی بات یہ ہے کہ آپ تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبار کے لئے خوراک اور لباس کا انتظام بھی مُفت کرتے ہیں، آٹھ نو سو طلبار کے خور ونوش کا انتظام معمولی بات نہیں ہے، اور پھر جب سوچا جائے کہ لاکھوں روپے سالانہ کے مصارف آپ صرف مُسلمانوں کے چندوں اور امدادی رقموں سے پورا کرتے ہیں تو اور بھی زیادہ مسرّت ہوتی ہے، چندے کا کام دراصل آپ کے لئے بڑا مفید کام ہے اس لئے آپ کو مُسلمانوں میں

جانے اور اُن میں کام کرنے اور عوام کے ساتھ دارالعلوم کا تعلق قائم رکھنے کا کام کرنا پڑتا ہے، اس طرح آپ مُسلمانوں کو اُن کی ذمہ داریاں یاد دلاتے رہتے ہیں، اس سے دوسری طرف مُسلمانوں میں خود اعتمادی اور ذمہ داری کا یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ اُنھیں اس دارالعلوم کو چلانا ہے، اس خیال کو سامنے رکھنے سے ان میں بیداری پیدا ہوتی ہے، آپ کے یہاں ہندوستان ہی کے نہیں بلکہ ایشیا اور افریقہ کے اور اس سے بھی زیادہ دور دراز کے طلبار پڑھنے آتے ہیں، اس طرح آپ کا اثر ساری دُنیا میں پھیلتا ہے، اور آپ بین الاقوامی عمل کا مرکز بنتے ہیں۔ دارالعلوم اسلامی ادارہ ہے، آپ کے اوپر اسلام کی طرف سے بھی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اور ہندوستان کی طرف سے بھی، علم ایک بڑی طاقت ہے، دنیا میں ہر جگہ علم کی عزت کی جاتی ہے، اپاسناسے میں خدا کے بھروسے پر زور دیا گیا ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی دوسرا بھروسہ نہیں ہو سکتا۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ کا یہ دارالعلوم دن بدن ترقی کر رہا ہے، اسلام نے دنیا کو سب سے پہلا جو پیغام دیا وہ علم کا پیغام ہے، حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے جو وحی نازل ہوئی اس کی ابتدار اِقْرَأْ کے لفظ سے ہوتی ہے جس کے معنیٰ ہیں "پڑھو" اسلام کا یہ اوّلین پیغام تھا جب اسلام دنیا میں آیا تو ہند و یونان اور مصر وغیرہ ممالک میں اگرچہ علم موجود تھا، مگر اس کو مخصوص لوگوں تک محدود رکھا جاتا تھا، عام لوگ تعلیم حاصل نہیں کر سکتے تھے، علم پر ہر جگہ اجارہ داری قائم تھی، مصر میں خاص خاص لوگوں کے علاوہ کوئی دوسرا طبقہ علم حاصل نہیں کر سکتا تھا، یہی حال یونان کا تھا، ہندوستان میں بھی تعلیم کا چرچا تھا، لیکن یہ صرف برہمنوں اور اونچی ذات کے لوگوں کے لئے مخصوص تھا، شودروں کو تحصیلِ علم کی اجازت نہ تھی، بعض اوقات اس طبقے پر علم حاصل کرنے کے جُرم میں بڑے بڑے مظالم بھی ہوتے تھے، یہ اسلام ہی تھا جس نے علم کو عام کرنے اور ہر شخص کو علم حاصل کرنے کی طرف متوجہ کیا، اسلام کے پیغمبر نے ساری دنیا کو یہ کہہ کر علم سے روشناس کرایا کہ "ہر مرد عورت کے لئے علم حاصل کرنا

ضروری ہے" اسلام کے اس اصول کو اب ساری دنیا نے اپنا لیا ہے، امریکہ جو آج علم کا مرکز بنا ہوا ہے اس میں علم یورپ کے ذریعے سے پہنچا ہے اور یورپ کو اسلام ہی نے علم سے روشناس کرایا ہے، اس لئے ساری دنیا کو اسلام کا شکر گذار ہونا چاہیئے، اسلام میں دین و دنیا کا فرق نہیں ہے، وہ دین و دنیا دونوں میں بنی نوع انسان کی بھلائی چاہتا ہے، پیغمبرِ اسلام نے ہدایت کی ہے کہ مسلمان علم حاصل کریں خواہ اس کے لئے انھیں چین جانا پڑے، چین جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ چین میں اُس زمانے میں کچھ زیادہ علم تھا، بلکہ اس زمانے میں چین کو دنیا کی آخری حد سمجھا جاتا تھا، اس لئے اس حکم کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو حتی الامکان علم حاصل کرنا چاہیئے خواہ اس کے لئے انھیں دنیا کے آخری سرے تک جانا پڑے،

مسلمانوں نے جب تک اس ہدایت پر عمل کیا ان کا قدم برابر آگے بڑھتا رہا، جب آپ علم سکھانے کی کوئی کوشش کرتے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں، اور چونکہ یہ بات آپ ہندوستان میں بیٹھ کر کرتے ہیں اس سے ہندوستان کا سر اونچا ہوتا ہے اور ہندوستان کی خدمت ہوتی ہے۔

مجھے یہ معلوم ہو کر خوشی ہوئی کہ آپ کے یہاں ذریعۂ تعلیم اُردو زبان ہے، آپ کے یہاں جو طالب علم آتے ہیں ان کی زبان برمی ہو یا بنگالی، وہ فارسی بولتے ہوں یا انڈونیشی، انگریزی بولنے والے ہوں یا اور کوئی اُن کی مادری زبان ہو، آپ انھیں اُردو میں تعلیم دیتے ہیں، اِس طرح پر آپ نے اُردو کو بین الاقوامی زبان بنا دیا ہے[1]۔

---

[1] اُردو کو دار العلوم میں ذریعۂ تعلیم ہونے کے باعث جو عظیم الشان فائدہ پہونچا ہے گو اس پر اُردو کی ترقی و اشاعت کے حلقوں کی ابھی تک نظر نہیں گئی ہے، تاہم اس کے ثمرات و نتائج سے انکار نہیں کیا جا سکتا، دار العلوم دیوبند چونکہ دنیائے اسلام کے مسلمانوں کی (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

آپ کے طریقۂ تعلیم اور سادہ طرزِ زندگی کا مجھ پر بڑا اثر ہوا ہے، آپ بہت ہی کم اخراجات میں بہت بڑا کام کر رہے ہیں، دارالعلوم دیوبند نے علم کی جو عظیم خدمت انجام دی ہے وہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ ساری دنیا کے لئے قابلِ قدر ہے، جس سادگی، خلوص اور ایثار و قربانی

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) مرکزی تعلیم گاہ ہے اور اس میں ہندوستان کے مختلف صوبوں ہی کے نہیں بلکہ مختلف ممالک کے طلبا تحصیلِ علم کی غرض سے آتے رہتے ہیں جو اُردو کے ذریعۂ تعلیم ہونے کی وجہ سے اپنے دورانِ قیام میں خاصی اُردو سیکھ جاتے ہیں اور پھر اپنے اپنے مقامات پر اس کی اشاعت کا ذریعہ بنتے ہیں، چنانچہ چند سال کی بات ہے کہ ایک صاحب جنھوں نے مختلف ممالک کی سیاحت کی تھی دارالعلوم میں آئے تھے وہ کہتے تھے کہ میں جب بخارا پہنچا جو وسط ایشیا کا مشہور مقام ہے تو وہاں ایسے لوگوں سے میری ملاقات ہوئی جنھوں نے مجھے ہندوستانی سمجھ کر بھر روانہ لہجے میں اُردو میں مجھ سے گفتگو کی، مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ہندوستان سے اس قدر دور دراز اتنی صاف اُردو اُن کو کیونکر آئی ہوگی، میرے دریافت کرنے پر انھوں نے بتلایا کہ یہ دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی فیض ہے، اور ہم ہی نہیں بلکہ یہاں کا علمی حلقہ بالعموم اُردو بولتا اور سمجھتا ہے۔

اُنھوں نے نہایت اخلاق و محبت سے میرے ہندو ہونے کے باوجود مجھے اپنے یہاں مہمان ٹھیرایا اور میرے اعزاز میں ایک شاندار پارٹی دی، جس کی یہ خصوصیت میں کبھی نہیں بھولوں گا کہ اس میں جس نے بھی تقریر کی وہ میری خاطر سے اُردو میں کی۔

اسی طرح کا ایک واقعہ ہمارے آنجہانی وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ اُن کے دورۂ روس کے موقع پر پیش آیا، پنڈت نہرو کو تاشقند کے ہوائی اسٹیشن پر وہاں کے باشندوں کی طرف سے جو سپاس نامہ پیش کیا گیا وہ اُردو میں تھا جسے وہاں کے ایک اُزبک نے پڑھ کر سنایا، پنڈت نہرو کو اس پر حیرت ہوئی اور اُنھوں نے بھی سپاس نامہ کا جواب اُردو ہی میں دیا، جسے اخبارات کے بیان کے مطابق حاضرین نے سمجھا، اور جوابی تقریر کے دوران (باقی صفحہ ۳۶۶ پر)

کے قابلِ قدر جذبات کے ساتھ آپ اسلام اور ملک کی خدمت کر رہے ہیں وہ سب کے لئے قابلِ تقلید ہے، مجھے اس سے بڑی خوشی ہوئی کہ آج جب کہ دنیا بھر کی یونیورسٹیاں لاکھوں اور کروڑوں روپے تعلیم پر خرچ کر رہی ہیں آپ بہت ہی کم خرچ سے اتنی عظیم اور قابلِ قدر خدمات انجام دے رہے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ یونیورسٹی کسی عمارت کا نام نہیں ہے وہ تو پڑھنے پڑھانے والوں سے بنتی ہے، یہی لوگ یونیورسٹی کی درحقیقت روح ہوتے ہیں، ورنہ عمارت تو ایک ڈھانچہ ہے اُس کا جوہر تعلیم و تعلّم ہی ہے ۔

آپ نے فیصلہ کیا ہے کہ دارالعلوم کے لئے گورنمنٹ سے امداد نہیں لیں گے اور صرف عوام کے چندوں سے اس درسگاہ کو چلائیں گے، اس میں شبہ نہیں کہ اس کا عوام پر اچھا اثر پڑتا ہے، اور اُن میں اپنی ذمہ داری کا احساس بڑھتا ہے، مگر اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے کہ آپ عوام کی مرضی کے خلاف کوئی اقدام نہیں کر سکتے خواہ وہ علمی اعتبار سے کتنا ہی مُفید اور ضروری کیوں نہ ہو۔ حکومتیں بے جان آثارِ قدیمہ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتی ہیں اور

(بقیہ حاشیہ گزشتہ) انھوں نے متعدد مرتبہ تالیاں بجائیں (روزنامہ الجمعیۃ مؤرخہ ۱۰ جون ۱۹۵۵ء صفحہ ۲)

اس سلسلے کی ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ جنوبی افریقہ کے فضلاء دارالعلوم جن کی وطنی زبان انگریزی یا گجراتی ہے وہ آپس میں خط و کتابت اُردو ہی میں کرتے ہیں، کینیا جو مشرقی افریقہ میں واقع ہے اس کے صدر مقام نیروبی سے اُردو میں ایک ہفتہ وار اخبار "ابزرور" کے نام سے نکلتا ہے، رنگون (برما) سے تو متعدد روزنامے ماہنامے اور رسائل اُردو میں شائع ہوتے ہیں، غرض کہ اس طرح دارالعلوم دیوبند نے اُردو کے دائرے کو اپنے فضلاء کے ذریعے سے دنیا کے تقریباً تمام ایشیائی و افریقی ممالک تک وسیع کر کے ہندوستان کی اس زبان کو بین الاقوامی زبان بنانے کا ایک اہم کام انجام دیا ہے ۔ سید محبوب رضوی سلمہ اس موقع پر یہ بات قابلِ غور ہے کہ عوام کو مفید و مضر بتانے والا بھی تو علماء کا ہی طبقہ ہے، عوام علماء سے سیکھتے ہیں، اُن کو سکھاتے نہیں ہیں ۔

اُن پر لاکھوں روپے صرف کرتی ہیں، آپ کا یہ دارالعلوم تو زندہ آثارِ قدیمہ ہے، اگر حکومت اس پر خرچ کرے تو یہ ایک مفید تربات ہوگی۔

سائنس کی ایجادات سے آج بڑی سہولتیں حاصل ہوگئی ہیں، دنوں اور ہفتوں کے سفر چند لمحوں اور گھنٹوں میں طے ہو جاتے ہیں، سائنس کے لئے بنیادی طور پر تین چیزیں ضروری ہیں، حروف، علم حساب اور کاغذ یہ تینوں چیزیں ایشیائی ہیں، حروف کے متعلق تاریخ دانوں کا فیصلہ ہے کہ وہ فنیقی قوم نے ایجاد کئے یہ ایشیا ہی کی قوم تھی، کاغذ چین میں ایجاد ہوا، اور حساب ہندوستان میں، عربوں نے یہاں سے حساب سیکھ کر اس کو ترقی دی، الجبرا کے موجد عرب تھے، اگر بنیادی طور پر یہ چیزیں پہلے سے موجود نہ ہوتیں تو سائنس کی موجودہ ترقی نہیں ہوسکتی تھی۔

سائنس اور مذہب، کسی مذہب کے ماننے والوں کے لئے دو ہوں، تو ہوا کریں، اسلام کے لئے دو نہیں ہیں، دوسرے مذاہب کے ماننے والے سائنس کو اُس وقت تک نہیں اپنا سکے جب تک انھوں نے اپنا مذہب ترک نہیں کر دیا (اور مسلمان جتنا مذہب کا زیادہ پابند اور واقف ہوتا ہے اُتنا ہی وہ سائنس کے زیادہ قریب آجاتا ہے) لیکن اب یورپ میں بھی سائنس کو مذہب کا مخالف سمجھنے کا خیال چھوڑ دینے کی باتیں ہونے لگی ہیں، وہاں اب بڑے بڑے مصنفین اس موضوع پر کتابیں لکھ رہے ہیں وہ سائنس اور مذہب دونوں کی بنیاد سچائی کو قرار دیتے ہیں[1]

اسلام اور سائنس میں کوئی اختلاف نہیں ہے، مسلمانوں نے پہلے بھی دنیا میں علم کی اشاعت کی ہے اور تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب تک انھوں نے علم میں فرق نہیں برتا وہ برابر آگے بڑھتے گئے، اس لئے مذہب اور سائنس کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں

---

[1] یہ اسلام ہی کا طفیل ہے۔ سید محبوب رضوی

دارالعلوم کو مدد کرنی چاہیئے۔ اب آپ ہی کو یہ کام کرنا ہے کہ مذہب اور سائینس کے جھگڑے کو دنیا سے ختم کر دیں اس سلسلے میں آپ کا دارالعلوم ایک بڑا قدم اٹھا سکتا ہے، اور اسطرح پر صرف ہندوستان ہی کی نہیں بلکہ پوری دنیا کی خدمت کر سکتا ہے، اس ملک کی تاریخ میں تعلیم کو عوام تک مفت پہنچانے کا جو راستہ آپ نے دکھلایا ہے اُسے ہندوستان کی تاریخ بھلا نہیں سکتی۔

ہندوستان کی جنگِ آزادی میں دارالعلوم کی شرکت کے متعلق آپ نے فرمایا کہ "اس ادارے کے علمار و فضلا رجنگِ آزادی میں ہمیشہ پیش پیش رہے، یہ امر واقعہ ہے کہ اس ادارے سے فرقہ پرستی کی ہمیشہ مخالفت کی گئی ہے، یہ دارالعلوم جس طرح پہلے فرقہ پرستیوں سے بالاتر رہا ہے آئندہ بھی اسی طرح رہے گا، یہ بات انتہائی افسوسناک ہے کہ اسے مطعون کیا جارہا ہے، جمعیۃ علمارِ ہند نے ملک کی آزادی کے لئے زبردست خدمات انجام دی ہیں، آج کچھ لوگ تنگ نظری کا شکار ہوکر اس محبِ وطن جماعت کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، اس جماعت کی ایک روشن تاریخ ہے جسے جھٹلایا نہیں جاسکتا، اگرچہ ہندوستان میں فرقہ پرستی کی دبا عام ہے، مگر دارالعلوم نے فرقہ پرستی کی ہوا کو قریب بھی نہیں آنے دیا، میرا یقین ہے کہ یہ دارالعلوم ہمیشہ دنیا کو انسانیت و شرافت اور نیکی اور محبت کے ساتھ قومیت کا سبق دیتا رہے گا، جس سے ہم ایک ایسی برادری بنانے میں کامیاب ہو جائینگے جس میں سب مل جل کر رہ سکیں گے۔"[1]

قرآن مجید کے ریکارڈ

حکومت مصر نے پورے قرآن مجید کی قرأت کے ریکارڈ تیار کئے ہیں، قرارت شیخ محمود الحصری کی ہے جو مصر کے مشہور قاری ہیں، چوالیس ریکارڈوں میں پورا قرآن مجید آگیا ہے، حکومت مصر کی

---

[1] تفصیل کے لئے "پروفیسر ہمایون کبیر دارالعلوم دیوبند میں" مطبوعہ کوہ نور پریس دہلی ۱۹۶۱ء مرتبہ سید محبوب رضوی سے مراجعت کی جائے۔

جانب سے ایک پورا سیٹ دارالعلوم کو دیا گیا ہے، دارالعلوم کے لئے دہلی سے اس سیٹ کے لانے کا فخر راقم سطور کو حاصل ہے۔

۱۳۸۲ھ، دارالعلوم ایک صدی کے بعد

دارالعلوم کی تاریخ کا یہ وہ سال ہے جس میں اس نے اپنی عمر کے ایک سو سال پورے کر لئے تھے، لیل و نہار کی اس طویل گردش میں دارالعلوم دیوبند کا ہر قدم بفضلہ تعالےٰ آگے کی جانب بڑھتا رہا ہے، اس سال کی روداد میں ایک سو سال پہلے کے حالات سے موازنہ کرتے ہوئے حضرت مہتمم صاحب نے ارقام فرمایا ہے جو انھیں کے الفاظ میں پیشِ خدمت ہے:۔

"الحمد للہ کہ دارالعلوم دیوبند نے اپنی عمر کے سو سال پورے کر لئے، محرم ۱۲۸۳ھ میں جس مکتب کی بنیاد حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ اور اُن کے مقدس ساتھیوں کے نیک ہاتھوں سے رکھی گئی تھی، سو سال کی مدت میں وہی مکتب ایک عظیم الشان بین الاقوامی تعلیمی اور تربیتی ادارے کی صورت میں نظر آرہا ہے، جو نہ صرف ایک تعلیمی ادارہ ہی ہے جس سے طلباء صرف سند حاصل کر لیتے ہیں بلکہ ایک اقامتی ادارہ بھی ہے جہاں تعلیم کے ساتھ تربیت اور اسلامی زندگی کے طور طریق بھی سکھائے جاتے ہیں، دارالعلوم کا فاضل اگر ایک طرف علوم دینیہ میں مہارت رکھتا ہے تو دوسری طرف اسلامی طور طریق، رہن سہن اور مذہبی زندگی کا آئینہ دار بھی ہوتا ہے، دنیا کے کسی گوشے میں آپ چلے جائیں دارالعلوم کا تربیت یافتہ اپنی حیثیت میں نمایاں اور ممتاز نظر آئے گا۔

بہر حال، اس سو سال کی مدت میں دارالعلوم دیوبند نے اگر ایک طرف ہزار ہا فضلاء اور اسلامی تعلیمات کے ماہر پیدا کئے تو دوسری طرف مبلّغ، مفسّر، قاضی، مفتی، سیاست داں اور اسلامی زندگی کے نمائندے بھی پیدا کئے جن سے دنیا کے کروڑوں مُسلمان دینی، دنیوی اور مذہبی رہنمائی حاصل کر رہے ہیں۔

اس سو سال کی مدت میں دارالعلوم دیوبند نے ہمہ نوع ترقی کی ہے، اگر ۱۲۸۳ھ میں طلبہ کی تعداد ۷۸، اساتذہ کی ۶ اور سالانہ آمدنی ۹۰۴۹ روپے کی تھی تو ۱۳۸۲ھ کے سو ویں سال میں طلبہ کی تعداد ۱۴۰۵، اساتذہ کی ۴۹ اور سالانہ آمدنی ۲۲۶، ۸۰۷ روپے ہوگئی، اسکے انتظامی عملے کا آغاز صرف ایک مہتمم سے ہوا تھا، اور آج بحمداللہ اس کے عملہ میں دو سو کے قریب افراد مشغولِ کار ہیں، جو عنداللہ اس ادارے کی مقبولیت، اسکے بانیوں کے نیک نیتی اخلاص اور للّہیت کی کھلی ہوئی نشانی ہے، اس کامیابی پر ارکین شوریٰ، تمام معاونین وچندہ دہندگان، اساتذہ، طلباء، اور کارکن سب ہی مبارک باد کے مستحق ہیں جن کے باہمی تعاون اشتراکِ عمل اور بے لوث خدمات کے نتیجے میں اس مکتب نے اتنا عظیم الشان مقام حاصل کیا ہے۔

اس سو سال کی مدت میں جو حضرات مرحوم ہو چکے ہیں اُن کے مراتبِ اُخروی کی بلندی کے لئے بارگاہِ حق سبحانہٗ تعالیٰ میں دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ اُن سب کو اجرِ عظیم عطا فرمائے، نیز بارگاہِ حق میں دعا ہے کہ حق تعالےٰ شانہٗ اس ادارے کے مقدس بانیوں سابق اساتذہ کارکنوں اور امداد کنندگان کی قبور کو نور سے بھر دے، آخرت میں اُنھیں مقامِ رفیع عطا فرمائے، اور تمام موجودہ حضرات کو زیادہ سے زیادہ دین اور اس دینی ادارے کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے، اور اپنی خوشنودی اور جزائے خیر سے نوازے۔

محرم ۱۳۸۳ھ دارالعلوم دیوبند کے لئے ایک مبارک و مسعود مہینہ تھا، ضرورت تھی کہ اس مہینے میں دارالعلوم دیوبند کی سو سالہ تقریب منائی جاتی اور ایک عظیم الشان اجتماع کیا جاتا، ۱۵ محرم کو دارالعلوم اور اس کے ملحقہ و متعلقہ مدارس میں اجتماعات اور جلسے کر کے اس عظیم ادارے کی تاسیس اور خدمات وغیرہ پر روشنی ڈالی جاتی گویا دارالعلوم دیوبند کا یہ سو سالہ اجتماع درحقیقت ہزارہا علماء، فضلاء ان کی دینی خدمات اور اتقیائے اُمت کے کارناموں کا اظہار، اور بالفاظِ دیگر علم و فضل کا ایک صد سالہ اجتماع ہوتا، ایسے وقت

میں اجتماعی خوشی کے جذبات کا اُبھرنا امرِ طبعی تھا، چنانچہ سب سے پہلے یہ جذبہ اس کارخانۂ حق احقر محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے دل میں موجزن ہوا، اور پھر احاطۂ دارالعلوم کے ملقوں حضرات اساتذۂ کرام، حضرات کارکنانِ دفاتر، عملۂ انتظام اور عزیز طلبا کی طرف سے بھی اجتماعی طور پر اس جذبے کا اظہار تحریراً و تقریراً کیا گیا کہ:۔

"اس مُبارک موقع پر اظہارِ خوشی و مسرت کے لئے تقریب کی کوئی مناسب شان صورت اختیار کی جائے"

ظاہر ہے کہ دارالعلوم کوئی رسمی ادارہ نہیں ہے بلکہ وہ رسمیات سے بالاتر ایک حقیقت اور حقیقتوں کا مربی ادارہ ہے اس لئے اس کی خوشی کا منظاہرہ پھول پتّیوں کی نمائش، یا چراغاں وغیرہ کی نمود، یا عام رسمی مظاہروں کی صورت اختیار نہیں کر سکتا تھا اور عام جذبات بھی یہی تھے کہ اس تقریبِ سعید کے موقع پر دارالعلوم میں ایک عام اجتماع منعقد کیا جائے جس میں بنائے دارالعلوم کے حالات، اس کی تاسیس کا پس منظر، قیام دارالعلوم کے مقاصد، اس کے بانیوں کی سیرت و کردار اور اس کے آئندہ کے لائحۂ عمل وغیرہ کی تذکیر کی جائے، اور دارالعلوم کی امتیازی خصوصیات کو ایک بار دلوں میں پھر تازہ کر دیا جائے کہ مظاہرۂ مسرت کی یہی صورت دارالعلوم کے شایاں ہو سکتی تھی لیکن بخت و اتفاق کی دنیا بالکل ہی الگ ہے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مقولہ ہے، عَرَفتُ رَبّی بِفَسخِ العَزائِم، ہوا یہ کہ بعینہ وہی تاریخیں جمعیۃ علمائے ہند کے اجلاس میرٹھ کی مقرر ہو کر شائع ہو گئیں، ایسی صورت میں ان ہی ایام میں دارالعلوم کی صد سالہ تقریب کا عظیم اجتماع اس اجلاس سے متصادم ہوتا جو ملت کے اجتماعی مفاد کے پیشِ نظر کسی طرح بھی مناسب نہ تھا، اس لئے ایسے تزاحم کے وقت التوائے اجتماع کو مناسب سمجھتے ہوئے، ان تاریخوں میں اجتماع کے خیال کو ترک کر کے صرف اس پر اکتفا کیا گیا کہ اس موقع پر سر دست ان تاریخوں میں دارالعلوم کی تعطیل کر دی جائے، اور اجتماع کا منصوبہ بعد میں کسی وقت پورا کیا جائے۔

ادھر اتفاق سے ان ہی ایام میں احقر مہتمم جنوبی افریقہ کے سفر کے لئے پابرکاب تھا جس میں تقریباً ساڑھے تین ماہ صرف ہو گئے، اس لئے اس خواب کی تعبیر برآمد ہونے میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی، حق تعالے کو منظور ہے تو انشاء اللہ جلد ہی یہ موقع آنے والا ہے۔"

کتب خانہ کی ترتیب

کتب خانہ دار العلوم میں ایک لاکھ کے قریب کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے اس میں بڑی تعداد اگرچہ درسی کتابوں کی ہے مگر کم و بیش نصف کتابیں ان میں غیر درسی ہیں، ان میں مطبوعہ غیر مطبوعہ دونوں طرح کی کتابیں شامل ہیں، مخطوطات بھی معتدبہ تعداد میں موجود ہیں۔

کتب خانہ کی ترتیب اور فہرست تیار کرنے کا کام پہلی مرتبہ ۱۳۵۵ھ میں راقم سطور کے سپرد ہوا تھا، مدت تک وہی فہرست کام دیتی رہی، چوتھائی صدی کے بعد ۱۳۸۲ھ میں پھر مزید ترتیب کی ضرورت پیش آئی، اس دوران میں ہزاروں کتابوں کا کتب خانے میں اضافہ ہو چکا تھا، اس کے لئے مجلس شوریٰ کی جانب سے مولانا ظہیر الدین صاحب کا انتخاب کیا گیا، مولانا موصوف نے بڑی جگر کاوی اور دیدہ ریزی سے فہرست کی تیاری کا کام انجام دیا ہے، اس مرتبہ مزید ایک اضافہ یہ ہوا ہے کہ لائبریریوں کے موجودہ طریق کے مطابق کتابوں کے کارڈ تیار کر کے ان کو حرف تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے، کارڈوں کے ذریعے سے کتاب برآمد کرنے میں بڑی سہولت ہو گئی ہے، علاوہ ازیں مخطوطات کی تعارفی فہرست بھی تیار کی گئی ہے جس کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں، کتب خانے کا تفصیلی تعارف "کتب خانہ" کے زیر عنوان آئندہ اپنے مقام پر پیش کیا جائے گا۔

مولانا حفظ الرحمٰن کی وفات

اس سال کے واقعات میں ایک اہم واقعہ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن کی وفات کا سانحہ ہے، مولانا نہ صرف دار العلوم کے علمی حلقوں میں ممتاز اور نمایاں شخصیت رکھتے تھے بلکہ ملک میں سیاسی لحاظ سے بھی اُن کا بڑا مقام تھا، مدت تک جمعیۃ علماء ہند کی نظامتِ اعلیٰ کے منصب

پر فائز رہے، اُن کی زندگی کا آغاز دارالعلوم کی مدرسی سے ہوا تھا پھر آخر میں مجلس شوریٰ کی رکنیت کے لئے اُن کا انتخاب کیا گیا، مولانا کی عمر کا بڑا حصہ دارالعلوم کی خدمت میں گذرا چناں چہ اُن کی خدمات کا اعتراف مجلس شوریٰ کے ارکین نے اِن الفاظ میں کیا ہے :۔

"مجلس شوریٰ کا یہ اجلاس مجاہدِ ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن کی وفاتِ حسرت آیات پر اپنے گہرے تأثرات اور دلی رنج وغم کا اظہار کرتا ہے، اور قوم سے ایسی یگانۂ روزگار شخصیت کے اُٹھ جانے کو ایک عظیم قومی حادثہ اور زبردست نقصان تصور کرتا ہے، حضرت مرحوم نہ صرف ایک جیّد عالم فاضل مصنّف اور بے نظیر خطیب تھے بلکہ صحیح معنیٰ میں مجاہدِ ملت بھی تھے، ہندوستان کی سیاسی اور قومی تاریخ میں اُن کی مجاہدانہ سرفروشیاں سُنہرے حروف میں لکھے جانے کے لائق ہیں، وہ نہ صرف ملک کے ممتاز لیڈر تھے، بلکہ مُسلمانوں کے قائد اور علمی وسیاسی رہنما بھی تھے، اِن کی ذاتِ گرامی اپنی ہمہ گیر قابلیت اور مقبولیت کے لحاظ سے بلا امتیاز مذہب وملت پورے ہندوستان کی ہمہ گیر شخصیت تھی، اُن کے فکرِ رسا، معاملہ فہمی، وقت شناسی، ثباتِ قدمی اور استقلال کا لوہا موافق ومخالف سبھی مانتے تھے، ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ خیز اور پرآشوب زمانے میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ملک اور بالخصوص مُسلمانوں کی جو زبردست اور عظیم الشان خدمات انھوں نے انجام دی ہیں حقیقت یہ ہے کہ یہ اُن ہی کا حصّہ تھا، ماضی میں دارالعلوم کی مجلس شوریٰ اور مجلس عاملہ کو ان کی منتظمانہ اور مُدبّرانہ بالغ نظری سے بڑی مدد اور تقویت ملتی رہی ہے، وہ معاملات کی تہ تک پہنچ جانے اور لاینحل گتھیوں کو سلجھانے کا بے نظیر ملکہ رکھتے تھے، اس لئے اُن کی زندگی پوری قوم اور ملک کے لئے ناقابلِ فراموش ہے، جماعت دارالعلوم اپنے اس جلیل القدر فرزند کی دائمی مفارقت پر مغموم ہے۔"

شام کے ایک جلیل القدر عالم کے تأثرات

جامعۂ حلب (شام) کے اُستاذ شیخ عبدالفتاح ابو غُدّہ نے دارالعلوم کو دیکھ کر اپنے جن تأثرات کا اظہار فرمایا ان کا یہ پہلو بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اُن کے نزدیک یہاں کے علماء کی تصانیف میں ایسے علمی مباحث ملتے ہیں جو علمائے متقدمین، معاصرین محدثین اور حکماء کے یہاں دست یاب نہیں ہیں، مگر یہ نادر کتابیں چونکہ اُردو زبان میں ہیں اسلئے ممالکِ عربیہ اُن کے استفادے سے محروم ہیں، ضرورت ہے کہ ان کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا جائے تاکہ وسیع پیمانے پر ان سے استفادے کے مواقع فراہم ہوں، شیخ ابو غدہ کے تأثرات کا ترجمہ یہ ہے:۔

اس عاجز و ناتواں راقم سطور کے لئے اللہ تعالےٰ کا یہ بہت بڑا فضل و انعام ہے کہ اُس نے ہندوستان کے شہروں کی سیاحت و زیارت کا موقع بہم پہنچایا، بالخصوص ان شہروں میں سرِ فہرست دیوبند اور اس کی دینی درسگاہ "دارالعلوم" کا درجہ ہے، جو درحقیقت ہندوستان کا علم و تقویٰ سے بھرپور زندہ قلب، علماء و مؤلفین کا مرکز اور دین و معرفت کے طلباء کی آماجگاہ ہے، اس مرکز کی زیارت عمر بھر کی تمناؤں اور لیل و نہار کے خوابوں میں سے ایک خواب و تمنا تھی، خدا کا شکر ہے کہ آج دارالعلوم کو دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی اور پُرانا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔

دُور رہتے ہوئے جو کچھ دارالعلوم کے بارے میں سُنا تھا اس کا جو کچھ ذہن میں خاکہ و تصور تھا قریب سے دیکھ کر اس کو اس سے کہیں زیادہ اچھا اور بہتر پایا، اس مقدس ادارے کے گوشے گوشے سے انوارِ علم کا فیضان ہوتا ہے، اس کی درسگاہوں میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کی احادیث کی تعلیم دی جاتی ہے اور تشنگانِ علم اور طالبانِ رُشد و ہدایت کے لئے مثالی نظم و نسق، سلیقہ شعاری اور روشن دماغی کے ساتھ اس اُسلوب سے احکامِ دین و شریعت بیان کئے جاتے ہیں جس میں اہلِ روحانیت کی روحانیت اور اصحابِ علم

تحقیق کے آثار وفیوض نمایاں طور پر جھلکتے ہیں۔

اللہ تعالےٰ کا یہ کمال فضل واحسان ہے کہ مجھے مولانا الاجل برکۃ الامۃ ذی الانفاس الطاہرہ سیدی الشیخ المحدث السید فخر الدین احمد المراد آبادی کے درسِ حدیث شریف کے کچھ حصے کی سماعت کا شرف حاصل ہوا، حضرتِ موصوف نے طلبارِ محبیّنِ کرام کی درخواست پر احقر کی رعایت کرتے ہوئے حدیث بنی سلمہ پر عربی میں تقریر فرمائی، جس میں ذکر ہے کہ بنی سلمہ کی خواہش ہوئی کہ وہ اپنے مکانوں کو چھوڑ کر مسجدِ نبویؐ کے جوار میں منتقل ہوجائیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے اس ارادے کا علم ہوا تو ارشاد فرمایا" دیارکم تکتب لکم اثارکم "موصوف کی تقریر بیش بہا موتیوں اور تابناک ستاروں کا مجموعہ اور فیضِ الباری اور عمدۃ القاری کا مصداق تھی، اسی کے ساتھ شیخ موصوف کی طرف سے ان طلبار کو جو گوش بر آواز تھے اپنے خصوصی ارشادات سے نوازنے کا سلسلہ جاری تھا جوان تلامذہ کے نفوس میں اس طرح سرایت کرتے تھے جس طرح عطر ہوا میں اور پانی زندگی میں کرتا ہے، دُعا ہے کہ اللہ تعالےٰ موصوف کو سنتِ مطہرہ اور اس کے متبعین کی طرف سے جزائے خیر دے اور اس ادارے کو سماحۃ الشیخ صدر المدرسین مولانا العلامہ ابراہیم البلیاوی اور مولانا القاری محمد طیب صاحب جیسے ارکان واساطین ائمہ اجلہ بدر الہدیٰ (بدرہائے ہدایت) اور مصابیح دجیٰ (شمعہائے ظلمت) کے زیرِ سایہ ہمیشہ پھلتا پھولتا قائم رکھے، اور ان بزرگوں کے نفع بخش اوقات اور انفاسِ طاہرہ میں برکت عطا فرمائے۔

ذمہ دارانِ مدرسہ نے میرے ساتھ مزید اکرام واحسان یہ کیا کہ احقر کو اپنا خصوصی مہمان بنایا اس طرح بسہولت علمائے اکابر سے علمی استفادے کا موقع ملا، فللّٰہ الحمد نیز وہ چیز جس کے لئے آج ہم سب اللہ تعالےٰ کے مرہونِ منّت اور احسان مند ہیں وہ یہ ادارہ ہے جو مع اساتذہ وتلامذہ کے دین کا گھنا سایہ دار درخت، علم وتقویٰ کا مرکز اور جسم اسلامی کی بقار کا ضامن وہ پھیپھڑا ہے جس میں حیاتِ روحانی کے آثار رواں دواں ہیں، ہم اللہ تعالےٰ

سے دُعا کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو اس ادارے کی بقاو ترقی اور اس کے علمار کو طولِ حیات سے زیادہ سے زیادہ مستفیض فرمائے ، واللہ یجیب ولا یخیب رجاء الس اجین فضلاً منہ وکرماً۔

علم وتقویٰ کے اساطین سے مالامال اس عظیم الشان ادارے کے علمار عظام کی خدمات جلیلہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں بلکہ اگر ذرا جرأت کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہمارا ایک واجبی حق ہے جس کا مطالبہ کر رہا ہوں ، وہ یہ ہے کہ ان علمائے کرام کا فریضہ ہے کہ اپنے منفردانہ عقول کے نتائجِ فکر اور بیش بہا علمی فیوض وتحقیقات کو عربی زبان کا جامہ پہنا کر عالمِ اسلام کے دوسرے علمار کے لئے استفادہ کا موقع فراہم کریں ، یہ فریضہ ان حضرات پر اس لئے عائد ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص ہندوستان کے علمائے محققین کی کوئی تصنیف پڑھتا ہے تو اُس میں اُس کو وہ نئی منفردانہ تحقیقات ملتی ہیں جن کا مدار علیہ گہرے علم اور وسیع مطالعے کے علاوہ تقویٰ وصلاح اور روحانیت ہوتی ہے ، اور چونکہ ہندوستان کے علمار و شیوخ کرام نیکی وصلاح اور روحانیت اور استغراق فی العلم جیسی شرائط پر نہ صرف یہ کہ پورے اُترتے ہیں بلکہ سلفِ صالحین کے صحیح وارث اور اُن کے نمونے ہیں اس لئے اُن کی کتابیں نئی اور کارآمد چیزوں سے خالی نہیں ہوتیں ، وذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء بلکہ ان حضرات کی بعض کتابیں تو وہ ہیں جن میں ایسی چیزیں ملتی ہیں جو متقدمین علمائے اکابر ، مفسرین ومحدثین اور حکمار کے یہاں بھی دستیاب نہیں ہوتیں ، لیکن افسوس اور قلق کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان نادر تالیفات میں سے اکثر بلکہ سب کی سب اُردو زبان میں لکھی گئی ہیں ، جو گو ہندوستان کی عام اسلامی زبان سہی لیکن عربی کو کثیر الاستعمال اور علوم اسلام کی خاص زبان ہونے کا جو شرف حاصل ہے ظاہر ہے کہ وہ اُردو کو حاصل نہیں ، لہٰذا یہ علوم اور بیش قیمت تحقیقات جو ہمارے برادرانِ اسلام علمائے ہند کا خصوصی حصہ اور کارنامہ ہیں اگر اردو ہی کے قالب میں محبوس رکھی گئیں تو ہم عربی زبان بولنے والوں سے مخفی اور پوشیدہ رہ کر ہماری محرومی کا

باعث بنا رہے گی، اس طرح نہ صرف ہمارے ساتھ ہی ناانصافی ہوگی بلکہ علم و دین کے حق کا بھی ایک بہت بڑا نقصان ہوگا، اس لئے فریضۂ معرفت اور امانتِ علم کی ادائیگی کے لئے یہ بات اوّلین واجبات میں سے ہے کہ ان نفیس شاہکار اور عمدہ کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا جائے تاکہ ان سے وہ آنکھیں روشنی حاصل کریں جو ایسی چیزوں کے لئے بیتاب، تشنہ اور مشتاق ہیں اور جیساکہ میرا خیال ہے اس اہم ذمہ داری اور کٹھن فریضہ کی ادائیگی کا کام اسی ادارۂ عامرہ کے افراد کر سکتے ہیں جو علمائے کرام اور طلبائے نجبار کا گہوارہ و سرچشمہ ہے۔

اس موقع پر جبکہ میں ذمہ دارانِ ادارے کے مشفقانہ طرزِ عمل، نوازشاتِ بزرگانہ اور طلبائے عزیز کے جذباتِ محبت و اُخوت کے لئے کلماتِ شکر حیطۂ تحریر میں لا رہا ہوں اپنے مذکورہ بالا حق اور مطالبے کو دہرانے کی ایک بار پھر پُرامید ہو کر جرأت کرنا ضروری سمجھتا ہوں اس لئے کہ اگر ان حضرات نے اس فریضے کی ادائیگی کی طرف توجہ مبذول فرمائی تو اس طرح جہاں وہ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوں گے ساتھ ہی ساتھ یہ دین و ثقافت کی ایک عظیم الشان خدمت اور قابلِ ذکر کارنامہ ہوگا، کیونکہ یہ علوم دُنیا کے تمام مسلمانوں ہی کی ملک نہیں بلکہ تمام بنی نوعِ انسان مساوی طور پر ان سے استفادے کے مستحق ہیں چہ جائیکہ صرف ہندوستان ہی کے مسلمان ان کے اجارہ دار قرار پائیں، اس لئے ازبس ضروری ہے کہ اُردو کتابوں کے عربی میں تراجم کئے جائیں تاکہ ان کی زیادہ سے زیادہ ترویج و اشاعت ہو، اور وسیع پیمانے پر ان سے استفادے کے مواقع فراہم کئے جا سکیں۔

مجھے یہ سُن کر کسی حد تک اطمینان اور مسرت ہوئی کہ یہ اہم مسئلہ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے زیرِ غور ہے، اور وہ عنقریب اس اہم بار اور ذمہ داری کی ادائیگی کے لئے قدم اُٹھانے والی ہے، جو درحقیقت اس ادارے کے علماء کا اور بالخصوص طلباء کا واجبی فرض ہے، میں اس خوشخبری کے بعد تمام علمائے اکابر ان کے اس مُبارک عزم اور اقدام پر تہ دل سے پیشگی شکریہ ادا کرتا ہوں، اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوں کہ اس

کارِ عظیم میں اس کی خصوصی مدد و معاونت ان کے شاملِ حال ہو تاکہ بسہولت وہ اس فریضے کو مرحلۂ تکمیل تک پہنچا سکیں، باری تعالےٰ کے لئے یہ کوئی دشوار امر نہیں، وما ذلک علی اللہ بعزیز۔ اور نہ ہی ان علمائے اماجد کے لئے ان کے پختہ عزائم کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی ایسا کٹھن اور دشوار گذار مرحلہ ہے جو ناقابلِ عبور ہو۔[1]

۱۳۸۳ھ حضرت مہتمم صاحب کا سفر افریقہ و مصر

سال زیرِ نظر میں حضرت مہتمم صاحب کے دو بیرونی سفر ہوئے، پہلا سفر جنوبی افریقہ کا تھا اور دوسرا مصر کا، یہ دونوں سفر مختلف حیثیتوں سے دارالعلوم کے لئے مفید ترین ثابت ہوئے، اواخر محرم میں جنوبی افریقہ کا سفر ہوا، جوہانسبرگ کے ہوائی اڈے پر استقبال کے لئے جنوبی افریقہ کے چاروں صوبوں کے مسلمانوں کا نمائندہ اجتماع خوش آمدید کہنے کے لئے موجود تھا جو تقریباً دو ہزار افراد پر مشتمل تھا، جوہانسبرگ کے ڈچ میئر مسٹر اوبر ہولز خیر مقدم کے لئے مع اپنی اہلیہ کے اس موقعے پر موجود تھے، یوروپین پولیس بھی کافی تعداد میں تھی، پندرہ دن جوہانسبرگ میں قیام رہا اور وہاں سے ڈربن اور پھر کیپ ٹاؤن تشریف لے گئے، ڈربن کے دورانِ قیام میں اطراف و جوانب کے مختلف مقامات پر جانا ہوا، کیپ ٹاؤن کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے حضرت مہتمم صاحب نے فرمایا کہ مسلمانوں کو مادی طاقت سے ہرگز پریشان نہیں ہونا چاہیئے، مسلمانوں کو اپنی روحانی طاقت بڑھانے کی ضرورت ہے، مسلمان اپنے ان فرائض کو بھول چکے ہیں جن کی بجا آوری کے لئے وہ پیدا کئے گئے ہیں، ہمیں نیکی کی تلقین کرتے رہنا چاہیئے اور برے کاموں سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

جنوبی افریقہ میں دارالعلوم دیوبند اور جماعتِ دارالعلوم کے خلاف جو غلط فہمیاں

---

[1] روداد ۱۳۸۳ھ ص ۱۳ - ۱۴ -

پھیلی ہوئی تھیں بڑی حد تک اس سفر سے اُن کا ازالہ ہوگیا اور پائیدار اثرات لوگوں کے دلوں میں راسخ ہو گئے۔ جوہانسبرگ میں وہاں کی یونیورسٹی وٹ واٹرز ریڈ میں اُن دنوں ایک تعلیمی کانفرنس ہو رہی تھی جس میں جنوبی افریقہ کے ماہرینِ تعلیم جمع تھے، کانفرنس میں حضرت مہتمم صاحب کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ صدرِ کانفرنس نے حضرتِ ممدوح کی شرکت پر شکریہ ادا کرتے ہوئے دارالعلوم دیوبند کی عظمت اور اس کے بین الاقوامی اثرات کا اعتراف کیا، حضرت مہتمم صاحب نے اپنی جوابی تقریر میں فرمایا کہ "ہمیں وطن و قوم اور نسل کی حد بندیاں ایک دوسرے سے جدا کر سکتی ہیں، مگر علم سارے انسانوں کا مشترک سرمایہ ہے اور انسانوں کی وحدت کے لئے ایک فطری ضامن ہے، چنانچہ رنگ و نسل اور جذباتی تفریقوں کے باوجود علم ہی وہ ذریعہ ہے جس نے ہم سب کو یہاں جمع کر دیا ہے۔"

جنوبی افریقہ کے اس سفر میں وہاں کے اجتماعات اور کانفرنسوں میں شرکت سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ جنوبی افریقہ میں وسیع پیمانے پر دارالعلوم کا تعارف ہوگیا، عام طور پر وہاں کے اجتماعات میں مغربی زبانوں کے اخبارات کے نمائندے موجود ہوتے تھے اور وہ اجتماعات کی کارروائیوں کے ساتھ دارالعلوم کے حالات بھی شائع کرتے تھے، اس طرح دارالعلوم کی شہرت نہ صرف برِاعظم افریقہ بلکہ یورپ کے مختلف ملکوں تک پہنچ گئی، اس کے علاوہ اجتماعات میں اخباری نمائندوں نے مختلف اسلامی مسائل پر بھی حضرت مہتمم صاحب سے مختلف سوالات کئے، اُن کے جوابات سے مغربی دُنیا کو اسلام کے متعلق صحیح معلومات حاصل ہوئیں جس سے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوگیا۔

جنوبی افریقہ سے نیروبی اور وہاں سے مصر، بیت المقدس اور حجاز ہوتے ہوئے بیروت کے راستے سے تین ماہ کے بعد واپسی ہوئی۔

دوسرا سفر ۱۹ شوال ۱۳۸۳ھ (۴ مارچ ۱۹۶۴ء) کو عالمی مؤتمر اسلامی قاہرہ کی دعوت پر ہوا اس مؤتمر میں جو مجمع البحوث الاسلامیہ کے نام سے موسوم تھی دنیائے اسلام

کے ممتاز علماء کو دعوت دی گئی تھی، اس میں ۳۸ ملکوں کے منتخب علماء نے شرکت کی مصری علماء کی تعداد اس کے علاوہ تھی، مجموعی طور پر سوا سو علماء مؤتمر میں شریک رہے، ہند و پاک کے نمائندے سب کے سب فضلائے دیوبند تھے، حضرت مہتمم صاحب کے علاوہ حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی امیر شریعت بہار و اڑیسہ جناب مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی سابق صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے مؤتمر میں ہندوستان کی نمائندگی فرمائی مؤتمر کا مقصد تمدنِ جدید سے پیدا شدہ مسائل کی شریعتِ اسلامی کی روشنی میں تحقیق و تنقیح تھا، یہ مسائل حسبِ ذیل عنوانات پر منقسم تھے۔

(۱) اسلام میں مالیات کی تقسیم کا انتظام۔

(۲) عرب اور اسلام کے عالم گیر نفوذ کے طبعی اسباب۔

(۳) اسلام میں آراضی کی شخصی ملکیت اور اس کے آثار۔

(۴) دولت مندوں کے اموال میں غریبوں کے حصے کی نوعیت۔

(۵) اسلام میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا نظام۔

(۶) اسلام میں اجتہاد کا ماضی و حال۔

اگرچہ مؤتمر میں مذکورہ بالا سبھی عنوانات پر بحث و تمحیص ہوئی، مگر سب سے زیادہ زور آخری عنوان پر تھا، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ کانفرنس کی پوری مدت میں دو تہائی وقت صرف اس مسئلہ پر صرف ہوا، فکر یہ ظاہر کیا گیا کہ جب تک علماء کے لئے اجتہاد کا دروازہ نہیں کھولا جائے گا اُس وقت تک پیچیدہ مسائل حل نہیں ہوں گے، کیونکہ آج کی صورتِ حال جدید انکشافات کی موجودگی میں یکسر بدل گئی ہے، پچھلا نقشِ قدم اس کا تصفیہ نہیں کر سکتا۔

حضرت مہتمم صاحب جو ہندوستانی وفد کے رئیس تھے اور مولانا محمد یوسف بنوری رئیس وفدِ پاکستان نے اس موضوع پر اپنے اپنے مقالے پیش کئے حضرت مہتمم صاحب کے مقالے کا بنیادی نقطۂ نظر یہ تھا کہ ہمارے لئے فکر و نظر یا طریقِ استنباط میں جہاں اصول علم

قواعدِ فن کی پابندی ضروری ہے وہیں سلف کی پیروی بھی ضروری ہے، ہم اجتہاد کے دائرے میں رہ کر بھی اتباعِ سلف کے دائرے سے باہر نہیں جا سکتے، سنت اور اُسوۂ سلف ہمارے اجتہاد کی انتہائی منزل ہونی چاہیے! آپ نے فرمایا کہ :۔

"آج مسلمانوں کو جو مسائل درپیش ہیں انھیں پیچیدہ سمجھا جا رہا ہے، اُن کے سلسلے میں اس کے بجائے کہ ہم اپنے لئے منصبِ اجتہاد ثابت کرنے پر اپنا زور صَرف کریں، یہ زیادہ موزوں ہوگا کہ اِن مسائل کا عملی حل پیش کر دیا جائے اشخاص کے لئے اجتہادی قوتوں پر غور کئے جانے کے بجائے مسائل پر غور کیا جانا زیادہ سہل اور مختصر راستہ ہے، نئے حوادث اور اُن سے اُبھرنے والے مسائل کچھ اس دَور کی خصوصیت نہیں ہے، بلکہ اسلام کے ہر قرن میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے، نئے افکار و نظریات، نئے واقعات و احوال کی وجہ سے ہمیشہ سامنے آتے رہتے ہیں، اور ہر دَور کے مفکّر علماء اپنی علمی صلاحیتوں اور فکری قوتوں سے اصولِ فقہ اور منضبط مسالکِ فقہیہ کی روشنی میں فیصلے دیتے رہے ہیں، چنانچہ آج بھی نئے حوادث کے سلسلے میں مسائل کی تنقیح میں علمائے اُمّت نے کوتاہی نہیں کی، حوادث الفتاوٰی اور آلاتِ جدیدہ کے شرعی احکام کے نام سے ہندوستان میں مستقل کتابیں شائع ہو چکی ہیں جو جدید مسائل کا شافی حل پیش کرتی ہیں، البتہ اگر ضرورت ہے تو اس کی ہے کہ ایسے احکام کی اشاعت و تنقیح عالمی پیمانے پر ہو اور اسے مقامی کے بجائے بین الاقوامی انداز سے پیش کیا جائے، اور ایسے جدید فتاوٰی وہ خواہ کسی بھی ملک کے ہوں انھیں پورے عالمِ اسلامی کے سامنے لایا جائے، ظاہر ہے کہ اس کام کو مجمع البحوث الاسلامیہ سے بہتر کون انجام دے سکتا ہے، وہ اپنے عالم گیر اثرات سے دنیا کے جدید فتاوٰی کے ذخیرے فراہم کر سکتی ہے، اور مختلف زبانوں میں ان کے تراجم

پیش کر سکتی ہے تاکہ فکر میں عالمیت اور یکسانی پیدا ہو کر اُمّت کے عمل میں یکسانیت پیدا ہوجائے، وحدتِ اُمّت کے لئے یہ مؤتمر ایک وسیلے کا کام دے سکتی ہے۔

حضرت مہتمم صاحب نے اپنے مقالے میں موجودہ دُنیا کو اسلام سے متعارف کرانے پر بھی زور دیا، اور مؤتمر اسلامی سے اپیل کی کہ اسلام کو پورے عالم کا دین بنانے کی جدوجہد مؤتمر کے پیشِ نظر رہنی ضروری ہے۔

مقالے کے آخر میں کہا گیا ہے کہ اجتہاد کی کچھ نہ کچھ توتیں آج بھی ہمارے علماء کے اندر موجود ہیں، اگر نہ ہوتیں تو مفتیوں کو فتوی دینا اور معاملات پر غور کر کے فیصلہ کرنا دشوار ہوجاتا مگر اس سلسلے میں یہ امر ملحوظ رکھا جانا ضروری ہے کہ اجتہاد کی طلب اس لئے نہ ہونی چاہیئے کہ ہم آج کے مغربی تمدّن سے مرعوب ہو کر اس کی تائید میں نئے نظریات تو پہلے سے خود قائم کر لیں اور پھر قرآن وحدیث سے اس کے مؤیّدات تلاش کر کے انھیں حدودِ جواز میں لانے کی فکر کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ کتاب وسنّت کا اتباع نہیں بلکہ کتاب وسنّت سے اپنا اتباع کرانا ہے، یہ ایک خطرناک غلطی ہے، فکر ونظر اور طریقِ استنباط میں جہاں اصول وقواعد کی پابندی ضروری ہے وہیں سلف کی مکمل پیروی اور اس ذوق کی بھی ضرورت ہے جو ہمیں اسلاف سے ورثہ میں ملا ہے، ورنہ اس کے بغیر وہ رنگ قائم نہیں رہ سکتا جو وَيُزَكِّيهِمْ کے تحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بخشا ہے، اس لئے ہم طبعاً اجتہاد کے دائرے میں رہ کر بھی اتباعِ سلف سے باہر نہیں جا سکتے، ایک ایک سنّت اور ایک ایک اُسوۂ سلف ہمارے جہد د اجتہاد کی انتہائی منزل ہونی چاہیئے۔[1]

مؤتمر میں دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ کے رکن حضرت مولانا منت اللہ رحمانی

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے روداد دارالعلوم اور ماہنامہ دارالعلوم کا دیوبند کا عالمی مؤتمر اسلامی

کی جانب سے بھی ایک مقالہ پیش کیا گیا تھا جس میں نہایت بالغ نظری سے فقہی مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے ایک اہم حقیقت کی جانب توجہ دلائی گئی ہے اور اصول و فروع کے فرق کو نہایت دقیقہ سنجی سے واضح کیا گیا ہے، مقالے میں لکھا ہے:۔

"فروعی مسائل کو غیر معمولی اہمیت دینے کا سب سے بڑا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے علماء اور اصحابِ فتاویٰ کی نظر دین کی اَبدی بُنیادوں اور عالم گیر اُصولوں سے ہٹ کر فروع پر آگئیں اور اصل دین مستور ہو گیا جس پر نجاتِ انسانی کا مدار ہے، چھوٹے چھوٹے مسائل نے اُن کی جگہ لے لی جس سے وحدتِ اسلامیہ کو غیر معمولی نقصان پہنچا اور اُخوتِ اسلامی پارہ پارہ ہو گئی اور وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعالمین اور وما ارسلنٰک الا کافۃ للناس بشیراً و نذیراً کا اعلان بے معنیٰ ہو گیا، اس لئے ضرورت ہے کہ فروعی مسائل میں غیر معمولی شدّت کو ختم کیا جائے اور ہر مسئلے کو وہی جگہ دی جائے جس کا وہ مستحق ہے اور حُجّتِ دینیہ کے پیشِ نظر اس کا جو مقام ہے اور ہم اصل دین کو دُنیا کے سامنے پیش کریں جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رہتی دنیا تک کے لئے اور ہر ملک و مکان کے لئے لے کر آئے تھے[1]۔

مؤتمر کے اختتام پر[2] حضرت مہتمم صاحب اور حضرت مولانا رحمانی قاہرہ سے حج بیت اللہ

---

[1] سفرِ مصر و حجاز از حضرت مولانا منت اللہ رحمانی ص۱۳۲ مطبوعہ لیبل پریس پٹنہ۔

[2] اس موقع پر حکومتِ مصر نے نمائندگان کی سیر و سیاحت کا بھی انتظام کیا تھا، پہلے ہوائی جہاز کے ذریعے اسوان بند پہونچایا گیا جہاں ہزارہا مزدور کام کر رہے تھے۔

پھر کاروں کے ذریعے مصر کے دوسرے شہروں طنطا اور دمنہور وغیرہ بھیجا گیا، طنطا مصر کا ایک عظیم صنعتی شہر ہے، وہاں کے کارخانے دکھلائے گئے، پھر تیسرا سفر کاروں کے ذریعے غزہ کا (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

کے لئے حجاز مقدس تشریف لے گئے، اولاً مدینہ منورہ میں قیام رہا، بعد ازاں حج سے مشرف ہوئے، قیام مدینہ منورہ کے دوران جامعۂ اسلامیہ مدینہ کی دعوت پر وہاں تشریف لے جانا ہوا، (اس موقع پر صاحبزادہ مولانا محمد سالم صاحب قاسمی استاذ دارالعلوم اور مولانا عبدالحق صاحب پیشکار اہتمام جو اس وقت مدینہ منورہ میں موجود تھے) جلسۂ خیر مقدم میں اساتذہ و طلبار کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے حضرت مہتمم صاحب نے اربابِ جامعہ کا شکریہ ادا کیا، آخر میں آپ نے دارالعلوم کے حالات اور مسلکِ دارالعلوم کا تعارف کرایا اور جامعۂ اسلامیہ مدینہ کی گراں قدر خدمات پر حکومت اور اربابِ جامعہ کو ہدیۂ تبریک و تحسین پیش کیا

مجموعی حیثیت سے حضرت مہتمم صاحب کے یہ دونوں سفر بہت نتیجہ خیز ثابت ہوئے، ان سفروں کے ذریعے سے برِاعظم افریقہ اور مشرقِ وسطیٰ کے علاوہ مغربی ممالک میں بھی دارالعلوم کے تعارف کا حلقہ وسیع ہوگیا، اور چونکہ قاہرہ کے اجتماع میں تمام دنیائے اسلام کے نمائندے موجود تھے اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ پورے عالمِ اسلام میں دارالعلوم متعارف ہوگیا۔

۷ محرم ۱۳۸۴ھ (۱۹ مئی ۱۹۶۴ء) کو حضرت ممدوح مراجعت فرمائے دیوبند ہوئے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کرایا گیا جس پر اب یہودیوں کا قبضہ ہے۔ کار یں صحرائے سینائے گذرتی ہوئی غزہ میں داخل ہوئیں، حضرت مہتمم صاحب کا بیان ہے کہ جب سینائے گذرے تو موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کا اسی صحرا سے گذرنا اور میدانِ تیہ میں حیران ہو کر چالیس سال گذارنے کا منظر نظروں میں پھر گیا، اس تاریخی پس منظر سے متاثر ہو کر حضرت ممدوح نے ایک مستقل کتاب کی تالیف شروع فرما دی جو ہندوستان پہونچکر مکمل ہوئی، یہ ضخیم کتاب بہت سے حقائقِ شرعیہ اور کتنے ہی سیاسی معارف پر مشتمل ہے، افسوس ہے کہ ابھی تک طبع نہیں ہو سکی۔ خیال یہ ہے کہ اس کی طباعت و اشاعت علمی ذخیرے میں ایک بیش بہا اضافہ ثابت ہوگی۔ اس کتاب کا عربی ترجمہ دارالعلوم کے ترجمان "الداعی" میں بالاقساط شائع ہو رہا ہے۔

اسٹیشن پر اساتذہ وطلباء، کارکنانِ دفاتر اور اہلِ شہر کی جانب سے پُرجوش استقبال کیا گیا، طلبائے دارالعلوم کی درخواست پر حضرت مہتمم صاحب نے دارالحدیث کے جلسۂ خیر مقدم میں ایک طویل تقریر فرمائی جس میں آپ نے سفرِ مصر و حجاز کے تاثرات اور موتمر اسلامی قاہرہ اور جامعۂ اسلامیہ مدینہ کے تفصیلی حالات بیان فرمائے۔

مستشرقین کی کانگریس میں دارالعلوم کی شرکت

مستشرقین کی بین الاقوامی

کانگریس کا چھبیسواں اجلاس جنوری ۱۹۶۴ء کی شروع تاریخوں میں منعقد ہوا، جس میں گیارہ سو ماہرین شرقیات نے شرکت کی، اُن میں پانچ سو بیرونی ممالک کے نمائندے شریک تھے، اور چھ سو ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور علمی اداروں کے فضلاء شامل تھے، یہ پہلا موقع تھا کہ اس کانگریس کا اجلاس یورپ سے باہر ایشیا میں ہوا، ایشیا میں سب سے پہلے یہ فخر ہندوستان کے دارالحکومت دہلی کی سرزمین کو حاصل ہوا۔ کانگریس کے ابتدائی سالوں میں اس کی مجلسوں میں شرکت صرف یورپی ماہرینِ شرقیات تک محدود تھی، رفتہ رفتہ اس کے دائرے میں توسیع ہوتی گئی اور ایشیائی ملک بھی اس میں شامل ہو گئے۔

دہلی میں کانگریس کا اجلاس وگیان بھون کی عظیم الشان عمارت میں منعقد ہوا تھا۔ یہ کانگریس دس شعبوں پر منقسم تھی، اس میں ایک شعبہ نوادر مخطوطات کے لئے مخصوص تھا، انڈین انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹیڈیز نئی دہلی کی درخواست پر دارالعلوم کے منتخب مخطوطات اس موقع پر پیش کئے گئے، مستشرقین نے ان کو خاص طور پر پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور متعدد مخطوطات کے نوٹس بھی لئے، اس طرح مستشرقین کی یہ کانگریس دارالعلوم کے لئے وسیع طور پر بین الاقوامی تعارف کا ذریعہ ثابت ہوئی، دارالعلوم کے مخطوطات کو کانگریس میں متعارف کرانے کا کام راقم سطور نے انجام دیا تھا۔

۸۴ھ و ۱۳۸۵ھ، مجلہ دعوۃ الحق کا اجراء

ہمدردانِ دارالعلوم کو دارالعلوم کے حالات و

کوائف سے باخبر رکھنے اور دارالعلوم کے مسلک کی توسیع واشاعت کے لئے ایک زمانے میں "القاسم" اور "الرشید" وغیرہ ماہنامے شائع ہوتے رہے ہیں، القاسم کے بند ہونے کے بعد ۱۳۶۰ھ میں مجلہ "دارالعلوم" جاری ہوا، مگر اب تک یہ رسائل صرف اُردو زبان میں شائع ہوتے تھے، سالِ رواں میں دارالعلوم کے حلقے کو وسیع تر بنانے کیلئے ایک سہ ماہی عربی مجلہ "دعوۃ الحق" کے نام سے نکالا گیا، "دعوۃ الحق" برِصغیر کے عربی مدارس کے علاوہ عرب ممالک میں بھی دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے، یہ عربی مجلہ عرب ملکوں میں مسلک دارالعلوم کی اشاعت کا ذریعہ ہونے کے علاوہ عرب ممالک سے رابطے کا بھی ایک قوی ذریعہ رہا ہے[۱]

غلے کی فراہمی میں حکومت اُتر پردیش کا تعاون

۱۳۸۴ھ کے آخری مہینے میں دارالعلوم کو شدید غذائی بحران سے دوچار ہونا پڑا، حضرت مہتمم صاحب نے اس صورتِ حال پر حکومت اُتر پردیش کو توجہ دلائی، دارالعلوم کی جانب سے حکیم محمد الیاس صاحب کشوری اور راقم سطور کو لکھنؤ بھیجا گیا ارکانِ وفد نے حکومت کے ذمہ داروں خصوصاً وزیرِ اعلیٰ اور وزیرِ خوراک کو بتایا کہ دارالعلوم کو غذائی ضرورتوں کو پورا کرنے میں کیا دقتیں پیش آرہی ہیں، اگر خدا نخواستہ ان مشکلات کی وجہ سے دارالعلوم نئے تعلیمی سال کے آغاز میں طلبار کا داخلہ نہ کر سکا تو اس سے دارالعلوم دیوبند کی بین الاقوامی حیثیت اور حکومت کے وقار پر ناخوش گوار اثر مرتب ہوگا، اُس وقت کی وزیرِ اعلیٰ مسز سوچیتا کرپلانی نے اس موقع پر اپنے پورے پورے تعاون کا ثبوت دیا، اور دارالعلوم کے لئے مطلوبہ غلے کی فراہمی میں سہولت بہم پہنچائی جس کا سلسلہ بحمداللہ اب تک جاری ہے۔

---

[۱] اب کچھ عرصے سے "دعوۃ الحق" کے بجائے ایک پندرہ روزہ عربی اخبار "الداعی" کے نام سے نکل رہا ہے۔

اُتر پردیش کے گورنر کی دارالعلوم میں آمد

اس سال دارالعلوم میں جو مختلف حضرات تشریف لائے اُن میں اُتر پردیش کے گورنر جناب وشوا ناتھ داس صاحب قابلِ ذکر ہیں، موصوف ۲۳ مارچ ۱۹۶۵ء کو دارالعلوم میں تشریف لائے اور دارالعلوم کو دیکھ کر جلسۂ عام میں اپنے جن گہرے اور گراں قدر تاثرات کا اظہار کیا یہاں اُن کا نقل کرنا طوالتِ بے جا نہ ہوگا، موصوف نے فرمایا:

"علم انسان میں جو تواضع اور انکسار پیدا کرتا ہے، میں اس کی بہت اچھی مثال دارالعلوم میں دیکھ رہا ہوں، آپ حضرات جس محنت اور جانفشانی سے تعلیم دے رہے ہیں، اُس نے مجھے بہت متأثر کیا ہے، اس پر میں آپ لوگوں کو مُبارک باد پیش کرتا ہوں، دارالعلوم کے طریقۂ تعلیم کو دیکھ کر مجھے ہندوستان کے اس قدیم طرزِ تعلیم کی یاد تازہ ہوجاتی ہے جس میں گرو اپنے شاگردوں کے کھانے پینے اور رہنے سہنے کے مصارف خود برداشت کرتے تھے، مگر جب سے ہندو سوسائٹی میں دنیوی ہوس جاگزیں ہوئی ہے وہ پُرانا طریقہ ختم ہوگیا ہے، مگر اب پھر اُس کی اہمیت کو محسوس کیا جانے لگا ہے، مجھے دارالعلوم کے حُسنِ انتظام کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی ہے میری خواہش ہے کہ آپ کا یہ دارالعلوم برابر ترقی کرتا رہے۔

آپ نے موجودہ طرزِ تعلیم پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ" آج کل جو طریقۂ تعلیم رائج ہے اس میں اُستاد اور شاگرد کے مابین روحانی تعلق نہیں رہا ہے، اس نے اُستادوں اور طلبار کو ایک دوسرے سے دور کردیا ہے، اور آئے دن طلبار کے ہنگامے پیش آتے رہتے ہیں، علم اور جہل دو متضاد صفت ہیں، علم انسان کو اونچا اٹھاتا ہے اور جہالت اسے پستی کی طرف لے جاتی ہے، آپ اپنے طلبار کو جہالت کی پستی سے اُٹھا کر انھیں علم کی

کی بلندی پر پہنچا رہے ہیں اور اس طرح انسانیت کی تکمیل کا اہم فریضہ انجام دے رہے ہیں، اُستاد کی مثال اس کمہار کی مانند ہے جو گیلی مٹی سے حسبِ منشاء برتن بناتا ہے، اسی طرح طلبہ کی زندگی اُستاد کی تعلیم کے سانچے میں ڈھلتی ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بھی خوشی ہوئی کہ آپ کی تعلیم میں دنیوی مال و دولت آپ کے پیشِ نظر نہیں ہے۔

گورنر صاحب نے طلبہ سے اپیل کرتے ہوئے کہا کہ آپ جو کچھ اپنے اُستادوں سے سیکھ رہے ہیں مجھے اُمید ہے کہ آپ اپنی زندگی میں اُس پر عمل کرنے کی کوشش کریں گے، میں آپ کی ترقی کے لئے دُعا کرتا ہوں اور دوسرے ممالک کے جو طلباء یہاں زیرِ تعلیم ہیں اُن کو تعلیمی سہولت پہنچانے کے لئے دارالعلوم سے خصوصی درخواست کرتا ہوں، یہ طلباء ہمارے ملک کے مہمان ہیں، یہ طلباء فراغت کے بعد جب یہاں سے اپنے اپنے وطن واپس جائیں گے تو یہ ہمارے ایلچی ثابت ہوں گے۔

گورنر صاحب نے ملک کی یک جہتی پر زور دیتے ہوئے کہا:۔

"دنیا کے اکثر ملکوں میں مختلف قومیں آباد ہیں جو مختلف زبانیں بولتی ہیں اُن کے مذہب بھی الگ الگ ہیں مگر اس کے باوجود سب آپس میں مل جل کر اور بھائی چارے کے ساتھ رہتے ہیں، اسی طرح اس ملک میں ہمیں رہنا چاہئے ہیں، مہتمم دارالعلوم یہاں کے اساتذہ، طلبہ اور کارکنوں کی خدمت میں اُن کے پُرخلوص اور پُرتپاک استقبال پر تہ دل سے شکر گذار ہوں نیز اپنے ملک کے اس عظیم ادارے کی ہر وہ خدمت جو یہ ادارہ پسند کرے، کرنے کے لئے میری حکومت ہمہ وقت تیار ہے۔

حضرت مہتمم صاحب نے اس موقع پر جو تقریر فرمائی اس میں دارالعلوم کے متوکلانہ

طریق کار پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، آپ نے بانئ دارالعلوم کے ہشتگانہ اصول کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:۔

دارالعلوم کی بنیاد ظاہری اسباب سے زیادہ مسبب الاسباب کی طرف رجوع کرنے پر رکھی گئی ہے، اسی لئے تکثیرِ چندہ کو بانی نے اصل قرار دیا ہے اور مستقل آمدنی کے وسائل جیسے کارخانہ تجارت یا بھاری گرانٹوں کے وعدے وغیرہ پر بھروسے سے روکا ہے تاکہ کارکنوں میں بے فکری نہ پیدا ہو اور وہ ان آمدنیوں پر بھروسہ کر کے بیٹھ نہ رہیں، کیوں کہ اس کا نتیجہ تعیش اور اس کا ثمرہ آپس کی پھوٹ ہے۔ حضرت بانی کا منشا یہ ہے کہ مالی سلسلوں میں ایک گونہ بے سروسامانی اور فکر قائم رہے، یہ فکر ہی اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کا ذریعہ بنتا ہے، جس سے توکل اور حقیقی زندگی کی شان پیدا ہوتی ہے، نیز اسی اصول میں حضرت بانی نے زیادہ تر غریبوں کے چندے کی طرف توجہ دلاکر درحقیقت رابطۂ عوام کی بنیاد ڈالی ہے تاکہ یہ ادارہ غریبوں کا رہے اور عوامی کہلائے، سرکاری یا جاگیردارانہ نہ ہو، اسی لئے یہاں کے فضلاء میں یہ اثرات الحمد للہ موجود ہیں، طلباء، اساتذہ اور منتظمین میں سادگی، کفایت شعاری اور تھوڑے پر قناعت کے جذبات پرورش پائے ہوئے ہیں، جس سے اُن میں ہوسناکی اور حرص و ہوا کے جذبات جمع نہیں ہونے پاتے، اس ادارے کی سب سے بڑی خصوصیت اور اساس و بنیاد علم و اخلاق ہے جس کی تکمیل کے لئے یہ ادارہ قائم ہوا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ کسی بھی قوم کی برتری یا ترقی کا راس المال درحقیقت نہ سرمایہ ہے نہ رسمی تنظیم بلکہ کردار و اخلاق اور علم صحیح ہے، اس لئے یہاں کے بزرگوں کی تمام تر توجہ طلباء کے علم و اخلاق کی درستگی، معاشرت کی سادگی، کردار کی بلندی اور آخرت کے یقین پر مبنی ہے۔"

دارالعلوم مرکزی حکومت کی نظر میں

مرکزی حکومت ہند کی جانب سے شائع کردہ ایک کتابچہ، جس کا عنوان ہے "ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی ادارے" اس میں دارالعلوم دیوبند کا تعارف ان الفاظ

میں کرایا گیا ہے:۔

"ہندوستان میں ایک ایسی یونیورسٹی بھی ہے جو اپنی خصوصیات کی وجہ سے بے مثال اور منفرد ہے۔ دہلی سے کوئی نوّے میل کے فاصلے پر دیوبند کے خوبصورت شہر میں اسلامی تعلیم کی یہ ممتاز درسگاہ واقع ہے، اس کی بنیاد گزشتہ صدی کے اواخر میں پڑی تھی، یہ ادارہ عباسیوں کے عہد کے بغداد کی پرانی یونیورسٹی کی یاد دلاتا ہے، کیونکہ یہ طرزِ تعلیم کے لحاظ سے لے کر معمولات تک میں اُسی کی طرح پر ہے۔

دارالعلوم دیوبند دنیا کے مشہور اسلامی اداروں میں سے ہے، تقریباً نوّے سال[1] پہلے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اسلامی تہذیب کے مطالعے کے لئے اس کی بنیاد ڈالی تھی، ابتداء میں یہ ادارہ ایک چھوٹے سے مکتب کی حیثیت سے شروع ہوا تھا، پھر آگے چل کر مولانا محمود الحسنؒ کی کوششوں سے بڑھا جو بعد میں شیخ الہند کے نام سے مشہور ہو کر بڑے مرتبے کو پہنچے وہ بڑے باہمت اور غیر ملکی حکومت کے کٹر دشمن تھے، اُنھوں نے انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت کی، جس کے سبب سے اُنھیں زندگی کا بقیہ حصہ جیل اور جلاوطنی میں گذارنا پڑا۔

اس دارالعلوم میں جن مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے، اُن میں تفسیر حدیث، اسلامی قانون، فلسفہ قانون، اصول فقہ، علم الکلام، فلسفہ، ادب

---

[1] دارالعلوم دیوبند محرم ۱۲۸۳ھ مطابق مئی ۱۸۶۶ء میں قائم ہوا، اس لئے قمری حساب سے سالِ رواں ۱۳۹۶ھ میں اس پر ۱۱۳ سال کی مدت گذر چکی ہے، شمسی حساب سے یہ مدت ۱۱۱ سال ہوتی ہے۔

علم نجوم، طب، ریاضی، تاریخ اور دوسرے متعدد مضامین شامل ہیں۔ مگر حدیث وتفسیر کی تعلیم کو یہاں خاص اہمیت حاصل ہے، اس کی بنا پر پورے مشرق میں یہ اپنی شہرت رکھتا ہے۔

یہاں طلبا سے فیس نہیں لی جاتی، بلکہ کتابیں رہائش اور خوراک کے اخراجات بھی دارالعلوم کے ذمے ہیں، یہ ایک بین الاقوامی ادارہ ہے، اور ہر سال مختلف ممالک کے طلبا، یہاں داخلہ لیتے ہیں۔

یہاں کی لائبریری میں تقریباً دس[1] ہزار عربی، فارسی اور اُردو کی کتابیں ہیں، جن میں نایاب قلمی نسخے اور تاریخی دستاویزیں شامل ہیں[2]۔

۸۷-۱۳۸۶ھ ایک افسوسناک واقعہ

اس سال دارالعلوم میں مجلسِ مشاورت کے ایک جلسے کے موقع پر ایک بہت ہی افسوسناک واقعہ پیش آیا، مجلسِ مشاورت کا یہ جلسہ شہر میں منعقد ہوا تھا، جلسے میں دارالعلوم کے طلبا بھی پہنچ گئے، دورانِ جلسہ میں طلبا اور اہلِ جلسہ کے مابین کشیدگی رونما ہو گئی جس نے بہت جلد ہنگامہ، مار پیٹ اور پتھراؤ کی صورت اختیار کر لی اور یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ جلسہ منتشر ہو گیا، جلسہ گاہ درہم برہم ہو گئی، طلبا نے جلسے سے واپس آکر دارالعلوم میں اُن لوگوں کے خلاف زبردست ہنگامہ کھڑا کر دیا جن کا جلسے سے تعلق تھا، یہ صورتِ حال اس لئے اور زیادہ سنگین بن گئی کہ مجلسِ مشاورت کے قائدین میں بعض حضرات دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ کے رکن بھی تھے، اہتمام نے حضرات اساتذہ کے تعاون سے بڑی مشکلات کے بعد شورش پر قابو حاصل کیا، ایسے سنگین حالات کے پیشِ نظر مجلسِ شوریٰ کا اجلاس طلب کیا گیا،

---

[1] دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں کتابوں کی مجموعی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے۔

[2] ماخوذ از اسلامک انسٹی ٹیوشن ان انڈیا۔ سید محبوب رضوی

مجلس نے صورتِ حال کا جائزہ لے کر فیصلہ کیا کہ دارالعلوم ایک تعلیمی اور تربیتی ادارہ ہے جس کا مقصد جماعتی کشمکش سے علیحدہ رہ کر اسلاف کے طرز پر طلبا کو تعلیم و تربیت دینا ہے، طلبائے دارالعلوم کا اوّلین اور اہم ترین فریضہ یہ ہے کہ وہ دارالعلوم کے مقصد کو ہمہ وقت پیشِ نظر رکھیں اور اپنی زندگی کو اسی مقصد کے تحت ڈھالیں اور کوئی ایسا قدم ہرگز نہ اٹھائیں جو دارالعلوم کے مقصد کے خلاف ہو۔

اس موقع پر کچھ لوگوں نے طلبار کی آڑ لے کر دارالعلوم کے نظم میں مداخلت کرنے کی کوشش کی بعض اخبارات بھی اُن کے ہم نوا ہو گئے، مگر عام طور پر پریس نے دارالعلوم کی حمایت کی اور جب دارالعلوم کی جانب سے ملک کے سامنے واضح طور پر صورتِ حال پیش کی گئی، تو فسادی عناصر کا سارا تانا بانا بادرِ ہوا ثابت ہوا۔

کتب خانہ کا جدید ہال

۱۳۸۶ھ میں دارالعلوم کی عمارتوں میں کتب خانہ کی توسیع کے لئے ایک جدید ہال اور دو کمروں کا اضافہ ہوا۔ یہ ہال عربی زبان کی کتابوں کے لئے مخصوص ہے، ہال سے ملحق ایک کمرے میں اکابر اور علمائے دارالعلوم کی تصانیف کو یکجا کر کے مصنف وار رکھا گیا ہے۔

علمائے دیوبند کی تصانیف

تصانیف کا سلسلہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے شروع کیا گیا ہے، جن مصنفین کی تصانیف اس کمرے میں جمع ہیں ان میں سے چند کے اسمار گرامی یہ ہیں:۔

شاہ ولی اللہ دہلوی، شاہ اہل اللہ، شاہ عبدالعزیز۔ شاہ رفیع الدین۔ شاہ عبدالقادر۔ شاہ محمد اسحاق۔ مولانا محمد اسماعیل شہید۔ مولانا احمد علی سہارنپوری۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی۔ مولانا رشید احمد گنگوہی۔ مولانا محمد یعقوب نانوتوی۔ مولانا ذوالفقار علی دیوبندی۔ مولانا خلیل احمد انبہٹوی۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی۔ مولانا احمد حسن امروہی۔ مولانا اشرف علی تھانوی۔ مولانا حافظ محمد احمد

مہتمم پنجم دارالعلوم ۔ مولانا محمد انور شاہ کشمیری ۔ مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی ۔ مولانا مفتی عزیز الرحمٰن ۔ مولانا رحیم اللہ بجنوری ۔ مولانا عبید اللہ سندھی ۔ مولانا منصور انصاری ۔ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی ۔ مولانا شبیر احمد عثمانی ۔ مولانا میاں اصغر حسین دیوبندی مولانا مفتی محمد سہول بہاری ۔ مولانا مرتضیٰ حسن ۔ مولانا سید حسین احمد مدنی ۔ مولانا مناظر احسن گیلانی ۔ مولانا عبد السمیع دیوبندی ۔ مولانا اعزاز علی امروہی ۔ مولانا فخر الدین احمد ۔ مولانا بدر عالم میرٹھی مولانا محمد ابراہیم بلیاوی ۔ مولانا حفظ الرحمٰن ۔ مولانا مفتی محمد شفیع ۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی مولانا سید محمد میاں دیوبندی ۔ مولانا محمد طاہر قاسمی رحمہم اللہ ۔

مولانا محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند ۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی ۔ مولانا منت اللہ رحمانی ۔ ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی ۔ مولانا محمد منظور نعمانی ۔ مولانا قاضی زین العابدین سجاد مولانا حامد الانصاری غازی ۔ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی ۔ مولانا انوار الحسن شیرکوٹی وغیرہم زیدت معالیہم فی الدارین ۔

مصر، شام اور اُردن کے لئے امداد

عالم اسلامی میں جب بھی کوئی المناک واقعہ پیش آیا اس پر دارالعلوم کی جانب سے ہمیشہ اظہارِ ہمدردی کیا گیا اس کی کچھ تفصیلات اوپر گذر چکی ہیں ۱۳۸۷ھ میں بیت المقدس پر اسرائیل کا قبضہ ملّتِ اسلامیہ کا ایک ایسا عظیم ترین حادثہ تھا جس سے پورا عالم اسلامی متاثر تھا، بالعموم دنیائے اسلام نے مظلوم عربوں کی امداد و اعانت میں حصہ لیا تھا، دارالعلوم نے بھی اپنی سابقہ روایت کے تحت اس موقع پر عربوں کی حمایت کے لئے اپنا دستِ تعاون بڑھایا، اس کے لئے ملک سے اپیل کی اور ایک خطیر رقم فراہم کر کے مصر، شام اور اُردن کی حکومتوں کو پیش کی گئی، دارالعلوم میں چندے کی فراہمی کے لئے ایک دفتر قائم کیا گیا جس میں دارالعلوم کے کارکنوں نے بڑے جوش و خروش سے بلا معاوضہ اپنی خدمات پیش کیں، اس دفتر کی ذمہ داری راقم سطور کے سپرد تھی ۔

مسجدِ اقصیٰ کی المناک آتش زنی پر دارالعلوم کے ایک منعقدہ جلسے کی طرف سے اس موقع پر حکومتِ اُردن کو جو قرار داد روانہ کی گئی تھی اُس میں اسرائیل کی مذمت کرتے ہوئے عربوں کو اپنے تعاون کا یقین دلایا گیا تھا، اس کے جواب میں حکومتِ اُردن کی جانب سے درج ذیل جواب موصول ہوا:۔

"ہمیں آپ کی قرارداد موصول ہوئی جو آپ کی پُرجوش جماعت دارالعلوم دیوبند نے عربوں کی حمایت اور بیت المقدس میں مسجدِ اقصیٰ کے سلسلے میں بھیجی ہے ہم آپ کی اس ہمدردانہ حمایت کے لئے صمیم قلب سے آپ کے شکر گذار ہیں۔

حضرت علامہ بلیاوی کی وفات

۱۳۸۷ھ کے رمضان المبارک میں حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم بلیاوی صدر المدرسین کی وفات دارالعلوم کے لئے ایک بڑا سانحہ تھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ذات سے دارالعلوم کی نصف صدی سے زیادہ کی تاریخ وابستہ تھی، حضرت علامہ اکابر کی یادگار، قدیم روایات کے حامل اور بزرگوں کی دینی روش کے امین تھے، وہ ایک جید عالم اور بے نظیر استاذ تھے، انھوں نے نصف صدی سے زیادہ دارالعلوم کی تدریسی خدمات انجام دیں اور ایک عرصے تک تدریس کے ساتھ صدارت اور نظامتِ تعلیمات کے فرائض بھی نہایت عمدگی سے انجام دیئے، تفسیر وحدیث کے علاوہ عقائد وکلام اور منطق وفلسفہ میں جو کمال اُنھیں حاصل تھا وہ علمی حلقوں میں آپ اپنی مثال تھا، اُن کی زندگی نہ صرف طلبار کے لئے بلکہ عموماً علمار کے لئے بھی روشنی کا ایک مینار تھی، اُن کے تلامذہ جن کی تعداد کا احصار کرنا مشکل ہے ہند و بیرونِ ہند میں بڑی تعداد میں ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں، اُن کا درس طلبار کے لئے بڑا گراں قدر سرمایہ ہوتا تھا۔ طویل مدت کی علالت کے بعد اُنھوں نے رمضان کے مُبارک مہینے میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا، قبرستان قاسمی اُن کی ابدی آرام گاہ ہے۔

۸۹-۱۳۸۸ھ دارالعلوم کا عام الحزن

حضرت علامہ کی وفات نے دارالعلوم میں

وفیات کا گویا دروازہ کھول دیا، ابھی اُن کا غم غلط نہیں ہوا تھا کہ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۸ھ میں دارالعلوم کے ایک قدیم استاد مولانا محمد جلیل صاحب نے انتقال فرمایا۔ ابھی اُن کا غم ہلکا نہیں ہوا تھا کہ ایک ہی ماہ کے بعد دارالعلوم کے نائب مہتمم اور بزرگوں کی روایات اور عادات واطوار کے حامل مولانا سید محمد مُبارک علی صاحب بھی ۴ر جمادی الثانی ۱۳۸۸ھ کی شب میں اللہ کو پیارے ہو گئے، یہ دونوں بزرگ حضرت شیخ الہندؒ کے مخصوص تلامذہ اور خدام میں سے تھے، کم وبیش چالیس سال سے زیادہ دارالعلوم کی خدمات انجام دیں، اور تادمِ واپسیں اُسی پرانی روش پر قائم رہے۔

اُن دونوں بزرگوں کا غم ابھی تازہ ہی تھا کہ مولانا حمیدالدین صاحب رُکن مجلس شوریٰ ۲۴ر شعبان ۱۳۸۸ھ کو مجلس شوریٰ میں شرکت کے لئے دہلی سے تشریف لاتے ہوئے مظفر نگر کے قریب کار کے حادثے میں جاں بحق ہو گئے، مولانا فہم وفراست اور دارالعلوم کی روایات اور اقتدار کے تحفظ میں ایک خاص مقام رکھتے تھے، دارالعلوم اور اس کے کاموں کے ساتھ بڑا شغف تھا

یہی صدمات کیا کم تھے کہ ۴ر شوال ۱۳۸۸ھ کو مولانا محمود احمد صاحب نانوتوی مفتیٔ اُجّین بھی واصلِ بحق ہو گئے۔ مولانا اپنی سادگی، صاف دلی اور ٹھوس علمی استعداد کے لحاظ سے بڑی عظمتوں کے حامل تھے، مدھیہ پردیش میں اُن کا وجود علم وہدایت کا ایک مرکز تھا، دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے اور بزرگانِ دارالعلوم کے آثار کے امین تھے۔

اس صدمۂ جانکاہ کو ایک عشرہ بھی نہیں گذرا تھا کہ ۱۴ر شوال ۱۳۸۸ھ کو دارالعلوم کے صدر القراء مولانا قاری حفظ الرحمٰن صاحب بھی ایک طویل علالت کے بعد انتقال فرما گئے، مرحوم نے بھی کم وبیش دارالعلوم میں ۴۰ سال فنِ قرأت کی خدمات انجام دیں اور ہزاروں شاگرد اور مجوّد تیار کئے جو ہند وپاک میں پھیلے ہوئے ہیں اور مسندِ علم تجوید وقرأت کی رونق بنے ہوئے ہیں۔

۱۳۸۹ھ کی اسٹرائک

ربیع الثانی ۱۳۸۹ھ میں طلبار نے جو اسٹرائک کی وہ دارالعلوم میں اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا، اگرچہ اس میں دارالعلوم کے سب طلبار شامل نہ تھے، مگر اسٹرائکی طلبار نے اس موقع پر جو مذموم طریقے اختیار کئے اس کے سبب سے طلبار کی وہ جماعت جو شریک اسٹرائک نہ تھی (حالاں کہ وہ تعداد کے لحاظ سے اسٹرائکی طلبہ سے بہت زیادہ تھی) بالکل بے بس اور مجبور ہوگئی اس لئے اسٹرائکی طلبار جو چاہتے وہ کر گذرتے، نو عمری کا جوش اور عقل و شعور کی ناپختگی اور اس کے ساتھ خارجی دواعی کے تحت ایسے مواقع پر آدمی جو کچھ بھی کر گزرے وہ کم ہے، اسٹرائک کے وقت حالات جس رُخ پر جارہے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ تعلیمی مقاطعہ صرف مطالبات کے لئے نہیں بلکہ یہ دارالعلوم کے لئے تخریب کاری کی کوئی منظم مہم اور سازش ہے جو دارالعلوم کو تباہ اور برباد کرنے پر آمادہ ہے اور جس کی قیادت بیرونی عناصر کے ہاتھوں میں ہے اور وہ طلبار کو آلہ کار کے طور پر استعمال کر رہی ہے اس مرتبہ اسٹرائکی طلبا نے صرف تعلیمی مقاطعے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ پہلے درس گاہوں کی کنجیوں پر قبضہ کیا اور پھر دارالعلوم کے تمام دروازوں کو اندر سے بند کر کے ان میں قفل لگا دیئے، اور اس طرح سے دارالعلوم پر مکمل طریقے سے اسٹرائکی طلبار کا قبضہ ہوگیا، تمام درس گاہیں، دارالعلوم کے جملہ دفاتر، کتب خانہ، حتیٰ کہ دارالاہتمام اور خزانہ سب طلبار کی گرفت میں آگئے۔

تخریب کاری کی یہ سازش اتنی مضبوط اور منظم تھی کہ جس کو دیکھتے ہوئے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ دارالعلوم کی بقار خطرہ میں پڑگئی ہے مگر اللہ تعالےٰ کے بے پایاں فضل و کرم نے ارباب انتظام کی دست گیری فرمائی، اہتمام اور مجلس شوریٰ کے کمال تدبر اور دوراندیشی نے چند ہی دنوں میں نہایت خوش اسلوبی سے تخریب کاری کی اس مہم پر قابو پالیا، شورش پسند طلبار کا اخراج کر دیا گیا، حالات کو رُو براہ لانے کے لئے کچھ دنوں کے واسطے دارالعلوم کو بند کر دیا گیا، اور طلبار کو اُن کے وطن بھیج دیا گیا۔

یہ ایسی زبردست سازش تھی کہ اگر خدانخواستہ کامیاب ہوجاتی تو دارالعلوم کا سفینہ اس گردابِ بلا میں پھنس کر غرق ہونے کے کنارے آلگا تھا، مگر اللہ تعالے کو ابھی دارالعلوم سے کام لینا ہے، رسیدہ بود بلائے و لے بخیر گذشت!

مغربی ممالک کے ریسرچ اسکالر

دارالعلوم کا کتب خانہ جو ایک عظیم الشان علمی ذخیرہ ہے اور اپنے نوادرات و مخطوطات اور بہترین ذخیرۂ کتب کے لحاظ سے اہلِ علم کے لئے ایک سرمایۂ خاص اور ہمیشہ باعثِ کشش رہا ہے، چند سالوں سے اس کی افادیت کا دائرہ روز بروز بڑھتا جاتا ہے، اس دور کے ریسرچ اسکالر اور تحقیقی کام کرنے والے کتب خانۂ دارالعلوم کی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں، متعدد محققین نے یہاں آکر کتب خانے کے علمی ذخائر سے فائدہ اٹھایا اور بعض لوگوں نے خط و کتابت کے ذریعے سے استفادہ کیا، ہندوستان کے مختلف حصوں سے آنے والوں کے علاوہ یورپ اور امریکہ کے ریسرچ اسکالر بھی اپنے تحقیقی کام کی تکمیل کے لئے کتب خانہ دارالعلوم سے استفادہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں، چنانچہ لندن یونیورسٹی سے پروفیسر ہارڈی امریکہ سے مسز گیلی گراہم، جرمنی سے مس کیریا ڈیٹ میرا اور کیلی فورنیا سے مسز مشکاف اپنے تحقیقی مقالے کی تیاری کے سلسلے میں دیوبند آئیں اور کتب خانہ دارالعلوم سے استفادہ کیا، جرمن طالبہ کی تحقیق کا موضوع تھا "ہندوستان کی سیاست میں مسلمانوں کا حصّہ" جرمن طالبہ نے بتایا کہ "مجھے دارالعلوم میں توقع سے زیادہ مواد ملا، مجھے امید نہیں تھی کہ میرے تحقیقی مقالے کے متعلق یہاں کی لائبریری میں اتنا زیادہ مواد مل سکے گا"[1] امریکن خاتون مسز گیلی گراہم کا موضوع مسئلۂ خلافت تھا، انھوں نے حضرت مہتمم صاحب سے اس مسئلے میں استفادہ کرنا چاہا تو آپ نے فرمایا کہ اس سلسلے میں اوّلاً کچھ سوالات مرتب کرلیں انہی کے ذریعے سے

---

[1] رسالہ دارالعلوم بابت ماہ فروری ۱۹۷۰ء ص ۴۶، روداد عمل ۱۳۸۹ھ ص ۵

معلومات کا راستہ کھُل سکے گا، اس پر انھوں نے ۳۱ سوالات کی ایک فہرست دی حضرت مہتمم صاحب نے اپنے دولت خانہ پر چند حضرات اساتذہ کو دعوت دے کر بلالیا تھا تاکہ مسز گراہم کو تحقیقی جوابات دیئے جاسکیں اس اجتماع کے بعد حضرت مہتمم صاحب نے سوالات کی فہرست ہاتھ میں لے کر مسز گیلی گراہم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ کے سوالات کے نمبر وار جوابات تو بعد میں یہ حضرات دیں گے میں اجمالاً اس مسئلہ کی بنیاد اور اس کی تفریعات کے بارے میں ابتداءً کچھ عرض کئے دیتا ہوں یہ کہکر آپ نے ایک مفصل تقریر فرمائی جس میں خلافت کی حقیقت اس کے تاریخی دور اور اُس کے تغیرات اور آثار مابعد پر تفصیلی روشنی ڈالی یہ تقریر تقریباً پون گھنٹہ جاری رہی جو اُن سوالات سے متعلق جامع معلومات پر مشتمل تھی اور فرمایا کہ اب یہ اساتذہ موجود ہیں آپ ایک ایک سوال کرتی رہیں اور یہ جوابات دیتے رہیں گے مسز گراہم جو تقریر پر نوٹ کرتی رہی تھیں انھوں نے کہا کہ مجھے میرے سارے سوالات کے تشفی بخش جوابات مل گئے اور اب کسی سوال کی مجھے ضرورت باقی نہیں رہی۔

عرب ممالک کے زائرین کے تأثرات

رجب ۱۳۸۹ھ میں عرب ملکوں میں سے مراکش، الجزائر اور شرقِ اُردن کے چند حضرات دارالعلوم میں تشریف لائے، دارالعلوم کو دیکھ کر یہ لوگ بہت متأثر ہوئے اور اپنے مشاہدات کا ان الفاظ میں اظہار فرمایا:۔

"خداوندِ قدوس کا احسان ہے کہ اُس نے ہمیں ہندوستان آنے کا موقع عطا فرمایا ہم ہندوستان کا سفر کرتے ہوئے اُس جوش وخروش اور دینی جذبات کو محسوس کر رہے تھے جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے قلوب میں موجزن تھے، ہم جب اپنی اُن مشکلات اور تکالیفِ راہ کا جو ہمیں ایسے اسفار میں پیش آتی ہیں صحابہ کرام کی مجاہدانہ زندگانی سے موازنہ کرتے ہیں تو ہماری یہ ساری جدوجہد ایک حقیر شے نظر آتی ہے، ہم نے ہندوستان کے مختلف علاقوں کو گھوم پھر کر دیکھا، یہاں مُسلمان باشندے بفضلِ اللہ سنّتِ نبویؐ کو

اپنی زندگی میں خاص مقام دیتے ہیں، اُن کی مستورات پردے کی پابند اور مذہبی اجتماعات اور مواعظ ونصائح سُننے کی شوقین ہیں، یہاں کے دینی ادارے بھی خصوصیات کے حامل ہیں جو اپنی خاص وضع پر چل رہے ہیں، ہمیں یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ ہندوستان کے رسم ورواج پر اسلامی تعلیمات کے اثرات دُور رَس ہیں، اور ہندوستان جیسے ملک میں جہاں اطرافِ عالم سے لوگ آتے رہتے ہیں اسلامی تعلیمات مرکزِ توجہات ہیں۔

ہم دارالعلوم کے اربابِ انتظام کے تہِ دل سے شکر گذار ہیں کہ انھوں نے ہمیں دارالعلوم سے واقف کرایا اور ہماری گذارشات کو غور وشوق سے سُنا، مزید یہ کرم فرمایا کہ ہم کتاب معائنہ میں اپنی رائے کا اظہار بھی کریں۔ فجزاہم اللہ خیرا۔

ہم خداوند کریم سے دُعا کرتے ہیں کہ وہ اس دارالعلوم کو مزید ترقی وکامرانی عطا فرمائے، اور اس کے رجال کار، مدرسین اور طلبار کو اُن کے مقاصدِ حسنہ میں فائز المرام بنائے۔

مسجد چھتہ

آپ کو یاد ہوگا کہ ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم کا آغاز چھتے کی ایک قدیم مسجد سے ہوا تھا اس مسجد کے شمال اور جنوب میں متعدد حجرے تھے، جنوبی حجروں میں حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ کا قیام رہتا تھا اور شمالی حجرہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی قیام گاہ تھا، شمالی حجرہ بہت بوسیدہ ہوچکا تھا، ۱۳۸۹ھ میں اسے از سرِ نو تعمیر کرایا گیا، اور ایک وسیع کمرہ میں اس تاریخی جگہ کو محفوظ کر دیا گیا، کمرے کے سامنے ایک وسیع برآمدہ بنا دیا گیا ہے، اس عمارت کی تعمیر کی سعادت خورجہ (بلند شہر) کے ایک ریٹائرڈ فوجی افسر اور ہمارے محترم جناب میجر احمد سعید خاں صاحب کے حصے میں آئی اللہ تعالیٰ میجر صاحب موصوف کو جزائے خیر عطا فرمائے، اُن کی توجہ سے یہ تاریخی مقام ایک بڑی مدت کے لئے محفوظ ہوگیا ہے۔

۱۳۹۰ھ، نصاب تعلیم میں تبدیلی

دار العلوم میں نصابِ تعلیم میں نظرِ ثانی کی ضرورت عرصے سے محسوس کی جا رہی تھی اور یہ مسئلہ مجلسِ شوریٰ کے زیرِ غور تھا، جس کے نتیجے میں حسبِ ذیل تبدیلیاں نصاب میں کی گئیں :-

(۱) نصابِ تعلیم میں درجہ بندی کو لازم قرار دیا گیا۔ اس سے قبل جماعت بندی کے بجائے کتاب وار طریقِ تعلیم جاری تھا۔

(۲) نصابِ تعلیم میں کچھ کتابوں کا اضافہ کیا گیا۔

(۳) درجاتِ تکمیل کے سلسلے میں تکمیلِ تفسیر، تکمیلِ دینیات، تکمیلِ معقولات اور تکمیلِ ادب کا اجراء کیا گیا۔ نصابِ تعلیم کی تفصیلات "نصابِ تعلیم" کے عنوان میں پیش ہوں گی۔

دار العلوم کا بیرونی ملکوں سے رابطہ

موجودہ دور میں آمد و رفت میں سہولت کے ذرائع نے صدیوں پہلے کے طویل ترین فاصلے ختم کر دیئے ہیں۔ ان حالات میں ایک ملک دوسرے ملکوں سے بے گانہ نہیں رہ سکتا۔ عربی مجلہ "دعوۃ الحق" اسی رابطے کے قیام کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ مجلہ جن ممالک میں پہنچ کر دار العلوم کی علمی اور دینی خدمات کے تعارف کا ذریعہ ہے اُن کی تفصیل یہ ہے۔

سعودی عرب۔ جمہوریۂ مصر۔ کویت۔ شام۔ لبنان۔ لیبیا۔ عراق۔ شرقِ اردن سوڈان۔ مراکش۔ تیونس۔ یمن۔ الخلیج العربی۔ نائیجیریا۔ الجزائر۔ ایران انڈونیشیا۔ ترکی۔ تاشقند۔ حبش۔ امریکہ۔ جرمنی۔ ڈنمارک۔ سیلون۔

اس وقت دعوۃ الحق کے بجائے پندرہ روزہ الداعی شائع ہو رہا ہے۔

۱۳۹۱ھ، جدید تعمیرات

اس سال میں دار العلوم کی عمارتوں میں جو اضافہ ہوا۔ اس کی تفصیل یہ ہے: دار الشفاء جامعہ طبیہ کی نامکمل عمارت مکمل ہو گئی، یہ عمارت دار العلوم کے احاطے سے باہر جانبِ شمال مغرب تعمیر کی گئی ہے، دار الشفاء

کی یہ عمارت دو بڑے ہال، چار کمروں اور برآمدوں پر مشتمل ہے۔ ایک وارڈ مین جانب وقف کرنال اور ایک وارڈ جناب حافظ ارشاد الٰہی صاحب آگرہ اور چند دوسرے معطیان کی طرف سے تیار ہوا ہے۔ دارالشفاء کے شمال میں افریقی طلباء کے دارالاقامہ کا بڑا حصہ افریقی بلڈنگ کے نام سے تیار ہوا جس میں ۱۱ وسیع کمرے ہیں، دارالاقامہ جدید کے کچھ کمروں میں تعمیری تغیر کر کے ان کو غلے کا گودام بنا دیا گیا، یہ گودام غلے کی حفاظت کے لئے تحفظ کے جدید ترین طریقے کے مطابق بنایا گیا ہے۔ اس میں دارالعلوم کی سال بھر کی ضرورت کا چھ ہزار من غلہ اسٹاک کیا جاتا ہے۔

دارالعلوم کی خدمات سے ہندوستان کی تاریخ روشن ہے

اس سال کے حالات میں نامناسب نہ ہوگا اگر آل انڈیا زرعی کمیشن کے ایک ممبر چودھری کارندھیر سنگھ کے ان تاثرات کا اظہار بھی کر دیا جائے جو موصوف نے دارالعلوم کو دیکھ کر جلسۂ عام میں کئے، چودھری صاحب نے فرمایا :۔

"یہ ادارہ ایک ایسا کارخانہ ہے جس کی زیارت اور جس میں حاضری بہت بڑی سعادت ہے، ایک دیرینہ تمنا کی تکمیل پر آج مجھے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے، میں آپ کی برادری اور خاندان کے ایک فرد کی طرح یہاں آیا ہوں اور آپ سے بہت ہی پُرخلوص اور صاف لفظوں میں یہ گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ آپ بحیثیت مسلمان اس ملک کے ایک اہم فرقے کے افراد ہیں، آپ کو فرقہ پرستوں کی تنگ نظریوں سے پریشان یا متاثر ہونے کی ضرورت نہیں ہے، مسلمانوں کا اس ملک پر بڑا احسان ہے، تہذیب و تمدن اور اخلاق و کردار بنانے اور سنوارنے میں مسلمانوں نے قابلِ فخر خدمات انجام دی ہیں اور ہم اس بات پر فخر محسوس کرتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام کے نام پر اور اسلام کی سچی روشنی پھیلانے والے لوگ اور ادارے موجود ہیں۔"

چودھری صاحب نے پُرزور انداز میں کہا کہ "یہ ملک آپ کا ہے، مسلمان اس ملک کے معزز شہری ہیں، ان کی خدمات سے اس دیش کی تاریخ روشن ہے، اس قسم کے روحانی اور اخلاقی ادارے ہندوستان کا سراونچا کرنے میں بہت اونچا مقام رکھتے ہیں"۔[1]

حضرت مہتمم صاحب کا سفر یورپ

اس سال کے اہم واقعات میں حضرت مہتمم صاحب کا سفر یورپ بھی لائق ذکر ہے

حضرت ممدوح نے انگلستان، فرانس اور مغربی جرمنی کا سفر فرمایا یہ سفر ۱۴ جمادی الآخر ۱۳۹۱ھ / ۱۹۷۱ء سے شروع ہو کر ۱۵ شعبان ۱۳۹۱ھ کو ختم ہوا۔ انگلستان کے تمام بڑے بڑے شہروں گلوسٹر بریڈفورڈ باٹلے، بلیک برن، برسٹن، بولٹن، شیفلڈ، کوئنٹری، برمنگھم، راچڈیل، والسول وغیرہ میں جانا ہوا، خاص لندن میں متعدد اجتماعات میں تقریریں ہوئیں، ایک تقریر بریڈفورڈ یونیورسٹی میں ہوئی یونیورسٹی کے طلباء کی خواہش تھی کہ یہاں ایک ایسی تقریر کی ضرورت ہے جو یورپ کے ملحدانہ خیالات اور غیر خدائی نظام پر اثر انداز ہو سکے، حضرت ممدوح کی تقریر میں وجودِ صانع، توحیدِ الٰہی، ضرورت رسالت، شریعتِ اسلام کے بنیادی مقاصد، مبداء و معاد وغیرہ مضامین پر مشتمل تھیں، تقریر کے بعد طلباء نے بتایا کہ "دورانِ تقریر میں ہمارے اُن تمام شبہات کا ازالہ ہوتا رہا جو یہاں کے مغربی ماحول نے ہمارے ذہنوں میں پیدا کر دیئے تھے۔ ہمیں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ٹھنڈے پانی سے ہمارے دلوں کو دھویا جا رہا ہے"۔

۲۲ ستمبر ۱۹۷۱ء تک انگلستان میں قیام رہا، وہاں سے واپسی میں پیرس جانا ہوا، پیرس میں عرب بڑی تعداد میں آباد ہیں، ہوائی اڈے پر عربوں نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ استقبال کیا، وہاں کے دو جلسوں میں عربی میں تقریریں ہوئیں، جن کا عربوں پر اچھا اثر پڑا، پیرس سے مغربی جرمنی کا سفر ہوا، اور وہاں سے مکہ مکرمہ میں حاضری ہوئی، عمرہ اور روضۂ اقدس

---

[1] روداد عمل ۱۳۹۱ھ ص ۴۵

حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہو کر کویت میں مختصر قیام کے بعد ہندوستان واپسی ہوئی۔

مغربی ممالک کے اس دورے کے بعد حضرت مہتمم صاحب نے یہ تاثر ظاہر فرمایا کہ یورپ کے لوگ اس وقت سکونِ قلب کے طلب گار ہیں، سائنس نے وہاں کے رہنے والوں کو روحانیت سے بالکل محروم کر دیا ہے، وہ لوگ تشنہ لب ہیں، وہاں ایسے علماء و مبلغین کی سخت ضرورت ہے جو انگریزی زبان پر پوری قدرت رکھنے کے ساتھ اسلامی علوم کے بنیادی اصول وہاں کے لوگوں کو بصیرت اور تفقہ کے ساتھ سمجھا سکیں، اور استغنار کے ساتھ اُن میں کچھ عرصہ گذاریں، یورپ کے حالات پر حضرت مہتمم صاحب کا ایک مفصل مکتوب متعدد اخبارات میں شائع ہو چکا ہے اور بہت دلچسپی کے ساتھ پڑھا گیا ہے، جس میں اعتدال کے ساتھ وہاں کے محاسن اور معائب کے دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۳۹۲ھ، مسلم پرسنل لا کے تحفظ کی جدّ و جہد

دار العلوم دیوبند کی سابقہ تاریخ سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ اس کا دائرۂ عمل محض تعلیمی میدان ہی تک محدود نہیں رہا ہے، چونکہ اسلام دینی و دنیوی زندگی کے لئے ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، اس لئے اُس نے نہ صرف آخرت کیلئے بلکہ دنیوی زندگی کے لئے بھی ایک مستقل نظامِ عمل دیا ہے، اسلام اپنے احکام کی معقولیت و منقولیت روحانیت و مادّیت، انفرادیت و اجتماعیت، عبادت و معاشرت اور رابطۂ انسانی اور علائق ربّانی کا وہ حسین امتزاج ہے جو انسانی عقل کی صحت مند روایات کے ساتھ ساتھ قلوب کو حجت و براہان سے مطمئن کر کے دعوتِ قبول دیتا ہے، اس لئے مسلمانوں کا تعلق اسلام سے فطری طور پر قوی رہا ہے، چناں چہ جب بھی اسلام یا مسلمانوں پر حملہ ہوا یا مسلمانوں کو کوئی دینی یا سیاسی ضرورت پیش آئی تو دار العلوم دیوبند کے اکابر نے حتی الامکان اس کے پورا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، چناں چہ اکابرِ دار العلوم کو جوں ہی یہ معلوم ہوا کہ حکومتِ ہند مسلم پرسنل لا میں تبدیلی

کرنا چاہتی ہے تو اکابرِ دارالعلوم نے اس پر اپنی پوری توجہ مرکوز کر دی، اس سے قبل ۱۳۳۶ھ/۱۹۱۷ء میں وزیرِ ہند کی ہندوستان میں آمد کے سلسلے میں ملک کے انتظام میں کچھ تغیرات متوقع تھے اس وقت بھی علمائے دیوبند نے اپنے اسلاف کے نقشِ قدم کو سامنے رکھ کر خود اس مسئلے پر میمورنڈم تیار کیا جو دس دفعات پر مشتمل تھا، نومبر ۱۹۱۷ء میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کی سربراہی میں ایک مؤقر وفد دہلی پہنچ کر وزیرِ ہند سے ملا، اور میمورنڈم پیش کیا جس میں صفائی سے ظاہر کر دیا گیا تھا کہ مسلمانوں کے عائلی مسائل میں گورنمنٹ کوئی ایسا ایکٹ وضع نہ کرے جو شرعی قوانین سے متصادم ہو، ایسا قانون ہمارے لئے ہرگز قابلِ قبول نہ ہوگا۔

اس میمورنڈم میں دو بنیادی مطالبے تھے ایک یہ کہ ہندوستان میں مسلم پرسنل لا کے اجراء کے لئے محکمۂ قضاء قائم کیا جائے، چونکہ شرعی اصول پر بہت سے مسائل کی تنفیذ کیلئے مسلم حاکم شرط ہے، اس لئے قاضیوں کا انتخاب و تقرر اہلِ سنّت والجماعت سے ہو، اس کونسل میں ہر فرقے کے علماء نمائندے اور ممبر ہوں، اور مسائل کا فیصلہ ہر فرقے کے اپنے فقہی اصول پر ہو، دوسرا یہ تھا کہ مسلمانوں کے مذہبی شعائر مساجد، مدارس، مقابر، اوقاف خانقاہوں اور دوسرے دینی رفاہِ عام کے تحفظ و نگرانی اور نظم و نسق کے لئے شیخ الاسلام کا عہدہ قائم کیا جائے جو ان تمام شعائر کو تنظیم کے ساتھ چلانے کا ذمّہ دار ہو۔

ان مطالبات پر اس دور کے تقریباً پانچسو علماء کے توثیقی دستخط حاصل کئے گئے جو اب تک دارالعلوم کے محافظ خانہ میں محفوظ ہیں۔

اس کے بعد ۱۳۴۸ھ/۱۹۲۹ء میں ہندوستان میں مسلم اوقاف کی تنظیم کا مسئلہ اُٹھا، جو مسلم پرسنل لا ہی کا ایک اہم جزو تھا۔ گورنمنٹ نے ایک کمیٹی مقرر کی جس نے استفساری سوالات ملک کے مختلف حلقوں میں بھیجے، اس پر وقف کے مسائل کی تفصیلات مرتب کرائی گئیں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی قیادت میں وقف بل کے مسودے پر شریعتِ اسلامی کے نقطۂ نظر

سے تنقید کرتے ہوئے پیش کردہ اشکالات کا تحریری حل پیش کیا گیا۔ اور ساتھ ہی ایک تحریر بنام "الانصاف فی قانون الاوقاف" مرتب کی گئی جس پر تمام اکابر علماء کے دستخط ثبت ہوئے، اس سلسلے میں وقت کے مناسب تمام مساعی عمل میں لائی گئیں۔

پھر برطانوی حکومت ہی کے زمانے میں سارداایکٹ کا مسئلہ اٹھا۔ جو پرسنل لاء کا ایک مستقل جزو تھا۔ علمائے دیوبند نے اس پر مضامین لکھے۔ اور حضرت مولانا تھانوی قدس سرہٗ نے ایک مستقل رسالہ ساردا بل کے بنیادی محرکات اور نکاح کی عمر کے متعلق شرعی قانون میں ترمیم کئے جانے کی تردید کے ساتھ لکھا، جس میں پیش آمدہ اشکالات کا حل بھی پیش کیا گیا تھا۔

انقلاب ۱۹۴۷ء / ۱۳۶۶ھ سے کچھ قبل علماء دیوبند کی طرف سے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب الحیلۃ الناجزہ شائع کرائی جس میں ظالم خاوندوں سے بے کس اور بے بس عورتوں کی گلوخلاصی کی شرعی صورتیں پیش کی گئیں، اس سلسلے میں دارالعلوم دیوبند میں علماء کی ایک کمیٹی قائم کی گئی، جس نے ان ہی شرعی اصولوں کی روشنی میں فیصلے کرکے سیکڑوں عورتوں کو رہائی دلائی اور ان کی مشکلات کا قرار واقعی حل نکالا۔

۱۹۴۷ء / ۱۳۶۶ھ کے انقلاب اور تقسیم ملک کے بعد گورنمنٹ کی طرف سے تنسیخ زمینداری کا مسئلہ اٹھا جس کا اثر اوقاف کی زمینوں پر بھی پڑتا تھا، جو پرسنل لاء کا بنیادی جزو تھا، اس بارے میں ایک وفد مولانا آزاد سے ملا جس کی قیادت حضرت مولانا محمد طیب صاحب نے فرمائی پھر دوبارہ یہی وفد لکھنؤ جاکر پنڈت پنتھ وزیر اعلیٰ یوپی سے ملا، اور بموجودگی دیگر وزراء یوپی کونسل کے چیرمین اوقاف سے اس مسئلے میں بحث و تمحیص کی۔

غرض کہ دارالعلوم نے نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے میں الحمد للہ کبھی کوتاہی نہیں کی، عائلی قوانین کے مشترک منصوبے کو خلاف شرع ہونے کی وجہ سے بڑی قوت سے چیلنج کیا گیا، مضامین اور مقالات شائع کئے گئے۔ دارالعلوم دیوبند کے ایک ممتاز عالم مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ سابق مفتی دارالعلوم دیوبند نے ایک مبسوط رسالہ بنام "ہمارے عائلی مسائل"

شائع کیا جس میں معقول انداز سے ان کا شرعی حل پیش کیا گیا۔

۱۳۹۲ھ / ۱۹۷۲ء میں پرسنل لا میں تغیر تبدل کا مسئلہ بڑے زور شور سے اُٹھا اور اسلام کے فقہی اور شرعی مسائل کو زمانۂ حال کی ضرورت کے لئے ناکافی ظاہر کیا گیا تو اس کا علمی جائزہ لینے اور اس کے بارے میں پیش کردہ شبہات کی جواب دہی کے لئے حضرات اساتذہ وارباب افتار دارالعلوم دیوبند کی ایک مسلم پرسنل لا کمیٹی بنائی گئی تاکہ وہ ان مسائل کے سلسلے میں مدلل دفاع کا فریضہ انجام دے چناں چہ کمیٹی نے خاطرخواہ طریق پر اپنا کام انجام دیا اس سلسلے میں اولاً حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم نے ممتاز فضلار دیوبند کا ایک اجتماع ۱۴ر مارچ ۱۹۷۲ء کو دارالعلوم میں طلب کیا جس میں ملک کے دوسرے دانشوروں کو بھی دعوت دی گئی، وجہ یہ تھی کہ اس مسئلے کے بارے میں ہر چند حضرات علمائے کرام نے بلاشبہ کافی توجہ فرمائی، مضامین مقالات اور رسائل شائع کئے، لیکن یہ ساری جدوجہد انفرادی اور شخصی طور پر ہوئی، ضرورت تھی کہ اجتماعی طور پر اس مسئلے کا شرعی موقف سامنے آئے اسی پر گورنمنٹ بھی توجہ دے سکتی تھی، اس نقطۂ نظر سے حضرت مہتمم صاحب نے اولاً علمائے دیوبند کے منتخب حضرات اور ملک کے دوسرے مشاہیر اہلِ دانش کو دارالعلوم میں جمع ہونے کی دعوت دی چناں چہ متعدد مقامی اور غیر مقامی مفکرینِ ملت شریک ہوئے، تاکہ پرسنل لا کے بارے میں شرعی موقف متعین کر لیا جائے، اس اجتماع میں بحث وتمحیص کے بعد ایک مشترک بیان اور سوال نامہ مرتب کیا گیا۔ ساتھ ہی اس اجتماع نے ایک آل انڈیا مُسلم پرسنل لا کنونشن کی تجویز منظور کی، اور اس کی تیاری کے لئے اجتماع نے ایک تیاری کمیٹی بنائی جس میں مقامی کمیٹی کے متعدد ممبر اراکینِ شوریٰ، ماہرینِ قانون اور دانشوروں کو بحیثیت رکن تیاری کمیٹی شامل کیا گیا، اس کمیٹی کے کئی اجلاس دارالعلوم میں ہوئے، تیاری کمیٹی کا ایک اجتماع اوائل مئی میں ہوا، جس میں متعلقہ سوال نامہ زیرِ بحث آیا، جسے طبع کرا کر ملک کے تمام مکاتب فکر کے علمار، مفتیانِ کرام، مفکرین اور دانشوروں کے پاس بھیجا گیا اور اُن سے درخواست کی گئی کہ جولائی تک جوابات روانہ کر دیئے جائیں، ان جوابات پر غور کرنے کے لئے مقامی تیاری کمیٹی کا اجلاس دارالعلوم میں ۳ جمادی الآخر

۱۳۹۲ھ (۲۳ جولائی ۱۹۷۲ء) کو منعقد ہوا اور اس میں طے کیا گیا کہ ان جوابات پر مزید غور و فکر کرنے اور مجوزہ اجتماع عام کی تاریخیں مقرر کرنے کے لئے تیاری کمیٹی کا اجلاس ۵، ۶ رجب ۱۳۹۲ھ (۱۵، ۱۶ اگست ۱۹۷۲ء) کو دارالعلوم دیوبند میں بلایا جائے، چنانچہ مقررہ تاریخوں میں یہ اجلاس منعقد ہوا، اس موقع پر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی، حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی حضرت مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی، حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی، جناب ڈاکٹر مصطفیٰ حسن صاحب لکھنوی، جناب مولانا عبدالقادر صاحب مالیگاؤں، جناب مولانا مجاہد الاسلام صاحب امارت شرعیہ بہار، جناب مولانا برہان الدین صاحب استاذ ندوۃ العلماء لکھنؤ اور اراکین مسلم پرسنل لا کمیٹی دارالعلوم دیوبند نے شرکت کر کے بحث میں حصہ لیا۔

اس جلسے میں شریک علماء و اکابر نے مطبوعہ سوالنامے کے جوابات سننے کے بعد جو دارالعلوم کے اساتذہ اور فضلاء نے مرتب کئے تھے اور جن کے لئے حضرت مہتمم صاحب نے اُن کے پاس چند رہنما اُصول پہلے ہی سے ارسال کر دیئے تھے سب نے اس پر اظہار مسرت کیا کہ وقت کے ان اہم ترین مسائل پر علماء کے جوابات محققانہ اور عقلی و نقلی دلائل سے مزین ہیں، جن سے مسائل زیر بحث میں اسلامی موقف پوری طرح کھل کر سامنے آگیا ہے، اور یہ ثابت کر دیا گیا ہے کہ شریعت اسلامی کے ناقابل تبدیل اصول ہر دور کے مسائل کا خاطر خواہ حل پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور انسانیت کی فلاح کے ضامن ہیں۔

تیاری کمیٹی کے فیصلے کے مطابق مجوزہ عام اجتماع کی تاریخ اور مقام طے کرنے کے لئے پانچ افراد کے ایک وفد نے جو حضرت مولانا محمد طیب صاحب حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی اور مولانا محمد سالم صاحب پر مشتمل تھا، بمبئی کا دورہ کیا، بمبئی کے مخلص اور حوصلہ مند مسلمانوں نے بڑی خوشی اور گرم جوشی سے اس کا ذمہ لیا کہ یہ آل انڈیا کنونشن بمبئی میں منعقد ہو، چنانچہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا کنونشن کے لئے ۲۰، ۲۱ ذیقعدہ ۱۳۹۲ھ (۲۷، ۲۸ دسمبر ۱۹۷۲ء) کی تاریخیں طے ہوگئیں، مقصد کی اہمیت کے پیش نظر یہ مناسب اور مفید

سمجھا گیا کہ ہندوستان کے مختلف مکاتبِ فکر کے اکابر اور معروف مسلم تنظیموں کے سربراہوں کی طرف سے مشترکہ دعوت نامہ جاری کیا جائے۔ چنانچہ ۲۷، ۲۸ دسمبر ۱۹۷۲ء / ۱۳۹۲ھ کو یہ عظیم کنونشن اپنی غیر معمولی خصوصیات کے ساتھ بمبئی میں منعقد ہوا۔ جس میں ہندوستان کی تمام مسلم جماعتوں نے حصہ لیا۔

مسلمانانِ ہند کے مختلف مکاتب فکر کے اجتماع اور نمائندگی کے لحاظ سے یہ کنونشن جس قدر غیر معمولی تھا اُسی حد تک خدا تعالیٰ نے اسے کامیاب بھی فرمایا، کنونشن کے داعیوں اور مندوبین کی منتخب رائے سے جن میں سنی، شیعہ، مہدوی، بریلوی اہلِ حدیث اور جماعتِ اسلامی کے علاوہ دوسری سیاسی غیر سیاسی جماعتوں کے رہنما موجود تھے، حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم کو کنونشن کا صدر منتخب کیا گیا، ہندوستانی مسلمانوں کے مختلف مذہبی مکاتبِ فکر اور طبقات میں سے کوئی طبقہ بھی ایسا نہیں رہا جس کے اکابر علماء و زعماء کنونشن کے پلیٹ فارم پر جمع نہ ہو گئے ہوں، اس کنونشن نے اور دوسرے لفظوں میں ہندوستان کے تمام مکاتبِ فکر کے مسلمانوں نے متحدہ آواز کے ساتھ اپنے ریزولیوشن کے ذریعے اعلان کر دیا کہ وہ کسی حالت میں بھی مسلم پرسنل لا میں تغیر و تبدل کو گوارہ نہیں کر سکتے، یہ شریعتِ اسلامی کا ایک حصہ ہے، اس متحدہ آواز کا اثر ملک اور حکومت دونوں پر پڑا اور اس ذریعے سے ہندوستان کے تمام مسلمان وحدتِ کلمہ کی بنا پر متحد ہو گئے، جو ہندوستان کی تاریخ میں ایک بے مثال صورت حال تھی۔

تحریکِ خلافت کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ ہر مکتبِ فکر کے مسلمانوں نے متحد ہو کر اور ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر اسلامی استحاد کا ثبوت دیا۔ اس کے بعد آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا دوسرا عظیم اجتماع حیدر آباد میں منعقد ہوا اس جلسے کی ورکنگ کمیٹی نے آل انڈیا بورڈ کا صدر حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند کو اور جنرل سکریٹری حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی کو منتخب کیا۔

بمبئی کے کنونشن کا بنیادی مقصد پرسنل لا کا تحفظ اور ترمیم سے اس کا بچاؤ کرتے ہوئے تمام مکاتبِ فکر کے اہلِ علم وفضل اور دانشوروں کو یہ اعلان کرنا تھا کہ مسلمانانِ ہند خواہ ان کا تعلق کسی مکتبِ فکر سے ہو اپنے پرسنل لاء سے نہ کسی حالت میں دست بردار ہو سکتے ہیں نہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی و ترمیم گوارا کر سکتے ہیں، اور نہ کسی ایسے قانون کو قبول کرنے کے لئے تیار ہیں جو پرسنل لا کے کسی ایک شرعی جزئیہ پر بھی اثر انداز ہو، بالفاظِ دیگر مسلمان اپنی معاشرتی اور ثقافتی خصوصیات اور امتیازات کو فنا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، جن پر ان کے ملی وجود کی عمارت کھڑی ہوئی ہے اور ان کا ممتاز شرعی اور قومی امتیاز قائم ہے۔

حوادث

اس سال کے حوادث میں سب سے بڑا حادثہ حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صدر المدرسین دار العلوم دیوبند کی وفات حسرت آیات کا ہے، ۲۰ صفر ۱۳۹۲ھ کو چہارشنبہ و پنجشنبہ کی درمیانی شب میں ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے علم و عمل کا یہ چراغ گل ہوگیا، اللہ تعالےٰ انھیں اعلیٰ علیین میں مقاماتِ رفیعہ عطا فرمائے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحبؒ کے درس بخاری شریف کو بڑی شہرت حاصل تھی، اُن کے درسِ حدیث میں حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کے درسِ حدیث کی خصوصیات پائی جاتی تھیں، چنانچہ اُن کے زمانے میں دورۂ حدیث کے طلباء کی تعداد تین سو کے قریب پہنچ گئی تھی۔

دار العلوم دیوبند کی مسندِ صدارت تدریس جواَب تک مسلسل شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن قدس سرہٗ کے بلا واسطہ تلامذہ میں چلی آرہی تھی حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحبؒ کی وفات سے خالی ہوگئی، اس حادثے کا غم غلط نہیں ہوا تھا کہ دار العلوم کے ایک قابل استاد مولانا اسلام الحق صاحب اعظمی کا اپنے وطن کوپا گنج (ضلع اعظم گڈھ) میں انتقال ہوگیا، مرحوم حضرت محدث کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز شاگردوں میں تھے، فراغت کے بعد برابر درس و تدریس کے

فرائض انجام دیتے رہے۔

تیسرا حادثہ مولوی عبد الواحد صاحب ناظم محاسبی کے انتقال کا ۴ر شوال ۱۳۹۲ھ / ۱۹۷۲ء کو پیش آیا، انھوں نے چالیس سال سے زیادہ دار العلوم کے شعبۂ محاسبی کی خدمات انجام دیں، حق تعالےٰ ان سب کی مغفرت فرمائے اور وہاں کی راحتیں نصیب فرمائے۔

مصری ثقافتی وفد

جناب محمد توفیق صاحب عویضہ کی قیادت میں مصر کا ایک وفد بذریعہ کار دیوبند پہونچا۔ وفد نے دار العلوم دیوبند کے لئے حکومت جمہوریۂ مصر کی جانب سے ایک مُطلا قرآن شریف اور قاری محمود البنار کی قرأت کے ۴۴ ریکارڈ کا ایک سیٹ پیش کیا، ان ریکارڈوں میں پورا قرآن شریف محفوظ ہے۔

توفیق صاحب نے دوران گفتگو میں فرمایا کہ علامہ رشید رضا کا یہ مقولہ بالکل صحیح ہے کہ "جس شخص نے دار العلوم کو نہیں دیکھا اس نے کچھ بھی نہیں دیکھا"۔

واردین وصادرین

۸ر ستمبر ۱۹۷۲ء / ۱۳۹۲ھ کو بذریعہ کار ٹوکیو یونیورسٹی (جاپان) کے اُردو پروفیسر تاکیش سوزدا اور تاریخ کے پروفیسر مسز مٹ میو آرا ایک اسکالر خاتون کے ساتھ آئے اساتذہ، طلبہ، کارکنوں اور آمد وخرچ کے اعداد وشمار نوٹ کئے، دفتر اہتمام میں اعداد وشمار کے آویزاں متعدد نقشوں کے فوٹو لئے، جن میں سو سال کے سال وار، صدر مدرس، مہتمم، اساتذہ طلبہ، تعداد فضلار اور آمد وصرف کے اعداد وشمار دیئے گئے ہیں، یہ تینوں خاصی اُردو سمجھ اور بول لیتے تھے ان لوگوں نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ بانئ دار العلوم دیوبند اور حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ گنگوہی سرپرست دار العلوم کی تمام تصانیف کے سرورق کے فوٹو لئے۔

زائرینِ حجاز

۱۳۹۲ھ / ۱۹۷۲ء میں منتعلقینِ دار العلوم میں سے مولانا انظر شاہ صاحب کشمیری بذریعہ ہوائی جہاز حج کے لئے گئے، مولانا موصوف کے علاوہ راقم سطور کو بھی حج بیت اللہ اور روضۂ اقدس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔

۱۳۹۳ھ رابطہ عالم اسلامی کے وفود

اس سال میں سعودی عرب سے دو وفد دار العلوم میں آئے،

ایک وفد جو رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی جانب سے دنیا کے مختلف ملکوں کا دورہ کر رہا تھا، وسطِ سال میں دار العلوم میں آیا، سید ابراہیم ثقاف رئیس الوفد تھے، اس کے کچھ عرصے کے بعد دوسرا وفد شعبان کے اوائل میں آیا، اس میں وزارت معارف کے ڈائرکٹر اور ادارہ مباحثِ علمیہ کے نمائندے شامل تھے، ان حضرات نے دار العلوم کو دیکھنے کے بعد اسے علم کا روشن مینار، عرفان و معرفت کا مرجع اور طالبینِ ہدایت کی پناہ گاہ قرار دیتے ہوئے اس امر کا اعتراف کیا کہ دار العلوم سے ایسے علماء پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے ہندوستان میں حدیث کا علم پھیلایا، اُنھوں نے غلو پسندوں کی تحریف، جاہلوں اور فتنہ پردازوں کی تاویلات اور گمراہی سے دینِ حنیف کو محفوظ رکھا ہے۔

گورنر اُتر پردیش کی آمد

۱۳۹۳ھ کے اواخر میں اتر پردیش کے گورنر اکبر علی خاں صاحب تشریف لائے، موصوف نے دار العلوم کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ "یہ اکابرِ دیوبند ہی تھے جنھوں نے کروڑوں انسانوں کے دلوں میں آزادی کی تڑپ اور جنگِ آزادی میں حصہ لینے کے لئے زبردست جذبات پیدا کئے، ہندو مسلم اتفاق، انسانیت کی اعلیٰ قدروں کی حفاظت اور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ اور تعلیماتِ مقدسہ کی ترویج و اشاعت کی وہ مشعل روشن کی جس سے پورے ملک کا گوشہ گوشہ منور ہوگیا، علم و دانش کا یہ گہوارہ اسلامی تعلیمات کا بین الاقوامی مرکز، جنگِ آزادی کا مضبوط قلعہ، ایک جہتی کا مرکز اور ہندوستان جیسے ملک کی عظمتوں کا امین ہے!"

اس موقع پر دیوبند میں بھارت ڈگری کالج کا سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے گورنر صاحب نے فرمایا کہ "آج ہم مہتمم صاحب دار العلوم دیوبند اور سوامی دیو کلیان جی بانی

بھارت ڈگری کالج دیوبند کو شانہ بشانہ دیکھ کر بے تکلف یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدمت کی لگن اور اخلاص سے جو دل بھرپور ہوتے ہیں اُن میں نہ صرف یہ کہ اختلاف نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک دوسرے کے قدردان اور قدرشناس بھی ہوتے ہیں۔ اختلاف وہیں ہوتا ہے جہاں خدمت کی لگن نہ ہو، ہمارا فرض ہے کہ اس موقع پر مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند کا شکریہ ادا کریں جو اپنا قیمتی وقت دے کر اخلاص و لگن کے ساتھ ملک اور قوم کی ہمتیں بڑھانے کے لئے یہاں موجود ہیں، اس وقت میں ان دونوں کی یہاں موجودگی ہم سب کو محبت و اخلاق سے ایک ہوجانے کا بڑا عظیم سبق دیتی ہے جسے ہمیں اپنے دلوں کی تختیوں پر لکھ لینا چاہیئے، اور اس پر عمل کرنا چاہیئے۔"

دارالقضاء کا قیام

۱۳۹۴ھ میں مُسلم پرسنل لا اور قوانینِ شریعت کے تحفظ اور بقا کے لئے عملی طور پر محکمۂ قضاء قائم کیا گیا اس کے نتیجے میں اب تک متعدد مقامات پر دارالقضاء قائم ہوچکے ہیں، جن میں نکاح و طلاق وغیرہ عائلی مسائل کا شرعی طور پر فیصلہ ہونے لگا ہے۔

۱۳۹۵ھ حضرت مہتمم صاحب کا سفر افریقہ و حجاز اور یورپ

اوائل شعبان ۱۳۹۵ھ میں مشرقی افریقہ کے ملک ری یونین میں سینٹ پیٹر کے مقام پر حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے ایک عالی شان مسجد کا افتتاح فرمایا۔ اس مسجد کا سنگِ بنیاد بھی چند سال قبل موصوف ہی نے رکھا تھا۔ وہاں سے رابطہ عالم اسلامی کی دعوت پر اس کے رسالت المسجد کے اجلاس میں شرکت کے لئے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ رابطہ عالم اسلامی کے اس اجلاس کا مقصد یہ تھا کہ دنیائے اسلام کے مُسلمانوں کو متحد کرنے کے لئے کیا ذرائع بروئے کار لائے جائیں، اس اجلاس میں مختلف ملکوں کے ممتاز علماء اور دانش وروں کو دعوت

دی گئی تھی حضرت مہتمم صاحب نے اس عظیم اجتماع میں جو مقالہ پیش کیا اُس میں مسجد کی اہمیت اور اس کے افادی پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے، جو ہر مُسلمان کے لئے لائقِ توجہ ہے۔ اس مقالے کے چند مختصر اقتباس ملاحظہ ہوں۔

"مسجد کے عنوان سے رابطہ عالم اسلامی نے دین کے جن بنیادی مقاصد کے شعور کو بیدار کیا ہے اس پر یہ مُبارک باد کا مستحق ہے، رابطہ عالم اسلامی کا یہ اقدام پورے عالم اسلام کے لئے ایک مُبارک اقدام ہے، جس سے توقع کی جا سکتی ہے کہ ہماری دین و دنیا کی تمام مہمات ذکراللہ اور صلوٰۃ کی روح کے ساتھ انجام پا سکیں گی۔

مسجد ہی انسان کی صلاح و فلاح اور دینی و دنیوی اصلاح کا واحد ذریعہ ہے، جو ذکر و صلوٰۃ کے راستے سے تمام اُمورِ خیر کو انسان کے ضمیر میں پیوست کر کے اُسے ایک سچا خدا پرست اور ایک سچا شہری بنا دیتی ہے، جس میں عبادت و طاعت، اُخوت و مساوات ایثار و ہمدردی اور ملنساری کے ساتھ تقدس و برگزیدگی کے ملے جلے جذبات اُبھر آتے ہیں اور وہ دنیا کیلئے ایک سکون بخش اور راحت دہ انسان بن جاتا ہے۔

مسجد کا تصور درحقیقت طہارت، عبادت، عدالت، سماحت، خدمت، دعوت، اُخوت محبت، مساوات اور اجتماعیتِ عامّہ کا تصور ہے، اور یہی وہ اسلام کے بنیادی مقاصد ہیں جو مسجد کا پیغام کہے جا سکتے ہیں پس مسجد اگر مکان ہے تو یہ اُمورِ خیر اُس کے مکین ہیں جن کے لئے یہ مقدس مکان تعمیر کیا گیا ہے، بنا بریں ہمارا شرعی فرض ہوگا کہ ہم مسجد کے لفظ کو کوئی رسم یا اصطلاح نہ سمجھیں بلکہ ان مقاصدِ مہمہ کی تکمیل کا ایک فطری عنوان باور کریں۔

اسلام میں سارے اساسی کاموں کا محل آغاز و اِتمام مسجد ہی رہی ہے مسجد ہماری عبادت گاہ بھی ہے اور تربیت گاہ بھی، مسجد ہی دعوت گاہ بھی ہے اور مسجد ہی سیاست گاہ بھی ہے جس سے ایک طرف اگر علمائے روزگار نکلتے تھے تو دوسری طرف مجاہدینِ اسلام

کے عساکر بھی روانہ ہوتے تھے، اس میں اگر درس و تدریس ہوتا تھا تو اسی میں عدالتی فیصلے اور بین الاقوامی معاہدے بھی طے پاتے تھے، نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد اسلام کی شوکت کا آغاز فرماتے ہوئے اولاً مسجد ہی کا سنگِ بنیاد رکھا، بارگاہِ حق میں تخلیق عالم کا آغاز مسجدِ حرام سے ہوا اور بارگاہِ رسالت میں تشریع کی شوکت کا آغاز مسجدِ نبوی سے ہوا، جس سے مسجد تکوین و تشریع دونوں کا مبدا ثابت ہوتی ہے، مسجد ہمیں پیغام دے رہی ہے کہ ہم عبادات، اخلاق، معاملات، معاشرت، سیاسیات اور اجتماعیات کو اس کے ذریعے سے اس رنگ میں دنیا کے سامنے پیش کریں جو نماز و ذکر اور تعلق مع اللہ کا رنگ ہے، صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ۔

بہرحال اس مقدس شہر اور بلدِ امین سے رسالۃ المسجد کی صدا کا اٹھنا اور مساجد یا مقاصدِ مسجد کی تنظیم کا ابھرنا خوش آئند اور اس دور کے مسلمانوں کے لئے نیک فال ہے، بشرطیکہ اس صدا کو اسی حقیقت کے ساتھ آگے بڑھایا گیا جو رسالۃ المسجد کے اس عنوان کا حقیقی موضوع اور اس صدا کا قدرتی مفہوم ہے، تو ہم سمجھتے ہیں کہ مسلمانانِ عالم کے بھلے دن آجائیں گے، اور ہر ملک کے مسلمان بالخصوص علماء دل وجان سے اس صدا کا خیر مقدم کریں گے، جہاں تک ہندوستان کے علماء اور فضلائے دارالعلوم دیوبند کا تعلق ہے تو میں یقین دلاتا ہوں کہ وہ خیر مقدم ہی نہیں بلکہ اپنا بھرپور تعاون بھی پیش کریں گے وباللہ التوفیق ۔

رسالۃ المسجد کے اس اجتماع میں حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، حضرت مولانا محمد منظور نعمانی اور حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی اراکین مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند نے بھی شرکت فرمائی ۔

مکہ مکرمہ سے حضرت مہتمم صاحب پیرس (فرانس) ہوتے ہوئے مسلمانانِ انگلستان کی دعوت پر لندن تشریف لے گئے، وہاں کے متعدد شہروں کے اجتماعات سے خطاب فرمایا

اور انگلستان میں مقیم بہت سے مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح کا موقع ملا۔

شیخ الازہر اور دیگر علماءِ عرب کی آمد

۱۳۹۵ھ کے اہم واقعات میں شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود، وکیل الازہر، شیخ عبدالرحمٰن بیطار، مفتیٔ اعظم مصر محمد خاطر اور سابق شیخ الازہر شیخ محمد الفحام تشریف لائے۔ شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود نے فرمایا:۔

"میں یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند کے زُہد و تقویٰ رفعتِ علم اور اخلاص و للّٰہیت، ہی کے یہ آثار ہیں جو اس ادارے میں دیکھے جا رہے ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ فضلائے دارالعلوم تمام شہروں اور ملکوں میں کامیابی کے ساتھ مشغول ہیں"۔

شیخ محمد الفحام نے فرمایا:۔

"میں ایک زمانے سے دارالعلوم دیوبند کی زیارت کا مشتاق تھا میرا یہ اشتیاق دن بدن بڑھتا رہا، میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ میری موت اُس وقت تک نہ آئے جب تک میں دارالعلوم کی زیارت نہ کرلوں، الحمد للہ کہ میری یہ تمنا پوری ہوئی جس کو میں کبھی بھول نہیں سکتا، میں نے اپنی آنکھ سے جو کچھ یہاں دیکھا وہ اُس سے بہت زیادہ ہے جو میں نے سُنا تھا، میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دارالعلوم دیوبند اور اُس کے علماء کو ہر قسم کی توفیق اور ترقی سے نوازے، یہ ادارہ اسلام کے قلعوں میں سے ایک محفوظ قلعہ ہے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی اعانت فرمائے جو اس میں کام کر رہے ہیں تاکہ وہ اسلام کی خوب سے خوب تر خدمت انجام دے سکیں"۔

ان حضرات کے چند روز بعد علمائے عرب کی ایک دوسری جماعت آئی جس میں جناب یوسف السید ہاشم رفاعی وزیر حکومتِ کویت، استاذ عبدالرحمٰن مدیر ماہنامہ "البلاغ" کویت اور قطر کے شیخ عبدالمعز عبدالستار کے ساتھ تاشقند کے نمائندے شرف الدین محمد وغیرہ شامل تھے، یوسف السید ہاشم الرفاعی نے جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے

فرمایا کہ :-

"عالمِ اسلام کو اس وقت ایک زبردست چیلنج کا سامنا ہے، یہ چیلنج پہلے تو اسلام کے دشمنوں کی جانب سے تھا وہ کہا کرتے تھے کہ اسلام اس دور کا ساتھ نہیں دے سکتا لیکن اب یہ چیلنج خود داخلی طور پر مسلمان نوجوانوں کے اندر سے ابھر رہا ہے، جدید تعلیم یافتہ نوجوان مستشرقین کی کتابیں دیکھتے ہیں۔ اور تشکیک میں مبتلا ہو کر کہتے ہیں کہ اسلام عصرِ حاضر میں رہنمائی کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اور بڑی مصیبت یہ ہے کہ اگر دشمن آپ کے گھر میں ہو تو اُس کا مقابلہ دشوار ہوتا ہے، ان نوجوانوں کا حال یہ ہے کہ وہ اسلام کو اُس کے صحیح خدو خال کے ساتھ جانتے ہی نہیں ہیں، اس فکری چیلنج کے لئے ہمیں علمائے راسخین کی ضرورت ہے، اور علمائے راسخین پیدا کرنے کے لئے دارالعلوم دیوبند جیسے ادارے کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت صرف ہندوستان کی نہیں بلکہ سارے عالمِ اسلام کی ضرورت ہے، اسلام پر اعتراضات کے دفعیہ کے لئے ہم جلیل القدر علمار کے محتاج ہیں، ہمیں حافظ ذہبی اور حافظ ابنِ حجر کے معیار کے علمار کی ضرورت ہے، اور ہمیں فخر ہے کہ الحمد للہ اس درجے کے علمار اس دارالعلوم میں موجود ہیں۔

دارالعلوم دیوبند اپنے افکار و نظریات میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے کسبِ فیض کرتا رہا ہے، امام غزالی نے اپنے عہد کے مطابق فلسفۂ یونان کی یلغار سے اسلام کو محفوظ رکھا شاہ ولی اللہ نے کفر و شرک کی تردید کے لئے کام کیا، ہمیں بھی اس وقت اُن چیزوں پر کام کرنا چاہیئے جو اس دَور کی پیداوار ہیں۔ شیطانی طاقتیں روز نئے حربے استعمال کرتی ہیں ہمیں اپنے عقائد و افکار کی حفاظت کے لئے اُن کے خلاف کام کرنا چاہیئے"

شیخ عبدالمعز عبدالستار نے فرمایا کہ :-

"اللہ تعالٰے نے ہمیں اس اسلامی قلعے کی زیارت کی توفیق بخشی جسے ہم ازہرِ ہند دارالعلوم دیوبند کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اللہ تعالٰے دارالعلوم دیوبند کو دینِ حنیف

کی خدمت اور اسلامی دعوت کی زیادہ سے زیادہ توفیق بخشے، ہم اپنے وطن میں برابر دارالعلوم کے بارے میں سنتے اور پڑھتے رہتے تھے اور جانتے تھے کہ دارالعلوم دیوبند ہندوستان میں دین کی روشنی کا مینار ہے جو اپنی ضیا پاشیوں سے سارے عالم اسلام کو منور کر رہا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کے مستقبل کو حال سے زیادہ بہتر بنائے جیسا کہ اُس نے حال کو ماضی سے بہتر بنایا ہے!

آخر میں انھوں نے کہا کہ میں سورۂ عصر کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں، امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ یہ سورت اپنے مندرجات کے لحاظ سے انسانی زندگی کو سنوارنے کے لئے بہت کافی ہے۔ اس میں ایمان، عمل صالح، حق کو مضبوطی سے پکڑے رہنے اور مصائب پر صبر کرنے کی تلقین کی گئی ہے، اگر ساری دنیا کے فلسفی اور دانش ور مل کر انسانی زندگی کیلئے پروگرام مرتب کریں تو ان چار چیزوں سے بہتر کوئی اور چیز پیش نہیں کرسکیں گے۔

وفیات

۷ شوال ۱۳۹۵ھ کو حضرت مولانا محمد میاں صاحب کی وفات کا الم ناک حادثہ پیش آیا، مولانا مرحوم متبحر عالم ہونے کے ساتھ فقہ اور تاریخ پر گہری نظر رکھتے تھے، جمعیۃ علمائے ہند میں ان کی سیاسی اور تصنیفی خدمات ہمیشہ یادگار رہیں گی، سیاسی ہنگامہ خیزیوں میں شرکت کے باوجود ان کی خلوت نشینی، درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور اوراد و ظائف کی پابندی کی مثال کم ملتی ہے، بر سہا برس دارالعلوم کی مجلس شوریٰ و عاملہ کے رکن رہے، ان مجالس کی تجاویز بالعموم وہی قلم بند کیا کرتے تھے۔

اواخر ذی الحجہ میں دارالعلوم کے شعبۂ کتابت کے استاذ حضرت مولانا اشتیاق احمد صاحب نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا، مولانا موصوف خط نسخ اور نستعلیق کے باکمال کاتب تھے، فنِ کتابت میں ان کے سیکڑوں شاگرد برِ صغیر میں موجود ہیں، مولانا موصوف کو ایک واسطے سے مشہور خطاط منشی ممتاز علی میرٹھی سے تلمذ حاصل تھا، حضرت مولانا نانوتویؒ سے آپ کو ایک خاص قلبی نسبت تھی، آپ نے مولانا نانوتویؒ کی کئی تصانیف کی تسہیل و تشریح فرمائی، اور دارالعلوم ہی کے زیر اہتمام ان کی اشاعت کی گئی۔

صدرِ جمہوریۂ ہند کی آمد

۲۳ ربیع الثانی ۱۳۹۶ھ کا دن دارالعلوم کی تاریخ میں صدرِ جمہوریۂ ہند کے دن کی حیثیت سے یادگار رہے گا، اسی تاریخ میں ہندوستان کے صدر محترم جناب فخرالدین علی احمد صاحب دارالعلوم کی دعوت پر بذریعہ ہیلی کوپٹر تشریف لائے یوپی کے گورنر اور وزیراعلیٰ کے علاوہ چند مرکزی اور صوبائی وزراء بھی صدرِ جمہوریہ کے ساتھ تھے، صدر محترم طے شدہ پروگرام کے مطابق ہیلی پیڈ سے حضرت نانوتوی، حضرت شیخ الہند اور حضرت مولانا مدنی رحمہم اللہ کے مزارات پر تشریف لے گئے اور ایصال ثواب کیا، پھر وہاں سے حضرت علامہ مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کے مزار پر پہنچ کر فاتحہ پڑھی، بعدازاں دارالعلوم اور اس کے کتب خانہ کا معائنہ کر کے دارالعلوم کی جانب سے دی گئی چائے کی دعوت میں شرکت کی، اس موقع پر اُتر پردیش کے گورنر اور وزیراعلیٰ کے علاوہ چند مرکزی اور صوبائی وزراء، سرکاری اعلیٰ حکام دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے بعض اراکین دارالعلوم کے اساتذہ و نظمائے شعبہ جات، دیوبند اور دیگر مقامات کے بہت سے عمائدین بھی شریک تھے

آخر میں صدر محترم جلسہ گاہ میں تشریف لے گئے، جہاں مولانا حامد الانصاری غازی رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم نے استقبالیہ تقریر میں صدر محترم کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا:۔ "یہ عالموں، فاضلوں، عارفوں اور جنگِ آزادی کے سورما سپاہیوں کا مرکز ہے، یہ ۱۸۵۷ء کے شہیدوں، ریشمی خطوط کی تحریک کے جانبازوں کی سرزمین دارالعلوم ہے، یہ ادارہ جنگِ آزادی کا قلعہ، مجاہدین آزادی کا تاریخی مرکز اور علوم و فنون کا سب سے بڑا ایشیائی ادارہ ہے، اس دارالعلوم نے انگریزوں کے خلاف اپنے فتوؤں کے ذریعہ سے تحریکِ خلافت، جلیانوالا باغ اور سوراج مومنٹ کی جنگِ آزادی میں ہر محاذ پر ہزاروں آدمیوں کو جیل اور قربانی کے راستے پر ڈالا ہے۔

غازی صاحب نے فرمایا کہ آج قومی اور بین الاقوامی قوانین میں جس سوشلزم اور اقوام متحدہ کے چارٹر میں جن بنیادی حقوق کا ذکر ہے یعنی کھانا، کپڑا، مکان، تعلیم اور صحت کا انتظام یہ سب اس دارالعلوم میں سو سال پہلے دیئے جا چکے ہیں، پورا ملک اس کے بارے میں دارالعلوم دیوبند سے روشنی اور رہنمائی حاصل کر سکتا ہے!

خیر مقدم کی تقریر کے بعد حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند نے سپاس نامہ پیش فرمایا جس میں دارالعلوم دیوبند کی علمی اور سیاسی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا

تھا کہ دارالعلوم کے بانی اعظم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی ؒ نے اپنے اساسی اصولِ ہشتگانہ میں رجوع الی اللہ اور آزاد تعلیمی نظام کی اساس عوامی تعاون کو قرار دیتے ہوئے سادہ ایمانی زندگی، روحانی تربیت، حب الوطنی، قومی یک جہتی اور ملکی آزادی کی حفاظت کو اسلامی تعلیم کے ساتھ یہاں کے نفوس میں پیوست کیا ہے، چناں چہ دارالعلوم دیوبند کی تعلیم و تربیت نے بڑے بڑے مجاہدینِ آزادی پیدا کئے ہیں جن کے احترام میں یہاں کے ہندو اور مسلمان برابر کا حصہ لیتے ہیں اور خلوص کے ساتھ مل جل کر اُن سے رہ نمائی حاصل کرتے ہیں، اس طرح یہ ادارہ ہندوستان کے لئے اسلامی رابطے کا سب سے قدیم اور قابلِ احترام ذریعہ ہے۔

آخر میں صدر محترم نے جوابی تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ "خدا کا شکر ہے کہ اُس نے ہمیں مسلمان پیدا کیا، ہم مسلمانوں کو چاہیے کہ ملکی زندگی میں ایک خوددار فعال اور مؤثر عنصر کی حیثیت سے بھرپور حصہ لیں اور اپنی قابلیتوں کو کمال پر پہنچائیں۔

صدرِ محترم نے اکابرِ دارالعلوم کو ان کی علمی اور سیاسی خدمات پر خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ وہ عظیم رہ نما تھے جنھوں نے اپنے امتیازی کردار کے ساتھ جنگِ آزادی کے ہر مرحلے میں سو سال تک ملک اور قوم کی خدمت انجام دی ہے، انھوں نے اپنی عظیم خدمات کا کوئی حق طلب نہیں کیا، بلکہ محض اپنا فرض سمجھ کر مسلمانوں کے تاریخی وقار میں اضافہ کیا ہے۔

صدر جمہوریۂ ہند کی تقریر کا خلاصہ یہ ہے:-

یہ دارالعلوم صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری دنیائے اسلام کی ایک اہم عظیم اور تاریخی، دینی درس گاہ ہے، میں آپ کے خلوص اور آپ کی اسلامی سادگی اور دینی لگاؤ سے بے حد متأثر ہوا ہوں، ترقی کے موجودہ دور میں انسانیت کی یہی قدریں کمیاب ہوتی جارہی ہیں۔

حضرات! ہمارا یہ دارالعلوم ایک دینی درس گاہ کے علاوہ بھی بہت کچھ رہا ہے،

جنگِ آزادی میں یہ سرفروشوں اور مجاہدوں کا ایک مرکز تھا، میرا یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ وطن عزیز کی آزادی کی جدوجہد میں دیش کی تمام دینی اور قومی درس گاہوں میں دارالعلوم دیوبند کا نام سرِفہرست رہا ہے۔ اس لئے اس کے تاریخی اور مجاہدانہ کردار کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے وطن کی آزادی کی تاریخ میں اس کا نام سنہری حروف سے لکھے جانے کا مستحق ہے۔

بانیٔ دارالعلوم مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور اُن کے دوسرے مخلص ساتھیوں، عالموں اور مجاہدوں اور ان کے جانشینوں کی مخلصانہ اور بے لوث علمی اور دینی خدمات کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ اس ادارے سے فیضیاب ہوئے، اور ان بزرگوں کے وسیلے اور واسطے سے لاکھوں گھرانوں میں دینی علم و فکر کی شمعیں روشن ہوئیں۔

آج سے ایک صدی پہلے ایک طرف حضرت حاجی امداد اللہؒ کی زیرِ سرپرستی مولانا محمد قاسم وغیرہ جیسی برگزیدہ ہستیوں نے دینی تعلیم کی تحریک شروع کی، دوسری طرف سرسید احمد خاں اور اُن کے ساتھیوں نے جدید تعلیم کی تحریک چلائی۔ بنیادی طور پر یہ دونوں تحریکیں ملّی دردمندی کا نتیجہ تھیں، ان کے درمیان کوئی ٹکراؤ نہ تھا، مگر دیوبند کو یہ خصوصی امتیاز حاصل تھا کہ اُس نے جہادِ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اس لئے یہ ادارہ ہر محبِ وطن ہندوستانی کے لئے باعثِ فخر ہے۔

جہاں تک اسلام اور اسلامی تعلیمات کا تعلق ہے آپ مجھ سے کہیں زیادہ جانتے ہیں کہ یہاں بہت سے ایسے حضرات بھی ہیں جن کی ساری زندگی اسلام اور اسلامی تعلیمات کو سمجھنے اور سمجھانے میں بسر ہوئی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں مسلمان پیدا کیا اور اسلام کے زندہ اور پائندہ اصولوں کی دولت سے مالا مال فرمایا، اسلام نے سب سے پہلا سبق توحید کا دیا ہے، اور دنیا کو مساوات سکھائی ہے۔ اس طرح وحدتِ کلمہ کی بنیاد پر متحد ہونے کا گُر سکھایا ہے، اس کے ساتھ ساتھ جسمانی صحت و صفائی اور قلبی پاکیزگی کی

پانچ وقتی ٹریننگ کا پابند بنایا ہے، ضبط و تنظیم کا سبق سکھایا، مرکزیت پر زور دیا اور علم کے ساتھ عمل اور تقویٰ کی اہمیت واضح کی ہے، اسلامی احکام دین اور دنیا دونوں کی رہنمائی کرتے ہیں، نماز روحانی تربیت کے ساتھ صحتِ جسمانی اور ضبط و نظم کا سبق سکھاتی ہے۔ اسلام نے جن بنیادی اصولوں کی تعلیم دی ہے، وہ وقتی نہیں بلکہ دائمی ہیں، کیا اس ترقی یافتہ دور میں اتحاد، تنظیم اور ڈسپلن کی اہمیت سے انکار کیا جا سکتا ہے؟

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نے بانیٔ دارالعلوم کے بنیادی اصولوں کی حفاظت اور پاسبانی کی ہے اور اپنے تعلیمی نظام کو کسی قسم کے بے جا دباؤ اور بیرونی مداخلتوں سے بالکل آزاد رکھنے کی کوشش کی ہے اور اس عظیم درس گاہ میں دینی تعلیم کے ساتھ طلبہ میں وطنی محبت، قومی یک جہتی اور ملک کی آزادی کی حفاظت کے پاکیزہ جذبات کی پرورش کی ہے اور یہی وہ روایات ہیں جن پر ہم سب کو فخر ہے، اور یقیناً اسی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ دارالعلوم کے اُستادوں اور طالب علموں نے جنگِ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، ہمارے بزرگوں نے قید و بند کی سختیاں جھیلیں، مجھے اسیرانِ مالٹا مولانا محمود حسنؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ اور اُن کے ساتھیوں کی یاد آرہی ہے، اُن کی پاکیزہ زندگی کا نقشہ میری آنکھوں میں گھوم رہا ہے، اور مولانا حفظ الرحمٰن کی مجاہدانہ زندگی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

۱۸۵۷ء میں جب سامراجیوں نے ہندوستان پر اپنا غاصبانہ قبضہ جمایا تو بجا طور پر یہ اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیاوی جاہ و دولت کے بعد ہم دینی آزادی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں، اسی دینی اور وطنی آزادی کے ملے جلے جذبے کے تحت حاجی امداد اللہؒ کی سرپرستی میں ۱۸۶۶ء میں یہ دینی مرکز قائم ہوا، اس نے دینی تعلیم کے ساتھ حب الوطنی کی شمعیں روشن کرنا بھی اس کا ایک اہم اور بنیادی مقصد رہا ہے، یقیناً

خوشی کی بات ہے کہ دارالعلوم میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ نے منطق فلسفہ. ریاضی طب، جرنلزم، انگریزی اور ہندی تعلیم کا بھی انتظام کیا ہے، مگر مجھے زیادہ خوشی ہوگی اگر آپ دیگر علوم کی طرف بھی توجہ دیں. تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے دوسرے علوم سیکھنے میں ہمیشہ پہل کی ہے۔

آپ حضرات اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارے عظیم رہنماؤں نے بڑی دانش مندی اور دور اندیشی سے سیکولرازم کے اصول کو اپنایا تھا، ہمارے دستور کے مطابق ہر شہری کو رائے اور عقیدے کی آزادی ہے، اس دستور میں تمام شہریوں کو برابر کے حقوق حاصل ہیں، اس دستور کا تقاضہ ہے کہ اونچ نیچ کی دیواروں کو ترقی کے راستے میں رکاوٹ نہ بننے دیا جائے، عقیدہ یا مذہب کی بنیاد پر کسی کے ساتھ کوئی امتیاز نہ برتا جائے، زبان یا علاقے کی بنیاد پر تعصب اور تنگ نظری کے لئے کوئی جگہ نہ چھوڑی جائے، یہ سب باتیں وہی ہیں جو پیغمبر اسلام کے عظیم اور تاریخی خطبے سے ہم آہنگ ہیں اور جسے انسانیت کا اوّلین منشور کہا جاسکتا ہے۔

آپ نے سپاس نامہ میں مسلم پرسنل لا کا ذکر کیا ہے، اس سلسلے میں آپ کی نظر سے پرائم منسٹر اور میرے بیانات گذرے ہوں گے جن میں متعدد بار واضح طور پر کہا جاچکا ہے کہ پرسنل لا میں تبدیلی لانے کا اس وقت تک کوئی سوال ہی نہیں جب تک مسلمان خود نہ چاہیں، جہاں تک اسلام کا سوال ہے اس کے لئے قرآن پاک اور اسوۂ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہر دور کے لئے رہنمائی موجود ہے، جب یہ ہمارا ایمان ہے تو ہمیں آج مسائل کا حل بھی اسی میں ڈھونڈھنا ہے، علماء کے اس مرکز میں اگر میں یہ یاد دلاؤں تو بے جا نہ ہوگا کہ اسلام کی نکھری ہوئی تعلیمات اس دعویٰ کے ساتھ دنیا کے سامنے آئی ہیں کہ وہ انسانی فطرت کے ہمنوا اور ہر دور اور ہر ماحول میں انسانیت کے لئے امن و فلاح اور ترقی کا پیغام ہیں، ان کی انسانیت نوازی اور نفع بخشی سے ہر دور میں فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، ہماری

دنیا گردشِ روزگار کے سائے میں تبدیلیوں کا ایک وسیع میدان ہے، حالات اور وقت کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں، زندگی ہر دن نئے مسائل کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے اور ہمیں اس کے ساتھ نباہ کرنا پڑتا ہے، اب یہ کام بیدار مغز علماء کا ہے کہ وہ اسلام کی پاکیزہ اور وسیع تعلیمات کو حالات کے پورے شعور کے ساتھ اس خوبی سے دنیا کے سامنے پیش کریں کہ ان کی دل نوازی، نفع بخشی اور تاثیر میں کسی طرح کوئی کمزوری محسوس نہ ہو سکے اور اُن کی صحت مند رہنمائی سے خدا کی مخلوق ہر دَور میں پورا فائدہ اُٹھا سکے۔

حضرات! ۱۸۶۶ء سے ۱۹۷۶ء تک کا ایک سو دس برس تک کا زمانہ ہے، اس عرصے میں دارالعلوم نے علم و فضل کی جو شاندار خدمات انجام دی ہیں۔ اور دیش کے لئے جو بیش بہا قربانیاں کی ہیں وہ بہت بڑا کارنامہ ہیں، اور میری دعا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا فیض ہمیشہ ہمیشہ جاری رہے۔

☆

باب ۳ سوم

دارالعلوم کا مسلک

دارالعلوم کی تحریروں میں اس کے مسلک کی یہ تشریح کی گئی ہے :-

دارالعلوم دیوبند کا مسلک اہل سنت والجماعت، حنفی مذہب اور اس کے مقدس بانیوں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کے مشرب کے موافق ہوگا۔

دارالعلوم کے مسلک کی حفاظت تمام ارکان و متعلقینِ دارالعلوم کا فرض ہوگا کسی ملازم دارالعلوم یا طالب علم کو اجازت نہ ہوگی کہ وہ کسی ایسی انجمن یا ادارے یا جلسے میں شرکت کرے جس کی شرکت دارالعلوم کے مسلک یا مفاد کے لئے ضرر رساں ہو[1]۔

جہاں تک دارالعلوم اور اکابر دارالعلوم کے دینی رُخ کا تعلق ہے اسے نہایت ہی بلیغ اور جامع انداز میں حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم نے اپنے رسالہ مسلک علمائے دیوبند میں واضح کردیا ہے، اس کا خلاصہ کم و بیش اُنہی کے الفاظ میں یہ ہے کہ :-

"علمی حیثیت سے یہ ولی اللہی جماعت مسلکاً اہل سنت والجماعت ہے، جس کی بنیاد کتاب و سنت اور اجماع و قیاس پر قائم ہے، اس کے نزدیک تمام مسائل میں اولین درجہ

---

[1] دستور اساسی دارالعلوم دیوبند دفعہ ۴ — ۶

نقل و روایت اور آثارِ سلف کو حاصل ہے، جس پر پورے دین کی عمارت کھڑی ہوئی ہے، اس کے یہاں کتاب و سنت کی مرادات محض توتِ مطالعہ سے نہیں بلکہ اقوالِ سلف اور ان کے متوارث مذاق کی حدود میں محدود رہ کر نیز اساتذہ اور شیوخ کی صحبت و ملازمت اور تعلیم و تربیت ہی سے متعین ہو سکتی ہیں، اسی کے ساتھ عقل و درایت اور تفقہ فی الدین بھی اس کے نزدیک فہمِ کتاب و سنت کا ایک بڑا اہم جزو ہے۔ وہ روایات کے مجموعے سے شارع علیہ السّلام کی غرض و غایت کو سامنے رکھ کر تمام روایات کو اُسی کے ساتھ وابستہ کرتا ہے، اور سب کو درجہ بدرجہ اپنے اپنے محل پر اس طرح چسپاں کرتا ہے کہ وہ ایک ہی زنجیر کی کڑیاں دکھائی دیں، اس لئے جمع بین الرّوایات اور تعارض کے وقت تطبیقِ احادیث اُس کا خاص اصول ہے، جس کا منشاء یہ ہے کہ وہ کسی ضعیف سے ضعیف روایت کو بھی چھوڑنا اور ترک کر دینا نہیں چاہتا، جب تک کہ وہ قابلِ احتجاج ہو، اسی بنا پر اس جماعت کی نگاہ میں نصوصِ شرعیہ میں کہیں بھی تعارض اور اختلاف محسوس نہیں ہوتا، بلکہ سارے کا سارا دین تعارض اور اختلاف سے مبرّا رہ کر ایک ایسا گلدستہ دکھائی دیتا ہے جس میں ہر رنگ کے علمی و عملی پھول اپنے اپنے موقع پر کھلے ہوئے نظر آتے ہیں، اسی کے ساتھ بطریقِ اہلِ سلوک جو رسمیات اور رواجوں اور نمائشی حال و قال سے مبرّا اور بری ہے، تزکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن بھی اس کے مسلک میں ضروری ہے۔ اُس نے اپنے منتسبین کو علم کی رفعتوں سے بھی نوازا اور عبدیت و تواضع جیسے انسانی اخلاق سے بھی مزین کیا، اس جماعت کے افراد ایک طرف علمی وقار، استغنا (علمی حیثیت سے) اور غنائے نفس (اخلاقی حیثیت سے) کی بلندیوں پر فائز ہوئے، وہیں فروتنی، خاکساری اور ایثار و زہد کے متواضعانہ جذبات سے بھی بھرپور رہے، نہ رعونت اور کبر و نخوت کا شکار ہوئے اور نہ ذلّتِ نفس اور مسکنت میں گرفتار، وہ جہاں علم و اخلاق کی

بلندیوں پر پہنچ کر عوام سے اونچے دکھائی دینے لگے وہیں عجز و نیاز، تواضع و فروتنی اور لا امتیازی کے جوہروں سے مزین ہو کر عوام میں ملے جلے اور "کاحد من الناس" بھی رہے، جہاں وہ مجاہدہ و مراقبہ سے خلوت پسند ہوئے وہیں مجاہدانہ اور غازیانہ اسپرٹ نیز قومی خدمت کے جذبات سے جلوہ آرا بھی ثابت ہوئے، غرض علم و اخلاق، خلوت و جلوت اور مجاہدۂ و جہاد کے مخلوط جذبات و دواعی سے ہر دائرۂ دین میں اعتدال اور میانہ روی اُن کے مسلک کی امتیازی شان بن گئی، جو علوم کی جامعیت اور اخلاق کے اعتدال کا قدرتی ثمرہ ہے، اسی لئے اُن کے یہاں محدث ہونے کے معنیٰ فقیہ سے لڑنے یا فقیہ ہونے کے معنیٰ محدث سے بیزار ہو جانے یا نسبتِ احسانی (تصوف پسندی) کے معنیٰ متکلم دشمنی یا علم کلام کی حذاقت کے معنیٰ تصوف بیزاری کے نہیں بلکہ اس کے جامع مسلک کے تحت اس تعلیم گاہ کا فاضل درجہ بدرجہ بیک وقت محدث، فقیہ، مفسر، مفتی، متکلم، صوفی (محسن) اور حکیم و مربی ثابت ہوا، جس میں زہد و قناعت کے ساتھ عدم تقشف، حیا و انکساری کے ساتھ عدم مداہنت، رأفت و رحمت کے ساتھ امر بالمعروف و نہی عن المنکر، تبلی یکسوئی کے ساتھ قومی خدمت اور خلوت در انجمن کے ملے جلے جذبات راسخ ہو گئے، ادھر علم و فن اور تمام اربابِ علوم و فنون کے بارے میں اعتدال پسندی، حقوق شناسی اور ادائیگی حقوق کے جذبات ان میں بطور جوہرِ نفس پیوست ہو گئے، بنا بریں دینی شعبوں کے تمام اربابِ فضل و کمال اور راسخین فی العلم خواہ محدثین ہوں یا فقہاء، صوفیاء ہوں یا عرفاء، متکلمین ہوں یا اصولین، امراء اسلام ہوں یا خلفاء ان کے نزدیک سب واجب الاحترام اور واجب العقیدت ہیں، جذباتی رنگ سے کسی طبقے کو بڑھانا اور کسی کو گرانا یا مدح و ذم میں حدودِ شرعیہ سے بے پروا ہو جانا اس جماعت کا مسلک نہیں، اس جامع طریق سے دار العلوم نے اپنی علمی خدمات

سے شمال میں سائبیریا سے لے کر، جنوب میں سماٹرا اور جاوا تک اور مشرق میں برما سے لے کر مغربی سمتوں میں عرب اور افریقہ تک علوم نبویہ کی روشنی پھیلادی جس سے پاکیزہ اخلاق کی شاہراہیں صاف نظر آنے لگیں۔

دوسری طرف سیاسی اور ملکی خدمات سے بھی اس کے فضلاء نے کسی وقت بھی پہلو تہی نہیں کی حتیٰ کہ ۱۸۰۳ء سے ۱۹۴۷ء تک اس جماعت کے افراد نے اپنے اپنے رنگ میں بڑی سے بڑی قربانیاں پیش کیں جو تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں، کسی وقت بھی ان بزرگوں کی سیاسی اور مجاہدانہ خدمات پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا بالخصوص تیرھویں صدی ہجری کے نصف آخر میں مغلیہ حکومت کے زوال کی ساعتوں میں خصوصیت سے حضرت شیخ المشائخ مولانا حاجی محمد امداد اللہ صاحب قدس سرہ کی سرپرستی میں اُن کے ان دو مریدانِ خاص حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ اور اُن کے منتسبین اور متوسلین کی مساعیٔ انقلاب، جہادی اقدامات اور حریت واستقلالِ ملی کی فداکارانہ جدوجہد اور گرفتاریوں کے وارنٹ پر اُن کی قید وبند وغیرہ وہ تاریخی حقائق ہیں جو نہ جھٹلائے جا سکتے ہیں نہ بھلائے جا سکتے ہیں، جو لوگ ان حالات پر محض اس لئے پردہ ڈالنا چاہتے ہیں کہ وہ خود اس راہِ سرفروشی میں قبول نہیں کئے گئے تو اس سے خود اُن ہی کی نامقبولیت میں اضافہ ہوگا، اس بارے میں ہندوستان کی تاریخ سے باخبر اور اربابِ تحقیق کے نزدیک ایسی تحریریں خواہ وہ کسی دیوبندی النسبت کی ہوں یا غیر دیوبندی کی جن سے ان بزرگوں کی ان جہادی خدمات کی نفی ہوتی ہو لایُعْبَأُ بِہٖ اور قطعاً ناقابلِ التفات ہیں، اگر حُسنِ ظن سے کام لیا جائے تو ان تحریرات کی زیادہ سے زیادہ توجیہ صرف یہ کی جا سکتی ہے کہ ایسی تحریریں وقت کے مرعوب کن عوامل کے نتیجے میں محض ذاتی حد تک حزم واحتیاط کا مظاہرہ ہیں، ورنہ تاریخی

اور واقعاتی شواہد کے پیش نظر نہ اُن کی کوئی اہمیت ہے نہ وہ قابلِ التفات ہیں ان خدمات کا سلسلہ مسلسل آگے تک بھی چلا اور انھیں متوارث جذبات کے ساتھ ان بزرگوں کے اخلاف رشید بھی سرفروشانہ انداز سے قومی اور ملّی خدمات کے سلسلے میں آگے آتے رہے، خواہ وہ تحریکِ خلافت ہو یا استخلاصِ وطن انھوں نے بروقت ان تمام انقلابی اقدامات میں اپنے منصب کے عین مطابق حصّہ لیا۔

مختصر یہ کہ علم و اخلاق کی جامعیت اس جماعت کا طرۂ امتیاز رہا اور وسعتِ نظری، روشن ضمیری اور رواداری کے ساتھ دین و ملّت اور قوم و وطن کی خدمت اس کا مخصوص شعار لیکن ان تمام شعبہ ہائے زندگی میں سب سے زیادہ اہمیّت اس جماعت میں مسئلہ تعلیم علوم نبوّت کو حاصل رہی ہے، جب کہ یہ تمام شعبے علم ہی کی روشنی میں صحیح طریق پر بروئے کار آسکتے تھے اور اسی پہلو کو اس نے نمایاں رکھا اس لئے اس مسلک کی جامعیت کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ جامع علم و معرفت، جامع عقل و عشق، جامع عمل و اخلاق، جامع مجاہدہ و جہاد، جامع دیانت و سیاست، جامع روایت و درایت، جامع خلوت و جلوت، جامع عبادت و مدنیت، جامع حکم و حکمت، جامع ظاہر و باطن، اور جامع حال و قال ہے، اس مسلک کو جو سلف و خلف کی نسبتوں سے حاصل شدہ ہے اگر اصطلاحی الفاظ میں لایا جائے تو اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دارالعلوم دیناً مسلم، فرقۃً اہل السنّت والجماعت، مذہباً حنفی، مشرباً صوفی، کلاماً ماتریدی اشعری، سلوکاً چشتی بلکہ جامع السلاسل، فکراً ولی اللّٰہی، اُصولاً قاسمی، فروعاً رشیدی اور نسبتاً دیوبندی ہے۔

اس سلسلے میں چونکہ "مسلکِ دارالعلوم" کے نام سے مستقل رسالہ لکھا جا چکا ہے اس لئے اس موقع پر اس کی زیادہ تفصیل کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی، اس کے جامع جملے اس تحریر میں لے لئے گئے ہیں، تفصیلات کے لئے اس رسالہ

سے مراجعت کی جا سکتی ہے۔[1]

نیز اس لئے بھی یہاں زیادہ تفصیل غیر ضروری تھی کہ اس مسلک کا واضح ترین خاکہ تاریخ کے مقدمہ میں بھی حضرت مولانا موصوف نے تحریر فرما دیا ہے۔ البتہ اس پھیلے ہوئے مضمون کی تلخیص کی ضرورت تھی سو وہ بھی حضرت ممدوح ہی کے الفاظ میں حسب ذیل ہے، جو انھوں نے احقر کی فرمائش پر تحریر فرما کر مجھے عنایت فرمائی ہے، جس کا متن بلفظہٖ یہ ہے:-

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ مسلک اعتدال سات اصولی بنیادوں پر قائم ہے جو مع مختصر تشریح حسب ذیل ہیں۔

۱- علم شریعت جس میں اعتقادات، عبادات، معاملات وغیرہ کی سب انواع داخل ہیں جن کا حاصل ایمان اور اسلام ہے، بشرطیکہ یہ علم سلف کے اقوال و تعامل کے دائرے میں محدود رہ کر اُن مستند علماء دین اور مربیانِ قلوب کی تعلیم و تربیت اور فیضانِ صحبت سے حاصل شدہ ہو، جن کے ظاہر و باطن، علم و عمل اور فہم و ذوق کا سلسلہ سندِ متصل کے ساتھ حضرت صاحبِ شریعت علیہ افضل الصلوات والتحیات تک مسلسل پہنچا ہوا ہو، خود رائی یا محض کتب بینی اور قوتِ مطالعہ یا محض عقلی تگ و تاز اور ذہنی کاوش کا نتیجہ نہ ہو، گو وہ عقلی پیرایۂ بیان اور استدلالی حجت و برہان سے خالی بھی نہ ہو کہ اس علم کے بغیر حق و ناحق، حلال و حرام، جائز و ناجائز، سنت و بدعت اور مکروہ و مندوب میں امتیاز ممکن نہیں اور نہ ہی اس کے بغیر دین میں خود رو تخیلات، فلسفیانہ نظریات اور بے بصرانہ توہمات سے نجات ممکن ہے۔

۲- پیرویٔ طریقت یعنی محققینِ صوفیہ کے سلاسل اور اصولِ مجربہ کے تحت (جو کتاب و سنت سے ماخوذ ہیں) تہذیبِ اخلاق، تزکیۂ نفس اور سلوکِ باطن کی تکمیل، کہ اس کے بغیر اعتدالِ اخلاق، استقامتِ ذوق و وجدان، باطنی بصیرت، ذہنی پاکیزگی

---

[1] دارالعلوم کی سو سالہ زندگی ص ۲۳ — ۲۷

اور مشاہدۂ حقیقت ممکن نہیں، ظاہر ہے کہ یہ شعبہ اسلام و ایمان کے ساتھ ساتھ احسان سے متعلق ہے۔

۳۔ اتباعِ سنت یعنی زندگی کے ہر شعبہ میں سنت نبوی کی پیروی اور ہر حال و قال اور ہر کیفیت ظاہر و باطن میں ادب شریعت برقرار رکھ کر سنتِ مستمرہ کا غلبہ، کہ اس کے بغیر رسوم جہالت، رواجی بدعات و منکرات اور با وجود احوال باطن کے فقدان کے محض رسمی طور پر اہل حال کے وجدی شطحیات و کلمات کی نقالی یا انہیں شریعت کے متوازی ایک مستقل قانونِ عام کی صورت دے دیئے جانے کی بلا سے نجات ممکن نہیں۔

۴۔ فقہی حنفیت اسلامی فرعیات اور اجتہادیات کا نام فقہ ہے، اور اکابر دار العلوم چونکہ عامۃً حنفی ہیں اس لئے فقہی حنفیت کے معنی اجتہادی فرعیات میں فقہ حنفی کا اتباع اور مسائل و فتاوی کی تخریج اور ترجیح میں اسی کے اصولِ تفقہ کی پیروی کے ہیں کہ اس کے بغیر استنباطی مسائل میں ہوائے نفس سے بچاؤ اور تلفیق کے راستے سے مختلف فقہوں میں تلون کے ساتھ دائر سائر رہ کر عوام کی حسبِ خواہش، نفسِ مسائل میں قطع و برید یا ہنگامی حالات کی مرعوبیت سے ذہنی قیاس آرائی اور لاعلمی کے ساتھ مسائل میں جاہلانہ تصرفات و اختراعات سے اجتناب ممکن نہیں، ظاہر ہے کہ یہ شعبہ اسلام سے متعلق ہے۔

۵۔ کلامی ماتریدیت یعنی اعتقادات میں فکر صحیح کے ساتھ طریق اہل سنت و الجماعت اور اشاعرہ و ماتریدیہ کے تنقیح کردہ مفہومات اور مرتب کردہ اصول و قواعد پر عقائدِ حقہ کا استحکام اور قوتِ یقین کی برقراری، کہ اس کے بغیر زائغین کی شک اندازیوں اور فرقِ باطلہ کے قیاسی اختراعات اور اوہام و شبہات سے بچاؤ ممکن نہیں ظاہر ہے کہ یہ شعبہ ایمان سے متعلق ہے۔

۶۔ دفاعِ زیغ و ضلالت یعنی متعصب گروہ بندوں اور اربابِ زیغ کے اٹھائے ہوئے فتنوں کی مدافعت، مگر وقت کی زبان و بیان

ہیں اور ماحول کی نفسیات کے شعور کے ساتھ وقت ہی کے مانوس وسائل کے ذریعہ جس سے اتمامِ حجت ہو، نیز مجاہدانہ روح کے ساتھ ان کے استیصال کی مساعی کہ اس کے بغیر ازالۂ منکرات اور معاندین کی دست بُرد سے شریعت کا تحفظ ممکن نہیں، اس میں ردِّ شرک و بدعت ردِّ الحاد و دہریت، اصلاح رسومِ جاہلیت اور حسبِ ضرورت تحریری یا تقریری مناظرے، اور تغییر منکرات سب شامل ہیں، ظاہر ہے کہ یہ شعبہ اعلاء کلمۃ اللہ بمصداقِ لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا اور اظہارِ دین بمصداقِ لیظھرہ علی الدین کلہ اور عام نظمِ ملت سے متعلق ہے۔

۷۔ ذوقِ قاسمیت و رشیدیت

پھر یہی پورا مسلک اپنی مجموعی شان سے جب دارالعلوم دیوبند کے مربیانِ اول اور نفس شناسانِ امت حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی رحمہما اللہ کے روح و قلب سے گزر کر نمایاں ہوا تو اُس نے وقت کے تقاضوں کو اپنے اندر سمیٹ کر ایک خاص ذوق اور خاص رنگ کی صورت اختیار کر لی جسے مشرب کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، چنانچہ دستور اساسی دارالعلوم دیوبند منظور شدہ شعبان ۱۳۶۸ھ میں اس حقیقت کو بایں الفاظ کہا گیا ہے کہ "دارالعلوم دیوبند کا مسلک اہل السنت والجماعۃ حنفی مذہب اور اُس کے مقدس بانیوں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہما کے مشرب کے موافق ہوگا۔" (دستور اساسی ص ۶) اس لئے مسلک دارالعلوم دیوبند کے اجزاءِ ترکیبی میں یہ جز ایک اہم عنصر ہے جس پر دارالعلوم کی تعلیم و تربیت کا کارخانہ چل رہا ہے، جو احسان کے تحت آتا ہے، جب کہ اُس کا تعلق روحانی تربیت سے ہے، پس علم شریعت، پیروئ طریقت، اتباعِ سنت، فقہی حنفیت، کلامی ماتریدیت، دفاعِ ضلالت اور ذوقِ قاسمیت و رشیدیت اس مسلکِ اعتدال کے عناصر ترکیبی ہیں، جو سبع سنابل فی کل سنبلۃ مائۃ حبۃ کا مصداق ہیں، ان سبع سنابل کو اگر شرعی زبان میں ادا کیا جائے تو ایمان، اسلام، احسان اور اظہارِ دین سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ ہر نمبر میں اس کی طرف اشارہ بھی کر دیا گیا ہے، انہی دفعاتِ سبعہ کا مجموعہ بہ تفصیلات بالا دارالعلوم دیوبند

کا مسلک ہے، غور کیا جائے تو یہ مسلک بعینہ حدیث جبریل کا خلاصہ ہے، جس میں جبریل علیہ السلام کے سوالات پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام، ایمان، احسان اور وقائع فتن کی تفصیل ارشاد فرمائی ہے، اور اس کے مجموعہ کو تعلیم دین فرمایا ہے، اس لئے اگر یہ کہہ دیا جائے کہ علماء دیوبند کا مسلک حدیثِ جبریل ہے تو بے محل نہ ہوگا۔

حدیثِ جبریل کا متن بلفظ مع ترجمہ حسب ذیل ہے:۔

عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قال بینما
نحن عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
ذات یوم اذ طلع علینا رجل شدید بیاض
الثیاب شدید سواد الشعر لا یری علیہ
اثر السفر ولا یعرفہ منا احدٌ
حتی جلس الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم
فاسند رکبتیہ الی رکبتیہ
ووضع کفیہ علی فخذیہ
وقال یا محمد اخبرنی
عن الاسلام قال الاسلام
ان تشہد ان لا الٰہ
الا اللہ وان محمدا رسول
اللہ وتقیم الصلوٰۃ وتؤتی
الزکوٰۃ وتصوم رمضان وتحج
البیت ان استطعت الیہ سبیلا قال
صدقت، فعجبنا لہ یسألہ

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے
کہ ہم ایک دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں تھے
کہ اچانک نہایت سفید کپڑوں والا، نہایت سیاہ بالوں والا
ایک شخص ظاہر ہوا، جس پر سفر کی کوئی علامت ظاہر نہ ہوتی
تھی اور ہم میں سے کوئی شخص اس کو پہچانتا بھی نہ تھا۔
یہاں تک کہ وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ گیا
اور اس نے اپنے دونوں زانو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے
زانو سے ملا دیئے اور اپنے دونوں ہاتھ اپنی دونوں رانوں
پر یا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رانوں پر رکھ دیئے اور اس نے
سوال کیا کہ اے محمد! مجھے اسلام کے بارے میں بتلائیے؟
آپ نے فرمایا اسلام یہ ہے کہ تم اس بات کی شہادت دو کہ
اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور یہ کہ محمد (صلی اللہ
علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، اور نماز کو قائم رکھو اور زکوٰۃ
ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو اور اگر قدرت ہو تو بیت اللہ
کا حج کرو۔ اُس شخص نے کہا کہ آپ نے سچ فرمایا، حضرت
عمرؓ کہتے ہیں کہ ہم لوگوں کو تعجب ہوا کہ آپ سے سوال کرتا ہے

وَيُصَدِّقُهُ، قال فاخبرني
عن الايمان قال ان تؤمن
بالله وملئكته وكتبه
ورسله واليوم الآخر
وتؤمن بالقدر خيره وشره قال
صدقت قال فاخبرني عن
الاحسان قال ان تعبدَ
الله كانك تراه
فان لم تكن تراه فانهُ
يراك قال فاخبرني
عن الساعة قال
ما المسئول عنها باعلم
من السائل قال
فاخبرني عن اماراتها قال
ان تلد الامةُ
ربتها وان ترى الحفاةَ العراةَ
العالةَ رعاءَ الشاء يتطاولون
في البنيان قال ثم انطلق
فلبثتُ مليًا ثم قال
لي يا عمر اتدري من السائل
قلت الله ورسوله اعلم

اور پھر اس کی تصدیق کرتا ہے، اس کے بعد اس شخص نے
کہا کہ مجھے ایمان کے بارے میں بتلائیے. آپ نے فرمایا
ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی
کتابوں پر، اس کے پیغمبروں پر اور آخرت کے دن پر
اور تقدیر پر خیر و شر پر کامل یقین کرو، اس شخص نے کہا
کہ آپ نے سچ فرمایا، پھر اس شخص نے کہا کہ آپ مجھے
احسان کے بارے میں بتلائیے، آپ نے فرمایا احسان
یہ ہے کہ تم اللہ کی اس طرح عبادت کرو گویا تم اس کو
دیکھ رہے ہو، اور اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ
یقیناً تم کو دیکھ رہا ہے، اس شخص نے کہا کہ آپ مجھے
قیامت کے بارے میں بتلائیے، آپ نے فرمایا کہ اس
بارے میں جس شخص سے سوال کیا جا رہا ہے وہ سوال
کرنے والے سے زیادہ جاننے والا نہیں ہے. اس
شخص نے کہا کہ آپ اس کی علامتوں کو بتلا دیجئے. آپ نے
فرمایا، علامات میں یہ ہے کہ باندی کے پیٹ سے اس کا
آقا پیدا ہو اور یہ کہ تم برہنہ پا، برہنہ بدن بکریاں چرانے والے
مفلسوں کو دیکھو کہ وہ بلند عمارتیں تعمیر کرنے میں ایک دوسرے
پر سبقت کریں، حضرت عمر کہتے ہیں کہ اس کے بعد
وہ شخص چلا گیا. میں دیر تک ٹھہرا رہا، پھر آپ نے
فرمایا کہ عمر! تم جانتے ہو کہ یہ سوال کرنے والا کون تھا؟
میں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں

قال فانه جبرئیل اتاکم یعلمکم دینکم رواه مسلم ورواه ابوهریرة مع اختلاف وفیه واذا رأیت الحفاة العراة الصم البکم ملوك الارض فی خمس لا یعلمهن الا الله ثم قرأ ان الله عندہ علم الساعة وینزل الغیث ، الآیة (متفق علیہ)	آپؐ نے فرمایا کہ یہ جبرئیلؑ تھے جو تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے ، یہ روایت مسلم کی ہے ، حضرت ابوہریرہؓ نے بھی تھوڑے اختلاف کے ساتھ اس کو روایت کیا ہے جس میں یہ الفاظ ہیں کہ جب تم برہنہ پا ، برہنہ بدن ، گونگے بہرے لوگوں کو زمین کا حکمراں دیکھو ، اور یوم قیامت ان پانچ چیزوں میں ہے جن کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا ، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی کہ بلاشبہ قیامت کا علم اللہ ہی کو ہے اور وہی بارش برساتا ہے (متفق علیہ)

پھران تمام بنیادی عناصر کی بنیاد دو اساس کتاب اللہ ، سنت رسول اللہ ، اجماع امت اور قیاس مجتہد ہے ، جن میں سے پہلی دو حجتیں تشریعی ہیں جن سے شریعت بنتی ہے اور آخر کی دو حجتیں تفریعی ہیں جن سے شریعت کھلتی ہے ، یہ پہلی دو حجتیں منصوصات کا خزانہ ہیں جو روایتی ہیں ، جن کے لئے سند و روایت ناگزیر ہے اور دوسری دو حجتیں درایتی ہیں جن کے لئے تربیت یافتہ عقل و فہم اور تقویٰ شعار ذہن و ذوق ناگزیر ہے ، اس لئے یہ مسلک اعتدال نقلی بھی ہے اور عقلی بھی ، روایتی بھی ہے اور درایتی بھی ، مگر اس طرح کہ نہ عقل سے خارج ہے نہ عقل پر مبنی ، بلکہ عقل و نقل کی متوازن آمیزش سے بایں انداز برپا شدہ ہے کہ نقل اور وحی اس میں اصل ہے اور عقل اس کی ہمہ وقتی خادم اور کارپرداز ہے۔

اس لئے علماء دیوبند کا یہ مسلک نہ تو عقل پرست معتزلہ کا مسلک ہے جس میں عقل کو نقل پر حاکم اور متصرف مان کر عقل کو اصل اور وحی یا اس کے مفہوم کو عقل کے تابع کر دیا گیا ہے ، جس سے دین فلسفۂ محض بن کر رہ جاتا ہے ، عوام کے لئے زندقہ کی راہیں ہموار ہو جاتی ہیں اور ساتھ ہی سادہ مزاج عقیدتمندوں کا کوئی رابطہ دین سے قائم نہیں رہتا ، اور نہ یہ مسلک ظاہریہ کا مسلک ہے ، جس میں

الفاظِ وحی پر جمود کر کے عقل و درایت کو معطل کر دیا گیا ہے، اور دین کے باطنی علل و اسرار اور اندرونی حکم و مصالح کو خیرباد کہہ کر اجتہاد اور استنباط کی ساری راہیں مسدود کر دی گئی ہیں، جس سے دین ایک بے حقیقت بلکہ بے معنویت غیر معقول اور جامد شے بن کر رہ جاتا ہے اور دانش پسند اور حکمت دوست افراد کا اُس سے کوئی علاقہ باقی نہیں رہتا، پس ایک مسلک میں عقل ہی عقل رہ جاتی ہے اور ایک مسلک میں عقل معطل اور بے کار، ظاہر ہے کہ یہ دونوں جہتیں افراط و تفریط اور دکانَ اَمرُہٗ فُرطاً کی ہیں جن سے یہ متوسط اور جامع و معتدل دین بری ہے، اس لئے دین کا جامع عقل و نقل مسلک یہی ہے اور یہی ہو بھی سکتا ہے کہ تمام اصول و فروع میں عقل سلیم نقل صحیح کے ساتھ ہمہ وقت وابستہ رہے مگر دین کے ایک مطیع و فرمانبردار خادم اور پیشکار کی طرح کہ اُس کی ہر ایک کلی و جزئی کے لئے عقلی براہین، معقول دلائل اور حسی شواہد و نظائر فراہم کرتی رہے جس سے دین، امت کے ہر طبقہ کے لئے قابلِ قبول اور ہمہ جہتی دستورِ حیات ثابت ہو اور یہ امت وَجَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا کی صحیح مصداق دکھائی دے، یہی مسلک اہل السنت والجماعت کا مسلک کہلاتا ہے اور علماء دیوبند اس مسلک کے نقیب اور علمبردار ہیں، اسی لئے وہ اس مسلکِ جامع اور ان تمام دینی علوم کے اجتماع سے بیک وقت مفسّر بھی ہیں اور محدّث بھی، فقیہ بھی ہیں اور متکلم بھی، صوفی بھی ہیں اور مجاہد و مفکّر بھی اور پھر ان تمام علوم کے امتزاج سے ان کا مزاج معتدل بھی ہے اور متوسّط بھی، یہی وجہ ہے کہ اُن کے جماعتی مزاج میں نہ غلو ہے نہ مبالغہ، اور اس وسعتِ نظری کی بدولت نہ تکفیر بازی ہے نہ دشنام طرازی، نہ کسی کے حق میں سبّ و شتم ہے نہ بدگوئی، نہ عناد و حسد اور طیش ہے اور نہ غلبۂ جاہ و مال اور افراطِ عیش بلکہ صرف بیانِ مسئلہ ہے اور اصلاحِ امت یا احقاقِ حق ہے اور ابطالِ باطل، جس میں نہ شخصیات کی تحقیر اور بدگوئی کا دخل ہے، نہ مغرورانہ طعن و استہزاء کا، ان ہی اوصاف و احوال کے مجموعہ کا نام دارالعلوم دیوبند ہے، اور اسی علمی و عملی ہمہ گیری سے اُس کا دائرۂ اثر دنیا کے تمام ممالک تک پھیلا ہوا ہے۔

دارالعلوم کے قیام کی مشکلات

اور مشیّتِ ایزدی کا فیصلہ

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دیوبند جیسی معمولی بستی میں دارالعلوم کے قیام کا یہ عظیم الشان تخیل بظاہر نہایت حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے، اور اس کا موجودہ حالت تک ترقی کرنا اس سے بھی زیادہ حیرت کا باعث ہے، ظاہر ہے کہ ایسے عظیم مذہبی مرکز کے لئے کوئی بڑا اور مشہور و معروف مقام تجویز کیا جانا چاہیے تھا، نیز دارالعلوم کے قیام کے متصلاً بعد ہی سہارن پور میں مظاہر علوم اور مرادآباد میں قاسم العلوم اور میرٹھ میں مدرسہ اسلامی قائم ہو چکے تھے اور یہ تینوں مقام دیوبند کے مقابلے میں زیادہ مرکزیت اور اہمیت رکھتے تھے، اس کے علاوہ دیوبند جیسی چھوٹی اور غیر معروف جگہ میں تعلیم کے لوازم و اسباب کا مہیا ہونا بھی سخت دشوار تھا، دیوبند نہ کوئی غیر معمولی تجارت گاہ ہے اور نہ رؤسا و ارباب ثروت کی بستی ہے جن کی دولت کے سہارے سے اتنے بڑے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جا سکتا تھا، ریل بھی جو آمد و رفت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اُس وقت موجود نہ تھی۔[1]

---

[1] دیوبند سے گذرنے والی موجودہ ناردرن ریلوے لائن جو پہلے نارتھ ویسٹرن ریلوے کہلاتی تھی، دارالعلوم کے قیام کے بعد جاری ہوئی ہے، اس کی تعمیر دسمبر ۱۸۶۸ء میں مکمل ہوئی اور جنوری ۱۸۶۹ء سے اس کا اجرا عمل میں آیا۔ (تاریخ سہارن پور ص ۲۰)

اسی کے ساتھ جب اس پر نظر جاتی ہے کہ جس وقت دارالعلوم قائم ہوا تو فارسی زبان اور قدیم علوم و فنون جو اَب تک ملک میں رائج تھے اور جن کے ذریعہ سے ہر قسم کی ملازمتیں اور دنیوی فوائد و اعزاز حاصل ہوتے تھے ان کے بجائے انگریزی کو سرکاری زبان قرار دیا جا چکا تھا اور اب انگریزی کے بجائے ان قدیم علوم کا حاصل کرنا گویا تمام دنیوی فوائد و اعزاز سے اپنے آپ کو محروم قرار دے لینا تھا۔ اسی بنا پر تحصیلِ علم کا سب سے بڑا محرّک قدیم علوم کے بجائے اب انگریزی کے حق میں تھا، چناں چہ قیام دارالعلوم کے وقت اکثر لوگوں کو یہ تشویش تھی کہ پڑھنے والے کہاں سے آئیں گے؟ ایک طرف تو یہ مشکلات دامن کشاں تھیں اور دوسری طرف جب مسلمانوں نے خود اپنی مذہبی تعلیم کے لئے مدارس کھولے تو حکومت کی جانب سے ان کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا گیا، مدارسِ عربیہ اور بالخصوص دارالعلوم کے متعلق تو انگریزوں کی یہ رائے تھی کہ "یہ سرحد کے لوگوں کو تعلیم کے بہانے سے داخل کر کے آزاد قبائل کو برطانوی حکومت کے خلاف تیار کرنے کی سازش کا مرکز ہے"، شروع شروع میں عرصے تک اس امر کی اعلانیہ اور خفیہ تحقیقات ہوتی رہی، (باب دوم میں صوبہ متحدہ کے گورنر کے ایک معتمد کی رپورٹ آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں) علماء کو عام طور پر "مذہبی دیوانے" سے تعبیر کیا جاتا تھا، اور ان کو حکومت کے حق میں خطرناک کوہِ آتش فشاں سمجھا جاتا تھا۔

ان حالات میں مسلمانوں کا اپنی مذہبی تعلیم کی جانب متوجہ ہونا جہاں دنیوی فوائد سے محروم ہو جانا تھا وہیں اپنی سیاسی حیثیت کو بھی مشتبہ بنا لینا تھا، چناں چہ اُمرا کا وہ طبقہ جو اَب تک تعلیمی کاموں میں پیش پیش رہتا تھا حکومت سے قریب ہونے کے باعث دارالعلوم کی امداد میں شریک ہونے سے عرصے تک گریز کرتا رہا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ خیز انقلاب کے بعد ملک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں رہی تھی جنھوں نے نفع اندوزی کی خاطر اپنے نئے آقاؤں کو خوش کرنے اور اپنے مخالفین سے انتقام لینے کے لئے جھوٹے اور غلط الزام لگانے کا مشغلہ اختیار کر لیا تھا، اور مسلمان آئے دن اُن کے ہاتھوں مشکلات اور مصائب

کا شکار رہتے تھے! ہم جب دارالعلوم کے اکابر کی عظیم خدمات کا روداد ہائے دارالعلوم میں مطالعہ کرتے ہیں تو عقل حیران رہ جاتی ہے کہ ہمارے اکابر و اسلاف میں کتنی زبردست صلاحیتیں ایک ایسے دور میں موجود تھیں جب کہ ان کو قبول کرنے کی راہیں مسدود ہو گئی تھیں، انھوں نے کمال اخلاص کے ساتھ اس دور کے مخالف ماحول کا بھرپور مقابلہ کیا اور اپنی خدمات کو مسلسل جاری رکھا۔

فلسفۂ تاریخ کا نقطۂ نظر اس بارے میں خواہ کچھ بھی ہو لیکن اہلِ بصیرت جانتے ہیں کہ ہر چیز کے اسباب صرف مادی ہی نہیں ہوتے بلکہ کچھ اور بھی ہوتے ہیں، دارالعلوم کا حال بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔ اسے اپنی زندگی میں بارہا بے شمار مشکلات سے دوچار ہونا پڑا مگر مشیتِ ایزدی ہر وقت دارالعلوم کی دست گیری کرتی رہی اور اس کا ہر قدم ترقی کی جانب گامزن رہا۔

دارالعلوم دیوبند کی زائد از ایک صدی کی مسلسل جد و جہد سے اسلام کی سربلندی اور ملّتِ اسلامیہ کی فلاحی زندگی کے لئے جو بہتر نتائج پیدا ہوئے وہ کسی منصف مزاج کیلئے لائقِ انکار نہیں ہیں آج بھی دارالعلوم کا کارواں لگاتار مصروفیت اور پُرخلوص تگ و دو کے ساتھ بحمداللہ دن بدن آگے بڑھ رہا ہے۔ علمی حلقوں اور دینی دائروں میں روز بروز وُسعت پیدا ہو رہی ہے، دینی لٹریچر بھی شائع ہو رہا ہے، تبلیغی مساعی اور عامۂ مُسلمین تک دین کی پیغام رسانی اور انھیں دینی قدروں سے روشناس کرانے کا سلسلہ روز افزوں ہے مثلاً حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم کے ایشیا، افریقہ اور یورپی ممالک کے دورے دارالعلوم کی تاریخ میں اپنی نوعیت کے ایک اہم باب کا اضافہ ہیں۔

یہاں یہ بات بتا دینا نامناسب نہ ہوگا کہ جن مقامات و ممالک میں دارالعلوم کے نقشِ قدم پر قائم ہونے والے دینی مدارس صحیح خطوط پر سرگرم عمل ہیں وہاں اسلام کی حیثیت اور مُسلمانوں کی ملّی خصوصیات بڑی حد تک محفوظ ہیں۔

دار العلوم کی عالمگیر دینی دعوت

اور تعلیمی تحریک

دار العلوم دیوبند، ایشیا کے مسلمانوں کی ایک عظیم مرکزی اور دینی درس گاہ ہے، جو ایک سو چودہ سال سے زیادہ مدت سے تفسیر و حدیث فقہ و کلام اور تہذیب و اخلاق وغیرہ علومِ دینیہ کے احیار اور ترقی کی زبردست خدمت انجام دے رہی ہے۔

ہندوستان میں مغل سلطنت کے زوال کے بعد جب انگریزوں نے اپنے سیاسی مصالح کے پیشِ نظر اسلامی علوم و فنون کی قدیم درس گاہوں کو یکسر ختم کر دیا تھا، اس وقت نہ صرف اسلامی علوم و فنون اور اسلامی تہذیب کے بقار کے لئے بلکہ خود مسلمانوں کو مسلمان رکھنے کے لئے ضرورت تھی کہ عظیم بنیادوں پر ایک عظیم درس گاہ قائم کی جائے، جو ہندوستان کے مسلمانوں کو الحاد اور بے دینی کے فتنۂ عظیم سے محفوظ رکھ سکے، اس وقت اسلام کے تحفظ کی تمام تر ذمہ داری علمائے کرام پر تھی، ہندوستان کی سرزمین شاہد ہے کہ علمائے کرام نے ہر وقت اپنا فرض انجام دینے میں کوتاہی نہیں کی۔

خدائے بزرگ وبرتر کا شکر ہے کہ دارالعلوم کے ذریعے سے یہ توقعات بدرجۂ اتم پوری ہوئیں، اور قلیل مدت میں دارالعلوم کی شہرت بامِ عروج پر پہنچ گئی۔ اور بہت جلد یہ دارالعلوم نہ صرف ہندوستان بلکہ افغانستان، وسطِ ایشیا، انڈونیشیا، ملیشیا، برما، تبت، سیلون اور مشرقی وجنوبی افریقہ وغیرہ ممالک کے مسلمانوں کی ایک بین الاقوامی تعلیم گاہ بن گیا جس میں ہندوبیرون ہند کے ڈیڑھ ہزار طلبا رکا ہر سال اجتماع رہتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند صرف ایک تعلیم گاہ ہی نہیں ہے بلکہ درحقیقت ایک تحریک ہے، ایک مستقل مکتبِ فکر اور ایک بحرِ بے کراں ہے، جس سے ہندو پاک اور بنگلہ دیش کے علاوہ پورے ایشیا اور مشرقی وجنوبی افریقہ کے تشنگانِ علوم سیراب ہو رہے ہیں، برِصغیر کے اطراف میں جس قدر دینی مدارس اس وقت موجود ہیں اُن کے اساتذہ تقریباً بلاواسطہ یا بالواسطہ دارالعلوم ہی کے فیض یافتہ ہیں اور ہر سال سیکڑوں طلباء یہاں سے فارغ ہو کر درس وتدریس، وعظ و تبلیغ اور تصنیف وتالیف کے ذریعے سے اشاعتِ دین کا فرض انجام دیتے ہیں اور اب یورپ وانگلستان اور امریکہ تک بھی یہ سلسلہ پھیل چکا ہے۔

دارالعلوم دیوبند نے برِصغیر کے مسلمانوں کی دینی زندگی میں ان کو ایک ممتاز مقام پر پہنچانے کا بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، یہ نہ صرف ایک بین الاقوامی تعلیمی ادارہ ہے بلکہ ذہنی نشوونما، تہذیبی ارتقار اور ملّی حوصلہ مندیوں کا ایک ایسا مرکز بھی ہے جس کے صحیح علم اور بلند کردار پر مسلمانوں کو ہمیشہ بھروسہ اور فخر رہا ہے، جس طرح عربوں نے ایک زمانے میں یونانیوں کے علوم کو ضائع ہونے سے بچایا تھا، ٹھیک اسی طرح دارالعلوم دیوبند نے اس زمانے میں علوم اسلامیہ اور بالخصوص علم حدیث کی جو گراں قدر خدمت انجام دی ہے وہ اسلام کی علمی تاریخ میں ایک زرّیں کارنامے کی حیثیت رکھتی ہے۔

دارالعلوم دیوبند نے ہندوستان میں نہ صرف دینی علوم اور اسلامی قدروں کی بقاء و تحفظ کے زبردست اسباب فراہم کئے ہیں بلکہ اس نے تیرھویں صدی ہجری کے اواخر

اور چودھویں صدی کے اوائل میں ہماری معاشرتی اور سیاسی زندگی پر بھی بہت دُور رس اور نتیجہ خیز اثرات ڈالے ہیں، ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ انقلاب میں شکست کھا کر مُسلمانوں پر بڑا اضمحلال اور بڑی قنوطیت طاری ہو چکی تھی، اس وقت مُسلمانوں کی علمی اور تہذیبی فضا میں ہولناک سناٹا چھا گیا تھا، اگر اس وقت دارالعلوم قائم ہو کر مشعلِ راہ نہ بنتا تو نہیں کہا جا سکتا کہ آج ہندوستانی مُسلمانوں کی تاریخ کیا ہوتی۔

غرض کہ گذشتہ ایک صدی سے دارالعلوم دیوبند تعلیمِ دین، وعظ و تبلیغ، اصلاح عقائد و اخلاق اور حفاظتِ دین کی جو عظیم الشان خدمات انجام دے رہا ہے وہ آج کسی سے مخفی نہیں ہیں، چناں چہ اب بہت سے ملکوں میں فضلائے دارالعلوم وہاں کے مُسلمانوں کی دینی رہنمائی اور درسی و اصلاحی اور تبلیغی خدمات میں مصروف ہیں، مولانا ابوالحسن علی ندوی کے الفاظ میں "فضلائے دارالعلوم کا جمہور و عوام سے جو ربط ہے وہ کسی دینی جماعت کا نہیں ہے سارے ہندوستان میں مدارسِ عربیہ کا جال بچھا ہوا ہے اور اس درس گاہ کے علماء فضلاء وہاں مسندِ درس پر متمکن ہیں، وہ عام مُسلمانوں میں ذی اعتبار اور مساجد اور محلّوں میں با اثر ہیں۔[۱]

اس لئے دارالعلوم کے وجود پر برِّصغیر کے مُسلمان جس قدر فخر و مباہات کا اظہار کریں وہ بے جا نہ ہوگا۔

ہندوستان میں برطانوی نظامِ تعلیم کے جاری ہونے کے بعد جب یہاں ایک نئی تہذیب اور نئے دور کا آغاز ہو رہا تھا، دارالعلوم کے اکابر نے مُسلمانوں کی دینی تعلیم کی اہمیت و ضرورت کو بروقت محسوس کیا، انھوں نے عوامی تعاون اور عام مُسلمانوں کے چندے سے دینی تعلیم اور مدارسِ اسلامی کے قیام کی تحریک شروع کر دی، خدا کے فضل و کرم سے ان کی یہ

---

[۱] عصرِ جدید کا چیلنج مصنفہ مولانا ابوالحسن علی ندوی، ص ۴۲

تحریک مسلمانوں میں مقبول ہوئی، چناں چہ برِّ صغیر میں جگہ جگہ دینی مدارس جاری ہو گئے، جن کا برِّ صغیر میں وسیع جال پھیلا ہوا ہے اور جو روز بروز وسعت پذیر ہے۔

دار العلوم کے ابتدائی زمانے ہی میں فضلائے دار العلوم کی نسبت یہ تصور قائم ہوگیا تھا کہ دار العلوم سے فراغت کے بعد اس کے فضلا کے لئے عزت و وقار کے ساتھ حصولِ معاش کے ذرائع پیدا ہو جاتے ہیں، چناں چہ ۱۲۹۰ھ کی روداد میں لکھا ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ دار العلوم سے فراغت کے بعد طلبار کو معاشی پریشانی کا شکار ہونا پڑا ہو، جیسا کہ قیام دار العلوم کے وقت بعض لوگوں کا خیال تھا، بلکہ اللہ تعالےٰ نے یہاں کے طلبار کو بڑی عزت اور قدر و منزلت عنایت فرمائی ہے، یہاں سے جو طلبار فارغ ہو کر گئے وہ عوام و خواص میں بڑی عزت اور عظمت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور بلحاظ معاش بھی ان کی حالت بہت بہتر ہے، اور پندرہ روپے سے لے کر پچھتر روپے ماہانہ تک تنخواہ پا رہے ہیں[1]۔

دار العلوم سے جو افراد فارغ ہوئے اُنھوں نے تعلیم و تبلیغ، تزکیۂ اخلاق، تصنیف افتار، مناظرہ، صحافت، خطابت و تذکیر، حکمت و طب وغیرہ میں جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں وہ کسی مخصوص خطے میں محدود نہیں ہیں بلکہ ہند و پاک کے ہر ہر صوبے کے علاوہ بیرونی ممالک میں بھی پھیل چکی ہیں۔ ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۹۶ھ تک ایک سو چودہ سال کی مدت میں اگر دار العلوم کی اُن خدمات کا جائزہ لیا جائے جو اُس نے برِّ صغیر میں انجام دیں تو معلوم ہوگا کہ ان ملکوں کے ہر ہر حصے میں اس نے اپنے فرزندانِ رشید کو پہونچا دیا ہے، جو اُس خطے میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور مخلوقِ خدا کو ظلمتِ جہل سے نکال کر اُنھوں نے نورِ علم سے مالا مال کر دیا، ہندوستان پاکستان اور بنگلہ دیش کے فضلار دار العلوم کی صوبہ وار اور ملک وار ایک سو سال کی فہرست از ۱۲۸۳ھ تا ۱۳۸۲ھ درج ذیل ہے، ان تلامیذ کی تعداد جنھوں نے دار العلوم سے

---

[1] روداد جلسۂ انعام ۱۲۹۰ھ ص ۱۵۔

استفادہ کیا مگر درجۂ فضیلت تک نہیں پہونچ سکے اس کے علاوہ ہے :۔

ہندوستان

نمبر شمار	نام صوبہ	تعداد فضلاء کرام	نمبر شمار	نام صوبہ	تعداد فضلاء کرام
۱	اُتر پردیش	۱۸۹۶	۹	میسور	۶
۲	مغربی بنگال	۱۵۱	۱۰	مدھیہ پردیش	۲۸
۳	آسام و منی پور	۲۶۵	۱۱	مشرقی پنجاب	۱۹۶
۴	بہار و اُڑیسہ	۷۸۰	۱۲	دہلی	۱۲
۵	مدراس	۳۰	۱۳	مہاراشٹر	۳۹
۶	ٹراونکور	۴	۱۴	گجرات	۱۳۸
۷	کیرالہ	۴۲	۱۵	راجستھان	۴۴
۸	آندھرا پردیش	۵۲	۱۶	جموں و کشمیر	۱۱۰

میزان ۳۷۹۲

سنہ ۱۲۸۳ھ لغایت ۱۳۹۶ھ میں ہندوستان کے فضلاء کی مجموعی تعداد ۳۶۱۱

کل میزان ۷۴۰۳

فضلائے دارالعلوم دیوبند کی یہ وہ تعداد ہے جس کا تعلق صرف ہندوستان سے ہے۔ ہندوستان کے علاوہ دوسرے جن ملکوں کے طالبانِ علم نے دارالعلوم سے علمی فیضان حاصل کرکے فراغت پائی اُن کے نقشے سے واضح ہوگا کہ دارالعلوم نے اپنے علمی فیوض سے صرف برِّصغیر ہی کو بہرہ اندوز نہیں کیا بلکہ ایشیا اور افریقہ کے اسلامی ممالک بھی اس کی ضیا پاشیوں سے محروم نہیں رہے۔ ان غیر ملکی فضلاء

دارالعلوم کی ایک سو چودہ سالہ فہرست از ۱۲۸۳ھ تا ۱۳۹۶ھ یہ ہے:۔

۱۔ افغانستان	۱۰۹	۱۰۔ سیام	۱
۲۔ انڈونیشیا	۱	۱۱۔ سیلون	۷
۳۔ ایران	۱۱	۱۲۔ عراق	۲
۴۔ برما	۱۶۰	۱۳۔ فرانس	۱
۵۔ تھائی لینڈ	۲	۱۴۔ کمبوڈیا	۱
۶۔ جنوبی افریقہ	۱۹۹	۱۵۔ کویت	۲
۷۔ چین	۴۴	۱۶۔ ملائشیا	۴۴۵
۸۔ روس بشمول سائبیریا	۷۰	۱۷۔ نیپال	۵۸
۹۔ سعودی عرب	۲	۱۸۔ یمن	۱
		میزان کل	۱۱۱۶

ہند و بیرون ہند کے فضلاء کی مجموعی تعداد یہ ہے:۔

۱۔ ہندوستان	۷۴۰۳
۲۔ پاکستان	۱۵۲۳
۳۔ بنگلہ دیش	۱۶۷۲
۴۔ مختلف ممالک	۱۱۱۶
مذکورہ بالا میزان	۱۱۷۱۴

سند یافتہ فضلاء دارالعلوم کے علاوہ جن طلباء نے دارالعلوم سے استفادہ کیا اُن کی تعداد کا تخمینہ یہ ہے:۔[1] ۵۸۳۱۰

کل میزان ۷۰۰۲۴

---

[1] یہ تخمینہ ۱۳۸۳ھ تک کا ہے۔ اس کے بعد ۱۳ سال کے اعداد و شمار فراہم کئے جا رہے ہیں۔

اور اگر فضلائے دیوبند کے قائم کردہ ہزاروں مدارس کے فضلاء و مستفیدین کو بھی بالواسطہ دارالعلوم ہی کا فاضل گنا جائے اور واقعۃً وہ فضلاء دیوبند ہیں بھی، تو اس طرح فضلاء و مستفیدین دارالعلوم کی تعداد لاکھوں تک پہونچ جاتی ہے، جن کے ذریعے سے دارالعلوم دیوبند کا علمی و دینی فیضان اب تک کروڑوں لوگوں تک پہنچ چکا ہے۔

فضلائے دارالعلوم کی کارکردگی

ان فضلائے دارالعلوم نے اپنے اپنے وقت میں اپنے اپنے مذاق اور رنگ سے دین کے کسی نہ کسی شعبے میں شخصی یا اجتماعی حیثیت سے جو کام کیا یا کر رہے ہیں ذیل کے نقشے سے یہ معلوم ہوگا کہ دارالعلوم دیوبند نے بحیثیت تعلیم گاہ ہونے کے ہمہ نوع کے ایسے فضلاء پیدا کئے ہیں، جنھوں نے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں کام کیا ہے، فضلائے دارالعلوم کے ان اعداد و شمار سے اندازہ ہوگا کہ ابنائے قدیم دارالعلوم نے کون کون سی خدمات انجام دی ہیں یہ اعداد و شمار کارکردگی کے لحاظ سے ہیں، یعنی اگر ایک شخص نے پانچ یا چھ کام کئے ہیں تو ہر کام میں اس کا نام شمار کیا گیا ہے، یہ اعداد و شمار سنِ آغاز دارالعلوم سنہ ۱۲۸۳ھ سے سنہ ۱۳۸۳ھ تک صرف گذشتہ سو سال کے ہیں:-

سنہ ۱۲۸۳ھ سے سنہ ۱۳۸۳ھ تک سو سال کے عرصے میں دارالعلوم دیوبند نے ۵۳۶ مشائخِ طریقت پیدا کئے

۵۸۸۸	مدرسین
۱۱۶۴	مصنفین
۱۷۸۴	مفتی
۱۵۴۰	مناظر
۶۸۴	صحافی
۴۲۸۸	خطیب و مبلغ
۲۸۸	طبیب

۱۲۸۳ھ سے ۱۳۸۳ھ تک سو سال کے عرصے میں

〃 〃 〃 〃 دارالعلوم کے ۴۸، فضلاء صنعت وحرفت جنھوں نے تجارت کے ساتھ دینی خدمات بھی انجام دی ہیں۔

ابنائے قدیم دارالعلوم نے ۸۹۳۶ مدارس ومکاتب قائم کیے۔[1]

مذکورہ بالا خدمات میں جن حضرات نے اونچے درجے کا مقام حاصل کیا ان کی تعداد یہ ہے:-[2]

اعلیٰ درجے کے معلمین مدرسین			۴۳۸
〃	〃	مصنفین	۲۷۶
〃	〃	مفتی	۱۶۴
〃	〃	مناظر	۱۱۳
〃	〃	صحافی	۱۰۸
〃	〃	خطیب ومبلغ	۲۸۸
〃	〃	طبیب	۱۶۴

غرض کہ دارالعلوم دیوبند نے اپنے فضلاء کرام کا ایک ایسا گلدستہ تیار کیا ہے جس میں رنگ برنگ کے پھول اپنی عطر بیزی سے مشام جان کو فرحت وانبساط کا سامان بہم پہنچا رہے ہیں، اس حقیقت سے کون واقف نہیں کہ طالبانِ علم ہی کسی قوم کی توانائی کا اصل خزانہ ہوتے ہیں، مسلمانوں میں ہونہار نوجوانوں کی کمی نہیں ہے لیکن آج ایسے بے شمار نوجوان اور بچے موجود ہیں جو تعلیم کا شوق تو رکھتے ہیں مگر اُن کی راہ میں مالی پریشانیاں حائل ہیں، وہ چلنا چاہتے ہیں مگر چل نہیں سکتے، آگے بڑھنا چاہتے ہیں مگر بڑھ نہیں سکتے، وہ اُبھرنا چاہتے

---

[1] و [2] دارالعلوم دیوبند کی سو سالہ زندگی ص ۸۲۔ اس سلسلے کے ۱۳۸۳ھ سے اب تک کے فضلائے دارالعلوم کی کارکردگی کے اعداد وشمار مہیا کیے جا رہے ہیں۔

ہیں، مگر ابھر نہیں سکتے یہی نوجوان اور بچے ہیں جو کل ہمارا مستقبل ہوں گے۔ اس مجبوری اور پابستگی کو محسوس کر کے دارالعلوم دیوبند اور اس کے نقش قدم پر قائم شدہ تمام دینی مدارس نے طلبائے علوم دینیہ کے لیے مفت تعلیم کے ساتھ ساتھ خورد ونوش، لباس اور قیام کی مفت سہولتیں بہم پہنچا کر تشنہ کامانِ علم کے لئے طلبِ علم کی شاہراہیں کھول دی ہیں اور اُن تمام رُکاوٹوں کو ختم کر دیا ہے، جو حصولِ تعلیم کی راہ میں حائل تھیں، دینی مدارس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دنیا کے خزانے کی اصل کنجی دین کی کنجی ہے، اِس نقطۂ نظر سے دینی مدارس میں تعلیم پانے والے بلاشبہ کامیاب زندگی گذار رہے ہیں، جہاں تک برِصغیر میں ان کی طلب کا تعلق ہے وہ روز بروز بڑھ رہی ہے، اس لحاظ سے فضلائے مدارسِ دینیہ کا مستقبل روشن اور لائقِ اطمینان ہے، تعلیم سے فارغ ہوکر فضلائے دارالعلوم نے اپنے لئے زندگی کی جس لائن کو بھی اختیار کیا وہ اس میں کامیاب رہے ہیں، اور بے روزگاری کی شکایت ان کے بارے میں بہت ہی کم سننے میں آتی ہے حالانکہ اس زمانہ میں عصری تعلیم پانے والوں میں بے روزگاری کی شکایت عام ہے۔

اپنی زائد از صد سالہ تاریخ میں دارالعلوم نے ہندوستانی مسلمانوں کو ایک طرف سماجی زندگی کا ترقی یافتہ شعور دیا ہے، تو دوسری طرف انھیں فکر وعمل کا توازن بخشا ہے، آج مسلمانوں کا جو طبقہ اسلامی نظریات کی معقول تعبیر، اسلامی افکار کی اطمینان بخش توجیہ اور صحیح اسلامی زندگی اختیار کئے ہوئے ہے وہ دارالعلوم کی زائد از سو سالہ علمی وعملی جدوجہد کا نتیجہ ہے، عام روایات کے برخلاف یہاں کا مذہبی رجحان کبھی رجعت پسند نہیں رہا۔ دارالعلوم نے اپنے بنیادی اصولوں کی گرفت کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے حالات میں ہمیشہ وقت کے تقاضوں کا اس حد تک ساتھ دیا ہے جس حد تک اسلامی اصول ساتھ دینے کی اجازت دیتے ہیں، اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ دارالعلوم ایک ایسا تعلیمی ادارہ ہے جو قدیم وجدید کے حسین سنگم پر قائم ہے اور جس کی زائد از یک صد سالہ شاندار

روایات اس کے تابناک ماضی کی نقیب اور اس کے عظیم مستقبل کی پیام بر ہیں۔

دار العلوم دیوبند کا علمی اور دینی فیضان

اس میں شک نہیں کہ مسلمان اپنی کمزوریوں کے باعث حکومت کو خیرباد کہہ کر اپنی اجتماعی زندگی کی موت کے فیصلے پر مہر لگا چکے تھے، مگر مشیتِ ایزدی ان کو باقی رکھنا چاہتی تھی، اس کے لئے دینی حرارت کی ضرورت تھی، جو ہمیشہ مسلمانوں کی ترقی کا سرچشمہ رہی ہے، اس سرچشمے کے لئے دیوبند کی سرزمین کو منتخب کیا گیا، چناں چہ صدیوں پہلے سے حضرت مجدد الفِ ثانیؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ کی مبارک زبانوں سے اس سرزمین کو علومِ نبوت کا گہوارہ بننے کی بشارت دی جارہی تھی، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ دار العلوم کی تاسیس و قیام میں حصّہ لینے والے حضرات صرف علوم ظاہری سے ہی آراستہ نہ تھے بلکہ اُن کے قلوب انوارِ الٰہیہ کی تجلّیات کے بھی خزینہ بردار اور آئینہ دار تھے، جنھیں خاص الہام کے ذریعے دار العلوم کے قیام پر مامور کیا گیا تھا، حضرت قاضی محمد اسمٰعیل منگلوریؒ جو اکابر اولیا اللہ میں سے گذرے ہیں فرماتے ہیں کہ " دار العلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور اور مراد آباد کا مدرسہ شاہی اُن مدرسوں میں سے نہیں ہیں جن کو اتفاقیہ طور پر قائم کر لیا جاتا ہے، یہ مدارس خاص الہامات کے ذریعے قائم کئے گئے ہیں[1]، حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ مہتمم پنجم دار العلوم اپنی ایک یادداشت میں تحریر فرماتے ہیں کہ :-

" بعالمِ اسباب اس مدرسہ کو جو کچھ شہرت، عزّت، وجاہت، حرمت، ترقی اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے، یہ محض اللہ کا انعام اور خاص احسان اس مدرسہ پر ہے، ہمیشہ سے اس مدرسہ کو ایسے مقبولانِ بارگاہِ ایزدی کی سرپرستی اور ایسے خاصانِ خدا کی تربیت نصیب ہوئی جن کی توجہ ظاہری

---

[1] علماء ہند کا شاندار ماضی حصّہ پنجم ص ۳۴

وباطنی کی وجہ سے یو ماً فیو ماً اس مدرسے نے ہمیشہ ہر قسم کی ترقی حاصل کی ہمیر دلی میں اخلاص، مدرسین میں اتحاد، ہر ایک امر میں خیر و برکت اور ہر ایک ساعت میں ترقی وغیرہ وغیرہ یہ سب امور انہی حضرات کی توجہ اور انہی ارباب خیر کے توکل کی علامت ہیں ۔[1]

اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اللہ تعالٰی کا اس اُمّت کے ساتھ جو معاملہ رہا ہے اور اُس نے جس طرح پہلے بھی بارہا اُمّت کی دستگیری کی ہے اسی طرح اس موقع پر بھی کرشمۂ ربانی کا ظہور ہوا فلسفۂ تاریخ کی روشنی میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ یہ ناسازگار حالات کا طبعی ردعمل تھا، جس نے مُسلمانوں کے ذہنوں کی خوابیدہ قوتوں کو جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا، اور ان کے اندر زندگی کی ایک نئی روح دوڑا دی۔

اس موقع پر یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ ہندوستان کے مُسلمانوں اور دوسرے ممالکِ اسلامیہ میں دارالعلوم کی تعلیم و تربیت کے کیا نتائج و ثمرات برآمد ہوئے، کیونکہ کسی چیز کی کامیابی کا صحیح معیار دراصل اس کے عواقب و نتائج ہی ہو سکتے ہیں اس سلسلے میں عرصہ ہوا لاہور کے مشہور روزنامہ "زمیندار" نے دارالعلوم دیوبند کے بارے میں لکھا تھا کہ۔

"اس وقت ہندوستان کے طول و عرض میں علوم دینیہ سے واقف جتنی ہستیاں نظر آتی ہیں اُن میں بڑا حصہ اسی دریائے علم (دارالعلوم دیوبند) سے سیراب ہو کر نکلا ہے، ہندوستان کے بڑے بڑے علماء نے اسی عظیم الشان مدرسہ میں زانوئے ادب تہ کیا ہے، اور درحقیقت علمی خدمات کی گراں مائیگی میں ہندوستان کی کوئی درس گاہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، یہی نہیں بلکہ بیرونی ممالک میں بھی ایک دو مستثنیات کو چھوڑ کر کوئی دارالعلوم ایسا نہیں جو اس کے

---

[1] یادداشت بنام اراکین شوریٰ مورخہ ۲۶ ذی الحجہ ۱۳۱۵ھ منسلکہ مسلہ مجلس شوریٰ

فکر کہا سکے اور جس نے ملتِ بیضاء اسلامیہ کی اتنی اہم خدمات انجام دی ہوں۔ لے

دارالعلوم دیوبند اُس وقت قائم ہوا جبکہ ہندوستان میں مذہبی تعلیم کے مدارس یکسر معدوم ہو چکے تھے اور وہ وقت قریب نظر آتا تھا کہ ہندوستان میں جدید تعلیم اور اُس کے اثرات کے سامنے مذہبی تعلیم، اسلامی احکام اور شعائرِ دین کی روشنی گم یا کم از کم مدھم ہو جائے اس پُر آشوب وقت میں دارالعلوم نے ملت کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو سنبھالا، اس لئے جہاں تک مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کی نشاۃِ ثانیہ کا تعلق ہے بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ اس کی تاریخ کا بڑا حصہ دارالعلوم کی مسلسل تعلیمی اور تبلیغی جد و جہد کے دامن سے وابستہ ہے۔ دارالعلوم کی طویل زندگی میں حوادث کے کتنے ہی طوفان اُٹھے اور حالات و سیاسیات میں کتنے ہی انقلاب آئے مگر یہ ادارہ جن مقاصد کو لیکر عالمِ وجود میں آیا تھا انتہائی استقلال اور ثابت قدمی کے ساتھ اُن کی تکمیل میں سرگرمِ عمل رہا۔ یہ حقیقت ہے کہ فکر و خیال کے ان ہنگاموں اور فتنۂ مغرب میں ڈوبی ہوئی تحریکوں کے دور میں اگر بالعموم مدارسِ عربیہ اور بالخصوص دارالعلوم جیسے علمی ادارے کا وجود نہ ہوتا تو نہیں جا سکتا کہ آج مسلمان جمود و بے حسی کے کس گردابِ عظیم میں پھنسے ہوئے ہوتے:

ارشاد و تلقین، تبلیغ و تذکیر، تعلیم و تربیت اور اصلاحِ خلق کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں دارالعلوم کے فضلاء مصروفِ عمل نہ ہوں، اور ملتِ اسلامیہ کی اصلاح و تربیت میں انھوں نے اہم کردار ادا نہ کیا ہو، دعوت و ارشاد اور وعظ و تبلیغ کے بڑے بڑے جلسوں کی رونق اس وقت ہندوستان میں دارالعلوم ہی کے گرامی قدر علماء کے دم سے قائم ہے۔ بڑے بڑے مدارسِ اسلامیہ کی مسندِ تدریس کی زینت آج یہی اصحاب ہیں۔

لے روزنامہ زمیندار لاہور مورخہ ۲۴ جون ۱۹۲۳ء

تعلیمی فکر و عمل کے لحاظ سے دارالعلوم ہمیشہ ایک مخصوص مسلک پر گامزن رہا ہے، یہ مسلک اس کے فہم و فراست کی روشنی اور وقت شناسی کا پورا پورا آئینہ دار ہے، اور صرف اس وقت ہی نہیں بلکہ ایک عرصے بعد تک بھی ہمارے ماہرینِ تعلیم کا ایک بڑا طبقہ اس کو سمجھنے سے قاصر رہا، مگر آخر کار حالات کی گردش نے دارالعلوم کی صداقتِ عمل کو روزِ روشن کی طرح واضح کردیا۔ حتیٰ کہ جن حلقوں سے اب تک دارالعلوم کی شدّ و مد کے ساتھ مخالفت کی جاتی رہی تھی اُن کو بھی اس کی ضرورت اور خدمات کا اعتراف کرنا پڑا، چنانچہ ایک موقع پر جبکہ حیدرآباد دکن سے دارالعلوم کی امداد بند کرانے کے لئے اس کے مخالفین نے تحریک شروع کی تو ڈاکٹر راس مسعود مرحوم نے جو اس وقت حیدرآباد دکن میں وزیرِ تعلیم تھے اس تحریک کی مخالفت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:۔

"اگرچہ ہم انگریزی کی اشاعت میں کوشاں ہیں اور جس طرح معاشی دنیاوی حالت سے ہماری سعی بجا ہے، اسی طرح مذہبی ضرورت سے دیوبند (دارالعلوم) کا وجود ضروری ہے"[1]

بہرائچ کی مشہور درگاہ حضرت سید سالار مسعود غازیؒ کے محافظ خواجہ خلیل احمد شاہ رقم طراز ہیں:۔

"دارالعلوم دیوبند جو ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں علومِ اسلامیہ کا ایک بے مثال مرکز ہے، اور جامعۂ ازہر کے بعد دنیا میں اس کا خاص نمبر ہے، یہی مدرسہ ہے جس نے ہندوستان میں علومِ اسلامیہ عربیہ کے دریا بہادیئے، ہندوستان کے گوشے گوشے میں یہاں کے فضلاء علومِ دینیہ کی تعلیم اور اسلامی خدمات میں لگے ہوئے ہیں، دارالعلوم دیوبند نے دین اور علومِ دینیہ

---

[1] مسل اہتمام نمبر ۱۳۳ بابت ۱۳۵۰ھ

کی جو خدمات انجام دیں وہ آفتاب کی طرح روشن ہیں، ہاں کوئی کور باطنی، ہٹ دھرمی اور حق دشمنی سے اپنی آنکھیں بند کرے تو اس کا علاج نہیں۔[1]

جن لوگوں کو ممالکِ اسلامیہ کی سیر و سیاحت کا اتفاق ہوا ہے، یا اُن ممالک کے حالات اخبارات و رسائل میں اُن کی نظر سے گذرے ہیں اُن کو ایک چیز اُن ممالک کے ذہن و فکر میں تو کسی قدر کم مگر طرزِ معاشرت میں نمایاں نظر آئے گی وہ یہ کہ ممالکِ اسلامیہ کے باشندے مغربی تہذیب و تمدن سے نہ صرف یہ کہ متأثر ہی ہوئے ہیں بلکہ کافی حد تک اس کے اثرات کو اُنھوں نے قبول اور اختیار کر لیا ہے، شام، مصر، عراق اور ایران وغیرہ ممالک جن کی زمینیں براہِ راست صحابہ کرامؓ کے قدوم سے مشرف ہوئیں اور ان کے انفاسِ طیبہ سے بلاد اسلامیہ حاصل کیا، صدیوں تک علومِ نبوت و آثارِ صحابہ سے ان کی فضا درخشندہ رہی اور وہ اسلامی علوم و فنون کا گہوارہ بنے رہے۔ مگر جوں ہی اُن کی سرزمین پر اغیار کے قدم پہنچے نہایت سُرعت کے ساتھ انھوں نے اسلامی علوم و فنون اور اسلامی تہذیب و تمدن کو خیرباد کہدیا اور ایسا تغیر و انقلاب قبول کیا کہ گویا وہ کبھی اس اسلامی خو بُو سے گذرے ہی نہ تھے، یا ہمیشہ سے یورپ ہی کا کوئی خطہ تھے۔

اس معاشرتی اور تہذیبی انقلاب کے علاوہ علمی انقلاب کی کیفیت آپ گذشتہ اوراق میں علامہ سید رشید رضا مرحوم کی زبان سے یہ سُن چکے ہیں کہ "اُس زمانے میں ہندوستانی علماء کی توجہ اگر علم الحدیث کی طرف مبذول نہ ہوتی تو مشرقی ممالک سے یہ علم ختم ہو چکا ہوتا، مصر، شام، عراق اور حجاز میں دسویں صدی ہجری سے چودھویں صدی کے اوائل تک یہ علم ضعف کی آخری منزل پر پہنچ گیا تھا، موصوف نے ۱۳۱۵ھ میں جب مصر ہجرت کی تو

---

[1] "فتاویٰ مُلّا یا دشمنانِ اسلام کے ایجنٹ" مُصنّفہ خواجہ خلیل احمد شاہ، مطبوعہ کلیل پریس، بہرائچ ص ۱۱ و ۱۲۔

جامع ازہر اور دوسری مسجدوں کے خطیبوں کو دیکھا کہ اپنے خطبوں میں ایسی حدیثیں پڑھتے ہیں جن کا کُتبِ حدیث میں کہیں پتہ نہیں، اس کے بعد لکھا ہے کہ واعظوں اور مدرسوں کا بھی یہی حال تھا :

لیکن ہندوستان جو عموماً صحابہ کرامؓ کے تقدم سے بھی محروم رہا ہے اور اُن کے انفاسِ طیبہ سے براہِ راست اسے استفادہ کا موقع بھی نہیں ملا ہے، جب یورپ کے تسلط واقتدار کے ہلاکت بار طوفان نے اسے بہالے جانا چاہا اور ان حوادث کا ڈیڑھ دو صدیوں تک یہاں کے مُسلمانوں کو مقابلہ کرنا پڑا مگر اس کے باوجود آج تک ہندوستان کے مُسلمانوں نے اپنی اسی قدیم اسلامی خوبُو، تہذیب ومعاشرت اور ٹھیٹ مذہبیت کو کلیتہً نہیں چھوڑا جس پر آٹھ سو سال پہلے اس کا سنگِ بنیاد رکھا گیا تھا :

اس فرق کی وجہ ؟ اس کا سبب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ متذکرہ اسلامی خطوں میں انقلاب کے وقت کوئی ایسی منظم دینی جماعت موجود نہ تھی جو انقلاب کی مسموم فضاء میں قوم کی نبض کو دیکھ کر اس کی بقا اور تحفظ کے لئے بطورِ حفظ ماتقدم کوئی ہمہ گیر انتظام کرتی لیکن ہندوستان میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہٗ نے اس تغیر کو اُس کے اوّلین اور دھندلے نقش ہی سے پہچان کر حفاظتی تدابیر کی بنیاد رکھدی تھی، اور وقت کے مناسب ذہن و فکر کی ایسی تشکیل فرمائی، جس نے اجنبی اثرات سے مُسلمانوں کو محفوظ رکھا اور بالآخر اس جماعت کی منظم اور بابرکت مساعی ایک طرف تو دارالعلوم کی شکل میں نمایاں ہو کر مُسلمانوں کے دین و دیانت کی ضمانت دار ثابت ہوئیں اور دوسری طرف ان کے اسلامی رشتوں اور دینی روابط کے استحکام کا ذریعہ بنیں۔ دارالعُلوم اور اس کی جماعت نے یورپ کی الحاد پرور آندھیوں اور لادینی کے زہریلے طوفانوں پر بند لگائے اور مُسلمانوں کو بہاؤ کے دھارے سے بچا کر کنارے پر لگا دیا، انھیں ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا اور اس طرح ہندوستان میں علم نبوت اور آثارِ صحابہ کو قائم رکھ کر مُسلمانانِ ہند کے قدم کو جادۂ مستقیم سے ہٹنے نہیں دیا۔

تیرھویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) پورے عالم اسلام میں سیاسی زوال اور فکری اضمحلال کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں اسلامی ملکوں پر یورپ کو غلبہ حاصل ہوا، اور ہر جگہ کم وبیش اسلامی تہذیب اور اسلامی علوم کو موت وزیست کی کشمکش سے دوچار ہونا پڑا۔ عالم اسلام میں نئی نئی گمراہ کن تحریکوں نے جنم لیا، غرض کہ شاہانِ مغلیہ کے اقتدار کے زوال کے بعد ہندوستان کے مسلمان اپنی تاریخ کے بڑے ہی نازک دور سے گذر رہے تھے، انھیں صحیح رہنمائی کی جس قدر ضرورت اس زمانے میں تھی وتنی پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ مغل سلطنت کا خاتمہ اور انگریزی حکومت کا قیام ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کا ایک عظیم ترین حادثہ تھا! انگریزوں کے جبر وتشدد اور ظالمانہ تسلط میں قوانینِ اسلام کا نفاذ تو بڑی بات تھی۔ خود اسلام اور مسلمان کا ہندوستان میں باقی رہنا بھی مشکل تھا، اس وقت تحفظِ اسلام کی تمام تر ذمہ داری کو سنبھالنے والی علماء ہی کی جماعت تھی۔ سرزمینِ ہند کا چپہ چپہ اس کا گواہ ہے کہ علماء نے اپنے فرائض کی ادائیگی میں شمہ برابر کوتاہی نہیں کی۔ تاریخ کا معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ حکومت کی پشت پناہی سے محروم ہونے کے باوجود گذشتہ سوا سو سال میں ہندوستان کے علماء کرام نے ملت کے تحفظ وترقی کی بھاری ذمہ داری کو اس خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے کہ غیر ملکی حکومت کو اسلام دشمنی کے ہر محاذ پر شکست اٹھانا پڑی۔ اور بحمداللہ مسلمان ہندوستان میں ترقی پذیر رہے!

۱۸۵۷ء کے سیاسی انقلاب کے بعد ہندوستانی مسلمانوں پر مصائب ومظالم کے جو پہاڑ توڑے گئے تھے انھوں نے عام طور پر مسلمانوں میں خوف وہراس اور بے کسی اور درماندگی کا ایک ایسا احساس پیدا کر دیا تھا کہ اگر اس کی جانب کوئی فوری مؤثر قدم نہ اٹھایا جاتا تو نہیں کہا جا سکتا کہ آج ہندوستان میں مسلمانوں کی من حیث الاسلام کیا حالت ہوتی۔ مدارس اور خانقاہیں تباہ وبرباد کر دی گئیں تھیں، علماء کو دار ورسن کی بھینٹ چڑھایا جا چکا تھا، امراء کی جاگیریں ضبط کر لی گئی تھیں، مدارس اور خانقاہوں کے اوقاف خورد برد ہو گئے تھے۔ عوام کو اس شدومد اور کثرت

سے سزائیں دی گئی تھیں کہ لوگوں پر اپنی بے کسی و بے چارگی اور محکومیت کا ایسا عالم طاری ہو گیا تھا جس نے ان کے دینی اور علمی قوتوں کو ماؤف کر دیا تھا، ان میں جمود کی ایک ایسی کیفیت پیدا ہو گئی تھی جس کو دیکھ کر یہ کہنا آسان نہیں تھا کہ یہ قوم پھر سے بھی پنپ سکتی ہے۔ فاتح انگریز کے جوشِ انتقام نے مسلمانوں کے صرف ملک و دولت ہی پر کفایت نہیں کی بلکہ ان کے تیرہ سو برس کے مایۂ نازکارناموں، تہذیب و تمدن علم و فن اور کمالاتِ انسانیت کو برباد کرنے اور مٹانے میں تا حدِ امکان کوئی کسر ایسی نہ تھی جو اٹھا رکھی گئی ہو۔ ان حالات میں یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہیں ہے کہ ہندوستان میں اسلام کا نام بڑی حد تک اسی دارالعلوم اور جماعتِ علماء کی عرق ریزیوں سے اس سرزمین میں زندہ رہا ہے، پھر نہ صرف ہندوستان بلکہ عالمِ اسلام کے بسنے والوں کو اس نے ایک علمی رشتے میں پرو کر ان کی بھی نیاضانہ طریق پر مربیانہ خدمت انجام دی ہے، دنیائے اسلام کے بہت کم ممالک ایسے ہیں جہاں سے علمِ دین کے طالب علم اپنی علمی پیاس بجھانے کے لئے اس دارالعلوم میں آئے نہ ہوں، چنانچہ گزشتہ ایک صدی میں ہزاروں طالبانِ علم اس شمعِ علم سے اپنی اپنی مشعلیں روشن کر کے دنیا کے اندھیروں میں دُور دُور تک پہنچ چکے ہیں۔ سیلون، جاوا سماٹرا، ملایا، برما، چین، منگولیا، تاتار، قازان، بخارا، سمرقند، افغانستان، مصر، شام، یمن عراق، حتیٰ کہ مدینہ منورہ، مکہ معظمہ سے بھی طلباء یہاں پڑھنے کے لئے پہنچے یہ کیا کچھ کم اعجاز ہے کہ وہ ملک جو علومِ نبوت سے براہِ راست کبھی مستفیض نہ ہوا ہو وہ تمام اسلامی دنیا کی دینی تعلیم کا مرکز بن جائے ؟ حتیٰ کہ حرمین شریفین میں بھی اسی آفتابِ علم کی شعاعیں ضیا پاشی کر رہی ہوں، اور یہ سعادت بھی کسی اور درس گاہ کے حصے میں نہیں آئی کہ اس کے طلباء نے مدینہ منورہ اور خاص مسجدِ نبوی میں مسندِ درس کو آراستہ کیا ہو۔ حضرت مولانا خلیل احمدؒ مصنف بذل المجہود حضرت مولانا سید احمدؒ اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے برسہا برس مدینہ منورہ اور مسجد نبویؐ میں حدیثِ نبوی کا درس دیا ہے اور علوم و فنون اور کتاب و سنت کے دریا بہائے ہیں جس سے حجاز کے علاوہ مصر و شام اور عراق کے بکثرت طلباء نے استفادہ کیا اور علم کی پیاس بجھائی

حضرت مولانا مدنیؒ کے برادر بزرگ حضرت مولانا سید احمدؒ نے جو دارالعلوم کے فیض یافتہ تھے مدینہ منورہ میں مدرسۃ العلوم الشرعیہ کے نام سے ایک مدرسہ جاری کیا، جس سے اہل مدینہ منورہ فیض یاب ہو رہے ہیں، حضرت مولانا مدنیؒ فرماتے تھے کہ "مدینہ منورہ کے قیام کے زمانے میں جب میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اور دوسرے ہندوستانی علماء کی تفسیری معلومات علمائے حجاز کے سامنے بیان کرتا تو وہ لوگ حیرت کرتے کہ قرآن فہمی کے یہ اسرار و رموز ان نے کہاں سے حاصل کئے ہیں" مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے مکہ مکرمہ میں مدرسہ صولتیہ قائم فرمایا، یہ مدرسہ دارالعلوم ہی کے خطوط پر قائم کیا گیا ہے۔ اسی طرح مکہ مکرمہ ہی میں دوسرا مدرسہ مولانا اسحٰق امرتسری نے قائم کیا جو دارالعلوم دیوبند کے فیض یافتہ تھے۔

دارالعلوم کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اسلام کے چشمۂ صافی سے سیراب ہے اور اپنی ایک خاص انفرادیت رکھتا ہے۔ اس کی یہ عالمگیر خدمات جو ہندوستان کی حدود سے گذر کر ممالکِ اسلامیہ تک پہونچ چکی ہیں، درحقیقت ہندوستانی مسلمانوں کی حق شناسی اور مالی قربانیوں کا ایک شیریں پھل ہے اور وہ تحدیثِ نعمت کے طور پر تمام اسلامی ممالک میں یہ کہکر اپنا سر اونچا کر سکتے ہیں کہ ایشیا کے مسلمانوں کی یہ سب سے بڑی دینی درسگاہ ان کی فیاضی اور علم دوستی کی اساس پر قائم ہے، اور اس کا دائرۂ فیض ان ہی کی حدود میں نہیں ہے بلکہ غیر ہندوستانی مسلمانوں کو بھی اپنی دینی تعلیم و تربیت کے احاطے میں لئے ہوئے ہے، اور ایک سو تیرہ سال سے ہندوستان میں قال اللہ و قال الرسول کی مجلسیں صرف دارالعلوم ہی کے دم سے گرم ہیں فیوض آبہ کا یہی وہ سرچشمہ ہے جس نے اپنے روحانی آبِ حیات سے ہند اور بیرونِ ہند کے گوشے گوشے میں ایمان کی کھیتیاں ہری بھری کر دی ہیں اور اسی درسگاہ کے تعلیم یافتہ علماء ہند اور بیرون کے اکثر اسلامی ممالک میں دینِ حنیف کی خدمت کا فرض ادا کر رہے ہیں. کوئی انصاف پسند مسلمان اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے جذباتِ بیداری بیشتر دارالعلوم ہی کی مساعیٔ حسنہ کا نتیجہ ہیں!

زمانے نے بہت سی کروٹیں اور مختلف رنگ دکھلائے، مگر دارالعلوم نے کسی وقت اپنا مطمح نظر نہیں بدلا، وہ سو سال سے زیادہ مدت سے اپنے قدیم رنگ پر قائم ہے، اسے بہت سے طوفانوں سے دوچار ہونا پڑا، اور اس نے بہت سی موجوں کے تھپیڑے کھائے ہیں، مگر اس نے اپنا موقف نہیں بدلا، اور اس کے بجائے کہ وہ زمانے کے انقلابات و حوادث سے متاثر ہوتا اس کی کوشش یہ رہی ہے کہ اپنی تاثیر سے زمانے کی فضا کو تبدیل کر دے، اسی لئے برِصغیر کے مسلمانوں میں مدتوں کی محکومیت کے باوجود جتنی دینداری پائی جاتی ہے وہ دوسرے اسلامی ملکوں میں نظر نہیں آتی، مجلۂ علوم الدین علی گڈھ کے ایک مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ :-

"انگریزوں کے تسلط نے یہ خطرہ پیدا کر دیا تھا کہ خدانخواستہ ملک سے دین اور علومِ دین سب رخصت ہو جائیں، ان حالات میں دیوبند کے قیام نے یہ خطرہ دور کر دیا، اور وہ اس آیتِ قرآنی إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ کی زندہ تفسیر بن کر ہندوستان کے نقشے پر ابھرا :

ہند و پاک (برِصغیر) کے مسلمان اپنی دینی زندگی میں دیوبند کے فضلاء کے ممنونِ احسان ہیں، ان کی تبلیغی اور اصلاحی کوششوں سے ملک کے گوشے گوشے میں بدعات اور غلط رسم و رواج کا خاتمہ ہوا، عقائد کی درستی، تبلیغِ دین اور فرقِ ضالہ سے مناظرہ وغیرہ ان حضرات کے نمایاں کارنامے ہیں۔

علمی میدان میں اس کے فضلاء نے عظیم کارنامے انجام دیئے، جن میں مفید کتابوں کی تصنیف و تالیف کے علاوہ قدیم علمی ذخیروں کی دریافت، مفید اور پُرمعنی شروح و حواشی اور بے شمار کتابوں کے ترجمے سب شامل ہیں، علمی میدان میں ان کی خدمات قابلِ قدر اور لائقِ تحسین ہیں۔

دارالعلوم کے متعدد فضلاء نے میدانِ سیاست میں قدم رکھا اور وطنِ عزیز کی آزادی

کے لئے قربانیاں دیں اور مصیبتیں برداشت کیں۔ دارالعلوم دیوبند مسلمانانِ ہند کی سیاسی رہبری کا بھی مرکز رہا ہے۔ اس کے فضلاء نے نہ صرف مختلف تحریکوں کے ساتھ وابستہ ہو کر کام کیا، بلکہ متعدد تحریکوں کے عالمِ وجود میں آنے کا ذریعہ بھی بنے۔ اس طرح برابر وہ مسلمانوں کی صحیح سیاسی رہبری کرتے رہے ہیں۔

بلاشبہ قیامِ دارالعلوم دیوبند وقت کی ایک اہم ضرورت تھی اور اس کے فضلاء نے وقت کی اس اہم ضرورت کو پورا کیا۔ ملک کے ایسے حالات میں جب تعلیم خصوصاً تعلیمِ دین کا تصور نہ تھا انگریزوں کے قائم کردہ اسکول تھے، جو یا تو اپنے طلبہ کو عیسائی بنا کر چھوڑتے یا کم از کم مذہب سے بیزار کر دیتے، دیوبند نے ان حالات میں ملک کی صحیح دینی رہبری کی اور پورے ملک میں دینی فضا پیدا کر دی۔ اس سلسلے میں دیوبند کی خدمات آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔

افغانستان کے ایک سابق سفیر سردار نجیب اللہ خاں نے دارالعلوم کی نسبت اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"دارالعلوم دیوبند افغانستان کے عوام کی نظر میں ایک عوامی علمی درسگاہ ہے۔ مگر میں اپنے مشاہدے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک عوامی درسگاہ ہی نہیں ہے بلکہ اسلامی ثقافت کا مرکز بھی ہے، دارالعلوم نے اس زمانے میں جب کہ ہندوستان پر اسلامی حکومت باقی نہیں رہی تھی دین اور اسلام کی حفاظت کی اور میں اُمید کرتا ہوں کہ وہ آئندہ بھی اسی طرح علوم و فنون کی خدمت میں مشغول رہے گا۔ افغانستان کے عوام علماء اور علم دوست اس کے قدردان ہی نہیں بلکہ علماء کے مددگار اور بہی خواہ بھی ہیں۔ حقیقت میں یہ محفل ثقافتِ اسلامی میں ایک ممتاز ترین محفل ہے اور آپ اپنی نظیر ہے۔ ثقافتِ اسلامی کی بنیاد سچائی، محبت اور حقیقت شناسی پر مبنی ہے، اور یہ محفل ان اجزاء پر مشتمل ہے۔[1]

---

[1] مجلہ علوم الدین، تنکلی آف تھیالوجی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بابت ۱۹۶۱ء-۶۲ء ص ۱۰۵ و ۱۰۶

دارالعلوم کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اس نے ہمیشہ راست کردار اور راست گفتار فرزند پیدا کئے ہیں جن پر دارالعلوم صحیح طور پر فخر کرسکتا ہے[1]۔

ایک مرتبہ کلکتہ کے اخبار "عصر جدید" نے دارالعلوم کی خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:۔

"دارالعلوم دیوبند اسلام کی جو مذہبی اور تعلیمی خدمات انجام دے رہا ہے، اور مغربی تہذیب و تمدن کے سیلاب سے جس طرح اس نے اسلامی ہند کی روحانی عمارت کو محفوظ رکھا ہے ہندوستان کے طویل و عریض براعظم کا ایک ایک گوشہ اس کی گواہی دے سکتا ہے، ایسے وقت میں جب کہ علوم جدیدہ کی روشنی نے ظاہر بین نظروں کو خیرہ کر دیا تھا، جب دنیوی عزت و مناصب کی کشش اچھے اچھے دلوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی، جبکہ لوگ مذہب سے بے پروا اور مذہبی تعلیم کی طرف سے غافل ہو چکے تھے، اور قال اللہ اور قال الرسول کی مقدس آواز نئی تعلیم کے نقار خانے میں دب گئی تھی اور مغربی تعلیم و تمدن کے فاتحانہ شور اور پکار سے مغلوب ہو چکی تھی، اس نازک وقت میں دیوبند اور صرف دیوبند تھا جو قرآن و حدیث کے علم کو سنبھالے ہوئے کھڑا رہا ملک کی غفلتوں اور سرد مہریوں کی آندھی نے رہ رہ کر اس کو گرانا چاہا مگر وہ پہاڑ کی طرح قائم رہا فاتح تہذیب کی خندہ زنی اس کو ایشیائیت اور اس قدامت سے منحرف نہ کر سکی، نئی تعلیم کے سیلاب نے چاہا کہ اپنی رو میں اسے بہالے جائے، اس کو بھی شکست ہوئی اور وہ کس مپرسی کے باوجود ایک طرف اپنے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کا مقابلہ کرتا رہا اور دوسری طرف اپنی روحانیت کی روشنی ملک کے گوشے گوشے میں پہنچاتا رہا، یہاں تک کہ مسلسل جد و جہد کے بعد وہ آج نہ صرف ہندوستان بلکہ ایشیا کے اندر اسلامی تعلیم کا ایک عظیم الشان مرکز ہے اور اس کی روحانیت کی کشش کا یہ عالم ہے کہ نہ صرف پشاور اور رنگون بلکہ قفقاز، موصل، بخارا اور اسلامی دنیا کے ہر حصے سے فدائیان

---

[1] حالات سنویہ ۱۳۶۹ھ / ۱۹۵۰ء ضمیمہ کوائف دارالعلوم دیوبند ص ۷

قرآن و حدیث آ آکر پروانہ وار اس کے گرد مجتمع ہیں۔

کہاجاتا ہے کہ علمار گوشہ نشین ہیں وہ دنیا کے نشیب و فراز سے واقف نہیں، مگر یہ صحیح نہیں ہے، وہ علوم جدیدہ کے مخالف نہیں ہیں، مگر اس مغربیت کے یقیناً دشمن ہیں جو دلوں و دماغوں کو اپنی قومیت سے اپنے مذہب اور اپنی معاشرت سے ناآشنا بنادیتی ہے، وہ جامد اور تنگ نظر نہیں ہیں، مگر یہ ضرور ہے کہ وہ ایسی تعلیم اور ایسی معاشرت کو پسندیدگی کی نگاہوں سے نہیں دیکھتے جو قوم اور ملک کے فرزندوں کو اپنے سے بے گانہ بنادے، ان کا جذبہ قومیت فنا کردے ان کو مذہب سے بے پروا اور مشرقی اخلاق سے بے بہرہ بنادے، ان کے اندر فیشن نوازی، ظاہر پرستی اور آرام طلبی پیدا کردے اور زندگی کے سب سے بڑے اور اہم مقصد یعنی خدا کی عبادت اور اس کی مخلوق کی خدمت کو اُن کی آنکھوں سے اوجھل کردے۔ [1]

اخبار الجمعیۃ دہلی مورخہ ۲۲ اپریل ۱۹۵۴ء نے اپنے افتتاحیہ میں لکھا تھا:۔

اس حقیقت سے انکار کرنا دنیا کی سب سے بڑی سچائی سے انکار ہوگا کہ ہندوستان کے اسلامی اور دینی مدارس خصوصاً دارالعلوم دیوبند نے اسلام اور مسلمانوں کی جو جلیل الشان خدمات انجام دی ہیں، اور جس طرح انھوں نے ذہن کو اسلامی سانچے میں ڈھالا ہے اس کی نظیر دنیا کے کسی نظامِ تعلیم میں نہیں مل سکتی، اتنی سستی اور ارزاں تعلیم جو عربی مدارس میں اب تک دی گئی ہے وہ ساری دنیا میں اپنی نظیر آپ ہے، مدرسین کو اتنی تنخواہ ملتی ہے، جو شاید آج کل دفتر کے چپراسیوں کو ملتی ہوگی، وہ بوریوں پر بیٹھ کر درس دیتے ہیں تاکہ ایسے طلبار تیار ہوں جو مسلمانوں کی مذہبی زندگی کے ذمے دار بنیں۔ طلبار کی استقامت کا یہ حال ہے کہ اُنھیں جو کچھ مل گیا اُس پر قناعت کرلی، مدرسے سے اگر امداد بھی ملی تو صرف اس قدر کہ تیل اور صابن خرید اجا سکے اور طلبار اپنے ہاتھوں سے کپڑوں کو صاف کرسکیں، یہ طلبار محض اللہ کی رضار کے لئے اپنے

---

[1] روزنامہ عصر جدید کلکتہ مورخہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۶ء

آپ کو وقف کر دیتے ہیں اور کوئی پرواہ نہیں کرتے اگرچہ انھیں کسی وقت فاقے سے بھی دوچار ہونا پڑے اور ان کے بدن پر سالم کپڑا بھی نہ ہو!

ان مدارس نے جس قدر سستی تعلیم دی ہے اگر اس کے اعداد و شمار شائع ہوں تو شاید دنیا کو اس پر یقین نہ آئے، یہ مدارس اسلامی زندگی کا سرچشمہ ہیں جن کے ذریعے سے مسلمانوں کے مذہبی جسم میں دین و عقائد کا گرم خون داخل کیا جاتا ہے، اور اس حقیقت سے تو سب ہی واقف ہیں کہ دارالعلوم دیوبند نہ صرف ہندوستان کا بلکہ ایشیا کا سب سے بڑا دینی مرکز ہے، جس میں دنیا بھر کے طلبار تعلیم پاتے ہیں، اور جس کے فیضان علمی کی چادریں تمام ایشیا پر پھیلی ہوئی ہیں[۱]۔

روزنامہ "دعوت" دہلی دارالعلوم کی خصوصیات کے بارے میں رقم طراز ہے:۔

"دارالعلوم دیوبند ہمارے پاس ایک صدی کی امانت ہے۔ ایشیائی ممالک میں یہ واحد ادارہ ہے جو ہر سال تقریباً پندرہ سو طلبار کی کفالت اور تعلیم کی پوری ذمہ داری اس حالت میں لیتا ہے کہ کبھی سرکار سے اس نے ایک پیسہ کی مدد نہیں لی۔ دارالعلوم دیوبند میں ایشیا کو چک سے لے کر حجاز اور شام و عراق تک کے طلبار تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ اور یہاں کے فارغ شدہ طلباء ان ملکوں میں پہنچ کر اپنے تبحر علمی کا سکہ بٹھاتے تھے، ہند و پاک میں مدرسوں کی معلمی اور مسجدوں کی امامت و خطابت کے اہم مناصب آج بھی بیشتر اسی دارالعلوم کے فارغ شدہ طلبار کے ہاتھوں میں ہیں[۲]۔

دارالعلوم کی نسبت ایک مغربی مفکر کی رائے سے آپ کو معلوم ہو گا کہ دارالعلوم کی شہرت و عظمت ایشیا اور افریقہ کے برّاعظم سے گذر کر کناڈا تک پہنچ گئی ہے، وہاں کی میک گل یونیورسٹی

---

[۱] روزنامہ "الجمعیۃ" دہلی مورخہ ۲۰ اپریل ۱۹۵۷ء

[۲] اداریہ روزنامہ دعوت دہلی مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۶۹ء

کاڈائرکٹر کینٹول، سمتھ اپنی کتاب ماڈرن اسلام ان انڈیا میں لکھتا ہے:۔

"ازہر ثانی دارالعلوم دیوبند اسلامی دنیا میں اہم ترین اور معزز ترین مذہبی ادارہ ہے مقدارتی طور سے اس کا اثر و اعزاز ہندوستان میں بہت زیادہ ہے۔ خصوصاً اس وجہ کر اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کی معاشرتی ترقی میں اپنی قدیم روایت کے مطابق کافی دلچسپی لی ہے، اس کی قدیم روایات کا مبدا، شاہ ولی اللہ دہلوی کی تحریک ہے۔ انھیں روایات کے پیش نظر دیوبندی علمار نے مختلف انقلابی تحریکوں میں حصہ لیا۔ مثلاً انقلاب ۱۸۵۷ء یا حال ہی میں کانگریس کی حمایت۔ بریلوی طرز فکر کے برعکس دیوبندی طرز فکر اس سے مطمئن نہیں ہے کہ حالات جوں کے توں رہیں بلکہ وہ حالات کو ترقی دینے کی جد وجہد میں پورے عزم اور جوش کے ساتھ منہمک ہے، اس کا نقطۂ نظر حقیقی اسلام کا احیار ہے۔ یعنی مسلمانوں کو مذہبی رنگ کی بداعمالیوں رُسوم ورواج کی پستی اور اُس مادّی دست بُرد سے نجات دلانا جس کے وہ برطانوی تسلّط کے وقت سے شکار ہورہے ہیں۔

دینیاتی اعتبار سے یہ نقطۂ نظر شدید قسم کی تقلید پسندی کا حامل ہے، اجتہادِ مطلق کا دروازہ اُس کے یہاں سختی سے بند ہے، دیوبند اسلام کی حدود کی نگہداشت میں بہت سخت ہے لیکن ان حدود کے اندر رہتے ہوئے وہ پکا عقلیت پسند ہے، وہ گمراہی، نفاق اور ذہنی کاہلی کو شکست دینے کے لئے برابر کوشاں ہے، اس کا دینی ماحول مکمل طور پر متکلمانہ ہے، اس کے اساتذہ بہت حد تک پُرانے طرز فکر کی تقلید کرتے ہیں۔

علمی میدان میں دیوبندی علمار بہت سخت پُختہ ہیں وہ عزم راسخ کے ساتھ اُس غلط کاری، اوہام پرستی، پیر پرستی اور لوازم جہالت غربت اور خوف وہراس کے خلاف کمربستہ ہیں جو پست دیہاتی سوسائٹی کے رگ وریشے میں سرایت کئے ہوئے ہیں، ان کا نقطۂ نظر روایتی اسلام ہے جو اپنی خالص ترین شکل میں ہو نیز شریعت کا سختی سے نفاذ۔

تاریخ اسلام کے بارے میں ان کا تخیل محققانہ ہے، بخلاف آزاد خیال طبقے کے جو اگرچہ

زمانۂ ماضی میں ایک مثالی دور کا بہت خوشنما اور رنگین نقشہ پیش کرتا ہے لیکن اس نقشے میں اسلامی تعلیمات کی مہذب معلومات کا رنگ بھرنے کے بجائے وہ زمانۂ موجودہ کے آزادانہ خیالات ونظریات کا بہت گہرا رنگ بھر دیتا ہے۔[1]

دارالعلوم کی علمی اور دینی خدمات اتنی واضح ہیں کہ دیکھنے والے کو پہلی نظر میں محسوس ہو جاتی ہیں۔ ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۷ء میں صدر جمہوریہ ہند آں جہانی ڈاکٹر راجندر پرشاد نے دارالعلوم میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:۔

"دارالعلوم کے بزرگ علم کو علم کے لئے پڑھتے اور پڑھاتے رہے ہیں، ایسے لوگ پہلے بھی ہوئے ہیں، مگر کم، جنھوں نے علم کو محض علم کے لئے سیکھا اور سکھایا، ان لوگوں کی عزت بادشاہوں سے زیادہ ہوتی تھی، آج دارالعلوم کے بزرگ اسی طرز پر چل رہے ہیں۔

دارالعلوم نے صرف اس ملک کے رہنے والوں ہی کی خدمت نہیں کی بلکہ اپنی خدمات سے اس نے اتنی شہرت حاصل کرلی ہے کہ غیر ممالک کے طالب علم بھی یہاں آتے ہیں اور یہاں سے تعلیم پاکر اپنے اپنے ملکوں میں اس کی اشاعت کرتے ہیں۔[2] یہ بات اس ملک کے سبھی باشندوں کے لئے قابلِ فخر ہے۔[3]

---

[1] ماڈرن اسلام ان انڈیا ص ۳۲۱

[2] حکومتِ ہند کو مدارس دینیہ خصوصاً دارالعلوم دیوبند کا شکرگذار ہونا چاہئے کہ یہ مدارس حکومت کی مالی امداد کے بغیر بہت معمولی مصارف پر سادگی کے ساتھ ملک سے ناخواندگی کو دُور کرنے اور مذہبی تعلیم کے ذریعے سماج میں اخلاقی شعور بیدار کرنے میں دن رات لگے ہوئے ہیں، صرف یہی نہیں کہ ان کی عظیم خدمات کے نتائج محض ہندوستان تک ہی محدود ہوں بلکہ بقول صدر جمہوریہ ہند دوسرے ملکوں میں بھی ہندوستان کی شہرت وعظمت کا وسیع ترین ذریعہ ہیں۔ سید محبوب رضوی

[3] "صدر جمہوریہ ہند دارالعلوم دیوبند میں" ص ۲۰ و ۲۱۔

دارالعلوم کے نقشِ قدم پر دینی مدارس کا قیام

تیرھویں صدی ہجری کے اواخر میں جب دارالعلوم قائم ہوا تو اُس وقت ہندوستان میں مدارس کا سابقہ نظام تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ کہیں کہیں خزاں رسیدہ کچھ مدارس اگر باقی بھی تھے، تو وہ صرف مقامی حیثیت رکھتے تھے، اُن میں سے کسی کو بھی مرکزی حیثیت حاصل نہ تھی، اس سے قبل اسلامی حکومت نے عوام کو اس سے بے نیاز کر دیا تھا کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم کی ذمہ داری خود اپنے سروں پر اُٹھائیں، مگر اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ آئندہ نسلوں کے لئے کس طرح تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ علاوہ ازیں اُس زمانے میں جن کو دینی مدارس سمجھا جاتا تھا اُن میں علوم معقولہ کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ ان علوم کی کتابیں صدرا، شمس بازغہ اور شرح مطالع اور اس کے شروح وحواشی وغیرہ معیارِ فضیلت سمجھے جاتے تھے، حدیث وتفسیر وغیرہ کی تعلیم کا بہت ہی کم رواج تھا، اس کے برعکس دارالعلوم کا قیام ولی اللہی طرزِ فکر پر عمل میں آیا تھا اس لئے یہاں علوم معقولہ کے بجائے زیادہ اہمیت علوم منقولہ تفسیر وحدیث اور فقہ کو دی گئی تھی، آگے چل کر برِ صغیر میں جتنے بھی دینی مدارس جاری ہوئے اُن میں بھی کم وبیش دارالعلوم کے اسی طریقے کو پسند کیا گیا۔

چناں چہ قیام دارالعلوم کے تقریباً ۶ ماہ کے بعد رجب ۱۲۸۳ھ میں سہارن پور میں مدرسہ مظاہر علوم جاری ہوا، تو اُس میں بھی وہی نصاب جاری کیا گیا جو دارالعلوم میں جاری تھا، پھر رفتہ رفتہ دارالعلوم کے نقشِ قدم پر مختلف مقامات میں دینی مدارس جاری ہو گئے، تھانہ بھون ضلع مظفر نگر میں حافظ عبدالرزاق[۱] صاحب مرحوم نے ایک دینی مدرسے کی بنیاد ڈالی، اور اُسے تعلیمی و انتظامی طور سے دارالعلوم کی شاخ قرار دیا، ۱۲۸۵ھ کی روداد میں تحریر ہے۔

"ہم نہایت خوشی ظاہر کرتے ہیں اس امر پر کہ اکثر حضراتِ باہمت نے اجرار مدارس عربی کو توسیع دینے میں کوشش کر کے مدارس بمقاماتِ مختلفہ دہلی و میرٹھ و خورجہ و بلند شہر و سہارن پور وغیرہ میں جاری فرماتے اور دوسری جگہ مثل علی گڈھ وغیرہ اس کار کی تجویزیں ہو رہی ہیں[۲]۔

پھر ۱۲۹۶ھ کی روداد میں مرقوم ہے۔

"ہم کمال خوشی سے یہ بات ظاہر کرتے ہیں اور منعمِ حقیقی کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس سال میں مقامات میرٹھ، گلاؤٹھی، دان پور وغیرہ میں مدارس اسلامی جدید جاری ہوئے اور

۱؎ حافظ عبدالرزاق مرحوم تھانہ بھون کے رہنے والے تھے، انھیں مسلمانوں کی دینی و دنیوی تعلیم سے بڑا شغف تھا۔ چناں چہ موصوف نے تھانہ بھون میں حوض والی مسجد تعمیر کرا کر اس میں ایک دینی مدرسہ جاری کیا تھا، مدرسہ کے اخراجات کے لئے حافظ صاحب نے مسجد کے اطراف میں دُکانیں بنوائی تھیں، یہ مدرسہ عرصے تک جاری رہا، مولانا فتح محمد صاحب جو دارالعلوم کے اوّلین فارغین میں سے تھے اس مدرسے کے مدرس تھے۔

حافظ صاحب نے انجینیرنگ کی تعلیم کیلئے ایک پرائیوٹ کالج بھی کھولا تھا جس میں وہ خود طلبار کو انجینیرنگ کی تعلیم دیتے تھے۔ اس کالج کے متعدد تعلیم یافتہ سب اُوَرسیروں کو راقم سطور نے دیکھا ہے افسوس ہے کہ حافظ صاحب کے انتقال کی تاریخ معلوم نہ ہو سکی۔ سید محبوب رضوی ۲؎ روداد ۱۲۸۵ھ ص، بمطبع ضیائی میرٹھ

اُن کا تعلق کم و بیش اس مدرسے سے ہوا۔[1]

پھر آخر میں میرٹھ، گلاؤ ٹھی، دان پور وغیرہ کے مدارس کے حالات اور اُن کے قیام کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

حضرت نانوتویؒ نے ایک تقریر میں فرمایا تھا۔

"اکثر مدارس اس مدرسے کی دیکھا بھالی مقرر کئے گئے ہیں تو کوئی مدرسہ اس سے ترقی پا جائے پر اہلِ عقل کے نزدیک وہ بھی دیوبند ہی کا پرتو ہوگا۔"[2]

دارالعلوم دیوبند کے نقشِ قدم پر اُس وقت جو مدارس جاری ہوئے، دارالعلوم کی روداروں میں تفصیل سے اُن کے حالات لکھے گئے ہیں، اُن میں سے چند مدرسے یہ تھے۔

مدرسہ تھانہ بھون

تھانہ بھون ضلع مظفر نگر میں ایک مدرسہ عربی بسعی و کوشش اہلِ اسلام مدت سے جاری ہے، جس کی نسبت وہاں کے مہتمم حافظ عبدالرزاق اور مولوی فتح محمد صاحب مدرس کی یہ رائے ہوئی کہ یہ شاخ مدرسہ عربی دیوبند کیا جاوے اور اس کی خواندگی کا انتظام و آمد و صرف نگرانی معرفت مہتمانِ مدرسہ دیوبند ہو، اس لئے حسبِ مشورہ مہتمانِ مدرسہ ہذا اُس مدرسے کو شاخ مدرسہ ہذا کر لینا مستحسن معلوم ہوا، چناں چہ محرم الحرام ۱۲۹۱ھ سے انتظام اس کا سپرد مہتمم مدرسہ عربی دیوبند کیا گیا۔[3]

۱۲۹۲ھ کی روداد میں مرقوم ہے:-

خداوند تعالےٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس تھوڑے سے عرصے میں اس مدرسہ (دارالعلوم دیوبند) کا منشا رحاصل ہونے لگا، اور اس نے اپنے کام میں وہ عروج اور کمال پیدا کیا کہ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں اس قسم کے بہت سے مدرسے جاری ہوگئے اور ہورہے

---

[1] روداد ۱۲۹۶ھ ص ۶۱ مطبوعہ مجتبائی دہلی [2] روداد ۱۲۹۰ھ ص ۱۲

[3] روداد ۱۲۹۰ھ ص ۵۱ مطبوعہ مطبع فاروقی دہلی۔

ہیں اور انشاء اللہ آئندہ ہوں گے، معاونانِ مدرسہ ہذا کو مبارک ہو۔ اور مقاماتِ ذیل کے اہلِ ہمت وکرم نے اپنے مقامات پر جن کا بالتفصیل آئندہ انشاء اللہ ذکر کریں گے۔ مدارسِ عربی جاری کرکے اس مدرسے کے تابع کر دیا، اور اپنی خوشی سے اُن کو شاخ مدرسہ ہذا قرار دیا، یہ اُن کی خوش فہمی اور عالی ہمتی کی دلیل ہے، تھانہ بھون، مظفر نگر، گلاؤٹھی، کیرانہ، انبٹہ۔[1]

۱۲۹۶ھ کی روداد میں لکھا ہے کہ:۔

ہم کمال خوشی سے یہ بات ظاہر کرتے ہیں اور منعم حقیقی کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس سال میں میرٹھ، گلاؤٹھی، دان پور میں مدارسِ اسلامی جدید جاری ہوئے اور اُن کا تعلق کم و بیش اس مدرسہ (دارالعلوم دیوبند) سے ہوا اور اُن مقامات کے باشندوں کو مبارک باد دیتے ہیں اور خدائے عزوجل کی جناب میں دعا کرتے ہیں کہ ان مدارس کو قیام ہو اور روز بروز ترقی پکڑیں اور بڑے بڑے شہروں اور قصبوں کے مسلمانوں کو اس کارِ خیر کی تقلید کی توفیق ہو۔ اے خدائے پاک وہ دن دکھلا کہ کوئی بستی اس دولتِ پائیدار سے خالی نہ رہے اور ہر گلی کوچے میں علم کا چرچہ ہو اور جہل عالم سے کافور ہو، آمین اللّٰھم آمین۔ اب ہم بغرض تفریح ناظرین ہر ایک کا حال بالاجمال جدا جدا عرض کرتے ہیں۔[2]

مدرسہ اسلامی میرٹھ

"میرٹھ ایک مشہور شہر ہے کہ ایسے عمدہ موقع پر مدرسہ کا ہونا مسلمانوں کو کمال درجے تقویت بخش ہے، الحمد للہ کہ سالِ حال میں بحُسن سعی مولوی محمد ہاشم صاحب رئیس میرٹھ یہ مدرسہ غریب مسلمانوں کے چندے سے جاری ہوا[3]، اگرچہ اس شہر کی حیثیت کے موافق اب تک چندہ نہیں ہوا، مگر انشاء اللہ اُمید قوی ہے۔

---

[1] روداد ۱۲۹۳ھ ص ۱۳ [2] روداد ۱۲۹۶ھ ص ۶۱-۶۳ - [3] یہ مدرسہ حضرت نانوتوی نے اپنے آخری زمانۂ قیام میرٹھ میں قائم کیا تھا، یہ مدرسہ دارالعلوم دیوبند کی شاخ تھا، اس کے اوّلین اساتذہ دارالعلوم کے فارغ التحصیل فضلاء تھے، مولانا ناظر حسن دیوبندی (باقی حاشیہ صفحۂ آئندہ پر)

جلد چندہ کافی فراہم ہوگا اور یہ مدرسہ اچھی ترقی پکڑے گا۔ بالفعل اس مدرسے کے مہتمم جناب مولوی محمد ہاشم[1] صاحب ہیں، مولوی ناظر حسن صاحب تعلیم یافتہ مدرسہ عربی دیوبند، مدرس اوّل عربی ہیں، ایک مدرس فارسی اور ایک قرآن شریف کے، اور ایک شخص واسطے وصول

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) جو بعد میں شمس العلماء ہوئے اور حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندی اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی (جو علی الترتیب بعد میں دار العلوم کے مفتی اعظم اور مہتمم ہوئے) اس مدرسہ کی مسند درس کو زینت دیتے رہے۔ حضرت مولانا حکیم محمد اسحٰق کٹھوری (وفات ۱۳۶۳ھ) حضرت قاری محمد اسحٰق میرٹھیؒ خلیفہ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندی (وفات ۱۳۶۴ھ) اور حضرت مولانا قاضی بشیر الدین قاضی شہر میرٹھ مؤلف تذکرہ عزیزیہ وغیرہ (وفات ۱۹۴۵ء) والد ماجد حضرت مولانا قاضی زین العابدین سجاد اور حضرت مولانا سراج احمد میرٹھی مدرس مدرسہ دار العلوم دیوبند جیسے حضرات اس مدرسہ کے اوّلین طلباء میں شامل تھے، مولوی محمد ہاشم مالک مطبع ہاشمی میرٹھ اس کے مہتمم تھے۔

۱۳۳۹ھ/ ۱۹۱۹ء میں جب یہ مدرسہ غیر دیوبندی عناصر کے قبضے میں چلا گیا تو مولانا قاضی بشیر الدین اور مولوی محمد سراج صاحب (خلف الرشید مولوی محمد ہاشم صاحب سابق مہتمم مدرسہ) یہ دونوں حضرات مدرسہ کی ممبری سے مستعفی ہو گئے اور ایک نیا مدرسہ جامع مسجد میرٹھ میں مدرسہ دار العلوم کے نام سے قائم کیا، اس مدرسے کے پہلے صدر مدرس حضرت مولانا خلیل احمد انبھٹویؒ کے مشورے سے مولانا مبارک حسین سنبھلی مقرر ہوئے، جو حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد اور نامور واعظ و مناظر تھے، مہتمم حاجی ظہور علی صاحبؒ والد ماجد حضرت مولانا بدر عالم مہاجر مدنیؒ تجویز ہوئے۔ حضرت مولانا قاضی زین العابدین سجاد صاحب اس مدرسہ دار العلوم کے پہلے طالب علم ہیں۔

[1] مولوی محمد ہاشم مرحوم میرٹھ کے رہنے والے تھے، اُن کا ایک پریس مطبع ہاشمی کے نام سے میرٹھ میں قائم تھا، ۱۲۸۵ھ میں جب منشی ممتاز علی حج کے لئے گئے تو حضرت نانوتویؒ کا تعلق مطبع ہاشمی سے قائم ہو گیا تھا دار العلوم دیوبند کی بعض رودادیں مطبع ہاشمی کی چھپی ہوئی موجود ہیں۔ (باقی صفحہ آئندہ پر)

کرنے چندے کے ملازم ہیں اور تعداد طلباء بھی اچھی اور طرز تعلیم بھی عمدہ ہے، میرٹھ کے مُسلمانوں کو اس طرف ہمت لگانی چاہیئے اور نقد و جنس سے امداد فرمانی چاہیئے، اگر سب مُسلمان ایک ایک پیسہ دیں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے، مُسلمانوں کو چاہیئے کہ اپنی نسل کو بلائے جہل سے بچاویں اور اس مدرسہ کو اپنے حال و مآل کی اصلاح کا باعث سمجھیں، اور دل و جان سے اس کی ترقی میں مدد کریں، واللہ ولی التوفیق۔

مدرسہ اسلامی گلاؤٹھی

قصبہ گلاؤٹھی ضلع بلند شہر میں جناب منشی سید مہربان علی صاحب[1] رئیس نے حسب ہدایت حضرت نانوتویؒ یہ مدرسہ جاری فرمایا اور اپنی عالی ہمتی سے اس کے استحکام اور قیام کی عمدہ تدبیر تجویز فرمائی۔ بارک اللہ بالفعل اس مدرسہ میں دو مدرس ہیں اور حُسنِ اتفاق سے دونوں کا نام مولوی عبداللہ ہے اور دونوں تعلیم یافتہ مدرسہ عربی دیوبند کے ہیں اور ماشاء اللہ دونوں فاضل ہیں۔ یاالٰہی اس مدرسے کو قیام بخش اور مُسلمانوں کو توفیق دے کہ اس سے نفع اٹھاویں۔ اور اس کے بانی کو خیر و برکت سے معمور فرما۔

آمین ثم آمین۔

نیز بخاری شریف، کیمیائے سعادت، جلالین شریف، بیان القرآن وغیرہ بہت سی کتابیں اس مطبع میں چھپیں، حضرت مولانا احمد علیؒ محدث سہارنپوری کا تعلق بھی اس مطبع سے رہا ہے، چنانچہ ۱۲۸۲ھ کی روداد میں حضرت محدث صاحب موصوف کے نام سے جو چندہ درج روداد ہے اُس میں مطبع ہاشمی میرٹھ کا پتہ تحریر ہے، مولوی محمد ہاشم نے ۱۳۰۳ھ میں وفات پائی: مولوی محمد ہاشم کے بھی متعدد گراں قدر چندے دارالعلوم کی رودادوں میں درج ہیں، یہ قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی کے جدِ امجد قاضی عبدالباری مرحوم کے برادر نسبتی تھے اور مفتی شوکت علی فہمی مدیر "دین دنیا" دہلی کے نانا۔ سید محبوب رضوی

[1] منشی سید مہربان علی (۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء - ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۹ء): گلاؤٹھی کے ایک فیاض اور مخیر رئیس تھے، ریاست

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

مدرسہ اسلامی دان پور [۱]

قصبہ دان پور ضلع بلند شہر میں جناب نواب محمد معشوق علی خاں [۲] صاحب رئیس قصبہ مذکور نے اپنی ہمت عالی سے ایک مدرسہ اسلامی جاری فرمایا، اور طلبا مسافرین کے لئے سامانِ معقول راحت کا تجویز کیا، واقعی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) بھرت پور میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے بعد ازاں گھوڑوں کی تجارت شروع کر دی، اور خیل کا کارخانہ کھولا جو اس زمانے کی ایک اہم صنعت اور آمدنی کا بڑا ذریعہ تھا۔ اس میں بہت فائدہ ہوا۔

منشی صاحب مرحوم نے قیام دارالعلوم کے سال (۱۲۸۳ھ) میں گلاؤٹھی میں اپنے صرف سے ایک شاندار جامع مسجد تعمیر کرائی۔ ——— مسجد کا سنگ بنیاد منشی صاحب نے حضرت نانوتوی سے رکھوایا۔ ۱۲۸۳ھ میں مدرسہ منبع العلوم ابتداءً منشی صاحب کے محل میں جاری ہوا۔ بعد میں جب جامع مسجد اور مدرسہ کی عمارت مکمل ہو گئی تو اس میں منتقل کر دیا گیا۔ حضرت مولانا عبداللہ انصاری اس کے سب سے پہلے مدرس تھے۔ منبع العلوم کے اُفق سے علم و فضل کے متعدد درخشندہ ستارے طلوع ہوئے۔ حضرت مولانا حافظ محمد احمد مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک کے ایک اہم رکن حضرت مولانا منصور انصاری، حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ حضرت مولانا فخرالدین احمد شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ اور آخر میں حضرت مولانا بشیر احمد نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے حضرات نے اپنی ابتدائی تعلیم کا آغاز اسی مدرسے کیا تھا، اس کا علمی فیضان اب تک جاری ہے راقم سطور نے بھی اپنی طالب علمی کی کچھ مدت اس مدرسے میں گزاری ہے۔

منشی صاحب کو رفاہ عامہ کے کاموں سے بڑی دلچسپی تھی، گلاؤٹھی کی جامع مسجد اور مدرسہ کے علاوہ دو مسجدیں اور تعمیر کرائی تھیں، ۵۲ پختہ کنوے بنوائے، ایک شفاخانہ جاری کیا، جس کے مصارف خود برداشت کرتے تھے، گلاؤٹھی سے دو میل کے فاصلے پر کالی ندی کا پل ۱۹ در کا بنوایا، کئی مسافرخانے تعمیر کرائے۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس زمانے میں اس کار سے بہتر کوئی کارِ خیر اور کوئی عمدہ خیر خواہی اور رفاہِ عام کی سبیل نہیں باقیات الصالحات اسی کا نام ہے. پاک پروردگار اس مدرسے کو قیام و استحکام عطا فرماوے اور مسلمانوں کو توفیق دے اور اس کے بانی مبانی کو سب بلاؤں سے اپنے حفظ و امان میں رکھے اور بالفعل اس مدرسے کے مدرس مولوی احمد اللہ صاحب تعلیم یافتہ مدرسہ عربی دیوبند ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) دار العلوم دیوبند کے مخلص ہمدرد اور بہی خواہ تھے، اور ہمیشہ اپنے چندوں سے دار العلوم کی مدد کرتے رہے، منشی صاحب نے چار لڑکیاں اپنی یادگار چھوڑیں، ان کے شاندار محلات آج بھی اپنی عظمتِ دیرینہ کے گواہ ہیں۔

لہ دان پور، علی گڈھ سے انوپ شہر (ضلع بلند شہر) جانے والی سڑک پر علی گڈھ سے ۲۳ کے فاصلے پر واقع ہے۔

ٰٰٰٰٰٰ٢ے ان کا اصل نام کنور مسعود علی خان تھا، ان کے نانا کنور وزیر علی خان نے اپنی جائیداد کو مختلف اعزہ میں تقسیم کردیا تھا، جائیداد کا بڑا حصہ کنور مسعود علی خان کو ان کی دنیوی فراست اور دینی شغف کے پیشِ نظر دیا، انھوں نے اپنے نانا کی یادگار میں ایک دینی مدرسہ دان پور میں جاری کیا جس کا نام وزیر العلوم رکھا، مدرسے کے اخراجات کے لئے کئی گاؤں وقف کردیئے، مدرسہ میں ایک زمانے تک دورۂ حدیث تک تعلیم کا انتظام رہا ہے، طلبار کے قیام اور خورد و نوش کے مصارف مدرسے کی جانب سے پورے کئے جاتے ہیں، اس مدرسے میں حفظ قرآن اور قرأت کا خاص اہتمام رہا ہے، چنانچہ آج بھی دان پور و اس کے اطراف میں تقریباً ایک ہزار حفاظ ایسے ہیں جنھوں نے اسی مدرسے میں حفظ کیا ہے، آج کل کنور عمار احمد خان، کنور مسعود علی خان کے وارث اور اس خاندان کے چشم و چراغ ہیں، جناب ممدوح کی نگرانی میں یہ مدرسہ اب تک جاری ہے

یہ لوگ مسلم لال خانی راجپوتوں کا ایک معزز اور رئیس خاندان ہے (باقی صفحہ آئندہ پر)

مدرسہ اسلامی مُراد آباد

مراد آباد ایک مشہور و معروف شہر ہے، وہاں کے غریب مُسلمانوں نے حسبِ ایماء حضرت نانوتوی عرصہ دو تین سال سے ایک مدرسہ اسلامی جاری کیا ہے۔ اگرچہ اوائل میں یہ کارخانہ بہت مختصر تھا، مگر ماشاء اللہ آج یہ مدرسہ اچھے عروج پر ہے اور یوماً فیوماً اُمیدِ ترقی ہے۔ واقعی اس مدرسے کے جملہ کارپردازان نہایت زیرک اور امانت دار و دیانت دار ہیں، خداوند تعالیٰ نے اُن کی سعی میں برکت عطا فرمائے اور اس کارخانے کو قائم رکھے اور زیادہ تر ترقی بخشے، آمین۔ اور اس کارخانے کی زیادہ ترقی و رونق کے سبب مولوی میر احمد حسن صاحب شاگردِ رشید حضرت مولانا مولوی محمد قاسم صاحبؒ جو مدرس اول اس مدرسے کے ہیں اُن کے اخلاقِ حمیدہ سے وہاں کے جملہ مُسلمانان کمال درجہ خوش ہیں، بارک اللہ۔ مہتمم اس مدرسے کے مرزا محمد نبی بیگ ہیں۔ اور نیز چند وجوہ سے اس مدرسہ کو ہم اپنا ہی مدرسہ سمجھتے ہیں، اور اس کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں۔ اللہم زد فزدؔ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) جس کی ریاستیں بلند شہر اور علی گڈھ کے اضلاع میں واقع تھیں اس خاندان کے رؤسا دینی اور ملّی کاموں میں ہمیشہ شریک رہے ہیں، نواب محمود علی خان چھتاری جن کو شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے شرفِ بیعت حاصل تھا، اور نواب یوسف علی خاں، نواب عبدالصمد خاں اور نواب حافظ احمد سعید خاں آف چھتاری چانسلر مُسلم یونیورسٹی علی گڈھ اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

کنور مسعود علی خاں نے اگست ۱۸۹۶ء میں انتقال کیا۔

(ماخوذ از مکتوب کنور عمار احمد خاں صاحب بنام راقم سطور مورخہ ۱۰ ر اکتوبر و ۶ ر نومبر ۱۹۷۳ء)

لہ روداد ۱۲۹۶ھ طبع قدیم ص ۶۱ - ۶۳

مراد آباد کا یہ مدرسہ جامعہ قاسمیہ کے نام سے موسوم ہے، یہ مراد آباد کی شاہی مسجد میں قائم ہے، دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی دور میں جو دینی مدارس جاری ہوئے اُن میں مظاہر علوم سہارن پور کو چھوڑ

(باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

اس موقع پر یہ بات یاد رہے کہ آج مدارس کا قیام کچھ زیادہ مشکل نہیں رہا ہے۔ مگر سو سوا سو سال پہلے کے حالات کا خیال کیا جائے، جب اس طرح کے مدارس کا رواج نہ تھا اور لوگ قیام مدارس کے اس طریقے اور اُن کی ضرورت سے زیادہ واقف نہ تھے ان حالات میں حکومت کی امداد و اعانت کے بغیر صرف عام مسلمانوں کے چندے کے بھروسے پر دینی مدارس جاری کرنا ایک زبردست کام تھا، اُس وقت سے لے کر اب تک برِ صغیر کے طول و عرض میں بحمداللہ بے شمار دینی مدارس جاری ہو چکے ہیں، اور روز بروز ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، ان میں سے بہت سے مدرسوں کا دارالعلوم سے باقاعدہ الحاق بھی ہے، ایسے مدارس کے امتحانات کے لئے دارالعلوم سے ممتحنین کا بندوبست کیا جاتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند سے ملک کے دینی مدارس کا یہ الحاق جماعتِ دیوبند کی شیرازہ بندی، علمی تنظیم، فکری اتحاد اور یگانگتِ باہمی کا ایک مفید اور مؤثر ذریعہ ہے، اس چیز نے دارالعلوم کو ایک مقامی تعلیم گاہ کے بجائے ایک یونیورسٹی کی حیثیت دینے اور ملک گیر تحریک بننے میں بڑی مدد پہنچائی ہے۔

دارالعلوم دیوبند کا علمی فیضان محض عالم بنا دینے تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ اس کے ہمہ گیر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کہ جامعہ قاسمیہ نے سب سے زیادہ ترقی کی ہے، اس مدرسہ کو اپنی تعلیم کی عمدگی کے باعث دینی مدارس میں بڑی شہرت حاصل رہی ہے، جامعہ قاسمیہ مراد آباد کو بام ترقی پر پہنچانے میں حضرت مولانا عبدالحق مدنیؒ مہتمم جامعہ قاسمیہ کی انتظامی مساعی اور حضرت مولانا سید فخرالدین احمد صدرالمدرسین کے درسِ حدیث کی عظیم تعلیمی خدمات کا بڑا حصہ ہے، حضرت مولانا سید محمد میاںؒ سابق شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ دہلی بھی ایک عرصے تک جامعہ قاسمیہ سے وابستہ رہے ہیں۔

سید محبوب رضوی

اثرات سے ایسا ماحول بھی پیدا ہوگیا جس سے جابجا دینی مدارس قائم ہوتے چلے گئے، دارالعلوم دیوبند کے قیام کے بعد ملک میں جس کثرت سے دینی مدارس قائم ہوئے اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اُس وقت مسلمانوں میں دینی مدارس قائم کرنے کا شدید جذبہ موجود تھا، لیکن اجرائے مدارس کے قدیم وسائل چونکہ یکسر ختم ہو چکے تھے، اس لئے ہمتیں پست ہوگئی تھیں، مگر جب دارالعلوم دیوبند نے پہل کی تو مسلمانوں کے سامنے ایک نئی شاہراہ کھل گئی، اسی کے ساتھ بعض مدارس کے منتظمین نے دارالعلوم کی حیثیت کو مرکزی قرار دے کر مناسب سمجھا کہ اپنے اپنے مدرسوں کو دارالعلوم دیوبند کے زیرِ اثر ایک سلسلے میں منسلک کر دیں۔

مُلتان میں مدرسہ حقانیہ نعیمیہ صد ہا سال پُرانا مدرسہ ہے، اس مدرسے کے موجودہ مہتمم مولانا شفیق احمد صاحب لکھتے ہیں کہ "مدرسہ کی کوئی مستقل یا غیر مستقل آمدنی نہیں ہے، اس لئے مدرسے کو چلانا دشوار ہو رہا ہے، میرے ایک دوست نے مشورہ دیا کہ فلاں حاکم وقت سے تعلق پیدا کرلو تو تمہاری مالی پریشانی دُور ہو جائے گی، اور آئندہ کے لئے معقول انتظام ہو جائے گا، مولانا شفیق احمد صاحب لکھتے ہیں کہ" میں نے اس مقصد کے لئے استخارہ کیا تو پہلے کئی راتوں تک خواب میں علمائے وقت کی زیارت نصیب ہوتی رہی، علمائے کرام کی زیارت سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ حکامِ وقت سے رابطہ پیدا کر کے ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ علماء کے طریقے پر عمل کرنا چاہئے اور حکومت کی امداد کے بجائے چندے پر مدرسہ کو چلانا چاہیے"[۱]

مدارسِ دینیہ کے الحاق سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مختلف مقامات کے مدارس ایک مخصوص انتظامی اور تعلیمی سلسلے میں منسلک ہو گئے جس سے ان مدارس کے نظام اور طریقِ تعلیم میں یکسانیت پیدا

---

[۱] مکتوب مولانا شفیق احمد صاحب مؤرخہ ۱۹ ربیع الثانی ۱۳۹۶ھ بنام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند

ہو گئی۔ مدارسِ دینیہ کی یہ ہم آہنگی اور یگانگت باہمی علمی تنظیم اور مدارس و علماء کی شیرازہ بندی نہایت کار آمد ثابت ہوئی۔

اس کے علاوہ مختلف مقامات میں مدارس کے قیام سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ جن دور دراز مقامات کے طلباء کے لئے دارالعلوم دیوبند تک پہنچنا مشکل تھا وہ اپنے گرد و پیش کے مدارس سے اپنی علمی اور دینی پیاس بجھانے لگے، اور چونکہ ان مدارس میں بالعموم دارالعلوم ہی کے فاضل علماء تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے، اس لئے دارالعلوم کی صوری و معنوی برکات سے فائدہ حاصل کرنے کا موقع فی الجملہ اُن کو بھی مل گیا، اُسی زمانے میں دارالعلوم کی یہ تحریک شمالی ہند سے گزر کر جنوبی ہند میں مدراس کے ایک مقام وانمباڑی تک پہنچ گئی تھی، آئینۂ وانباڑی میں لکھا ہے کہ" وہاں تحریک دیوبند کی نسبت سے درسِ نظامی کے سلسلے کی ایک دینی درسگاہ معدن العلوم کے نام سے جاری کی گئی، اس درسگاہ سے جو علماء فارغ ہو کر نکلے وہ مدراس اور بیرونِ مدراس میں علمی اور دینی خدمات میں معروف ہیں۔"[1]

دینی مدارس کے اس فروغ سے برِ صغیر کے تمام گوشوں تک کم و بیش دارالعلوم دیوبند کے اثرات پہنچ گئے، ہند و پاک اور بنگلہ دیش کے دینی مدارس اپنی اپنی جگہ عام مسلمانوں کے تعاون و امداد سے دینی خدمات انجام دے رہے ہیں، خدا کا شکر ہے کہ مدارسِ عربیہ کے قیام کا یہ سلسلہ روز بروز ترقی پذیر ہے، اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ!

یہ حقیقت ہے کہ آج برِ صغیر میں جس قدر بھی دینی مدارس نظر آتے ہیں اُن میں سے بیشتر وہی ہیں جو دارالعلوم دیوبند کے نقشِ قدم پر یا اس کے قائم کئے ہوئے اثرات سے جاری ہوئے ہیں، اس لئے مدارسِ دینیہ کی تعلیمی ذمہ داریاں زیادہ تر فضلائے دارالعلوم دیوبند کے ذریعے سے انجام پا رہی ہیں، اس طرح دارالعلوم دیوبند کا وجود اسلام کی جدید تاریخ میں

---

[1] آئینۂ وانباڑی ص ۴۴ مطبوعہ ۱۹۶۰ء

ایک عہد آفریں حیثیت رکھتا ہے اور یہیں سے اس وقت پورے برصغیر میں دینی تعلیم گاہوں کا جال پھیلا ہوا ہے۔

بہت سے حضرات مدارسِ دینیہ بالخصوص دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد دینی مدارس قائم کرنے کی لگن اپنے ساتھ لے کر نکلتے ہیں، انھوں نے بہت سے مدارس کو وجود بخشا ہے، چنانچہ قیام دارالعلوم سے اب تک برصغیر میں اتنی بڑی تعداد میں مدارس جاری ہو چکے ہیں کہ اُن سب کا شمار آسان نہیں ہے، کلکتہ کی ایک انجمن ندائے اسلام مدارس دینیہ کی فہرست شائع کرتی رہتی ہے، ۱۳۹۳ھ / ۱۹۷۳ء کی فہرست میں ۲۰۸۰ دینی مدارس کے نام درج ہیں، جن میں صرف اتر پردیش کے ۲۲۸ مدارس کے نام ملتے ہیں[1]۔ اس کوشش کے باوجود جو انجمن ندائے اسلام مدارسِ دینیہ کا کھوج لگانے کے لئے کرتی رہتی ہے اس فہرست میں ہندوستان کے نصف سے بھی کم مدرسوں کے نام نظر آتے ہیں، بہت سے ایسے مدارس جن کا خود راقم سطور کو علم ہے ان کے نام اس فہرست میں درج نہیں ہیں۔

پاکستان کے ۹۱۵ دینی مدارس میں دیوبندی مسلک کے مدارس کی تعداد ۵۸۰ ہے[2]، بقیہ ۳۳۵ مدارس اہل حدیث، اہل تشیع اور بریلوی مسلک کے ہیں یہ اعداد و شمار ۱۳۹۱ھ / ۱۹۷۱ء کے ایک جائزے سے ماخوذ ہیں، بعد کے پانچ سالوں میں یقیناً اس تعداد میں اضافہ ہوا ہوگا۔

بنگلہ دیش میں بھی جا بجا مدارس کا جال بچھا ہوا ہے، مگر افسوس ہے کہ وہاں کے اعداد و شمار دست یاب نہیں ہو سکے۔

---

[1] ماخوذ فہرست انجمن ندائے اسلام کلکتہ مطبوعہ ۱۳۹۳ھ / ۱۹۷۳ء

[2] تفصیل کے لئے دیکھئے ماہنامہ "الرشید" لاہور کا دارالعلوم دیوبند نمبر

تحفّظِ دین کی مساعی

یورپ کے عیسائی ممالک ابتدا ہی سے مُسلمانوں کے حریف رہے ہیں۔ اُنھوں نے بُت پرست قوموں کو کبھی اپنا دشمن نہیں سمجھا، یہ قومیں عیسائی دنیا میں بین الاقوامی سیاست کے لئے کوئی خطرہ پیدا نہیں کرسکتی تھیں۔ لیکن مُسلمانوں کو بین الاقوامی حیثیت حاصل تھی، انھوں نے نہ صرف ایشیا میں اپنی حکومتیں قائم کیں بلکہ یورپ کے ملک اسپین کے اندر آٹھ سو سال تک حکومت کرتے رہے، اور پھر چھ سو سال تک قدیم مشرقی روما کے پایۂ تخت قسطنطنیہ اور اُس کے زیرِنگیں ممالک پر حکمراں رہے۔ عیسائیوں کے اصل مدِمقابل مُسلمان ہی تھے، چودہ سو سال کی مدّت میں دونوں قوموں کے مابین بڑی بڑی جنگیں ہوئیں، صرف فلسطین کی سرزمین پر تیرہ صلیبی جنگیں لڑی گئیں، جن میں یورپ کے متحدہ بیڑے نے شرکت کی، اور بالآخر شکست کھائی، چھ سو سال تک ترکوں کو یورپ کی عیسائی قوموں سے نبرد آزما رہنا پڑا، عیسائی دنیا صرف مُسلمانوں سے خائف تھی اور وہ اسی جوڑ توڑ میں لگی رہتی تھی کہ مُسلمانوں کی سیاست میں کمزوری پیدا ہو اور وہ اس کمزوری سے فائدہ اُٹھائے۔ پھر اٹھارویں صدی عیسوی میں جب انگریزوں نے ہوسِ ملک گیری میں سرزمینِ ہند پر قدم رکھے تو اُس وقت

یہاں بھی مسلم اقتدار ہی کا پرچم لہرا رہا تھا۔ اس لئے انگریزوں نے ہندوستان آکر مسلمانوں ہی کو اپنا حریف سمجھا اور اُن کو کچلنے کی تدبیریں کرتے رہے۔ انگریزوں کے نزدیک مسلمان کسی ہمدردی کے مستحق نہ تھے، ۱۸۵۷ء کے جذبۂ انتقام نے انھیں مسلمانوں کے ساتھ عدل و انصاف کے انسانی جذبات سے بھی محروم کردیا تھا۔ چونکہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب اور اس سے پہلے انگریزوں کی مخالفت کی ہر تحریک میں مسلمان پیش پیش تھے۔ اسی لئے انگریزی حکومت کے استحکام کے بعد اُن ہی کو سب سے زیادہ موردِ عتاب بنایا گیا۔ مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کی شکست کے بعد ہندوستان پر جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط پورے طور پر قائم ہوگیا تو عیسائی مشن کی پُرجوش سرگرمیاں پورے ملک میں پھیل گئیں، ہندوستان میں عیسائی مشن کی تبلیغی سرگرمیوں کا آغاز مغل سلطنت کے زمانے ہی میں ہوچکا تھا۔ معاصر مورخ خافی خان نے لکھا ہے کہ "فرنگیوں نے اکثر ساحلی بندرگاہوں پر اپنے علاقے قائم کر رکھے ہیں، ان کی رعیت میں سے جب کوئی شخص مرجاتا ہے تو اُس کا مال ضبط کرلیتے ہیں اور اس کے خوردسال بچوں کو خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان اپنا غلام بنا کر عیسائی بنا لیتے ہیں[1]۔

انگریزوں نے عیسائیت کو پھیلانے کے لئے جو حربے اور طریقے اختیار کئے تھے اُن سے ہندوستانیوں میں زبردست بدگمانیاں پھیل گئی تھیں۔

• انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں عیسائی مشن کی سرگرمیوں نے پورے ملک کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ ۱۸۱۳ء / ۱۲۲۸ھ کے ایک قانون کے ذریعے سے جب یورپ کے مشنریوں کو ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت کے لئے مشن اسکول کھولنے کا موقع ہاتھ آگیا تو پورے ملک میں مشن اسکولوں اور کالجوں کے علاوہ مشن کے ہسپتال اور بائبل سوسائٹیاں

---

[1] ترجمہ اُردو منتخب اللباب مصنفہ خافی خان جلد دوم ص ۳، مطبوعہ ایجوکیشنل پریس کراچی ۱۹۶۳ء

قائم ہوگئیں، تاکہ ان کے ذریعے سے ہندوستانیوں کو عیسائیت کے قریب لایا جائے، اس کام کے لئے انگلستان اور دوسرے یورپی ملکوں سے پادریوں کی فوج کی فوج ہندوستان آنے لگی، کروڑوں روپیہ پانی کی طرح بہایا جانے لگا، مردوں کے علاوہ مشن میں بکثرت عورتیں بھی ملازم رکھی گئیں تاکہ ان کے ذریعے سے عورتوں میں عیسائیت کی تبلیغ کی جا سکے، اچھوت ذاتوں کے لوگوں پر عیسائی مبلغوں کا کافی اثر پڑا، اُن کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ کر عیسائی بننے لگے۔

۱۸۲۶ء / ۱۲۴۲ھ میں کلیسائے انگلستان کے اسقف اعظم آرچ بشپ ہیبر (HEBER) نے ہندوستان میں طویل تبلیغی سفر کرنے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں کو یہ رپورٹ دی کہ سارے ہندوستان میں ہمارا سیاسی اقتدار قائم ہو چکا ہے، مُسلمان، مرہٹے، راجپوت اور سکھ سب ہمارے مطیع بن چکے ہیں، اس لئے ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ سے اب کوئی ہنگامہ یا شورش برپا ہونے کا خطرہ باقی نہیں رہا ہے، ان چیزوں نے پادریوں کی ہندوستان میں آمد و رفت قیام اور اشاعت و تبلیغ میں بڑی مدد پہونچائی اور مسیحیت کے مبلغوں کا ایک سیلاب اُمنڈ آیا، پُرجوش مشنری ہر طرف پھیل گئے، انھوں نے شہروں سے لے کر دیہات تک عیسائیت کی تبلیغ کا جال بچھا دیا، یہ لوگ صرف اپنے مذہب کے فضائل و محاسن بیان کرنے پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق ایسا لٹریچر شائع کرتے تھے، جس میں ہندوستان کے مذاہب اور بالخصوص اسلامی تہذیب اور اسلام کی تعلیمات کا مذاق اڑایا جاتا تھا، پیغمبرِ اسلام اور مُسلمان بادشاہوں اور بزرگوں کی توہین اور تذلیل کی جاتی تھی، ان لوگوں کا مقصد غالباً یہ تھا کہ سیاسی زوال کے بعد مُسلمان ہمت و حوصلہ اور بلند نظری سے محروم ہو گئے ہیں، اس لئے اس موقع پر اگر ان کے سامنے عیسائیت کے محاسن و فضائل اور ان کے اپنے مذہب و تاریخ کے معائب بیان کئے گئے تو بہت ممکن ہے کہ مُسلمان اپنے مذہب کو خیر باد کہہ کر مسیحیت اختیار کرلیں، اور انگریزوں

کو ہندوستان میں اطمینان سے دائمی طور پر حکومت کرنے کا موقع مل جائے، ۱۸۳۳ء / ۱۲۵۰ھ میں چرچ آف انگلستان کا مشہور مبلغ ڈاکٹر سی، جی فینڈر ہندوستان آیا، یہ ایک جرمن نژاد پادری تھا، اور عربی و فارسی دونوں زبانوں میں تحریر و تقریر کی قدرت رکھتا تھا۔ اس نے ۱۸۳۵ء / ۱۲۵۱ھ میں فارسی زبان میں اسلام کی تردید میں ایک کتاب شائع کی جس کا نام میزان الحق تھا، اسلام کی تردید میں یہ پہلی کتاب ہے جو ہندوستان میں شائع ہوئی ۔

سرسید مرحوم جیسا شخص جس نے انگریزوں کی حمایت و اعانت میں بیش از بیش حصہ لے کر انگریزوں سے اپنی وفاداری کو غیر مشکوک بنالیا تھا، وہ بھی اس ہنگامے کے اسباب میں ایک بڑا سبب ان ہی پادریوں کی علانیہ اور خفیہ ریشہ دوانیوں کو قرار دیتا ہے، چنانچہ سرسید مرحوم اسباب بغاوت ہند میں لکھتے ہیں :۔

"سب کو یقین تھا کہ گورنمنٹ علانیہ مذہب بدلنے پر مجبور نہیں کرے گی۔ البتہ خفیہ تدبیریں کر کے جس طرح عربی اور سنسکرت کو فنا کر دیا ہے اسی طرح ملک کو مفلس اور جاہل بنا کر اپنے مذہب کی کتابیں اور وعظ و تبلیغ کے ذریعے نوکریوں کا لالچ دیکر لوگوں کو بے دین کر دے گی ۔

۱۸۳۷ء کی قحط سالی میں جو یتیم لڑکے عیسائی بنائے گئے وہ شمالی مغربی اضلاع میں گورنمنٹ کے طرز عمل کے لئے ایک نمونہ گنے جاتے تھے کہ ہندوستان کو اس طرح سے مفلس و محتاج کر کے اپنے مذہب میں لے آئیں گے، جیسے جیسے گورنمنٹ کی فتوحات زیادہ ہوتی تھیں ہندوستانیوں کو رنج ہوتا تھا کیوں کہ ان کو یقین تھا کہ جب کسی دشمن اور ہمسایہ حاکم کے مقابلے اور فساد کا اندیشہ نہ رہے گا تو ہمارے مذہب اور رسم ورواج میں کھلے بندوں مداخلت

کی جائے گی، سب جانتے تھے کہ گورنمنٹ نے پادریوں کو مقرر کیا ہے ان کو تنخواہ دی جاتی ہے، تقسیم کتب اور دیگر اخراجات کے لئے بڑی بڑی رقمیں دی جاتی ہیں، حکام شہر اور افسرانِ فوج ماتحتوں سے مذہبی گفتگو کرتے اور اپنی کوٹھیوں پر بلوا کر پادریوں کا مذہبی وعظ سنواتے تھے، غرض کہ اس بات نے یہاں تک ترقی کی تھی کہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ گورنمنٹ کی عملداری میں ہمارا یا ہماری اولاد کا مذہب قائم رہے گا تکرارِ مذہب کی کتابیں بطور سوال وجواب مفت تقسیم کی جاتی تھیں جن میں دوسرے مذاہب پر اعتراضات اور رکیک حملے ہوتے تھے، پادری غیر مذاہب کے مجامع میں جاکر وعظ کہتے تھے، اور کوئی شخص حکام کے ڈر سے کچھ کہہ نہ سکتا تھا، بسا اوقات چپراسیوں کو اپنے ہمراہ لے جاتے تھے، بہت سے مشنری اسکول قائم کئے گئے، اُن میں مذہبی تعلیم شروع کی گئی، بڑے بڑے حکام اُن اسکولوں میں جاتے اور دوسروں کو اُن میں شامل ہونے کی ترغیب دیتے، امتحان مذہبی کتابوں میں لیا جاتا، مذہبی سوالات کے جوابات اگر عیسائی مذہب کے مطابق دیئے جاتے تو نوعمر بچوں کو انعامات ملتے، لوگ مجبوراً اپنے بچوں کو ان اسکولوں میں داخل کراتے، کیونکہ ان کی حد سے زیادہ مُفلسی اور محتاجی نے اولاد کی تعلیم کے لئے ان اسکولوں کے علاوہ اور کوئی ذریعہ باقی نہ رکھا تھا: جس کے بعد وہ بسر اوقات کی شکل نکال سکتے۔

دیہاتی مکاتب نے یہ یقین اور بھی زیادہ مضبوط کر دیا تھا کہ ان کا مقصد صرف عیسائی بنانا ہے، انسپکٹر اور ڈپٹی انسپکٹر کو

کالا پادری کہتے تھے۔ یہ لوگ افسرانِ بالا کو خوش کرنے کے لئے زبردستی بچوں کو ان مکاتب میں داخل کراتے، درآنحالیکہ بچوں کے ماں باپ کو یقین ہوتا تھا کہ یہ عیسائی بنائے جانے کا جال ہے، اُن ہی کالے پادریوں کے سرٹیفکٹ پر ملازمت مل سکتی تھی۔

۱۸۵۷ء میں پادری ایڈمنڈ نے کلکتہ سے عموماً لوگوں کے پاس اور سرکاری ملازمین کے پاس خصوصاً خطوط بھیجے جن کا مطلب یہ تھا کہ اب تمام ہندوستان میں عملداری ایک ہوگئی، اس لئے آپ کو بھی صرف ایک مذہب عیسائی میں داخل ہوجانا چاہیئے۔

ان خطوط کے آنے سے سب پر دہشت طاری ہوگئی خوف کے مارے آنکھوں میں اندھیرا چھاگیا، سب کو یقین ہوگیا کہ ہندوستانی جس چیز کے منتظر تھے، آخر وہ آہی گئی۔ اب سارے ملازمین کو عیسائی بننا پڑے گا۔ سرکاری ملازم شرم کی وجہ سے ان خطوط کو چھپاتے پھرتے تھے، کیوں کہ اُن کے دوست احباب اُن کو طعن دیتے تھے اور یقین کرتے کہ سرکاری ملازموں کو ایک دن کرسٹان بننا پڑے گا۔[1]

بنائے اَمن تھا تثلیث کا پابند ہو رہنا ٭ کہ داخل جرم تھا قُل ھُوَاللہُ اَحد کہنا

لارڈ میکالے نے جو ۱۸۳۵ء کی تعلیمی کمیٹی کے صدر تھے، اپنی رپورٹ میں ہندوستان کے آئندہ تعلیمی نظام کی نسبت لکھا تھا کہ۔

"ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیئے جو ہمارے اور ہماری رعایا کے درمیان مترجم کا کام دے سکے، یہ ایسی جماعت ہوتی

---

[1] ملخصاً رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند مصنفہ سرسید احمد خاں۔

چاہیئے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق رائے، الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو[۱]۔"

ایسٹ انڈیا کمپنی جس کا ظاہری مقصد تجارت اور اصل مقصد ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ اور سیاسی اقتدار کا حصول تھا، رفتہ رفتہ ہندوستان کے سیاسی، تعلیمی اور انتظامی معاملات میں مداخلت کرنے لگی تھی، اس غرض سے جگہ جگہ بائبل سوسائٹیاں قائم کی گئیں، انجیل کا ترجمہ ملک کی تمام زبانوں میں کیا گیا، ہندوستان کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں عیسائی مشن کھولے گئے کمپنی کے حکام اور عیسائی مشنریوں نے متحدہ طور پر پوری قوت کے ساتھ عیسائیت کی تبلیغ شروع کردی، انگریزوں کا منصوبہ یہ تھا کہ کسی طرح ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کو عیسائی بنالیا جائے تاکہ جو مذہبی عصبیت انھیں انگریزوں سے نفرت اور ان کی مخالفت پر اُبھارتی ہے اس کا رُخ تبدیل ہو جائے اور یہ طاقت برطانوی حکومت کے استحکام کے کام میں لائی جاسکے اور عیسائیت کے فروغ کے ساتھ ہندوستان پر اطمینان سے حکومت کے مواقع حاصل ہوسکیں۔

غرض کہ ایک طرف تو پادریوں کی تبلیغی سرگرمیاں جاری تھیں، مشن اسکول کھولے جا رہے تھے جن میں حصول تعلیم کے لئے سہولتیں مہیا کی جاتی تھیں، کمپنی کے حکام پشت پناہ تھے اور ہر قسم کی امداد و اعانت بہم پہنچاتے تھے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ملازمتوں کا لالچ تھا، کمپنی کی اسکیم یہ تھی کہ ہندوستان کے بسنے والوں بالخصوص مسلمانوں کو جاہل اور مفلس بنا کر جس کے لئے طرح طرح کے جائز و ناجائز ذرائع اختیار کئے جاتے تھے ملازمتوں کے حصول کی ترغیب دلا کر مشن اسکولوں میں تعلیم پانے پر مجبور کردیا جائے، جو اس وقت عیسائیت کی تبلیغ کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھے جاتے تھے، اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ مسلمانوں کے علوم، اور ان کا

---

[۱] تاریخ تعلیم از میجر باسو ص۱۰ بحوالہ روشن مستقبل طبع چہارم ص۱۳۱

مذہبی شغف تھا۔ اس کے لئے ۱۸۳۵ء کا تعلیمی نظام مرتب کیا گیا، جس کی روح لارڈ میکالے کے نزدیک جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے یہ تھی کہ :۔

" ایک ایسی جماعت تیار کی جائے جو رنگ و نسل کے لحاظ سے تو ہندوستانی ہو مگر فکر اور عمل کے اعتبار سے عیسائیت کے سانچے میں ڈھلی ہو "

انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب کا یہ دوسرا حربہ کوئی شبہ نہیں کہ پہلے حربے سے کہیں زیادہ کامیاب رہا۔ ظاہر ہے کہ کمپنی کی یہ اسکیم اور اس کا یہ تعلیمی نظام مسلمانوں کی مذہبی زندگی، قومی روایات اور علوم و فنون کے لئے سخت تباہ کن اور مہلک ترین حربہ تھا، جس کو قبول کرنے کے لئے وہ کسی طرح تیار نہ ہو سکتے تھے اور ابھی تک وہ اپنی مذہبی زندگی اور قومی شعور کو برقرار رکھنے کا کوئی حل سوچ نہ سکے تھے کہ اسی دوران میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ پیش آگیا، جس کی بے پناہ تباہ کاریوں اور ہولناکیوں نے دلوں کو ہیبت زدہ، دماغوں کو ماؤف اور روحوں کو پژمردہ کر دیا، پوری قوم پر جمود، بے حسی اور مایوسی کی گھٹائیں چھا گئیں، حاکمانہ عظمت و اقتدار اور دولت و شوکت کا خاتمہ ہو چکا تھا، مسلمان ذرائع معاش سے یکسر محروم کر دیئے گئے تھے، عاداتِ قبیحہ روز بروز اُن میں جڑ پکڑ رہی تھیں، اور قوم کی قوم تباہی و بربادی کے غار میں گرتی چلی جا رہی تھی، تعلیم سے بے رغبتی اور مذہب سے بے گانگی میں روز افزوں اضافہ تھا، اپنی قوت و حیثیت کا احساس فنا ہوتا جا رہا تھا، پادریوں کی تبلیغی سرگرمیوں نے حالات کو اور زیادہ تشویش ناک بنا دیا تھا، اور وہ زمانہ بہت قریب تھا کہ علماء کی وہ نسل جو سابقہ درس گاہوں کی تعلیمیافتہ تھی، رفتہ رفتہ ختم ہو جاتی۔

یہ حالات تھے جن میں ہمارے مفکرین اور اربابِ علم و فضل کو یہ محسوس کرنا پڑا کہ سیاسی زوال و انحطاط اور حکومت سے محرومی کے ساتھ مستقبل میں مسلمانوں کا علم و مذہب اور قومی زندگی سخت خطرے میں ہے، وہ تاریخ کے اس فیصلے سے بے خبر نہ تھے کہ جب کسی قوم نے کسی ملک کو فتح کیا اور اس ملک کے باشندوں پر سیاسی غلبہ اور

تسلط پایا ہے، تو فاتح قوم کے اثرات وخصائص مفتوح قوم کے جسموں تک محدود نہیں رہتے، بلکہ مفتوح قوم کے دل ودماغ اور علم وفکر بھی مسخر ہو جاتے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مفتوح قوم اپنے ملی شعائر، قومی خصائص اور فکر وعمل کو نہ صرف یہ کہ خیرباد کہہ دیتی ہے بلکہ "الناس علیٰ دینِ ملوکہم" کے اصول اور مدت تک جذب وکشش کا مسلسل عمل جاری رہنے کے باعث وہ آخر کار اپنی روایات واقدار اور فکر وعمل سے نفرت کرنے لگتی ہے، اور اس کے لئے صرف فاتح قوم کی نقالی اور کورانہ تقلید واتباع ہی سرمایۂ افتخار ہو جاتا ہے،

ہندوستان میں مسلمانوں کی چھ سو سالہ تاریخ میں یہ سب سے زیادہ بھیانک نازک اور خطرناک وقت تھا، ایسے نازک اور خطرناک وقت میں جب کہ گردش لیل ونہار نے ملتِ اسلامیہ کے لئے نہایت تباہ کن صورتِ حال پیدا کر دی تھی مسلمانوں کے تحفظ اور بقا کیلئے سب سے اہم ضرورت دینی اقدار کا احیاء اور مدارسِ دینیہ کا قیام تھا۔

ہمارے علماء ومشائخ کی ایک بڑی خصوصیت یہ رہی ہے کہ دینی وعلمی اور فقہی مسائل سے لے کر تہذیب ومعاشرت اور سیاست وتمدن تک کے کسی شعبے میں انھوں نے اسلامی شریعت کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا، انھوں نے کسی گوشے میں بھی حریف طاقتوں کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے، انیسویں صدی عیسوی مسلمانوں کے عقائد وافکار اور نظریات کے لئے ایک زبردست چیلنج تھی، مغربی علوم وفنون اور فرنگی تہذیب تمام دنیا کو ایک عظیم سیلاب کی طرح اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی، ہندوستان میں مغلوں کی سلطنت کا چراغ گل ہو چکا تھا، سائنس اور ٹیکنالوجی کی آب وتاب اور چمک دمک نے آنکھوں کو خیرہ اور ذہنوں کو مرعوب بنا دیا تھا، مگر علماء کرام مغربی چیلنج سے برابر نبرد آزما رہے، انھوں نے ایک طرف تو ملک میں جابجا دینی مدارس قائم کر کے ایک ایسا دفاعی حصار تیار کیا جس نے مسلمانوں کو سیاسی شکست کے نتائج سے بڑی حد تک محفوظ کر دیا اور دوسری طرف مولانا رحمت اللہؒ کیرانوی اور حضرت مولانا محمد قاسمؒ نانوتوی، مولانا ابو المنصور اور ڈاکٹر

وزیر خاں وغیرہ حضرات نے پوری ہمت وجرأت کے ساتھ عیسائی مشنریوں کا زبردست مقابلہ کیا، اور ہندوستان کے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے مسیحی مبلّغین کے خواب کو شرمندۂ تعبیر نہیں ہونے دیا۔

اُس زمانے میں عیسائی مشنریوں نے عیسائیت کی تبلیغ کے لئے جو طریقے اختیار کئے تھے اُن کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) مشن اسکول جن میں حکومتِ وقت کی زبان (انگریزی) پڑھائی جاتی تھی، ہر مشن اسکول میں انجیل کی تعلیم لازمی تھی، یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تعلیم کسی مذہب کی تبلیغ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، طالب علم جو اپنی کم عمری اور ناتجربہ کاری کے باعث سادہ لوح اور مذہبی معلومات سے بے خبر ہوتے ہیں، اُن کے ذہن وفکر کو اُن کی آبائی روایات واقدار سے ہٹا کر بڑی سہولت کے ساتھ تعلیم کے ذریعے متأثر کیا جا سکتا ہے، اور اپنے افکار و نظریات کی خوبیاں اُن کے دل ودماغ میں راسخ کی جا سکتی ہیں، اس زمانے میں یہ تصور عام ہو گیا تھا کہ انگریزی پڑھنے سے بچے اپنے مذہب کو خیرباد کہہ کر "کرسٹان" بن جاتے ہیں، کرشان بننے کا مطلب یہ تھا کہ عیسائی مذہب اختیار کر لیتے ہیں، اس لئے مسلمانوں نے خاص طور پر اپنے بچوں کو مشن اسکولوں میں داخل کرانے سے اجتناب کیا، اور پوری شدت سے انگریزی تعلیم کی مخالفت کی، خواجہ غلام الحسنین پانی پتی نے لکھا ہے کہ میری والدہ سے مولانا الطاف حسین حالی نے میرے متعلق فرمایا کہ "اس کو دہلی بھیجدو، تاکہ میرے پاس رہ کر انگریزی تعلیم حاصل کر سکے، مگر والدہ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ "میں اس کو انگریزی تعلیم دلا کر نیچری اور بے دین بنانا نہیں چاہتی"[1]

یہ ایک طرح کا تحفظ ہی تھا جو عیسائی مشن کے خلاف مسلمانوں کی جانب سے عمل میں

---

[1] رسالہ حیات نو ص۱۴۰۔

لایا گیا، مسلمانوں میں اس شعور کو پیدا کرنے میں علمائے کرام پیش پیش تھے۔

(۲) مشن ہسپتالوں کو بھی عیسائیت کی تبلیغ کا ذریعہ بنایا جاتا تھا۔ اور ہسپتالوں میں مریضوں کو متاثر کرنے کی کوششیں کی جاتی تھیں، یہ سلسلہ کسی قدر ابھی تک بھی جاری ہے۔ اس لئے ایلوپیتھک طریقۂ علاج کی بھی مخالفت کی گئی، مسلمان اپنے علاج معالجے کے لئے زیادہ تر یونانی طب، جڑی بوٹیوں اور آیور ویدک طریق کی جانب رجوع کرتے ہے اس ردِ عمل کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ طب یونانی اور علاج کے دیسی طریقے آج تک ہندوستان میں باقی ہیں اور دن بدن ترقی پذیر ہیں۔

(۳) عیسائی مشن کا تیسرا طریقہ عام مجموں میں وعظ و تقریر اور مناظروں کا تھا، علماء نے اس میدان میں بھی مسیحی مبلغین کا زبردست مقابلہ کیا، اور اپنے پُرزور دلائل سے عیسائی مشنریوں کو پے در پے ایسی شکستیں دیں کہ ان کے منصوبے خاک میں مل گئے۔ اس سلسلے میں دہلی، آگرہ اور شاہجہاں پور کے نام خاص طور پر لئے جا سکتے ہیں ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء میں آگرہ میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی[۱] اور اُن کے رفیق کار ڈاکٹر وزیر خاں[۲] کے زبردست علمی دلائل اور مسکت اعتراضات

---

[۱] مولانا رحمت اللہؒ کیرانوی ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء میں کیرانہ (مظفر نگر) میں پیدا ہوئے، مولانا کا سلسلۂ نسب چند واسطوں سے مخدوم حضرت جلال الدینؒ کبیر الاولیاء (وفات ۱۲۶۵ھ/۱۳۶۴ء) تک پہونچتا ہے۔ فارسی کی کتابیں وطن میں پڑھیں، پھر دہلی چلے گئے، وہاں اس زمانے کے مشہور عالم مولانا محمد حیات سے تعلیم حاصل کی، بعد ازاں مفتی سعد اللہ مراد آبادی کی شہرت سُن کر لکھنؤ چلے گئے، وہاں مفتی صاحب کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا اور معقولات کی تکمیل کی۔

اس زمانے میں ہندوستان میں پادریوں کی تبلیغی جد وجہد پورے شباب پر تھی، عوام پر مشنریوں کے پروپیگنڈے کا اثر ہونے لگا تھا، ۱۸۵۴ء/۱۲۷۱ھ میں مولانا رحمت اللہؒ نے ردِّ نصاریٰ میں ازالۃ الاوہام لکھ کر عیسائی پادریوں کو چیلنج کیا اور آگرہ کے مناظروں میں انہیں (باقی صفحہ آئندہ پر)

سے گھبرا کر اس زمانے کے سب سے بڑے عیسائی مشنری سی۔ جی فینڈر کو مناظرے کے میدان سے فرار ہونا پڑا، اور وہ اپنی شکست فاش سے شرمندہ ہو کر اور ہندوستان کی سرزمین کو اپنے مقصد کے لئے ساز گار نہ پاکر مایوسی کے ساتھ ہندوستان سے واپس چلا گیا۔ مناظرۂ آگرہ کی تفصیلی روداد شائع ہو چکی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) زبردست شکست دی۔ عیسائی مبلغ پادری فینڈر کو بے نیل مرام ہندوستان سے واپس جانا پڑا۔

سنہ ۱۸۵۳ء / ۱۲۷۱ھ میں مولانا رحمت اللہؒ کا جہاد بالقلم اور جہاد باللسان سنہ ۱۸۵۷ء / ۱۲۷۴ھ کے جہاد بالسیف کا پیش خیمہ ثابت ہوا، جنگ آزادی میں بھی انھوں نے مردانہ وار حصہ لیا، شکست کے بعد وارنٹ گرفتاری جاری ہوا، مولانا بچتے بچاتے مکہ مکرمہ پہونچ گئے۔ کیرانہ کی جائیداد بغاوت کے جرم میں انگریزی حکومت نے ضبط کرلی، مکہ مکرمہ کے زمانہ قیام میں انھوں نے مدرسہ صولتیہ قائم کیا جو اب تک بہت اچھی حالت میں چل رہا ہے، اُسی زمانے میں پادری فینڈر قُسطُنطُنیہ پہنچا، اور اپنی تبلیغی جد وجہد سے ترکی میں ہلچل پیدا کردی، یہ سلطان عبدالعزیز (سنہ ۱۲۷۷ھ / ۱۸۶۱ء۔ سنہ ۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۶ء) کا عہد تھا۔ سلطان نے مکہ مکرمہ سے مولانا رحمت اللہ کو قسطنطنیہ طلب کیا، فینڈر کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ قسطنطنیہ سے فرار ہوگیا، مولانا رحمت اللہ نے سلطان عبدالعزیز کی فرمائش پر پادری فینڈر کے اعتراضات کے جوابات اور ردِ نصاریٰ میں سنہ ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۳ء میں اظہار الحق کے نام سے ایک معرکۃ الآراء کتاب لکھی۔

مولانا رحمت اللہؒ نے سنہ ۱۳۰۸ھ / ۱۸۹۱ء میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا، جنت المعلّیٰ میں دفن کئے گئے۔

(ماخوذ از آثار رحمت مؤلفہ امداد صابری)

؎ ڈاکٹر وزیر خاں بہار کے شرفائے اکابر سے تعلق رکھتے تھے۔ مرشد آباد میں انگریزی پڑھی، پھر ڈاکٹری کی تعلیم کے لئے انگلستان گئے، وہاں سے اسسٹنٹ ڈاکٹر کی ڈگری لی، آگرہ میں سب اسسٹنٹ سرجن تھے، انگریزی زبان پر عبور حاصل تھا۔ (باقی صفحہ آئندہ پر)

اسی طرح شاہجہاں پور کے مناظرے میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوئیؒ اور مولانا ابوالمنصور دہلوی کے مقابلے میں عیسائی پادری ٹھیر نہ سکے اس مناظرے کی تفصیلات گفتگوئے مذہبی اور مناظرہ شاہجہاں پور میں درج ہیں۔

مذکورہ بالا مقامات کے علاوہ اور بھی بہت سے مقامات پر علماء نے پادریوں سے مناظرے کئے اور اس طرح سے عیسائی مشن کے اثرات کو پھیلنے سے روکنے کے لئے زبردست رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہندوستان میں مناظروں کی ابتداء عیسائی مشنریوں سے ہوئی ہے مسلمانوں نے اپنے چھ سو سالہ دورِ حکومت میں ہندوؤں سے کبھی کوئی مناظرہ نہیں کیا تھا، مگر عیسائیوں نے اس سرزمین پر قدم رکھتے ہی مناظروں کا بازار گرم کر دیا اور یہ عجیب بات ہے کہ ہندوستان سے انگریزی اقتدار کے ختم ہوتے ہی مناظروں کا زور

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) وہ جب انگلستان گئے تھے تو وہاں سے انجیل و تورات وغیرہ کی شرحیں ساتھ لائے تھے، اُس دور میں عیسائیت کے لٹریچر پران کا مطالعہ بہت گہرا اور وسیع تھا، چنانچہ آگرہ کے مناظروں میں ڈاکٹر وزیر خاں مولانا رحمت اللہؒ کے معاون ہوا کرتے تھے۔

اُنھوں نے جنگِ آزادی میں بھی حصہ لیا، آگرہ، دہلی، لکھنؤ اور بدایوں وغیرہ مقامات میں انگریزی فوجوں سے معرکہ آرا رہے، ناکامی کے بعد ڈاکٹر وزیر خاں حجاز چلے گئے، وہاں مکہ مکرمہ میں مولانا رحمت اللہؒ کے پاس مقیم ہوئے، اور ڈاکٹری شروع کر دی، انگریزوں نے ڈاکٹر وزیر خاں کو حکومت ترکی کے ذریعے سے گرفتار کرنے کی کوشش کی، مگر کامیابی نہ ہو سکی، ڈاکٹر صاحب کا مکہ مکرمہ میں انتقال ہوا

("آثارِ رحمت" مؤلفہ امداد صابری و "غدر کے چند علماء" از مفتی انتظام اللہ شہابی شائع کردہ نیا کتاب گھر دہلی۔

بھی ختم ہو چکا ہے۔

اس موقع پر یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ عیسائی مشنری محض عیسائیت کی تبلیغ پر اکتفا نہیں کرتے تھے۔ اگر وہ اتنا ہی کرتے کہ اپنے مذہب کی اچھائیاں اور خوبیاں عوام کے سامنے پیش کرتے رہتے تو ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کی جانب سے کوئی سخت مزاحمت عمل میں نہ آتی۔ مگر اس کے برعکس عیسائی مشنری اسلام اور پیغمبرِ اسلام پر رکیک حملے اور اعتراض کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال مسلمانوں کے لئے ہرگز قابلِ برداشت نہیں ہو سکتی تھی، اس لئے علماء کی جانب سے شدید مزاحمت کی گئی، اور وہ اپنے امکان بھر مشنریوں کے اثرات کو زائل کرنے میں لگے رہے، اس کام میں بلاشبہ ہندوستان کے بہت سے علماء کا حصہ رہا ہے، اور اُن کی عظیم خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، مگر اس سلسلے میں علماء دیوبند نے جو زبردست خدمات انجام دی ہیں وہ اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

(۲) عیسائی مشن کی تبلیغ کا جو تھا طریقہ تصنیف و تالیف تھا، اس میں بھی وعظ و تقریر کا وہی جارحانہ طریقہ اختیار کیا گیا تھا، جس میں عیسائیت کے محاسن بیان کرنے سے زیادہ اس بات پر زور دیا جاتا تھا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور اسلام پر رکیک حملے کئے جائیں۔ علماء کی جانب سے اس میدان میں بھی عیسائی مشنریوں کو چیلنج کیا گیا جس کے نتیجہ میں ان کی روز افزوں سرگرمیاں بڑی حد تک کمزور پڑ گئیں، حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی ؒ نے اظہار الحق[1] کے نام سے ایک کتاب لکھ کر نہ صرف مشنریوں کے اعتراضات

---

[1] اظہار الحق اپنے پُر زور مضامین اور قوتِ استدلال کے لحاظ سے عیسائیت کے رد میں ایک معرکۃ الآراء کتاب ہے، جس میں قرآن حکیم کی صداقت اور رسالت کے مدلل اثبات کے ساتھ ساتھ عیسائیت کے عقائد پر بھرپور فاضلانہ تنقید اور بائبل میں تحریف پر (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے پرخچے اڑا دیے بلکہ خود پادریوں کو جواب دہی کی دفاعی حیثیت میں ڈال دیا، اس کتاب کی مقبولیت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یورپ کی چھ مختلف زبانوں میں اظہار الحق کے ترجمے اسی زمانے میں شائع ہو گئے تھے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں نے انگریزوں سے ضرور سیاسی شکست کھائی تھی، مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ علمائے کرام نے علمی اور فکری میدانوں میں عیسائی پادریوں کو کبھی کامیاب ہونے کا موقع نہیں دیا، وہ تبلیغِ عیسائیت کے ہر محاذ پر پادریوں کو پے در پے شکستیں دیتے رہے، یہاں تک کہ عیسائی مشنریوں کو اپنی پُرجوش سرگرمیوں کے دائرے کو محدود کر دینا پڑا، اور خصوصاً تبلیغ عیسائیت کا وہ پہلو جس میں دوسرے مذاہب پر جارحانہ حملے ہوتے تھے بالآخر ترک کر دیا گیا، غرض کہ دارالعلوم دیوبند اور اسکے اکابر نے اُس وقت دین کی حفاظت کی جب اس کا چراغ گُل ہو رہا تھا، انھوں نے ہر داخلی اور خارجی فتنے سے نمٹنے کی بھرپور کوشش کی اور ہر ممکن طریقے سے اسلام کا دفاع کیا۔ دفاعی تحفظ کے ساتھ ساتھ اُس وقت مثبت اقدامات کی بھی ضرورت تھی، اس

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ) فیصلہ کن بحث کی گئی ہے، یہ کتاب سلطان عبدالعزیز خاں کی فرمائش پر ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۴ء میں لکھی گئی ہے، سلطان کے حکم سے کئی یورپی زبانوں میں اس کتاب کے ترجمے شائع کئے گئے تھے، اظہار الحق کے انگریزی ترجمے پر "لندن ٹائمز" نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "اگر یہ کتاب دنیا میں پڑھی جاتی رہی تو مذہب عیسوی کی ترقی رک جائے گی"۔

ابھی حال میں اظہار الحق کے اُردو ترجمے کی پہلی جلد ۴۲۰ صفحات پر مکتبہ دارالعلوم کراچی سے شائع ہوئی ہے، اس کے شروع میں مولانا محمد تقی عثمانی دیوبندی ثم کراچوی کا ایک فاضلانہ مقدمہ شامل ہے، جو ۲۰۰ سے زائد صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

(سید محبوب رضوی)

سلسلے میں سب سے پہلا قدم مدارسِ دینیہ کا قیام ہے، چنانچہ ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء میں دارالعلوم دیوبند قائم کیا گیا۔ دارالعلوم کے چند ماہ بعد سہارنپور میں مظاہر علوم قائم ہوا بعد ازاں تھانہ بھون مظفرنگر، انبٹھہ، گلاؤٹھی، میرٹھ وغیرہ مقامات میں مدارسِ دینیہ جاری ہو گئے، جن میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اس دور میں بزرگانِ دیوبند اور بالخصوص حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی سیاست یہی تھی کہ مدارسِ دینیہ قائم کئے جائیں چنانچہ خود حضرت جہاں بھی جاتے تھے مدرسے قائم فرماتے تھے مراد آباد، گلاؤٹھی، انبٹھہ وغیرہ میں خود مدارس قائم کرائے اور جہاں جہاں حضرت کے متوسل تھے وہاں خطوط سے یہی تاکید فرماتے تھے کہ مدرسے قائم کرو، اس ترغیب و تحریک سے بہت سے مدرسے قائم ہوئے گویا وہ ایک درجے میں بانیٔ مدارسِ ہند کہلانے کے مستحق ہیں۔

اسلامی معتقدات کو عوام تک پہنچانے کے لئے مطابع جاری کئے گئے، جن میں قرآن شریف کے علاوہ دوسری کتابیں بھی چھاپی جاتی تھیں، ان میں بعض کتابیں عیسائیت کے رد میں بھی چھاپی گئیں، مطابع سے چھپنے والی کتابوں کے ذریعے سے عام مسلمانوں کی مذہبی معلومات میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا، اور عیسائی مشن کی جانب سے کئے جانے والے اعتراضات کے مدلل اور مسکت جوابات سے عام مسلمان مطمئن ہوتے رہے، علمائے دارالعلوم نے ہزاروں کتابوں پر مشتمل لٹریچر مسلمانوں کو دیا ہے، اسلامی موضوعات پر بہت سی کتابیں یہاں سے شائع ہوئیں، اسلامی علوم کی تعلیم اور نشر و اشاعت سے عیسائی مشن کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ کھڑی ہو گئی، اس لئے مشن کی تبلیغی جد و جہد کے وہ نتائج جن کا مشن آرزومند تھا برآمد نہ ہو سکے۔

غرض کہ اسلامی اور دینی مدارس کے قیام کا مقصد اگرچہ اسلامی علوم کی بقا و تحفظ تھا، مگر یہ مدارس عیسائی مشن کی پرجوش تبلیغی سرگرمیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے لئے محفوظ ترین حصار ثابت ہوئے، ان مدارس کے تعلیم یافتہ علماء ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئے

ان کے درس وتدریس، وعظ وتقریر اور تصنیف وتالیف نے عیسائی مشن کے منصوبوں کی راہ میں ناقابلِ تسخیر فولادی دیواریں کھڑی کردیں، چنانچہ ان کی زبردست جدوجہد کے باعث ہندوستان کو عیسائی سلطنت بنانے کا وہ خواب جو ۱۸۵۵ء میں کلکتہ کے مشن نے ہندوستان میں عیسائیت کی کامیابی کے لئے دیکھا تھا ہمیشہ کے لئے شرمندۂ تعبیر ہونے سے محروم ہوگیا، مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم نے اپنی عربی تصنیف "نظرۃ اجمالیۃ فی الدعوۃ الاسلامیۃ فی الہند والباکستان" میں اس زمانے کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"انگریزی حکومت کے قیام کے بعد کچھ لوگ تو اُن کی پیروی وتقلید میں لگ گئے، یہ سرسید احمد خاں اور اُن کا گروہ تھا، مگر علماء و مشائخ پر حادثۂ غدر کے بعد ایک دوسرا اثر پڑا، کچھ علماء نے تو غدر کے ہنگامے میں شرکت کا فتویٰ دیا اور کچھ مجاہدین نے یہ محسوس کیا کہ انگریزی حکومت اور اس کی تہذیب اور عیسائی مشنریوں کی ریشہ دوانیوں سے مُسلمانوں کو بچانے کے لئے ایک ہی شکل ہے کہ ایسے آزاد مدارس کھولے جائیں جن میں حکومت کا کوئی عمل دخل یا مدد شامل نہ ہو، چنانچہ قریب قریب ہر بستی اور شہر میں ایسے مدارس کھولے گئے، اس پروگرام کے تحت ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا، اس کی ابتداء تو معمولی طریقے سے ہوئی، مگر آہستہ آہستہ اس نے اتنی ترقی کی کہ ہندوستان کا سب سے بڑا دینی مدرسہ اور دینی مدارس کا سب سے بڑا مرکز ہوگیا"[1]۔

---

[1] نظرۃ اجمالیۃ فی الدعوۃ الاسلامیۃ فی الہند والباکستان ص ۶۰ تا ۶۲۔

۱۳۴۱ھ / ۱۹۲۳ء میں آگرہ کے ملکانوں میں ارتداد نے ہندوستان کے مسلمانوں میں سخت ہیجان و اضطراب پیدا کر دیا تھا۔ اس لئے ہندوستان کی انجمنیں اور مدارس فوراً اس کے انسداد کی طرف متوجہ ہو گئے۔ دارالعلوم نے اپنی حیثیت کے مطابق بڑی بے جگری کے ساتھ اس میں حصہ لیا، اور اپنے ۵۰ مبلغ ارتداد کے علاقے میں بھیج دیئے، جو مدت تک بڑی محنت اور جانفشانی سے تبلیغی خدمات انجام دیتے رہے، اس مقصد کے لئے دارالعلوم کی جانب سے آگرہ میں ایک مستقل دفتر تبلیغ قائم کر دیا گیا، اور فتنۂ ارتداد کے علاقے میں ۲۰ مکتب قائم کئے گئے جن میں ملکانوں اور اُن کے بچوں کو اسلام کے عقائد و فرائض اور ضروریاتِ دین کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس جدوجہد کا یہ فائدہ ہوا کہ ارتداد کا بڑھتا ہوا سیلاب رک گیا۔[1]

اس سلسلے میں لاہور کے اخبار "سیاست" نے لکھا تھا کہ :-

"دارالعلوم دیوبند کے مبلّغین کو انسدادِ فتنۂ ارتداد میں جو نمایاں کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں، جہاں تک تحفظِ دین، تردیدِ مخالفین اور اصلاح المسلمین کا تعلق ہے، دارالعلوم کے مدرسین و مبلّغین اور منتظمین کا حصہ سارے ہندوستان سے بڑھ چڑھ کر ہے، مثال کے طور پر اگر اُن غیر محدود کوششوں کو ملاحظہ کر لیا جائے جو آریہ سماج[2] نے اسلام کے خلاف کیں

---

[1] روداد دار العلوم ۱۳۴۲ھ ص ۲ - ۲۲ ۔

[2] ملکانہ راجپوت آگرہ کے آس پاس رہتے تھے، ان کی تعداد چار لاکھ کے قریب تھی، یہ لوگ خدا جانے کب مسلمان ہوئے، ۱۹۲۳ء کے اوائل میں آریہ سماج نے انھیں آریہ بنانے کا سلسلہ شروع کیا جس کو وہ شدھی کے نام سے موسوم کرتے تھے، سوامی شردھانند شدھی کی اس تحریک کے لیڈر تھے، شدھی کی اس تحریک پر مسلمانوں میں بڑی سراسیمگی پیدا ہوئی اور اس کے دفاع و انسداد کے لئے بہت سی تبلیغی جماعتیں اطراف ملک سے آگرہ پہنچ گئیں، یہ واقعہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی کا بہت بڑا سبب بن گیا، چنانچہ شدھی کی تحریک کے بعد فضا اتنی بگڑی کہ پھر سابقہ انداز پر نہ آ سکی (باقی صفحہ پر ملاحظہ)

توآپ کو روز روشن کی طرح نظر آئے گا کہ ان مساعی کے مقابلے میں سب سے زیادہ نمایاں طریق پر جو سینہ سپر ہوا وہ مدرسہ عالیہ عربی دیوبند ہی ہے ۔ جو ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دینی ملی سرمایہ کے تحفظ اور بقا کا ذریعہ بنا ہے۔

تبلیغ عیسائیت کے ساتھ عیسائیت اور آریہ سماج کے حملے جن کا سلسلہ تیرھویں صدی ہجری کے اواخر میں شروع ہوگیا تھا.

(بقیہ صفحہ گزشتہ) اس تحریک نے ملک کی فضا کو اتنا مسموم کر دیا کہ ملک میں جا بجا ہندو مسلم فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا، سیاسی نقطۂ نظر سے انگریزوں کے لئے یہ تحریک بہت کارآمد تھی، انگریز تحریک آزادی میں رخنہ ڈالنے کے لئے اسے اپنے استحکام کے واسطے بہت مفید سمجھتے تھے۔ اس لئے دن بدن یہ تحریک زور پکڑتی رہی، دسمبر ۱۹۲۱ء میں سول نافرمانی کی تحریک کے سلسلے میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم اور آنجہانی سوامی شردھانند میانوالی جیل میں تھے، مولانا مرحوم کے بیان سے شدھی سنگٹھن کی اس تحریک کے اسباب کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے، مولانا لدھیانوی کی سوانح رئیس الاحرار میں "دسترخوان کی وسعت پر شدھی سنگٹھن کا پروگرام" کے عنوان سے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا یہ بیان نقل کیا گیا ہے:۔

"میانوالی جیل میں مسلمانوں کے دسترخوان کی وسعت اس میں ہندو نوجوانوں کی شمولیت، ہندو نوجوانوں کی آزاد خیالی، چھوت چھات سے نفرت سوامی شردھانند کے لئے ناقابل برداشت ہو گئی، پہلے تو انھوں نے ہندوؤں کو مسلمانوں کے دسترخوان پر ساتھ کھانے سے منع کیا، اور کہا کہ "آپ لوگ مسلمان ہوتے جا رہے ہیں" سوامی جی کے نزدیک ہندوؤں کا مسلمانوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا مسلمان ہونے کے برابر تھا، لیکن سوشل تعلقات کی وسعت کے خلاف سوامی جی کی کوئی بات ہندو نوجوانوں نے نہ مانی، آخر انھوں نے اپنی ناکامی کے بعد میانوالی جیل میں یہ اعلان کر دیا کہ:۔

"اگر خلافت تحریک اور ستیہ گرہ کے یہی معنیٰ ہیں کہ دسترخوان پر (باقی بر صفحہ آئندہ)

لے اداریہ روزنامہ "سیاست" لاہور ۲۴ جون ۱۹۲۳ء۔

ان حملوں کا پہلے حضرت مولانا نانوتوی ؒ نے اور اُن کے بعد فضلاء دارالعلوم دیوبند میں مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری ؒ اور مولانا ثناء اللہ امرتسری نے جس قوت اور بے جگری سے مقابلہ کیا وہ دارالعلوم کی تاریخ میں ایک عظیم کارنامہ ہے[1]۔

قادیانیت کے مقابلے میں حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری ؒ، مولانا مرتضیٰ حسن

(بقیہ صفحہ گزشتہ) ہندو مسلمان کی تفریق ختم ہوجائے تو ایسی آزادی ہند کی تحریک سے میں متفق نہیں ہوں "۔

چنانچہ اُنھوں نے سول نافرمانی کی تحریک سے اپنے اقدام کو واپس لے لیا، اور نہایت ڈرامائی انداز سے میاں والی جیل سے رہا ہوگئے، جیل سے آتے ہی اُنھوں نے شدھی سنگھٹن کا اعلان کردیا، میاں والی جیل کے وسیع دسترخوان کی یہ تاریخی اہمیت ہے کہ اس دسترخوان سے ایک شخص نے نادم ہوکر اُس تحریک کا آغاز کیا جس کے نتائج خوفناک حد تک ہندوستان میں سامنے آئے (رئیس الاحرار "ہندوستان کی جنگ آزادی" مصنفہ عزیز الرحمن جامعی ص۱۱۰، ۱۱۱ مطبوعہ ۱۹۶۱ء ۔

بقول مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی ۱۹۱۹ء میں کانگریس کے اجلاس امرتسر میں ہندوؤں مسلمانوں اور سکھوں کے اتحاد کی تاریخ اس واقعہ کے بعد پھر واپس نہیں آئی ۔

چودھری رحم علی ہاشمی جو انگریزی اور اُردو زبانوں کے مشہور صحافی ہیں اپنی تصنیف "یادیں" میں لکھتے ہیں کہ :۔

"لارڈ ریڈنگ نان کوپریشن کی تحریک کو کچلنے میں کامیاب ہوگئے، اُنھوں نے سوامی شردھانند کو جیل سے رہا کرکے سارے ملک میں شدھی اور سنگھٹن کی تحریک چلانے پر مامور کیا، جس سے نان کوپریشن کا پیدا کیا ہوا سارا اتحاد پاش پاش ہوگیا، اور فرقہ پرستی کا جو زہر بویا گیا وہ آج تک ہندوستانی سیاست میں خلفشار پیدا کئے ہوئے ہے" (یادیں بحوالہ ماہنامہ زبان و ادب، نومبر ۱۹۶۲ء مطبوعہ آزاد کتاب گھر دہلی ص ۴۴)

[1] اس سلسلے میں تفصیل کے لئے دیکھئے میلہ خداشناسی، مباحثہ شاہجہانپور، حجۃ الاسلام، انتصار الاسلام، قبلہ نما اور جواب ترکی بترکی ۔

چاند پوری، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا محمد علی جالندھری اور قاضی احسان اللہ شجاع آبادی وغیرہ حضرات نے جو عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں وہ دارالعلوم کی تاریخ کا ایک اہم اور روشن باب ہیں۔

اسی طرح برطانوی دور میں جب بھی کوئی ایسا قانون بنانے کی کوشش کی گئی جو اسلامی شریعت سے متصادم ہو سکتا تھا تو علمائے دیوبند نے اُس کا زبردست مقابلہ کیا اور بروقت اپنی فرض شناسی کا ثبوت دیا ہے، شاردا ایکٹ اور وقف بل کے موقعوں پر جرأت اور صفائی کے ساتھ انھوں نے اسلام کا نقطۂ نظر پیش کرنے میں کبھی تأمل نہیں کیا۔

۱۹۱۷ء میں برطانوی وزیر ہند کی ہندوستان میں آمد کے سلسلے میں ملک کے انتظام میں کچھ تغیرات متوقع تھے، اس موقع پر دارالعلوم دیوبند کی جانب سے ایک مطبوعہ تحریر کے ذریعے مسلمانوں کو اپنے ضروری حقوق طلب کرنے پر متوجہ کیا گیا، اس توجہ دہانی کی اہمیت یوں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس وقت تک مسلمانوں کی کسی سیاسی جماعت نے اس پر توجہ نہیں دی تھی یہ تحریر" جو "تجاویز علماء دیوبند" کے عنوان سے حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ مہتمم خامس دارالعلوم دیوبند نے پیش کی تھی اس میں لکھا ہے کہ:۔

"بروقت تشریف آوری وزیر ہند بہادر نظام ملک میں اہم تغیرات کی توقع کی جاتی ہے، گورنمنٹ کے اعلان ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

ایسے وقت میں مسلمانوں کے مذہبی حقوق اور ان کی کامل آزادی کا تحفظ ضروری ہے، سیاسی مجالس نے اس کی طرف توجہ نہیں کی علماء کا اس وقت سکوت آئندہ کے لئے مضر ثابت ہوگا، اس لئے نہایت ضروری ہے کہ منجانب علماء دیوبند جو ہندوستان کے ہر حصے میں

پھیلے ہوئے ہیں اور اکثر و بیشتر حصہ مدارس دینیہ و سلاسل اسلامیہ ان کے انتظام و سپردگی میں ہے، ایسی تجاویز پیش کر دی جائیں۔ بنا بریں یہ تجاویز آپ کی خدمت میں بھیجی جاتی ہیں کہ انکو ملاحظہ فرما کر اپنی رائے سے یا ان کے علاوہ کوئی اور تجویز پیش کرنی ہو، اس سے مطلع فرمائیں اور اسی مطبوعہ تحریر پر اپنی رائے ثبت فرما کر دارالعلوم دیوبند میں بھیجدیں، علماء کے یہ مطالبات ہر حال میں قابلِ منظوری ہیں، خواہ ہوم رول یا سیلف گورنمنٹ اپنے اصلی معنی میں ملک ہند کو دیئے جائیں یا ان کا کچھ حصہ دیا جائے۔

ان تجاویز کی منظوری کے لئے گورنمنٹ سے عرض کرنا ہر حال میں اسلامی معاملات کے تحفظ اور حسبِ قوانین شرعیہ بلا کسی قسم کی مداخلت یا مزاحمت کے نفاذ کے لئے نہایت ضروری ہے۔

(۱) طبقۂ علماء بحیثیت حقیقی نمائندگان عامۂ مسلمین ہونے کے کسی قسم کی تبدیلی جو مسلمانوں کے کامل آزادانہ حقوق و فوائد سیاسی یا مذہبی کے انتفاع یا تحفظ میں خطرہ پیدا کرنے کا باعث ہو، قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

(۲) مسلمانوں کے عام فوائد کے لحاظ سے یہ امر اشد ضروری ہے کہ کم سے کم ایک مسلمان عالم جو اسلامی دینیات میں دستگاہ کامل رکھتا ہو منجانب سرکار ہر لیجس لیٹو کونسل کے لئے جماعت میں سے نامزد کیا جائے۔

(۳) تمام معاملات فیما بین اہلِ اسلام بموجب قانون شرع محمدی قاضی و مفتیان کی عدالت ہائے اسلامی سے طے ہونے چاہئیں اور اس قسم کی عدالتیں شرع محمدی کے مطابق ملک ہند میں قائم ہونی چاہئیں۔

(۴) تحفظ اوقاف و مساجد و معابد و مقابر وغیرہ وغیرہ اہلِ اسلام زیر نگرانی شیخ الاسلام بموجب قواعد شرعیۂ اسلام ہونی چاہئیں۔

(۵) کوئی ایکٹ و ضوابط آئین و قوانین جو اس معاملے میں قوانین شرعیۂ اسلام سے

متصادم ہو نافذ نہیں ہونا چاہیئے۔

(۶) ایک علیحدہ محکمہ بماتحتی شیخ الاسلام کے جس کے ارکان علماء میں سے انتخاب کئے جاویں قائم ہونا چاہیئے، ہر فرقے کے قائم مقام اس کی مجلس کے رُکن ہوں اور اس فرقے کے معاملات کی نگرانی اُن کے سپرد کی جائے۔

(۷) معاملات مذہبی فیما بین اہلِ اسلام و دیگر اقوام کا تصفیہ مخلوط عدالتوں میں ہونا چاہیئے۔

(۸) تعلیم مذہبی کو قطعاً آزاد رہنا چاہیئے اور کوئی ایسا قانون جو اس میں روکاوٹیں پیدا کر سکے نافذ نہیں ہونا چاہیئے۔

(۹) سند یافتگان مدارس مذہبی کو ان صیغجات میں جو اُن کے مناسب حال ہوں ملازمت ملنا چاہیئے۔

(۱۰) خزانۂ عامرہ سے سالانہ ایک خاص (امداد) تعلیم مذہبی کے واسطے ملنی چاہیئے۔

خادم الاسلام

محمد احمد مہتمم دارالعلوم دیوبند

اسلامی شریعت کے بموجب بہت سے مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لئے قاضی کا مُسلمان ہونا شرط ہے، اسلامی احکام کی رو سے عورت خود نکاح کو فسخ نہیں کر سکتی بلکہ ضروری ہے کہ مُسلمان قاضی سے نکاح فسخ کرایا جائے، اس طرح نکاح، طلاق، میراث، وقف، شفعہ کے ہزاروں مقدمات ایسے ہوتے ہیں جن میں مُسلمان حاکم کے فیصلے اور حکم کی ضرورت ہے، غیر مُسلم حاکم کا فیصلہ اور حکم شرعی نقطۂ نظر اور اسلامی عقائد کے بموجب کافی نہیں ہے، برطانوی عہد میں بہت سے مقامات ایسے تھے جہاں کوئی منصف یا جج مُسلمان نہیں تھا، اس صورت میں خاص طور پر اُن عورتوں کے لئے بڑی مشکلات تھیں جو خلع کی ضرورت مند تھیں،

اُن کے لئے دشواری یہ تھی کہ اگر وہ غیر مُسلم حاکم سے فسخ نکاح کا حکم حاصل کر کے دوسرا نکاح کر لیتی ہیں تو وہ گنہگار اور مرتکبِ حرام ہوتی ہیں ۔

افسوس ہے کہ برطانوی حکومت کی عدم توجہ سے یہ مطالبات منظور نہیں ہو سکے ، اور ابھی تک مُسلم پرسنل لا کا یہ اہم مسئلہ طے نہیں ہو سکا ہے ، تاہم جہاں تک دارالعلوم کے امکان میں تھا اس کی جانب سے بروقت فرض شناسی کا ثبوت دیا گیا ہے اور آج بھی آل انڈیا مُسلم پرسنل لا بورڈ حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی قیادت میں مُسلمانوں کے ان عائلی قوانین کے لئے سرگرم عمل ہے ۔

۱۹۴۷ء / ۱۳۶۶ھ میں ملک کی تقسیم کا زمانہ مُسلمانوں کے لئے بڑا مایوس کن اور حوصلہ شکن تھا اُس وقت مُسلمانوں میں اپنے مستقبل سے سخت مایوسی پیدا ہو گئی تھی ، ان کے اندر خود اعتمادی کے بجائے احساس کمتری رونما ہو چکا تھا اور قریب تھا کہ مُسلمانوں کے قدم اُکھڑ جائیں جن لوگوں نے یہ زمانہ نہیں دیکھا وہ اس کی شدت اور سنگینی کا اندازہ نہیں کر سکتے ، یہ بڑے خوف و ہراس تذبذب اور تزلزل کا ہولناک دور تھا ، اس بلائے رستخیز اور طوفانی سمندر میں دین کی کشتی کو کھینا اور تیز و تند مخالف ہواؤں کے تھپیڑوں سے مقابلہ کرتے ہوئے ثابت قدم رہنا آسان بات نہ تھی ، اس نازک وقت میں علمائے دیوبند نے مُسلمانوں کی ہمت بندھائی اور اپنے وطن میں رہنے اور ناسازگار حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے ان کو آمادہ کیا ، مولانا ابوالحسن علی ندوی نے مکتوباتِ شیخ الاسلام کے مقدمہ میں لکھا ہے :۔

" شمالی ہندوستان اور بالخصوص یوپی جو ہندوستان کے مُسلمانوں کا ذہنی ، علمی اور سیاسی مرکز ہے ، مُسلمانوں کی قسمت اور اُن کے قیام کا انحصار یوپی کے مغربی اضلاع سہارنپور ، مظفر نگر اور میرٹھ کے برقرار رہنے اور مُسلمانوں کے اپنی جگہ قائم رہنے پر تھا ، سہارنپور جو یو . پی اور مشرقی پنجاب کا درمیانی ضلع ہے اُکھڑ جاتا تو مُسلمانوں کا کسی ضلع میں باقی رہنا مشکل تھا ، سہارنپور اور اس کے متصل اضلاع میں مقامی حالات اور مشرقی

پنجاب کے قرب کی وجہ سے ترکِ وطن اور انخلاء کی طاقت ور تحریک اور رجحان پایا جاتا تھا. علماء دیوبند و سہارن پور کا یہ بڑا احسان ہے کہ ان حضرات نے ترکِ وطن کی تحریک و ترغیب کا سختی سے مقابلہ کیا اور اس کو دینی و سیاسی حیثیت سے مسلمانوں کے لئے اقدام قتل کا مرادف بتلایا اور مسلمانوں کے روکنے اور ان کے قدم جمانے کی سخت جد و جہد کی اس میں حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کا بڑا حصہ تھا اُن کی ایمان افروز تقریروں نے ان اضلاع کے مسلمانوں میں دینی روح اور نیا حوصلہ پیدا کر دیا ترکِ وطن کا سلسلہ رک گیا۔[1]

اس سلسلے میں حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند نے میرٹھ اور دوسرے مقامات میں پہنچ کر مسلمانوں کے بستر ے کھلوائے جو پاکستان جانے کے لئے بندھ چکے تھے، اسی سلسلے میں تقریباً ایک ماہ تک مولانا کی تقریر پر میرٹھ میں پابندی عائد کر دی گئی تھی

یورپ اپنے افکار و خیالات کی ترویج و اشاعت مشرقی اقوام میں برسرِ اقتدار افراد کے ذریعے کرتا رہا ہے، چنانچہ اکثر اسلامی ملکوں میں مغرب کی علمی اور سائنسی ترقی سے تاثر اور مرعوبیت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ ان ملکوں میں اسلامی تصورات اور قومی خصوصیات کو ترک کر کے مغربی افکار و نظریات اور قوانین کی نقالی کی جا رہی ہے اور بہت سے ملک تقریباً مغربی تہذیب میں جذب ہو گئے ہیں۔

مگر علماء دیوبند کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے ہر معاملے میں صرف شرعی نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھا اور باہر کی صداؤں اور خارجی اسباب و محرکات سے مرعوب نہیں ہوئے، چناں چہ مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کے خلاف سب سے زیادہ مؤثر آواز جس طبقے کی رہی ہے وہ علماء دیوبند ہی کی جماعت ہے۔

غرض کہ ہند و بیرونِ ہند میں اسلامی احکام و مسائل اور ملک و ملت کی جو عظیم خدمات

---

[1] مقدمہ مکتوبات شیخ الاسلام جلد دوم ص ۴۴ و ۴۵ مکتبہ دینیہ دیوبند

اس ادارے نے انجام دی ہیں اور علوم نبوّت کی جس وسیع پیمانے پر یہاں سے اشاعت ہوئی وہ آپ اپنی مثال ہے دارالعلوم نے دین و شریعت کی یہ خدمات مختلف جہتوں سے انجام دی ہیں۔

دارالعلوم نے اُمّت کو حریت فکر عطا کرنے کے علاوہ معاشرتی اور سماجی زندگی میں تعمیر و اصلاح کے تقریباً ہر گوشے کو اپنی خدمات سے منوّر کرنے کی جد و جہد کی ہے، یہ واقعہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند اگر وجود پذیر نہ ہوتا تو شاید اِس برِّصغیر میں اسلام اپنی اصلی شکل و صورت میں ہمیں ہرگز نظر نہ آتا، دینی علوم اور اسلامی تہذیب و معاشرت کی جو امانت اپنے بزرگوں سے اس ادارے نے پائی ہے وہ اس نے پوری دیانت داری کے ساتھ اُمّت کو منتقل کر دی ہے، یہ ادارہ پچھلی ایک صدی میں اسلامی علوم، تہذیب اور ثقافت کا سب سے بڑا امین ثابت ہوا ہے، اور گزشتہ سو سال سے ہندوستان میں اسلامی علوم و ثقافت سے مُسلمانوں کو روشناس کرا رہا ہے، موجودہ الحاد اور بے دینی کے پُرآشوب دور میں یہی وہ حصار ہے جس نے کروڑوں مُسلمانوں کو روحانی شکست سے محفوظ رکھا ہے، اس نے ملّت کی اجتماعی زندگی اور اس کی عظمت کو برقرار رکھنے میں جو کردار ادا کیا ہے وہ آپ اپنی مثال ہے!

دارالعلوم کی اس نوع کی مساعی کی تاریخ کافی طویل ہے، برِّصغیر کا شاید ہی کوئی لکھا پڑھا مُسلمان ایسا ہو جو اس سلسلے میں دارالعلوم کی گراں قدر کوششوں سے باخبر نہ ہو۔

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موجِ تند جولاں بھی نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا

ممتاز عالم اور مصنّف مولانا سید ابوالحسن ندوی نے ہندوستان کے مسلمانوں کی دینی غیرت اور ملّی حمیّت کا ذکر تے ہوئے جن کی دینی بیداری اور ذہنی شعور کو جِلا بخشنے میں علمائے دیوبند کی خدمات کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ لکھا ہے کہ:

"انگریزی اقتدار اُن مُسلمانوں کی طرف سے جنھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی

قیادت کی تھی خار کھائے ہوئے تھا، وہ مسلمانوں کو اپنا اصل دائمی حریف اور اسلام کو اپنے کیمپ کا متوازی و مقابل کیمپ سمجھتا تھا، دونوں کو اس کا دعویٰ تھا کہ وہ زندگی کی راہ نمائی اور معاشرۂ انسانی کی تعمیر و تشکیل کی اہلیت رکھتے ہیں، اس لئے اس معرکے کی شعلہ سامانیوں اور تاداںِ جنگ میں مسلمانوں کا حصہ ملک کے ہر فرقے سے زیادہ تھا، ان کو صورتِ حال کی سنگینی اور دور رس خطرات کا پورا اندازہ تھا۔

لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان اِس زبردست سازش اور مغربی تہذیب کی طوفانی یلغار کے سامنے بہت سی اُن مسلم قوموں سے کہیں زیادہ ثابت قدم، سخت جاں، ناقابلِ تسخیر اور اپنی اسلامی شخصیت اور معنوی دولت کی حفاظت میں زیادہ کامیاب ثابت ہوئے جن کا انیسویں صدی کے اواخر یا بیسویں صدی کے اوائل میں مغربی اقتدار یا مغربی افکار سے واسطہ پڑا۔

مغربی تہذیب و تعلیم کی اِس یلغار کے علاوہ ہندوستانی مسلمانوں کو ایک دوسری یلغار کا بھی مقابلہ کرنا پڑا، یہ عیسائی مشنریوں کی یلغار تھی جو انگریزی اقتدار کے اس ملک میں قدم جماتے ہی زور شور سے شروع ہوئی اور قریب تھا کہ پورے ملک کو وہ اپنی لپیٹ میں لے لے، یہ عیسائی مشنری جدید ترین اور موثر ترین اسلحہ سے لیس تھے، ان کو حکومت کی حمایت و سرپرستی بھی حاصل تھی جو اس زرخیز ملک کو حضرت مسیح کا عطیہ اور انعام سمجھ رہی تھی اور اس اقتدار کو عیسائیت کے فروغ و اشاعت کے لئے ایک زریں موقع تصور کرتی تھی۔

ان مشنری سرگرمیوں اور پورے ملک کو عیسائی بنا لینے کے عزم و منصوبے کے علاوہ تشکیک کی ایک طاقت ور تحریک بھی جاری تھی جس کا مقصد اسلام سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کو مسلمان نوجوانوں کی نظر میں مشتبہ و مشکوک بنا دینا تھا، خواہ اس کا تعلق شریعت و قانون سے ہو یا تہذیب و تمدن اور ثقافت و تاریخ سے، ہندوستان کے علماء نے ان دونوں تحریکوں اور طاقتوں کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کیا، انھوں نے معذرت و دفاع کی

سیاست کو ترک کے انہدام وحملے کی سیاست اور بھرپور علمی تنقید کا راستہ اختیار کیا، اسکے نتیجے میں تبلیغ عیسائیت کی یہ تیز و تند لہریں اور تشکیک کی پوری مہم پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئی، اور مسلمانوں کے اندر اسلام پر نیا اعتماد اپنی تہذیب و ثقافت پر فخر اور اپنی شخصیت و تاریخ کا احترام پیدا ہوا۔

اسلامی مسائل کے بارے میں خواہ اُن کا تعلق دنیا کے دور دراز گوشوں سے ہو، یہاں کی ملّتِ اسلامی ہمیشہ سے بہت ذکی الحس واقع ہوئی ہے اور اس کا عمل اس بارے میں "داور ستنہ" ..... اور لیبن دین کے اصول پر نہیں ہے، یہ اس کے دینی جذبات اور مخصوص تربیت کا نتیجہ ہے۔

اس کا یہ جذبۂ اسلامی اور دین سے گہری وابستگی اُن دینی مدارس و مکاتب کی شکل میں نمایاں ہے جن کا سارے ملک میں جال بچھا ہوا ہے اور جس سے کوئی شہر و قریہ مشکل سے بچا ہوگا، مسلمانوں نے یہ قلعے انگریزی حکومت کے استحکام اور تعلیمی نظام کے نئے رُخ کو سامنے رکھ کر قائم کئے تھے جن کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہو کر ہزاروں تک پہنچتی ہے۔

ہندوستانی مسلمان خدا کے فضل سے بڑی حد تک اسلام کے معاملے میں خود کفیل ہیں وہ اسلام کے اوّلین و حقیقی سرچشموں کتاب وسنّت اور اسلام کے اولین علم برداروں کی سیرت و کردار ان کی قربانی و ایثار اور اُن کی اولوالعزمی اور حوصلہ مندی کی جلائی ہوئی شمع سے روشنی حاصل کرتے ہیں، انھوں نے اپنا عقیدہ و ایمان، اپنا حال و مآل اسلام کے چمکتے ہوئے سورج کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔ مسلم اقوام یا عرب ممالک کے ابھرتے ڈوبتے ستاروں یا ٹمٹماتے چراغوں سے نہیں، وہ آنکھ بند کر کے اُن میں سے کسی کی اُنگلی پکڑ کر چلنے والے نہیں ہیں نہ انھوں نے اُن میں سے کسی کی اسلام کے ساتھ وفاشعاری کو اپنی وفاشعاری کی شرط قرار دی ہے، انھوں نے اللہ کے بھروسے پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان کو اسلام اور اسلامی

تعلیمات کو اپنے سینے سے لگائے رکھتا ہے، خواہ دنیا کی کوئی قوم (عرب ہو یا عجم) اس سے بے تعلقی یا روگردانی اختیار کرے، ہم انشاء اللہ وحدتِ اسلامی اور شریعتِ اسلامی کا دم بھرتے رہیں گے، ہم اسلامی اصولوں اور اسلام کے مسلکِ زندگی کے معاملے میں کسی قسم کا سودا کرنے کے لئے تیار نہیں، ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ہمیں اس ملک میں اور اس ملک کے باہر اپنی اصول پسندی اور وفا شعاری کی قیمت ادا کرنی پڑے گی، ہمیں بہت سے اُن منافع اور مواقع سے آنکھیں بند کرنی پڑیں گی جو ہوا کے رُخ پر چلنے والی ملتوں اور فرقوں کو حاصل ہوتے ہیں، لیکن ہمارا یقین ہے کہ اگر ہمارا خدا ہم سے راضی ہے .... اور ہم خلوص و فہم کے ساتھ اپنے اصولوں پر قائم رہے تو ہمارے لئے کوئی تنگی اور ہماری قسمت میں کوئی محرومی نہیں لکھی ہے"۔[1]

مدارسِ دینیہ سے برصغیر کے مسلمانوں کو کیا نفع پہنچا؟ اس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے علامہ اقبال نے ایک مرتبہ اپنے ایک عقیدت مند حکیم احمد شجاع سے کہا تھا کہ "ان مدرسوں کو اسی حالت میں رہنے دو، غریب مسلمانوں کے بچوں کو انھیں مدرسوں میں پڑھنے دو، اگر یہ ملا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ جو کچھ ہوگا میں اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں، اگر ہندوستان کے مسلمان ان مدرسوں کے اثر سے محروم ہو گئے تو بالکل اسی طرح ہوگا جس طرح اُندلس (اسپین) میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس حکومت کے باوجود ہوا آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈر اور الحمراء کے نشانات کے سوا اسلام کے پیروؤں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا، ہندوستان میں بھی آگرہ کے تاج محل اور دلی کے لال قلعے کے سوا مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت اور انکی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔"[2]

---

[1] خطبۂ استقبالیہ مولانا ابوالحسن علی ندوی مطبوعہ تعمیر حیات لکھنؤ ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۵ء ص ۴ - ۶

[2] خون بہا از حکیم احمد شجاع حصہ اول ص ۴۳۹

دارالعلوم کا حصّہ تحریکِ آزادی میں

دارالعلوم دیوبند کی سیاسی تاریخ کا آغاز قیامِ دارالعلوم سے بھی نو دس سال پہلے سے سمجھنا چاہیئے، ۱۸۵۷ء / ۱۲۷۴ھ میں انگریزی اقتدار سے ہندوستان کی آزادی کے لئے دارالعلوم کے اکابر بالخصوص شیخ الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ (عمر ۴۲ سال) حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (۲۵ سال) اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (۲۹ سال) وغیرہم حضرات نے استخلاصِ وطن کے لئے جو سرفروشانہ جد و جہد فرمائی وہ تاریخ دارالعلوم کا صفحۂ اوّلین ہے، ضلع مظفر نگر کے مشہور تاریخی قصبے تھانہ بھونؔ[1] کے ایک اجتماع میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے ہاتھ پر بیعتِ امارت کر کے اُن کو امیر منتخب کیا گیا اور اسی وقت انگریزی حکومت کے ختم ہو جانے کا اعلان کر دیا گیا، اور آزادیٔ وطن کے لئے جان باز مجاہدین کی ایک جماعت بنائی گئی، حضرت حافظ محمد ضامن شہیدؒ کو جماعتِ مجاہدین کا قائد بنایا گیا، اتفاق سے ٹھیک اُسی زمانے میں انگریزی فوج کے چند سوار کہاروں کے کندھوں پر کارتوسوں کی بہنگیاں

---

[1] تھانہ بھون کا قدیم نام تھانہ بھیم تھا، ابو الفضل نے آئینِ اکبری میں یہی نام لکھا ہے، کثرتِ استعمال سے تھانہ بھون کہلانے لگا، تھانہ بھون اُتر پردیش کے شمالی مغربی حصّہ کا ایک قدیم قصبہ ہے (باقی آئندہ صفحہ پر)

لدوائے ہوئے سہارن پور سے کیرانہ[1] جا رہے تھے، جماعتِ مجاہدین کے لئے یہ بڑا اچھا موقع تھا انھوں نے سواروں پر حملہ کر کے ہتھیار چھین لئے، انگریز افسر جو ساتھ تھے مقابلے میں مارے گئے[2]، اس کامیابی کے بعد مجاہدین نے قریب کی تحصیل شاملی پر حملہ کیا، تحصیل کو انگریزی فوج نے قلعے کی طرح مستحکم کر کے دروازہ بند کر لیا، مجاہدین چونکہ کھلے میدان میں تھے، اس لئے انھیں انگریزی فوج کی گولیوں سے بڑا نقصان اٹھانا پڑا، سوانح قاسمی کی روایت کے مطابق اس نازک موقع پر حضرت نانوتویؒ نے بڑی جرارت اور دلیری سے کام لے کر تحصیل کے پھاٹک کو آگ لگا دی، مجاہدین آگ کے شعلوں ہی میں تحصیل کے اندر گھس گئے بڑا سخت معرکہ پڑا دست بدست جنگ کے بعد محصورین ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔

عین اُس وقت جب انگریزی فوج کے سپاہی ہتھیار ڈال رہے تھے حضرت حافظ محمد ضامنؒ نے انگریزی فوج کی گولی سے جام شہادت نوش کیا، یہ واقعہ ۲۴ محرم ۱۲۷۴ھ کو دوشنبہ کے دن ظہر کے وقت پیش آیا[3]۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ) تھانہ بھون مظفر نگر کے ضلع میں واقع ہے، انقلاب ۱۸۵۷ء سے پہلے اس کی آبادی ۵۰ ہزار کے لگ بھگ تھی، آبادی کے گرد شہر پناہ بنی ہوئی تھی جس میں ۴ دروازے تھے ستمبر ۱۸۵۷ء میں انگریزی فوج کے ہاتھوں بڑی طرح برباد ہو گیا تھا، اور اب تو یہ اُجڑے دیاروں میں شامل ہے پانچ ہزار سے زیادہ کی آبادی نہیں ہے، اکابر علماءِ دیوبند کے جہادِ شاملی کی تحریک کا یہی قصبہ مرکز تھا، حضرت حاجی امداد اللہ تھانویؒ اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا وطن ہونے کی وجہ سے اس قصبہ کو شہرتِ عام حاصل ہو گئی ہے۔

[1] کیرانہ، ضلع مظفر نگر کی تحصیل ہے، پہلے یہاں کی تحصیل کا صدر مقام شاملی تھا۔

[2] سوانح قاسمی جلد دوم ص ۱۳۲۔

[3] ۲۴ محرم الحرام ۱۲۷۴ھ کی مطابقت حساب کی رو سے ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء ہوتی ہے (باقی صفحہ آئندہ پر)

معرکۂ شاملی کی ۱۴ ستمبر کی یہ وہی تاریخ ہے جس میں انگریزی فوج دہلی میں داخل ہو کر لال قلعہ پر قابض ہو گئی تھی، بدقسمتی سے ہندوستان کے عوام اُس وقت اپنی طاقت کو منظم نہ کر سکے اور نتیجۃً انگریزوں کا پورے ہندوستان پر تسلّط قائم ہو گیا۔

شاندار ماضی کی روایت کے مطابق یہ معرکہ تین دن تک جاری رہا جس میں مجاہدین کا بہت نقصان ہوا، تیسرے دن حضرت حافظ ضامن شاہؒ نے سرفروشی کو کام میں لا کر تحصیل کا دروازہ توڑ دیا اور خود انگریزی فوج کی گولی سے شہید ہو گئے۔[1]

انگریز وقائع نگار ہنری جارج کین کا بیان ہے کہ لڑائی صرف ایک دن جاری رہی جس میں ۱۱۳ محصورین مارے گئے لکھا ہے کہ :-

(بقیہ صفحہ گزشتہ) اس تاریخ شہادت کا ماخذ حکیم ضیاء الدین رام پوری (وفات ۱۳۱۳ھ) کا غیر مطبوعہ رسالہ مونس مہجوران ہے، یہ عجیب بات ہے کہ معرکہ شاملی اور حضرت حافظ محمد ضامنؒ کی شہادت کے حالات متعدد حضرات نے لکھے ہیں، مگر کسی نے بھی اس واقعے کے پیش آنے کی تاریخ نہیں لکھی۔

مونس مہجوران کا مخطوطہ مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے کتب خانے میں موجود ہے، یہ مصنف کا اصل مخطوطہ ہے، اس کی دریافت کا سہرا راقم سطور کے صدیق مکرم مولانا نسیم احمد صاحب فریدی امروہی کے سر ہے، فریدی صاحب نے مونس مہجوران کے ضروری مقامات کے اقتباسات لے کر اُن کو ماہ نامہ "تذکرہ" دیوبند بابت نومبر ۱۹۶۱ء میں شائع کرا دیا ہے، مونس مہجوران میں معرکہ شاملی کی تاریخ ۲۴ محرم ۱۲۷۴ھ لکھی ہے، اس تاریخ کی تائید سر سید مرحوم اور انگریزی وقائع نگاروں کی تحریروں سے بھی ہوتی ہے۔

سید محبوب رضوی

[1] جاں بازانِ حریت جلد چہارم

"لڑائی تمام دن جاری رہی، لیکن چونکہ حملہ آوروں کی تعداد زیادہ تھی، اس لئے اُن کا پلّہ بھاری رہا، انھوں نے بہت سی عمارتوں کے چھپروں میں جو احاطے کی دیوار سے باہر نکلے ہوئے تھے آگ لگادی، محصورین میں ۱۱۳ آدمی مارے گئے، جن میں ابراہیم خاں سب کلکٹر بھی تھا[1]۔"

انگریزوں نے شاملی پر حملے کا سخت انتقام لیا اور تھانہ بھون کو بُری طرح تباہ وبرباد کر دیا، حضرت حاجی صاحبؒ مکّہ مکرمہ ہجرت کر گئے۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی چھ ماہ جیل خانہ میں رہے، حضرت مولانا نانوتویؒ کا وارنٹ گرفتاری جاری ہوا، مگر انگریزوں کے ہاتھ نہیں آئے، اور دوسرے بہت سے حضرات روپوش ہوگئے۔

ان حضرات کے دلوں میں چونکہ برطانوی سامراج کی طرف سے ایک تلخ جذبہ ہمیشہ موجود رہا، اس لئے اس جذبے کے تحت قیام دارالعلوم ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء سے لے کر ۱۳۶۶ھ/۱۹۴۷ء تک دارالعلوم کے بزرگ ملکی تعمیر اور جنگِ آزادی کی جدوجہد سے حقیقی دلچسپی اور ہمدردی اپنے سینوں میں رکھتے آئے ہیں، حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ:-

"۱۸۵۷ء کے بعد صرف یہی جماعت تھی جس نے آزادی کے تصور کو ہندوستان میں زندہ رکھا، اور بالآخر اس تصور کا سب کو دیوانہ بنا کر چھوڑا، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے بقول اس تصور کے سب سے بڑے حامل حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تھے، انھوں نے اپنے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ کی قیادت میں تلوار اُٹھائی اور آزادی کی راہ میں سرفروشی کے ساتھ میدان میں اُترے، شاملی کی تحصیل فتح کی آگے بڑھنا چاہتے تھے،

---

[1] کین بحوالہ حالات حضرت مولانا شیخ محمد تھانویؒ مصنفہ نثار الحق دیوبندی تم کراچوی ص ۵۳ مطبوعہ پاک اکیڈمی کراچی ۱۹۶۳ء

کہ حالات دگرگوں ہو گئے، دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

گو میدانِ جنگ میں شکست ہو چکی تھی، مگر جماعت کا تصورِ آزادی فنا نہیں ہوا تھا اس زمانہ میں چھتہ کی مسجد میں ایک بزرگ نے انگریزوں کے تسلط اور اُن کی غیر معمولی طاقت کو دیکھ کر کہا تھا کہ "انگریزوں نے بڑے گہرے پنجے جمائے ہیں، دیکھئے کس طرح اُکھڑتے ہیں، اس پر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ صدر المدرسین اوّل دارالعلوم دیوبند نے جو حضرت نانوتویؒ کے عزیز و شاگرد اور رفقاءِ خاص میں سے تھے، بڑے پُر جلال انداز میں فرمایا کہ "آپ کس خیال میں ہیں، وہ وقت دور نہیں جب ہندوستان صف کی طرح لوٹ جائے گا، رات کو سوئیں گے ان کی حکومت میں اور صبح کریں گے دوسری عملداری میں"

علمائے دیوبند ہمیشہ اولوالعزمی اور توکل علی اللہ کے ساتھ نہ صرف ہندوستان کی تحریک آزادی کی جدوجہد کرنے والوں کی صفِ اول میں رہے ہیں، بلکہ اکثر اوقات انھوں نے تحریکِ آزادی کی قیادت کی ہے اور زیادہ غور سے دیکھا جائے اور انصاف سے کام لیا جائے تو اوّل اوّل یہ خیال انھوں نے ہی دیا آزادی کے جذبے میں جو حرارت، طاقت اور عمومیت پیدا ہوئی وہ انھیں کی رہینِ منت تھی ان میں سے متعدد حضرات نے انگریزی حکومت کے خلاف علم جہاد بلند کیا، انگریزی فوجوں سے دوبدو جنگ کی، متعدد حضرات ایسے تھے جنھوں نے اپنی زندگی کا خاصہ حصہ جیلوں میں گزارا، حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی کی تاریخ علماء اور دینی شخصیتوں کی تاریخ کے ساتھ اس طرح گھل مل گئی ہے کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا بہت مشکل ہے، سیاسی زوال نے مسلمانوں کو بے چارگی و مجبوری اور بے چینی و پریشانی کے جس عالم میں پہنچا دیا تھا دارالعلوم دیوبند کے قیام سے انھیں سکون و اطمینان اور قرار نصیب ہوا۔

۱۹۱۲ء میں حضرت نانوتویؒ کے تلمیذ رشید حضرت مولانا محمود حسن شیخ الہند نے برطانوی حکومت کے خلاف انقلاب برپا کرنے کی اسکیم تیار کی جسے رولٹ کمیٹی کی رپورٹ

میں "ریشمی خطوط" کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے، مگر اتفاق سے یہ اسکیم ناکام ہو گئی، اور حضرت شیخ الہند کو اپنے رفقاء حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا عزیز گل صاحب اور دوسرے چند حضرات سمیت گرفتار کیا گیا، اور کئی سال تک بحر روم کے جزیرہ مالٹا میں نظر بند رکھا گیا، حضرت شیخ الہندؒ کے تلامذہ میں حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور حضرت مولانا منصور انصاریؒ کو بڑی طویل مدت تک جلاوطنی کی زندگی گزارنی پڑی۔

۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء میں مالٹا سے رہائی کے بعد حضرت شیخ الہندؒ جمعیۃ العلماء میں شامل ہو گئے جسے اُن کے تلامذہ نے ۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء میں تحریکِ آزادی کو فروغ دینے کے لئے قائم کیا تھا جمعیۃ العلماء نے انڈین نیشنل کانگریس کے شانہ بشانہ ملک کو سیاسی اور سماجی طور پر بیدار کرنے میں اپنی قوت صرف کر دی، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، حضرت مولانا سید فخر الدین احمد اور بعد میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، حضرت مولانا منت اللہ رحمانی، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی، حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی، اور دوسرے بہت سے علماء دیوبند استخلاصِ وطن کی تحریکوں میں نہ صرف یہ کہ پیش پیش رہے بلکہ وہ متعدد تحریکوں کے عالمِ وجود میں آنے کا ذریعہ بنے ہیں اور اس سلسلہ میں قید و بند اور جیلوں کی مصیبتیں بھگتی ہیں۔

۱۳۴۵ھ/۱۹۲۶ء میں جمعیۃ العلماء ہند کے اجلاس کلکتہ میں ہندوستان کی مکمل آزادی کی داغ بیل جن حضرات کے ہاتھوں سے پڑی وہ دارالعلوم دیوبند ہی کے فضلاء تھے، پھر ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۷ء میں پشاور کے اجلاس میں اس کا اعادہ کیا گیا۔[۱]

یہاں یہ واضح رہے کہ انڈین نیشنل کانگریس نے تین سال کے بعد اپنے اجلاس لاہور میں آزادی کامل کا اعلان کیا تھا۔[۲]

---

[۱] روشن مستقبل باب نہم ص ۳۹۰، ۳۹۱ مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۴۳ء

[۲] ایضاً ص ۴۰۳

خان عبدالغفار خاں نے ۱۳۸۹ھ/۱۹۶۹ء میں اپنے دورۂ ہندوستان کے موقع پر دارالعلوم میں طلبار سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ :۔

" حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب جب حیات تھے اس وقت سے میرا تعلق دیوبند سے ہے، ہم یہاں بیٹھ کر آزادی کی تحریک کے پلان تیار کیا کرتے تھے کہ کس طرح انگریزوں کو اس ملک سے نکال باہر کریں اور کس طرح ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے چھٹکارا دلا کر آزاد کرائیں ۔ اس ادارے نے ملک کی آزادی کے لئے بڑی بڑی کوششیں کی ہیں "

مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں مسٹر ظہیرالدین صدیقی نے اپنی ایک تقریر میں دارالعلوم دیوبند کو ایشیا میں اسلامی تعلیمات کا سب سے بڑا مرکز بتلاتے ہوئے کہا کہ :۔

" نہ صرف مذہبی میدان میں بلکہ سیاسی میدان میں بھی دارالعلوم کی خدمات کی ایک زرّیں تاریخ ہے، ہمیں فخر ہے کہ دیوبند نے ہمیں آزادی کی خاطر لڑنا سکھایا ۔ وہاں کے اساتذہ نے عملی طور پر ہماری رہنمائی فرمائی اور سیاسی قدامت پرستی کے خلاف عَلم بلند کیا، اور ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے سیاسی ترقی پسندی کا تصور پیش کیا اور اس کے حصول کی راہ میں کسی قربانی سے گریز نہیں کیا، اُن کی سیاسیات میں بلا کی دوربینی، ہوشمندی اور حق پسندی ہے، اور اُن کے طرزِ عمل میں ہمیں ایک ٹھیراؤ، عزم اور خلوص ملتا ہے۔[1]

تحریکِ خلافت میں دارالعلوم نے جس جوش و خروش سے حصہ لیا اس کے دیکھنے والے ابھی زندہ ہیں، اُس زمانے میں اس بات کا شدید خطرہ محسوس کیا جارہا تھا کہ برطانوی حکومت دارالعلوم کی سیاسی سرگرمیوں کو روکنے کے لئے اسے بند کر دینے پر آمادہ ہے، مگر اس کی قطعاً پرواہ نہیں کی گئی، اساتذہ اور طلبار نے شہر بشہر اور قریہ بقریہ پھر کر اپنی

---

[1] روزنامہ الجمعیۃ دہلی ۱۳ر دسمبر ۱۹۵۳ء ــــ ص ۳

پُرجوش تقریروں سے عوام کو بیدار کرنے کی مہم میں زبردست حصہ لیا، اور اپنی امکانی حد تک کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، بلا مبالغہ اُس وقت عام مسلمانوں میں جس نے آزادی کی تڑپ پیدا کی وہ حضرت شیخ الہندؒ کی آواز تھی، جس نے اس وقت کے عوام وخواص کو بے چین کر کے ایک مرکز پر جمع کر دیا تھا، اس وقت اقوام ہند کے سامنے صرف آزادیٔ وطن کا مسئلہ تھا، لیکن مسلمانوں کے سامنے دو مسئلے تھے، ایک وطن کی آزادی کا اور دوسرا خلافت کے بقا و تحفظ کا تھا، اس لئے جس طرح مسلمانوں کے فرائض دوچند تھے اسی طرح اُن کی جدوجہد بھی جملہ اقوام ہند سے زیادہ تھی۔

اسی زمانۂ تحریک خلافت (۱۹۱۹ء، ۱۳۳۸ھ) میں علماء کی ایک مستقل سیاسی جماعت قائم کی گئی، جو جمعیۃ العلماء ہند کے نام سے موسوم ہے جس نے ہندوستان کی آزادی میں ملک کی عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں، جمعیۃ العلماء کا سوادِ اعظم علمائے دیوبند ہی پر مشتمل رہا ہے، اس لحاظ سے جمعیۃ العلماء ہند کی تاریخ گویا دارالعلوم دیوبند ہی کی سیاسی تاریخ کا حصّہ ہے، دارالعلوم آزادی کے عَلم برداروں کے لئے ہمیشہ قوت اور فیضان کا سرچشمہ رہا ہے

غرض کہ ملک وملت کے کسی بھی تقاضے کو پورا کرنے میں اکابرِ دارالعلوم کا قدم کبھی پیچھے نہیں رہا، بلکہ ہمیشہ حق کی آواز بلند کرنے میں انھوں نے سبقت کی، اور سیاسی گتھیوں کو سُلجھانے میں شرعی حیثیت سے رہنمائی کی ہے، چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ملک میں دارالعلوم دیوبند کی رائے کو شرعی حیثیت سے ہمیشہ اہمیت حاصل رہی ہے۔

دارالعلوم نے مسلمانانِ ہند کی علمی، دینی، سیاسی اور ثقافتی زندگی کو دینی مدارس کے ذریعے سب سے زیادہ متأثر کیا ہے، اس کے فرزندوں نے زندگی کے مختلف میدانوں میں مسلمانوں کی رہنمائی کی وہ عظیم خدمات انجام دی ہیں جو بالآخر مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی تحریک کا سب سے بڑا سرچشمہ ثابت ہوئیں۔

دارالعلوم سے آزادی کے مجاہدوں اور قوم کے خدمت گزاروں کی ایک ایسی جماعت

پیدا ہوئی جس سے ملت کی پیشانی کو تابندگی ملی۔ انھوں نے ملک کو محکومی اور غلامی کی زندگی سے نکال کر دنیا کی آزاد قوموں میں حصہ دلانے کے لئے عظیم قربانیاں دیں، دعوت و اصلاح کے میدانوں میں عظیم الشان خدمات کے انجام دینے میں وہ ملک بھر میں پیش پیش رہے ہیں اس کے فرزندوں میں بہت سے شعلہ نوا خطیب، بلند پایہ مصنف، صحافی اور انشا پرداز پیدا ہوئے، ندوۃ المصنفین دہلی جیسا علمی و تحقیقی ادارہ دارالعلوم ہی کے فیض یافتہ ارباب علم و فضل نے قائم کیا ہے۔

گورنمنٹ نیشنل کالج کراچی کے مجلۂ علم و آگہی میں لکھا ہے:۔

"دارالعلوم دیوبند علوم اسلامی کی ایک قدیم درس گاہ ہی نہیں بلکہ احیائے اسلام و قیام ملت کی ایک عظیم الشان تحریک کا نام ہے، دارالعلوم دیوبند انقلاب کا مرکز اور سیاسی تربیت گاہ تھی، اس نے اسلام کے جاں نثاروں اور ملت کے غم گساروں کی ایک ایسی جماعت تیار کردی جو ملت کے غم میں خود بھی روئے اور دوسروں کو بھی رُلایا، جو اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کے وقار کی بحالی کے لئے خود بھی تڑپے اور دوسروں کو بھی تڑپایا، انھوں نے آبرومندانہ زندگی کے حصول کے لئے خود بھی اپنی جانیں قربان کیں اور دوسروں کو بھی جاں نثاری اور ایثار پیشگی کا سبق دیا، انھوں نے مسلمانوں کے ذہنی جمود کو توڑا، برٹش استعمار کے سحر کو توڑا، انھوں نے وقت کی استبدادی قوتوں سے پنجہ آزمائی کی اور ملک کے ذہنوں سے خوف و ہراس کو دُور کیا، اتنا ہی نہیں انھوں نے علی گڑھ کے سیاسی ویرانے میں آزادی کی شمع روشن کی، نصب العین کی پستی سے نکالا، مقصد کی سطحیت کا احساس پیدا کیا اور اس محفل میں جہاں زباں بندی کا دستور نافذ تھا، جہاں بات کرنے پر زبان کٹتی تھی اور ذہنوں پر پہرے بٹھائے جاتے تھے، وہاں انقلاب کا صور پھونکا، اور نوجوانوں کی ایک بڑی جماعت کو کاسہ لیسانہ زندگی کی غلاظت سے نکال کر ملک کی آزادی کی جدوجہد میں رہنمائی کے منصب پر فائز کیا، یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ بیسوی صدی

کے شروع میں علی گڈھ میں جو سیاسی بیداری پیدا ہوئی وہ دیوبند اور ملک کی دوسری انقلابی وسیاسی تحریکات کی رہنِ منت تھی، اور جو انقلابی حریت پسندا تھے وہ دیوبند کے سرچشمۂ فکر کا فیضان تھا۔

دیوبند کے اکابر نے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں بیش از بیش حصہ لیا، اس راستے کی تمام صعوبتوں کو برداشت کیا اور ہر آزمائش میں پورے اُترے، دارالعلوم کے قیام کے بعد وطنی سیاست میں حصہ لینے کا دور حضرت شیخ الہندؒ سے شروع ہوتا ہے، مولانا عبیداللہ سندھی نے حضرت شیخ الہند کی زندگی کو تحریک ولی اللہی کا ایک مستقل عہد تسلیم کیا ہے، حضرت شیخ الہند کی سرکردگی میں اصحابِ عزیمت کا جو قافلہ تیار ہوا تھا اس میں مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا محمد میاں منصور انصاری، مولانا فضل ربی (رکن ہیئت تمیز یہ افغانستان) مولانا سیف الرحمٰن کابلی، مولانا محمد صادق کراچوی، مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا احمد علی لاہوری، اور دوسرے بہت سے اکابر شامل تھے، آج بھی ہندوستان سے پاکستان تک دارالعلوم دیوبند کے فضلا سیاسی میدان میں بھی ملک وملت کی رہ نمائی کررہے ہیں، دیوبند کے ایک نامور عالم حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بعض مسائل میں جو روش اختیار کی اس سے تحریکِ پاکستان کے رہ نماؤں نے فائدہ اُٹھایا، مولانا شبیر احمد عثمانی تو تحریک پاکستان کے رہ نماؤں میں شامل تھے اور انھوں نے اپنی بہترین عالمانہ صلاحیتوں سے مسلم لیگ کو اسلامی ریاست کے نصب العین پر مستحکم کرنے اور استوار رکھنے کی کوشش کی پھر قیام پاکستان کے بعد دیوبند کے ہندوستانی رہ نماؤں نے نہایت خراب حالات میں ہندوستانی مسلمانوں کی رہ نمائی کی اور ان کے حوصلوں کو بلند رکھا، اور پاکستان میں اس سلسلے کے بزرگوں نے ملک وملت کی تعمیر وخدمت کا ایک نئے عزم کے ساتھ بیڑا اُٹھایا اور پاکستان کی زندگی کے ہر گوشے میں اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں سے ملت کی رہبری کی۔

دارالعلوم دیوبند کے اکابر اور اس کے فرزند علمی و ادبی خدمت کے میدان میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے، اس کے بانیوں میں حاجی امداد اللہؒ اور مولانا محمد قاسمؒ اُردو کے بہترین ادیب اور صاحبِ تصنیف و تالیف بزرگ تھے، حضرت شیخ الہندؒ دیوبند کے نامور سپوت اور اس کے رہ نماؤں میں تھے، وہ بہت بڑے صاحبِ قلم بزرگ تھے، ان کا ترجمہ قرآنِ حکیم اُردو ادب کا شاہکار ہے، ان کے علاوہ علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی مولانا بدرِ عالم میرٹھی، مولانا سید محمد میاں، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا قاری محمد طیب صاحب کی تحریریں عالمانہ اور محققانہ ہی نہیں زبان و بیان اور اسلوب کے لحاظ سے بھی وقت کی معیاری ادبی تحریریں ہوتی ہیں، تاجور نجیب آبادی، منظر الدین بجنوری، حامد الانصاری غازی، شائق احمد عثمانی تو ادب و شعر کی دنیا میں معروف ہی ادبی حیثیت سے ہیں، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا حسین احمد مدنی اور بہت سے اکابر دیوبند اگرچہ ادبی حیثیت سے مشہور نہیں ہو سکے لیکن وہ اپنی تصانیف کی کثرت یا تصانیف کی علمی، تاریخی، سیاسی حیثیت کی بنا پر علمی و ادبی دنیا کی معروف شخصیت ہیں، ان کی خدمات سے ہر شخص واقف ہے، اگر ندوۃ العلماء لکھنؤ کو اس امر کا حق پہنچتا ہے کہ وہ دار المصنفین اعظم گڈھ میں ہونے والے علمی کام اپنے لئے باعثِ افتخار سمجھے تو دار العلوم دیوبند کو بھی اس کا حق ہے کہ اس کے عظیم فرزندوں نے ندوۃ المصنفین دہلی میں بیٹھ کر علم و ادب اور تصنیف و تحقیق کے جو ہفت خواں طے کئے ہیں وہ اُن پر فخر کرے، یا اس کے فرزندوں نے علم و ادب کے جس میدان میں بھی اور کسی علمی ادارے کے گوشۂ خلوت میں یا کسی مجلہ و اخبار میں کوئی علمی و صحافتی اور ادبی خدمت انجام دی ہے وہ اسے اپنی تاریخ و تذکرے میں بیان کرے۔

دارالعلوم دیوبند ظاہر ہے کہ ایک قدیم طرز کی اسلامی درس گاہ ہے، اس میں

اسلامی علوم و فنون کی ایک مخصوص انداز سے تعلیم دی جاتی ہے، ہمیں اس کی تعلیم اور اسکے نتائج کو کسی جدید علمی درسگاہ کے معیار پر نہیں جانچنا چاہیے۔ لیکن دارالعلوم دیوبند کی اس خصوصیت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ اس کے فارغ التحصیل ذہن و فکر اور اخلاق و سیرت کے ان پیمانوں سے بہت بلند ہیں جن کا تصور کیا جا سکتا ہے، ان میں دوسرے دینی مدارس اور مکاتب فکر کے لوگوں کی نسبت وسعتِ قلبی، بلند نظری، اعلیٰ ظرفی اور اخلاص و عمل کی زیادہ صلاحیتیں ہوتی ہیں، دوسرے مکاتبِ فکر کے علماء کے مقابلے میں وہ ہمیشہ اور ہر دور میں زیادہ بیدار مغز ثابت ہوئے ہیں، غالباً اس کی وجہ یہاں کے عرفانی ذوق کے علاوہ بظاہر اسباب یہ بھی ہے کہ دیوبند کے نصاب تعلیم میں جمود نہیں رہا بلکہ وقتاً فوقتاً تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور حالاتِ وقت کے مطابق دیوبند کے اکابر نے اپنے طلباء کو جدید علوم و فنون کے مطالعے اور غور و فکر کی آزادی سے محروم نہیں رکھا بلکہ ان کی رہنمائی کی، اور غیر نصابی مضامین کی حیثیت سے جدید علوم ہیئت، فلسفہ، سائنس، اقتصادیات معاشیات، سیاسیات، سماجیات وغیرہ مضامین کے مطالعے کی دعوت دی، یہ مرحلہ اس وجہ سے زیادہ آسان ہوگیا کہ اس کے بعض نامور فضلاء نے مختلف موضوعات پر نہایت احتیاط کے ساتھ قلم اٹھایا، ایسی تصانیف پیش کیں جو اگر ایک طرف اسلامی فکر کی حامل تھیں تو دوسری طرف ان کا علمی و فنی پایہ بھی بہت بلند تھا، ابنائے دارالعلوم کے ظرف کی بلندی کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ دارالعلوم نے اپنے طلباء کو محض ملائے مکتبی بننے کی تعلیم نہیں دی تعلیم میں انہوں نے مقصد کی پستی کو بھی گوارا نہیں کیا، ساتھ ہی مختلف صنعتوں کی تعلیم و تربیت کے اہتمام و انتظام سے طلباء کے بہت سے مادی و معاشی مسائل حل کئے، جن کا بر وقت حل نہ ہونا انسان کو اخلاق و کردار کی پستی میں ڈھکیل دیتا ہے۔[1]

---

[1] "مجلہ علم و آگہی کراچی کا خصوصی شمارہ ۱۹۶۸ء مرتبہ ابو سلمان، شائع کردہ گورنمنٹ نیشنل کالج کراچی ص ۱۰۱، ۵۸، ۵۹،

فضلائے دارالعلوم کی تصنیفی خدمات

دارالعلوم دیوبند کی تعلیمی اور تدریسی خدمات ایک معروف حقیقت ہے، اور دنیا نے اس کا اعتراف کیا ہے، مگر علمائے دیوبند نے درس و تدریس، وعظ و تقریر اور دوسرے دینی مشاغل کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی جو عظیم الشان کارنامے انجام دیئے ہیں وہ نہ صرف برِ صغیر کے مسلمانوں کے لئے بلکہ دنیائے اسلام کے لئے بھی ایک قابلِ فخر سرمایہ ہے، علوم دینیہ سے متعلق کوئی علم و فن ایسا نہیں ہے جس میں ان کی تصنیفات و تالیفات موجود نہ ہوں، ان میں بڑی بڑی ضخیم کتابیں بھی ہیں اور چھوٹے چھوٹے رسالے اور کتابچے بھی ہیں، یہ کتابیں زیادہ تر تو عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں ہیں، مگر ان کے علاوہ اور زبانوں میں بھی ملتی ہیں، دارالعلوم دیوبند کی خدمات کے دو رُخ ہیں، ایک اندرونی جس کا تعلق طلبار کی تعلیم و تدریس سے ہے، اس کا دوسرا رُخ بیرونی ہے جو عام مسلمانوں اور ملک سے متعلق ہے، عوام سے رابطہ، وعظ و تبلیغ، فتویٰ دینی و ملکی معاملات میں قوم کی شرعی رہنمائی، تذکیر و تزکیہ اور تصنیف و تالیف اس کے اہم عنوانات ہیں، اس سلسلے میں دارالعلوم سے جو قابلِ قدر خدمات انجام پائیں وہ برِ صغیر کی تاریخ میں آپ اپنی مثال ہیں،

صرف تصنیف و تالیف ہی کے میدان میں تنہا ایک بزرگ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی چھوٹی بڑی کتابوں کی تعداد ایک ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے، دینی اور اصلاحی نقطۂ نظر سے زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس میں حضرت تھانوی کی تصانیف موجود نہ ہوں، وہ اپنی تصانیف کی کثرت اور افادیت کے لحاظ سے ہندوستانی مصنفین میں اپنا جواب نہیں رکھتے، ہندوستان میں دینی شغف رکھنے والا کون شخص ہے جو حضرت تھانوی کی ایک بہشتی زیور ہی سے واقف نہیں ہوگا

حضرت تھانوی اور بعض دوسرے بزرگان دیوبند کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی تصنیفات کا حقِ تصنیف محفوظ نہیں رکھا، بلکہ ان کو افادۂ ملت کے لئے عام کردیا ہے ان بزرگوں کو تجارت اور منفعتِ مالی کبھی مقصود نہیں رہی بلکہ صرف افادہ و اصلاح کا مقصد سامنے رہا ہے۔

علمائے دیوبند کے اس تحریری سرمائے کا مدار شام کے ایک جلیل القدر عالم شیخ ابوغدہ کے الفاظ میں گہرے علم اور وسیع مطالعے کے علاوہ تقوی وصلاح، روحانیت اور استغراق فی العلم ہے، چنانچہ شیخ ابو الفتاح ابوغدہ نے علمائے دیوبند کی تصانیف کی اہمیت کے اعتراف کے ساتھ اس خواہش کا اظہار بھی کیا ہے کہ ان میں جو کتابیں اُردو اور فارسی زبانوں میں ہیں ان کا عربی میں ترجمہ کرایا جائے تاکہ عرب دنیا کو بھی اُن سے

لہ شیخ ابو الفتاح ابوغدہ حلب شام کے رہنے والے اور عالم اسلامی کے ایک جلیل القدر عالم ہیں، آپ کو علامہ زاہد الکوثری سے شرف تلمذ حاصل ہے، آج کل جامعۂ ریاض (سعودی عرب) کے استاذ ہیں، شیخ ابوغدہ ۱۳۸۳ھ میں دار العلوم دیوبند میں تشریف لائے تھے، دار العلوم کی نسبت اُنھوں نے بڑے وسیع انداز میں تفصیل کے ساتھ اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے، اُنھوں نے حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری کی تصنیف التصریح بما تواتر فی نزول المسیح کو (باقی صفحہ آئندہ)

استفادے کا موقع مل سکے، موصوف کے الفاظ یہ ہیں :۔

"علم وتقویٰ کے اساطین سے مالامال اس عظیم الشان ادارے کے علمائے عظام کی خدماتِ جلیلہ کا ذکر کرتے ہوئے میں ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں بلکہ اگر ذرا جرأت کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہمارا ایک واجبی حق ہے جس کا مطالبہ میں کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ ان علمائے کرام کا فریضہ ہے کہ اپنے منفردانہ عقول کے نتائجِ فکر اور بیش بہا علمی فیوض وتحقیقات کو عربی زبان کا جامہ پہنا کر عالم اسلام کے دوسرے علماء کے لئے استفادے کا موقع فراہم کریں، یہ فریضہ ان حضرات پر اس لئے عائد ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص ہندوستان کے علمائے محققین کی کوئی تصنیف پڑھتا ہے تو اس میں اس کو وہ نئی منفردانہ تحقیقات ملتی ہیں جن کا مدار گہرے علم اور وسیع مطالعے کے علاوہ تقویٰ وصلاح اور روحانیت پر ہوتا ہے۔

چونکہ ہندوستان کے یہ علماء وشیوخ کرام نیکی وصلاح روحانیت اور استغراق فی العلم جیسی شروط پر نہ صرف یہ کہ پورے اُترتے ہیں بلکہ سلفِ صالحین کے صحیح وارث اور اُنکے نمونے ہیں اس لئے ان کی کتابیں بہت سی نئی تحقیقات اور حسب حالاتِ وقت کتنی ہی کارآمد چیزوں پر مشتمل ہوتی ہیں، وذلك فضل الله يؤتيه من يشاء ، بلکہ ان حضرات کی بعض کتابیں تو وہ ہیں جن میں ایسی چیزیں ملتی ہیں جو متقدمین علمائے اکابر، مفسرین، محدثین

(بقیہ صفحہ گزشتہ) نہایت آب وتاب کے ساتھ ٹائپ میں شائع کیا ہے، اُنھوں نے مولانا عبدالحئی لکھنوی (وفات ۱۳۰۴ھ) کی کچھ کتابوں کو بھی ایڈٹ کرکے طبع کرایا ہے۔

شیخ ابوغدہ کا شمار اسلام کے نامور محققین میں ہوتا ہے، بیسیوں کتابوں کے مصنف ہیں علم حدیث میں اُنھیں امتیازی مقام حاصل ہے، اسی کے ساتھ ہندوستانی علماء کے بڑے قدردان اور پایہ شناس بھی ہیں۔

اور حکمار کے بیاں بھی دستیاب نہیں ہوتیں، لیکن افسوس اور قلق کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان نادر تالیفات میں سے اکثر بلکہ سب کی سب اُردو زبان میں لکھی گئی ہیں، جو گو ہندوستان کی عام اسلامی زبان سہی لیکن عربی کو کثیرالاستعمال اور علوم اسلام کی خاص زبان ہونے کا جو شرف حاصل ہے ظاہر ہے کہ وہ اُردو کو حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا یہ علوم اور گراں قدر تحقیقات جو ہمارے برادرانِ اسلام علمار ہند کا خصوصی حصہ اور کارنامہ ہیں۔

اگر ان کو اُردو ہی کے قالب میں محبوس رکھا گیا تو ہم عربی بولنے والوں سے مخفی و پوشیدہ رہ کر ہماری محرومی کا باعث بنی رہیں گی، اس طرح نہ صرف یہ ہمارے ساتھ ہی زبردست ناانصافی ہوگی بلکہ علم و دین کے حق کا بھی ایک بڑا نقصان ہوگا، اسلئے فریضۂ معرفت اور امانتِ علم کی ادائیگی کے لئے یہ بات اولین واجبات میں سے ہے کہ ان نفیس شاہکار اور عمدہ کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا جائے، تاکہ ان سے وہ آنکھیں روشنی حاصل کریں جو ایسی چیزوں کے لئے بیتاب، تشنہ اور مشتاق ہیں، اور جیسا کہ میرا خیال ہے اس اہم ذمہ داری اور کٹھن فریضے کی ادائیگی کا کام اسی ادارۂ عامرہ کے افراد کر سکتے ہیں جو علمائے کرام اور طلبائے نجبار کا گہوارہ و سرچشمہ ہے[1]۔"

دارالعلوم دیوبند سے اب تک جن حضرات نے تکمیلِ علوم کے بعد فراغت حاصل کی ان کی تعداد بارہ ہزار کے قریب ہے، ان کے علاوہ جن لوگوں کو تکمیل کا موقع نہ مل سکا مگر اُن کے علمی استفادے کا تعلق دارالعلوم دیوبند سے وابستہ ہے اُن کی تعداد ساٹھ ہزار کے لگ بھگ ہے، اس طرح ۷۲ ہزار افراد کے حالات کا پتہ لگانا آسان نہیں ہے، تاہم دارالعلوم کے شعبۂ تنظیم ابنائے قدیم کے ذریعے سے ۱۳۸۲ھ تک ۱۱۶۴ مصنفین کا علم حاصل ہو سکا ہے، جن میں سے تین سو کے قریب مصنفین کو نمایاں حیثیت

---

[1] شیخ ابوغدہ کے تاثرات کی تفصیل کے لئے دیکھئے باب دہم۔

حاصل ہے[1]۔ صرف مذکورہ مصنفین کی تصانیف کے ذکر کے لئے بھی ایک ضخیم جلد درکار ہوگی، یہ موضوع ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس ادارہ کے فضلاء مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک پھیلے ہوئے ہوں اور سو سال سے دنیا کے مختلف خطّوں میں علمی اور دینی خدمات میں منہمک ہوں اُن کے حالات آسانی سے فراہم نہیں ہو سکتے، اس کے علاوہ یہاں محدود صفحات میں ان تمام کتابوں اور مصنفین کے نام لکھنا بھی ممکن نہیں ہے۔ اس لئے صرف چند مصنفین کی کتابوں پر اکتفا کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے[2]۔ تاہم اس سے فی الجملہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ علمائے دیوبند نے کیا کچھ تصنیفی خدمات انجام دی ہیں اور درس و تدریس کے علاوہ انھوں نے کتابوں کی صورت میں بھی کتنا قیمتی ذخیرہ مہیا کیا ہے، یہ کتابیں علم و حکمت کے دریائے ناپیدا کنار کی پنہائیوں کا جائزہ لیتی اور اس کی گہرائیوں سے گوہر نایاب نکال کر علوم و معارف کو عام کرنے کی راہیں ہموار کرتی ہیں۔

---

[1] دار العلوم دیوبند کی سو سالہ زندگی ص ۳۰ و ۸۶، یہ اعداد و شمار صرف ایک سو سال کے ہیں، مزید ۱۴ سال کے اعداد و شمار ابھی فراہم کرنا باقی ہیں۔ [2] کتب خانہ دار العلوم کے ایک نئے ہال میں مصنفین دار العلوم دیوبند کی کتابوں کو مولانا ظفیر الدین صاحب مدیر کتب خانہ ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، اب تک دو ہزار سے زائد کتابیں جمع ہو چکی ہیں، اسی کے ساتھ مولانا موصوف کے پیشِ نظر ان کتابوں کی تعارفی فہرست تیار کرنا بھی ہے، یہ فہرست عنقریب شائع ہونے والی ہے، کتابوں کے یکجا جمع ہونے اور ان کی تعارفی فہرست کے بعد فضلائے دار العلوم دیوبند کی تصانیف کا مُرقّع تفصیل کے ساتھ سامنے آسکے گا، اور اس وقت صحیح اندازہ ہوگا کہ فضلائے دار العلوم دیوبند نے اس علمی میدان میں کیسی عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں، اور یہ کتابیں موجودہ دور کے لئے کتنا قیمتی سرمایہ ہیں، تفسیر، حدیث، اصولِ تفسیر، اصولِ حدیث، فقہ، کلام، تصوف، اخلاق، تاریخ ادب، سیاست وغیرہا علوم و فنون کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس پر علمائے دیوبند نے کتابیں لکھی ہوں جن سے ملک و ملّت کو عظیم فائدہ پہنچا ہے۔

سید محبوب رضوی

قرآن مجید کے تراجم و تفاسیر

اور متعلقات

۱	ترجمہ قرآن مجید	شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ
۲	ترجمہ قرآن مجید	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۳	ترجمہ قرآن مجید (کشمیری)	مولانا محمد یوسف شاہ کشمیریؒ
۴	حواشی قرآن مجید مترجم شیخ الہندؒ	حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندیؒ
۵	حواشی قرآن مجید مترجم شاہ عبدالقادرؒ	حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ
۶	اعجاز القرآن	حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندیؒ
۷	تفسیر بیان القرآن (بارہ جلدیں)	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۸	تفسیر ثنائی (اردو)	مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ
۹	تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن (عربی)	ایضاً
۱۰	تفسیر المعوذتین	حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ قدس سرہ
۱۱	ترجمہ تفسیر جلالین	حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی دیوبندیؒ
۱۲	تفسیر معارف القرآن (آٹھ جلدیں)	حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی ثم کراچویؒ
۱۳	تفسیر معارف القرآن	حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ

۱۴	تفسیر الحاوی (تقریر بیضاوی)	حضرت مولانا سید فخر الحسن صاحب صدر المدرسین دارالعلوم
۱۵	تدوین قرآن	حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ
۱۶	التعوذ فی الاسلام	مولانا محمد طاہر قاسمی مرحوم نبیرہ حضرت نانوتویؒ
۱۷	حاشیہ تفسیر بیضاوی (عربی)	حضرت مولانا عبدالرحمٰن امروہیؒ تلمیذ حضرت نانوتویؒ
۱۸	دینی دعوت کے قرآنی اصول	حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب
۱۹	سبق الغایات فی نسق الآیات	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۲۰	العون الکبیر شرح الفوز الکبیر	مولانا سعید احمد پالن پوری استاذ دارالعلوم دیوبند
۲۱	فہم قرآن	حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی
۲۲	قصص القرآن	حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ
۲۳	کمالین ترجمہ جلالین	مولانا محمد نعیم صاحب دیوبندی استاد دارالعلوم دیوبند
۲۴	مشکلات القرآن (عربی)	حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ
۲۵	منحۃ الجلیل فی بیان ما فی معالم التنزیل	حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ
۲۶	وحی الٰہی	حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی
۲۷	ہدیۃ المہدیین فی آیۃ خاتم النبیین	حضرت مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی ثم کراچوی

حدیث اور متعلقاتِ حدیث

۱	الابواب والتراجم (عربی)	شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ
۲	اعلاء السنن[1] (۱۸ جلدیں)	مولانا ظفر احمد عثمانی زیر نگرانی حضرت مولانا اشرف علیؒ

[1] اعلاء السنن احادیث و آثار کا یہ عظیم الشان مجموعہ ۱۸ جلدوں پر مشتمل ہے (باقی صفحہ ۱۸ مئی کا)

۳	الفقہ الحدیث	حضرت مولانا محمد منظور نعمانی
۴	انوار الباری شرح صحیح بخاری	مولانا احمد رضا بجنوری
۵	انوار المحمود حاشیہ سنن ابو داؤد	حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ
۶	انتخاب صحاح ستہ	حضرت مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی
۷	ایضاح البخاری	حضرت مولانا فخر الدین احمدؒ
۸	بذل المجہود شرح ابو داؤد (عربی، ۵ جلد)	حضرت مولانا خلیل احمد انبہٹویؒ
۹	تدوین حدیث	حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ
۱۰	ترجمان السنۃ	حضرت مولانا بدر عالم میرٹھیؒ
۱۱	ترجمہ صحیح بخاری	حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ
۱۲	التعلیق الصبیح شرح مشکوٰۃ المصابیح (عربی)	حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ
۱۳	التعلیق المحمود حاشیہ ابو داؤد	حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ
۱۴	تقریر الترمذی	شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ
۱۵	حاشیہ آثار السنن علامہ شوق نیمویؒ	حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ

(بقیہ حاشیہ گزشتہ) اس میں وہ تمام احادیث جمع کردی گئی ہیں جن سے فقہ حنفی ماخوذ و مستنبط ہے۔ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ اور بعض دوسرے علماء نے حضرت مولانا تھانویؒ کی زیر نگرانی یہ اہم کارنامہ انجام دیا ہے ۱۳۵۰ھ میں یہ کتاب مکمل ہوئی، اس میں ابواب الطہارت سے کتاب المواریث تک تمام مسائل اختلافیہ میں احناف کی تائید کے لئے احادیث پیش کی گئی ہیں، فقہ حنفی کی تائید میں احادیث کا یہ عظیم الشان ذخیرہ ہے، یہ علم حدیث کی اُن چند کتابوں میں سے ہے جو ہندوستان کے لئے سرمایۂ افتخار ہیں، اعلاء السنن کی ابتدائی سات جلدوں کا اُردو میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

سید محبوب رضوی

۱۶	حاشیہ سنن ابن ماجہ (عربی)	حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ
۱۷	حجیّتِ حدیث	حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ
۱۸	حدیثِ رسول کا قرآنی معیار	حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب
۱۹	روضۃ الریاحین ترجمہ بستان المحدثین	حضرت مولانا عبدالسمیع دیوبندیؒ
۲۰	سنن سعید بن منصور (عربی)	مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی
۲۱	شرح ترمذی	حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی
۲۲	العرف الشذی علی جامع الترمذی (عربی)	حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ
۲۳	فتح الملہم شرح صحیح مسلم (عربی)	حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ
۲۴	فضل الباری شرح صحیح بخاری	حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ
۲۵	فیض الباری علی صحیح البخاری (عربی)	حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ
۲۶	القول الفصیح	حضرت مولانا سید فخر الدین احمد
۲۷	کتاب الزہد والرقاق	تعلیق وتحقیق حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی
۲۸	الکوکب الدری	حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ
۲۹	مسند حمیدی (عربی)	تعلیق وتحقیق حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی
۳۰	مشکوٰۃ الآثار	حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندیؒ
۳۱	مصنف عبدالرزاق (عربی) (۱۱ جلدیں)	تعلیق وتحقیق حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی
۳۲	المطالب العالیہ (عربی) (چار جلد)	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی
۳۳	مظاہر حق شرح مشکوٰۃ المصابیح (جدید)	مولانا عبداللہ جاوید
۳۴	معارف الحدیث (۵ جلد)	حضرت مولانا محمد منظور نعمانی
۳۵	معارف السنن شرح جامع ترمذی	حضرت مولانا محمد یوسف بنوری

۳۶ معارف مدنیہ تقریر ترمذی حضرت مدنیؒ مرتبہ ـــــــــ مولانا سید طاہر حسن

۳۷ معارف المشکوٰۃ شرح مشکوٰۃ المصابیح مولانا عبدالرؤف عالی

۳۸ نبراس الساری علی اطراف البخاری (عربی) مولانا عبدالعزیز گوجرانوالا

۳۹ النفخ الشذی شرح الترمذی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

۴۰ الورد الشذی علی جامع الترمذی شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ

فقہ اور متعلقاتِ فقہ

۱	الحجۃ علی اہل المدینہ (امام محمدؒ)	تعلیق مولانا مفتی مہدی حسنؒ
۲	احکام القرآن[۱]	حضرت مولانا ظفر احمد تھانوی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی، حضرت مولانا ادریس کاندھلویؒ
۳	احکام حج	حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی
۴	آسان حج	حضرت مولانا محمد منظور نعمانی
۵	اسلام کیا ہے ؟	حضرت مولانا محمد منظور نعمانی
۶	آلاتِ جدیدہ کے شرعی احکام	حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ
۷	امداد الفتاویٰ (۶ جلدیں)	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۸	امداد المفتیین	حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ

---

[۱] احکام القرآن میں فقہ و عقائد کے وہ مسائل بیان کئے گئے ہیں جو قرآن سے مستنبط ہیں، اُن مسائل پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے جو عہدِ حاضر میں پیدا ہو گئے ہیں اور جن کے بارے میں سلف کی کتابوں میں تفصیلی مباحث نہیں ملتے۔ سید محبوب رضوی

۹	بغیۃ الالمعی فی تخریج الزیلعی	
۱۰	بہشتی زیور (۱۱ حصوں میں)	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۱۱	ترجمہ قدوری	مترجمہ مولانا ابوالحسن بارہ بنکوی
۱۲	تعلیم الاسلام	حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ
۱۳	حاشیہ سراجی	مولانا رحمت اللہ سلہٹی
۱۴	حاشیہ شرح نقایہ (عربی)	حضرت مولانا اعزاز علی امروہیؒ
۱۵	حاشیہ کنز الدقائق	ایضاً
۱۶	حاشیہ نور الایضاح	ایضاً
۱۷	حج کیسے کریں؟	حضرت مولانا محمد منظور نعمانی
۱۸	جواہر الفقہ	مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی
۱۹	عزیز الفتاوی حضرت مولانا عزیز الرحمن	مرتبہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی
۲۰	عثمانی دیوبندی	
۲۱	فتاوی امدادیہ (اشرفیہ)	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۲۲	فتاوی دار العلوم دیوبند (۱۰ جلدیں تیار)	مرتبہ مولانا ظفیر الدین مدیر کتب خانہ دار العلوم دیوبند
۲۳	فتاوی محمدی مع شرح دیوبندی	حضرت مولانا میاں سید اصغر حسین دیوبندیؒ
۲۴	کفایۃ المفتی	حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ
۲۵	مفید الوارثین	حضرت مولانا سید اصغر حسینؒ
۲۶	میراث المسلمین	حضرت مولانا سید اصغر حسینؒ
۲۷	نور الاصباح ترجمہ نور الایضاح	حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندیؒ

عقائد و کلام

۱۔	احسن الکلام فی اصول عقائد الاسلام	حضرت مولانا رحیم اللہ بجنوریؒ

۲	اسلامی عقائد (اُردو)	مولانا محمد عثمان در بھنگوی
۳	اسلامی عقائد (بنگلہ)	ایضاً
۴	ترجمہ شرح عقائد	حضرت مولانا عبدالاحد دیوبندی
۵	حدوث مادّہ وروح	حضرت مولانا ادریس کاندھلوی
۶	الدین القیم	حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ
۷	علم الکلام	حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ
۸	عقائد الاسلام	حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ
۹	عقائد الاسلام قاسمی	حضرت مولانا طاہر قاسمی دیوبندیؒ
۱۰	عقد الفرائد حاشیہ شرح عقائد	مولانا محمد علی چاٹگامی

احسان وتصوّف

۱	احسان وتصوف (بنگلہ زبان)	مولانا امین الحق میمن سنگھی
۲	آداب الشیخ والمرید	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۳	تبویب تربیت السالک	ایضاً
۴	تربیت السالک	ایضاً
۵	ترجمہ انفاس العارفین	مولانا محمد یوشع سہارنپوری مقیم گوجرانوالہ
۶	التشرف بمعرفۃ احادیث التصوف	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۷	التعرف فی تحقیق التصوف	ایضاً
۸	التکشف عن مہمات التصوف	ایضاً
۹	خصوص الکلم فی حل فصوص الحکم	ایضاً

۱۰	شرح مثنوی مولانا رومؒ	مولانا عبدالقادر ڈیروی
۱۱	شریعت و تصوّف	حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب علی گڈھی
۱۲	عنوان التصوف	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۱۳	کلید مثنوی مولانا رومؒ	ایضاً
۱۴	مبادی التصوف	ایضاً
۱۵	مسائل السلوک من کلام ملک الملوک	ایضاً

ادب و لغت

۱	اُردو عربی ڈکشنری	حضرت مولانا عبدالحفیظ بلیاویؒ
۲	بیان اللسان (عربی اُردو لغت)	حضرت مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی
۳	البنیات ترجمہ اُردو قصائد لامیۃ المعجزات	حضرت مولانا محمد اعزاز علی امروہیؒ
۴	ترجمہ مقاماتِ حریری مع حاشیہ	مولانا عبدالصمد صارم
۵	توشیحات شرح سبع معلقات	مولانا قاضی سجاد حسین
۶	التعلیقات شرح المقامات	مولانا نور الحق
۷	حاشیہ دیوان حماسہ (عربی)	حضرت مولانا محمد اعزاز علی امروہیؒ
۸	حاشیہ دیوان متنبی "	ایضاً
۹	حاشیہ مقامات حریری "	حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ
۱۰	حاشیہ مفید الطالبین	حضرت مولانا محمد اعزاز علی امروہیؒ
۱۱	حاشیہ مفید الطالبین	مولانا ظہور الحق دیوبندی
۱۲	حاشیہ مفید الطالبین	مولانا محمد علی چاٹگامی

۱۳	قاموس القرآن (الفاظ قرآنی کی لغت وتفسیری فوائد)	حضرت مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھیؒ
۱۴	القاموس الجدید	مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی
۱۵	القرأة الواضحہ (عربی)	ایضاً
۱۶	قصیدہ لامیۃ المعجزات (عربی)	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی دیوبندیؒ
۱۷	کلام عربی (۲ جلد)	حضرت مولانا قاضی زین العابدین سجاد
۱۸	مصباح اللغات	حضرت مولانا عبدالحفیظ بلیاویؒ
۱۹	معین اللبیب فی قصائد الحبیب (عربی)	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی دیوبندیؒ
۲۰	نفحۃ العنبر (عربی)	حضرت مولانا محمد اعزاز علی امروہیؒ
۲۱	نفحۃ الادب	مولانا وحید الزماں صاحب کیرانوی

تاریخ وسیر

۱	اسلام کا نظام تعلیم وتربیت	حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ
۲	اسلام کا نظام حکومت	حضرت مولانا حامد الانصاری غازی
۳	اسلام میں غلامی کی حقیقت	حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی
۴	اسلام اور مغربی تہذیب	حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب قاسمی
۵	اشاعتِ اسلام	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی دیوبندیؒ
۶	اعیان الحجاج	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی
۷	امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی	مولانا مناظر احسن گیلانیؒ
۸	انوار قاسمی (حضرت نانوتوی کی سوانح حیات)	مولانا انوار الحسن شیرکوٹیؒ

۹	بلاغ المبین فی مکاتیب سید المرسلین	حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ
۱۰	پانی پت اور بزرگانِ پانی پت	حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی
۱۱	تاریخ الاسلام	ایضاً
۱۲	تاریخ التفسیر	مولانا عبد الصمد صارم
۱۳	تاریخ الحدیث	ایضاً
۱۴	تاریخ القرآن	ایضاً
۱۵	تاریخ ملت (تین حصے)	حضرت مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی
۱۶	تجلیات عثمانی	مولانا انوار الحسن شیرکوٹیؒ
۱۷	تذکرۃ الاعزاز	مولانا سید انظر شاہ کشمیری
۱۸	تذکرہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ	حضرت مولانا محمد منظور نعمانی
۱۹	تذکرہ حضرت مجدد الف ثانی	ایضاً
۲۰	ترجمہ سیرت حلبیہ	مولانا محمد اسلم صاحب رمزی
۲۱	جائزہ تراجم قرآنی	مرتبہ مولانا محمد سالم قاسمی، مولانا عبد الرؤف عالی، سید محبوب رضوی
۲۲	حضور اکرمؐ کی سیاسی زندگی اخلاق کے آئینہ میں	مولانا اخلاق حسین قاسمی
۲۳	حیات امداد اللہ مہاجر مکیؒ	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۲۴	حیات امدادؒ	مولانا انوار الحسن شیرکوٹیؒ
۲۵	حیات شیخ الہندؒ	حضرت مولانا میاں سید اصغر حسین دیوبندیؒ
۲۶	حیات شیخ الاسلام	حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی
۲۷	حیاتِ نبویہ	حضرت مولانا مفتی محمود نانوتویؒ

۲۸	خاتم الانبیاء	حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی
۲۹	خاتم النبیین	حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب قاسمی
۳۰	خالد بن ولیدؓ	مولانا عبد السبوح پشاوری
۳۱	خُلقِ عظیم	حضرت مولانا حامد الانصاری غازی
۳۲	رسول کریمؐ	حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی
۳۳	زبدۃ السیر	مولانا عماد الدین شیر کوٹیؒ
۳۴	سفرنامہ شیخ الہندؒ	حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ
۳۵	سیرت خالد بن ولیدؓ	قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی
۳۶	سفرنامہ برما	حضرت مولانا محمد طیب صاحب قاسمی (مرتبہ مولانا محمد سالم صاحب)
۳۷	سفرنامہ افغانستان	حضرت مولانا محمد طیب صاحب قاسمی
۳۸	سفرنامہ مقاماتِ مقدسہ و مآثرِ سفرِ مصر	حضرت مولانا محمد طیب صاحب قاسمی
۳۹	سفرنامہ مصر و حجاز	حضرت مولانا منت اللہ رحمانی
۴۰	سوانح ابوذر غفاریؓ	حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ
۴۱	سوانح اویس قرنیؓ	ایضاً
۴۲	سوانح حیات حضرت میاں صاحبؒ	حضرت مولانا میاں سید اختر حسین دیوبندی
۴۳	سوانح قاسمی	حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ
۴۴	سیرتِ طیبہ (حضرت محمد مصطفیٰ)	حضرت مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی
۴۵	سیرت المصطفیٰ	حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ
۴۶	سیرتِ مبارکہ محمد رسول اللہ	حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ
۴۷	سیرتِ رسول	مولانا محمد اسلم رمزی
۴۸	شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک	حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ

۴۹	شہید کربلا	حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب قاسمی
۵۰	شہید کربلا	حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی
۵۱	شہید کربلا	قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی
۵۲	شہیدِ اسلام	مولانا اخلاق حسین قاسمی
۵۳	صدیقِ اکبرؓ	حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی
۵۴	عربی کتابوں کے تراجم	مولانا عبدالسبوح پشاوری
۵۵	علمائے حق	حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ
۵۶	علمائے ہند کا شاندار ماضی	ایضاً
۵۷	غلامانِ اسلام	حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی
۵۸	فقیہِ مصر	مولانا ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی
۵۹	مشاہیرِ امت	حضرت مولانا محمد طیب قاسمی
۶۰	محتسبِ اسلام	مولانا ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی
۶۱	مرقعِ سیر	مولانا مفتی جمیل الرحمٰن سیوہاروی
۶۲	مسلمانوں کا عروج وزوال	حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی
۶۳	مولوی معنوی	حضرت مولانا سید اصغر حسین دیوبندیؒ
۶۴	میری ڈائری	حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ
۶۵	النبی الخاتم	حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ
۶۶	نشر الطیب	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۶۷	نقشِ حیات	حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ
۶۸	وفات النبی	مولانا اخلاق حسین قاسمی
۶۹	ہزار سال پہلے	حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ مرتبہ سید محبوب رضوی

علم کلام حقائقِ اسلامیہ اور فن اسرارِ دین اور دوسرے مختلف علوم و فنون میں دیوبند کے بزرگانِ سلف و خلف کی ہزاروں محققانہ تصانیف ہیں جن کا شمار اور تعارف ان مختصر اوراق میں ممکن نہیں ہے ' علمائے دارالعلوم دیوبند کی تصنیفات و تالیفات اور تراجم کا یہ ایک بہت ہی مختصر اور اجمالی خاکہ ہے جس میں صرف چند علوم کی کچھ کتابوں کے نام دیئے جا سکے ہیں، ورنہ ایک اندازے کے مطابق علماء دیوبند کی تصانیف کی مجموعی تعداد دس بارہ ہزار کے لگ بھگ ہے۔ صرف ایک عالم حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی قدس سرہٗ کی تصانیف ایک ہزار کے قریب ہیں، دہلی کا تصنیفی ادارہ ندوۃ المصنفین اور ڈابھیل میں مجلس علمی فضلائے دارالعلوم ہی کے قائم کئے ہوئے ادارے ہیں جن سے اب تک بہت سی معیاری کتابیں شائع ہو کر ملک سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں، اس سے پہلے مطبع قاسمی دیوبند دارالاشاعت دیوبند اور تاج المعارف وغیرہ اداروں سے بھی بہت سی کتابیں چھپ چکی ہیں، ہند و پاک اور بنگلہ دیش میں علمائے دیوبند کے اور بھی بہت سے تصنیفی اور اشاعتی ادارے ہیں، اُن سب کا استقصار بہت مشکل ہے، یہ ادارے برِّ صغیر کے مختلف مقامات اور مختلف زبانوں میں اپنے اپنے طور پر دینی اور علمی خدمت میں لگے ہوئے ہیں جن میں مختلف علوم و فنون کے علاوہ درسِ نظامی کی بہت سی کتابوں کی شروح اور حواشی بھی لکھے گئے ہیں اور مختلف زبانوں میں ترجمے کئے گئے ہیں۔

ل تفصیل کے لئے دیوبند کے تجارتی کتب خانوں: کتب خانہ رحیمیہ، اعزازیہ، امدادیہ، مکتبہ تجلی، علیم بکڈپو، ادارہ نشر و اشاعت، مجلس معارف القرآن، مکتبہ دینیہ، راشد کمپنی، عالم کمپنی اور کتب خانہ قاسمی وغیرہ کی فہرست ہائے کتب سے مراجعت کی جائے دیوبند میں چھوٹے بڑے کتب خانوں کی تعداد ۴۰ ہے۔

دیوبند کے تقریباً ساٹھ کتب خانے اکابرِ دیوبند کی تصانیف کو چھاپنے اور شائع کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کتابوں کی اشاعت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ لیتھو پریس کی تین چار مشینیں کتابوں کے چھاپنے میں مصروف رہتی ہیں۔ ان کتابوں کے قبولِ عام کا یہ عالم ہے کہ بہشتی زیور (حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ؒ) کے کئی کئی ایڈیشن معریٰ اور محشیٰ بیک وقت مختلف کتب خانوں سے نکلتے رہتے ہیں، بہشتی زیور کے ترجمے اب تک کئی زبانوں میں ہو چکے ہیں، لکھے پڑھے مسلمانوں کے کم گھر ایسے ہوں گے جہاں بہشتی زیور موجود نہ ہو، تعلیم الاسلام مصنفہ مولانا مفتی کفایت اللہ ؒ کی مقبولیت کا بھی یہی عالم ہے، اس کے بھی ایڈیشن پر ایڈیشن نکلتے رہتے ہیں۔ ہندی اور دوسری زبانوں میں اس کا بھی ترجمہ ہے۔

علمائے دیوبند کی تصانیف برِ صغیر کے ملکوں کے علاوہ، افغانستان، برما، نیپال سیلون، جنوبی افریقہ، انگلستان، امریکہ اور دوسرے بہت سے ملکوں تک پہنچتی اور ذوق وشوق کے ہاتھوں سے لی جاتی ہیں، دینی کتابوں کی کثرتِ اشاعت کی وجہ سے دیوبند ہندوستان بھر میں دینی کتابوں کا سب سے بڑا مرکز سمجھا جاتا ہے، چنانچہ ان کتابوں کے ذریعے سے بہت سے ملکوں میں دینی علوم کے نشر و اشاعت کی زبردست خدمت دیوبند کی سرزمین سے انجام پا رہی ہے۔

چونکہ دیوبند سے شائع ہونے والی کتابیں زیادہ تر اردو زبان میں ہوتی ہیں اسلئے ان کتابوں کے ذریعے سے اُردو زبان کا دائرہ بھی دن بدن وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے

تلک آثار نا تدل علینا   فانظروا بعدنا الی الآثار

ایشیا، افریقہ اور یورپی ملکوں کے کروڑوں مسلمان ان کتابوں سے مستفید ہو رہے ہیں، اور بقول مرحوم پروفیسر ہمایوں کبیر " اس ذریعے سے دنیا میں ہندوستان کی عظمت کو زبردست بڑھاوا مل رہا ہے، اور اس طرح سے اُردو بین الاقوامی زبان

بن گئی ہے ۔؎۱

تاریخ دارالعلوم دیوبند کی کتابت کے دوران پاکستان کے ماہنامہ "الرشید" لاہور کا دارالعلوم دیوبند نمبر نظر سے گزرا، اس میں صوبۂ سرحد کے ۵۰ مصنفین کی کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے، ان تصانیف کی کثرت کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ "الرشید" کے ۴۰ صفحات پر یہ طویل فہرست پھیلی ہوئی ہے ۔؎۲ یہ پاکستان کے صرف ایک صوبۂ سرحد کی تصنیفات ہیں، بقیہ تین صوبوں خصوصاً پنجاب کے فضلائے دارالعلوم دیوبند کی تصنیفات کا فی الجملہ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

؎۱ پروفیسر ہمایوں کبیر دارالعلوم دیوبند میں ص ۱۵

؎۲ ماہنامہ "الرشید" لاہور کا دارالعلوم دیوبند نمبر صفحہ ۴۰۴

"الرشید" پاکستان کا مشہور علمی اور دینی ماہنامہ ہے، اس کا دارالعلوم دیوبند نمبر بابت ۱۳۹۶ھ / ۱۹۷۶ء بڑی تقطیع کے آٹھ سو کے قریب صفحات پر مشتمل ہے، یہ خاص نمبر دارالعلوم دیوبند پر ایک قیمتی تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے، دارالعلوم دیوبند نے جو دینی، علمی اور اسلامی خدمات انجام دی ہیں اور اس سے کیسے کیسے ماہرینِ فن اساتذہ، ارباب صلاح و تقویٰ علماء اور مشائخ طریقت و معرفت پیدا ہوئے اور کس نے کس فن میں نمایاں شہرت اور کامیابی حاصل کی، ان کے کارنامے کیا کیا اور کس نوعیت کے ہیں؟ یہ اور دوسرے مختلف عنوانات و مباحث کو اس ضخیم نمبر میں بڑی تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔

سید محبوب رضوی

مآخذ و مراجع

۱ البدایہ والنہایہ ۔ حافظ ابنِ کثیرؒ ۔ مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۳۵۱ھ

۲ اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء والمحدثین، نواب صدیق حسن خاں ۔
مطبوعہ نظامی کانپور ۱۲۸۸ھ ۔

۳ آثارِ رحمت ۔ از امداد صابری ۔ مطبوعہ یونین پریس دہلی ۔

۴ آثار الصنادید ۔ سر سید احمد خاں ۔ نولکشور لکھنؤ ۱۳۱۸ھ ۔

۵ اخبار الاخیار ۔ شیخ عبدالحق دہلوی ۔ مجتبائی دہلی ۱۳۳۲ھ ۔

۶ ارواحِ ثلاثہ مجموعہ حکایات ۔ امیر شاہ خاں ۔ مطبوعہ آزاد پریس دیوبند ۔

۷ اسلامک انسٹی ٹیوشن اِن انڈیا ۔ گورنمنٹ پریس دہلی ۔

۸ امپیریل گزیٹر آف انڈیا ۔ مطبوعہ گورنمنٹ پریس ۱۹۰۸ء ۔

۹ انتصار الاسلام ۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ۔ مطبوعہ دیوبند ۱۹۵۲ء ۔

۱۰ آئینِ اکبری ۔ شیخ ابوالفضل ۔ مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ ۔

۱۱ الیانع الجنی فی اسانید شیخ عبدالغنی ۔ مطبع صدیقی بریلی ۱۲۸۶ھ

۱۲ بانئ دار العلوم دیوبند (سلسلۂ مضامین) حضرت مولانا محمد طیب صاحب
مطبوعہ مدینہ پریس بجنور ۔

۱۳ پروفیسر ہمایوں کبیر دارالعلوم دیوبند میں۔ سید محبوب رضوی۔ شائع کردہ دفتر اہتمام دارالعلوم دیوبند

۱۴ پریچنگ آف اسلام۔ پروفیسر ٹی۔ ڈبلیو آرنلڈ۔ مطبوعہ لاہور ۱۹۵۵ء۔

۱۵ تاریخ دیوبند۔ سید محبوب رضوی۔ مطبوعہ آزاد پریس دیوبند ۱۹۷۲ء۔

۱۶ تاریخ سہارن پور۔ منشی نند کشور۔ مطبع مرلیدھر ۱۸۹۸ء۔

۱۷ تاریخ شاہ جہاں پور۔ میاں فصیح الدین۔ مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۳۲ء۔

۱۸ تاریخ صحافت اُردو۔ امداد صابری۔ مطبوعہ دہلی۔

۱۹ تاریخ فرشتہ۔ ابوالقاسم فرشتہ۔ مطبوعہ مطبع نول کشور لکھنؤ۔

۲۰ تاریخ الکامل۔ علامہ ابن اثیر جزری۔ مطبوعہ مصر۔

۲۱ تاریخ مظاہر علوم سہارنپور۔ حضرت مولانا محمد زکریا صاحب۔ شائع کردہ کتب خانہ اشاعت العلوم سہارن پور

۲۲ ترجمہ الثورۃ الہندیہ۔ مولانا فضل حق خیر آبادی۔ مطبوعہ مدینہ پریس بجنور۔

۲۳ ترجمہ خطبات گارساں دتاسی۔ شائع کردہ انجمن ترقی اُردو دہلی ۱۹۳۵ء۔

۲۴ ترجمہ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ مطبوعہ نفیس اکیڈیمی کراچی۔

۲۵ تذکرۃ الخلیل۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی۔ الخلیل مشین پریس میرٹھ۔

۲۶ تذکرہ طبقات شعرائے ہند۔ مولوی کریم الدین پانی پتی۔ مطبع العلوم دہلی ۱۸۴۸ء۔

۲۷ تذکرہ علمائے فرنگی محل۔ مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی مطبوعہ لکھنؤ۔

۲۸ ترجمہ تذکرہ علمائے ہند۔ مولوی رحمان علی۔ مترجمہ محمد ایوب قادری۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، مطبوعہ کراچی۔

۲۹ تذکرہ فرائد الدہر۔ مولوی کریم الدین پانی پتی۔ مطبع العلوم دہلی ۱۸۴۶ء۔

۳۰ ترجمہ تاریخ فیروز شاہی۔ شمس سراج عفیف۔ مطبوعہ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔

۳۱ ترجمہ منتخب اللباب ۔ خافی خان ۔ مطبوعہ ایجوکیشنل پریس کراچی ۱۹۶۳ء ۔

۳۲ تفہیمات الٰہیہ ۔ شاہ ولی اللہ دہلوی ۔ مطبوعہ مدینہ پریس بجنور ۔

۳۳ جاں بازانِ حُریت ۔ مولانا سید محمد میاں ۔ مطبوعہ دہلی ۱۹۶۰ء ۔

۳۴ الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف ۔ شاہ ولی اللہ دہلوی ۔ مطبوعہ مطبع احمدی دہلی

۳۵ جون پور نامہ ۔ خیر الدین (وفات ۱۸۳۴ء)

۳۶ حالات مولانا شیخ محمد تھانوی ۔ شار الحق دیوبندی ثم کراچوی ۔ مطبوعہ پاک اکیڈمی کراچی ۱۹۶۳ء ۔

۳۷ حجۃ اللہ البالغہ ۔ شاہ ولی اللہ دہلوی ۔ مطبوعہ مصر ۔

۳۸ حیات شبلی ۔ مولانا سید سلیمان ندوی ۔ مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڈھ ۔

۳۹ خطبۂ استقبالیہ ۔ مولانا ابو الحسن علی ندوی ۔ مطبوعہ تعمیر حیات لکھنؤ ۱۹۷۵ء ۔

۴۰ دار العلوم دیوبند کی سو سالہ زندگی ۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب ۔ شائع کردہ دار العلوم دیوبند ۱۳۸۵ھ ۔

۴۱ دار العلوم دیوبند کی سیر ۔ مؤلفہ محمد رفیع میرٹھی ۔ مطبوعہ دلی پرنٹنگ پریس دہلی ۱۳۳۵ھ ۔

۴۲ دستور اساسی دار العلوم دیوبند ۔ شائع کردہ دار العلوم دیوبند ۔

۴۳ دی آریہ سماج (انگریزی) از دیوان چند ۔

۴۴ ذخیرہ خطوط و مراسلات و کاغذات (ریکارڈ) محفوظ محافظ خانہ دار العلوم دیوبند ۔

۴۵ رسالہ اسباب بغاوت ہند ۔ سر سیّد احمد خاں ۔

۴۶ روداد جمعیۃ الانصار ۔ مرتبہ مولانا عبید اللہ سندھی ۔ مطبوعہ رفاہ عام پریس لاہور ۔

۴۷ روداد خیر مقدم مولانا ابو الکلام آزاد ۔ مرتبہ سیّد محبوب رضوی ۔ شائع کردہ دفتر اہتمام دار العلوم دیوبند ۔

۴۸ روداد عمل (سالانہ رپورٹ) از ۱۳۸۰ھ لغایتہ ۱۳۹۶ھ ۔ شائع کردہ دفتر اہتمام دار العلوم دیوبند ۔

۴۹ روداد ہائے دارالعلوم دیوبند از ۱۲۸۳ھ لغایتہ ۱۳۶۰ھ و ۱۳۶۱ھ لغایتہ ۱۳۹۰ھ

شائع کردہ دارالعلوم دیوبند۔

۵۰ روداد ہائے مجلس شوریٰ و مجلس عاملہ (غیر مطبوعہ) محفوظ محافظ خانہ دارالعلوم دیوبند۔

۵۱ رئیس الاحرار (ہندوستان کی جنگِ آزادی) عزیز الرحمٰن جامعی، مطبوعہ ۱۹۶۱ء۔

۵۲ سفرنامہ ابن حوقل۔ مطبوعہ لائیڈن

۵۳ سفرنامہ افغانستان۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحب۔ مطبوعہ محبوب المطابع دہلی ۱۳۵۸ھ

۵۴ سفرنامہ برما۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحب۔ مرتبہ مولانا محمد سالم قاسمی ۱۹۵۷ء۔

۵۵ سنن ابنِ ماجہ۔ حافظ محمد بن یزید بن ماجہ القزوینی۔ مجتبائی دہلی ۱۳۳۳ھ۔

۵۶ سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتویؒ۔ مصنفہ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ۔ مطبوعہ

صادق الاخبار بھاولپور و مطبع مجتبائی دہلی۔

۵۷ سوانح قاسمی۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی۔ مطبوعہ نیشنل پریس دیوبند۔

۵۸ سیر المتاخرین۔ غلام حسین طباطبائی۔ نول کشور لکھنؤ ۱۳۱۴ھ۔

۵۹ سیرۃ النبی۔ علامہ شبلی نعمانی۔ مطبوعہ نامی پریس کانپور طبع اوّل۔

۶۰ شاہ افغانستان دارالعلوم دیوبند میں۔ مرتبہ سید محبوب رضوی۔ شائع کردہ دفتر اہتمام

دارالعلوم دیوبند۔

۶۱ شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک۔ مولانا عبید اللہ سندھی۔ مرکنٹائل پریس لاہور ۱۹۴۲ء۔

۶۲ صحیح بخاری۔ امام محمد بن اسمٰعیل بخاری۔ مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۲۲ھ۔

۶۳ صدرِ جمہوریہ ہند دارالعلوم دیوبند میں (۱۹۵۷ء) مرتبہ سید محبوب رضوی۔ شائع کردہ

دفتر اہتمام دارالعلوم دیوبند۔

۶۴ طبقاتِ ناصری۔ منہاج سراج۔ مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ۔

۶۵ عالمی موتمر اسلامی، قاہرہ۔ مرتبہ سید محبوب رضوی۔ شائع کردہ دفتر اہتمام دارالعلوم دیوبند

۶۶ علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۔ مطبوعہ علی گڈھ ۱۸۸۰ء ۔

۶۷ غدر کے چند علماء ۔ مفتی انتظام اللہ شہابی ۔ شائع کردہ نیا کتاب گھر دہلی ۔

۶۸ فسادی ملّا یا دشمنانِ اسلام کے ایجنٹ ۔ خواجہ خلیل احمد شاہ ۔ اکلیل پریس بہرائچ ۔

۶۹ فہرست انجمن ندائے اسلام کلکتہ ۔ مطبوعہ ۱۲۹۳ھ ۔

۷۰ کتاب الخطط ۔ علامہ تقی الدین مقریزی ۔ مطبوعہ مصر ۔

۷۱ کشف الظنون ۔ ملا کاتب چلپی ۔ مطبوعہ استنبول ۱۲۷۴ھ ۔

۷۲ کمالات عزیزی ۔ مطبوعہ مطبع ہاشمی میرٹھ ۱۸۹۷ء ۔

۷۳ مآثر الکرام ۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی ۔ مطبوعہ مفید عام آگرہ ۱۳۲۸ھ ۔

۷۴ ماڈرن اسلام اِن انڈیا ۔ ڈاکٹر کانٹویل اسمتھ ۔ میک گل یونیورسٹی کناڈا ۔

۷۵ مدرسہ اسلامی عربی کا زریں ماضی و مستقبل ۔ مولانا حافظ محمد احمد صاحب ۔ مطبوعہ افضل المطابع دہلی ۱۹۱۰ء ۔

۷۶ مرحوم دہلی کالج ۔ مولوی عبدالحق ۔ انجمن ترقی اُردو ہند دہلی ۱۹۴۵ء ۔

۷۷ مذہبِ منصور ۔ مولانا حکیم منصور علی خان ۔ مطبوعہ محمود پریس حیدر آباد دکن ۔

۷۸ مُسلمانوں کا روشن مستقبل ۔ مولوی طفیل احمد منگلوری ۔ مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۴۲ء ۔

۷۹ مشکوٰۃ المصابیح ۔ حافظ ولی الدین الخطیب البغدادی ۔ مطبوعہ اصح المطابع دہلی ۔

۸۰ مفتاح کنوز السنۃ ۔ علامہ سید رشید رضا ۔ مطبوعہ مصر ۱۳۵۳ھ ۔

۸۱ ملفوظات شاہ عبدالعزیز دہلویؒ ، مطبع ہاشمی میرٹھ ۔

۸۲ مولانا محمد احسن نانوتوی ۔ از پروفیسر محمد ایوب قادری ۔ مطبوعہ جاوید پریس کراچی ۱۹۶۶ء

۸۳ نزہۃ الخواطر ۔ مولانا حکیم عبدالحئی ۔ مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدر آباد دکن ۔

۸۴ نظرۃ اجمالیۃ فی الدعوۃ الاسلامیہ فی الہند والباکستان ۔ مولانا مسعود عالم ندوی ۔

۸۵ ہزار سال پہلے ۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی ۔ شائع کردہ انجمن ثمرۃ التربیت دارالعلوم دیوبند

۸۶ ہمارے ہندوستانی مسلمان۔ ترجمہ ڈاکٹر صادق حسین۔ شائع کردہ اقبال اکیڈمی لاہور ۱۹۴۴ء۔

۸۷ ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں۔ مولانا ابوالحسنات ندوی۔ مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڈھ۔

۸۸ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی۔ مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی۔

۸۹ واقعات دارالحکومت دہلی۔ بشیر الدین احمد۔ مطبوعہ شمسی پریس آگرہ۔

اخبارات و رسائل

۹۰ الجمعیۃ دہلی (روزنامہ)

۹۱ "الرشید" لاہور کا دارالعلوم دیوبند نمبر (ماہنامہ) مدیر عبدالرشید ارشد۔

۹۲ "الفرقان" کا شاہ ولی اللہ نمبر (ماہنامہ) مولانا محمد منظور نعمانی ۱۳۵۹ھ۔

۹۳ "القاسم" (ماہنامہ) مطبع قاسمی دیوبند۔

۹۴ برہان دہلی (ماہنامہ) مولانا سعید احمد اکبر آبادی۔ ندوۃ المصنفین دہلی۔

۹۵ حیاتِ نو (ماہنامہ)

۹۶ دارالعلوم دیوبند (ماہنامہ) مولانا سید محمد ازہر شاہ قیصر۔

۹۷ "دعوت" دہلی (روزنامہ) ۱۹۶۹ء۔ مولانا محمد مسلم۔

۹۸ زبان و ادب (ماہنامہ) شائع کردہ آزاد کتاب گھر دہلی ۱۹۶۶ء۔

۹۹ زمیندار لاہور (روزنامہ) ۱۹۲۳ء۔

۱۰۰ سیاست لاہور (روزنامہ) ۱۹۲۳ء۔ سید حبیب۔

۱۰۱ "عصرِ جدید" کلکتہ (روزنامہ) ۱۹۳۶ء۔

۱۰۲ "قومی آواز لکھنؤ" (روزنامہ) مضمون مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی۔ مطبوعہ لکھنؤ

۱۰۳ "مجلّۃ العربی" ۔ کویت ۱۹۶۸ء ۔

۱۰۴ مجلّہ علوم الدین فیکلٹی آف تھیالوجی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بابت ۱۹۷۱-۷۲ء۔

۱۰۵ "مدینہ بجنور" (اخبار) ۱۹۴۶ء ۔